قصص القرآن

جلد اول

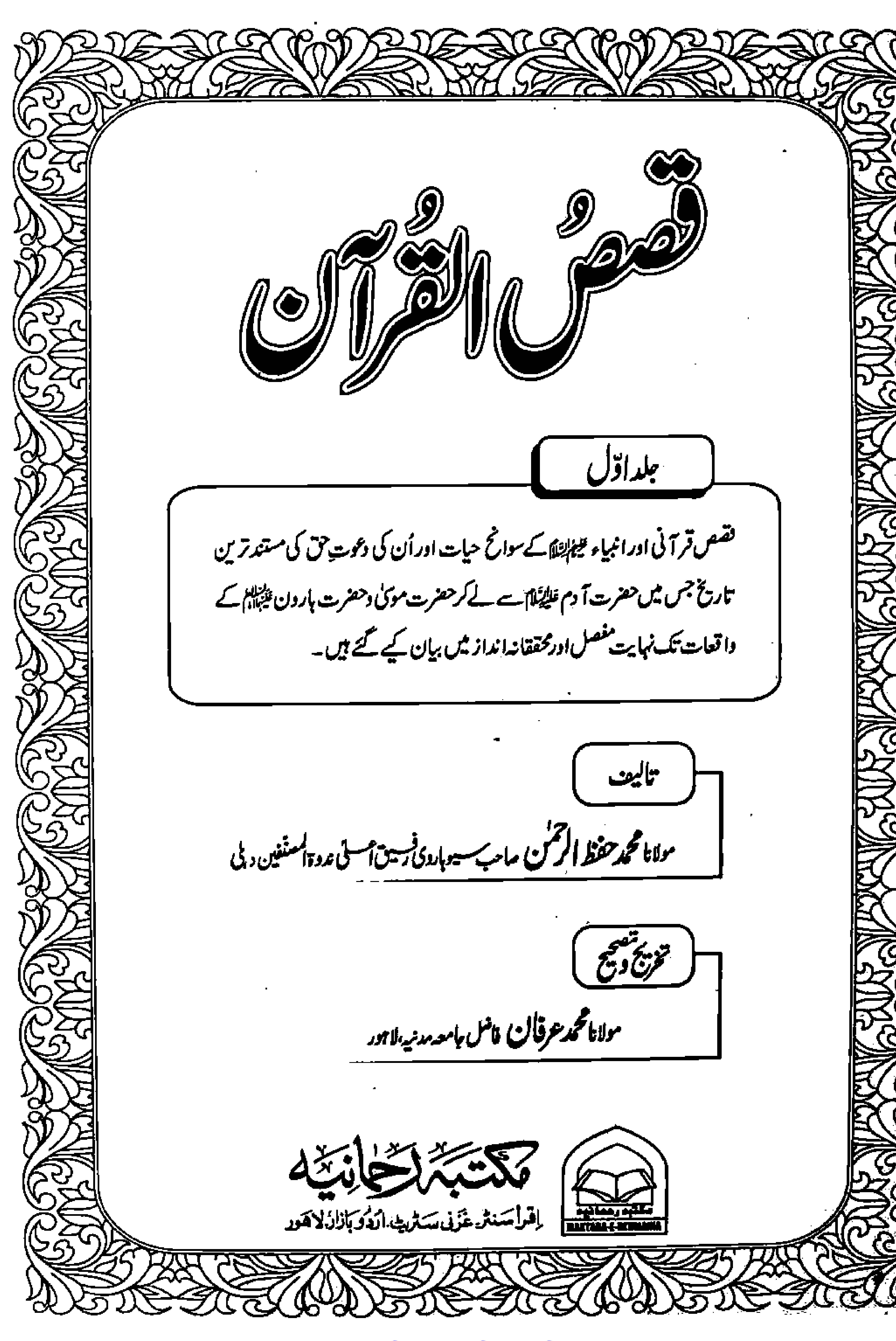
تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

رفیق ندوۃ المصنفین

مکتبہ رحمانیہ





قصص القرآن

جلد اوّل

قصص قرآنی اور انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات اور اُن کی دعوتِ حق کی مستند ترین تاریخ جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کے واقعات تک نہایت مفصل اور محققانہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

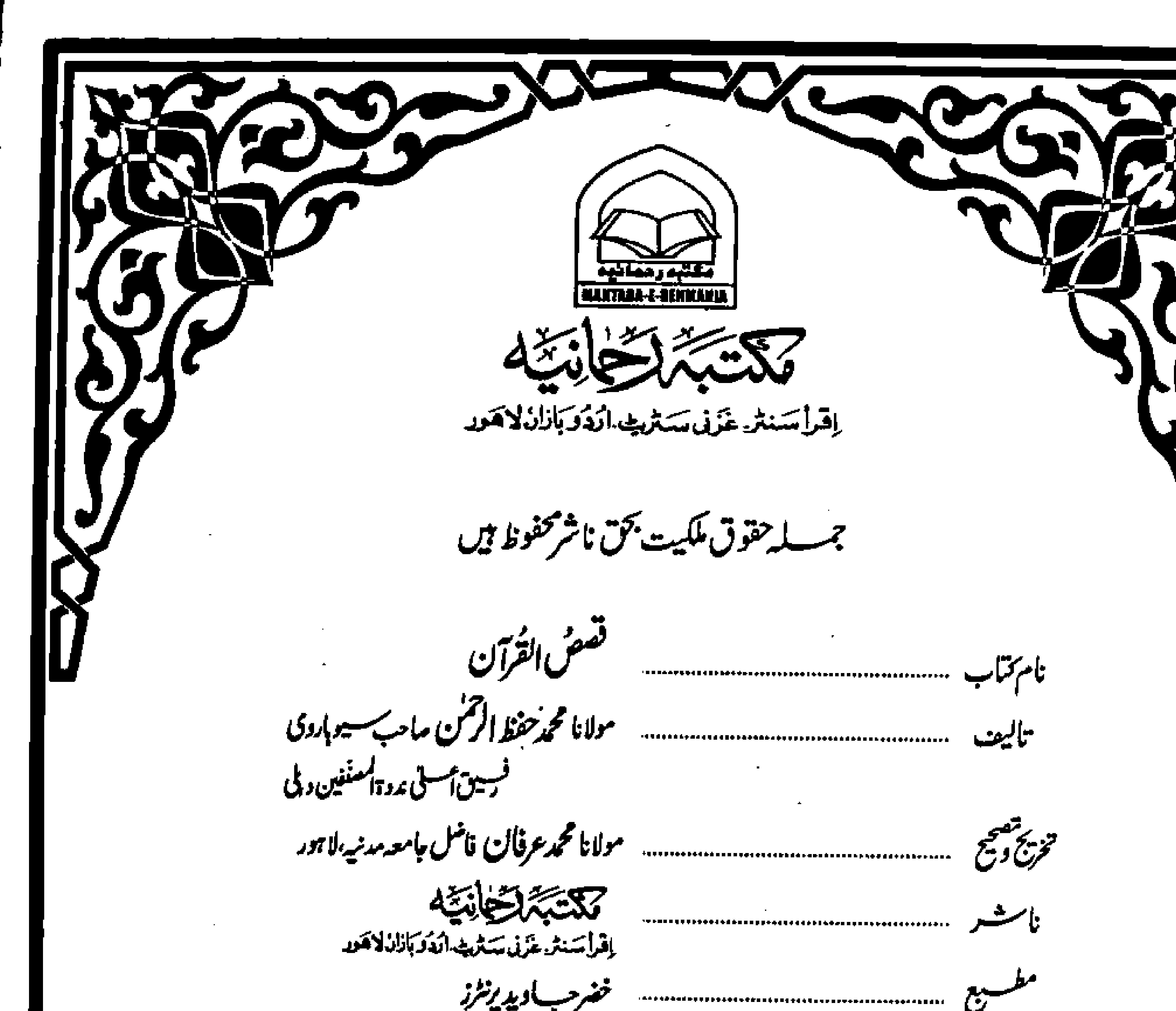
تخریج و تصحیح

مولانا محمد عرفان فاضل جامعہ مدنیہ، لاہور

مکتبہ رحمانیہ

اقرا سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

MAKTABA-E-REHMANIA



مکتبہ رحمانیہ

اِقرا سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار لاہور

نام کتاب .... قصص القرآن

تالیف .... مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی
رفیق اعلی ندوۃ المصنفین دہلی

تخریج و تصحیح .... مولانا محمد عرفان فاضل جامعہ مدنیہ، لاہور

ناشر .... مکتبہ رحمانیہ
اِقرا سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار لاہور

مطبع .... خضر جاوید پرنٹرز

ضروری وضاحت

ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لیے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لیے پھر بھی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرمادیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

فہرست مضامین (جلد اوّل)

حضرت ادریس علیہ السلام

حضرت ہود علیہ السلام

حضرت صالح علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت اسماعیل علیہ السلام

حضرت اسحاق علیہ السلام

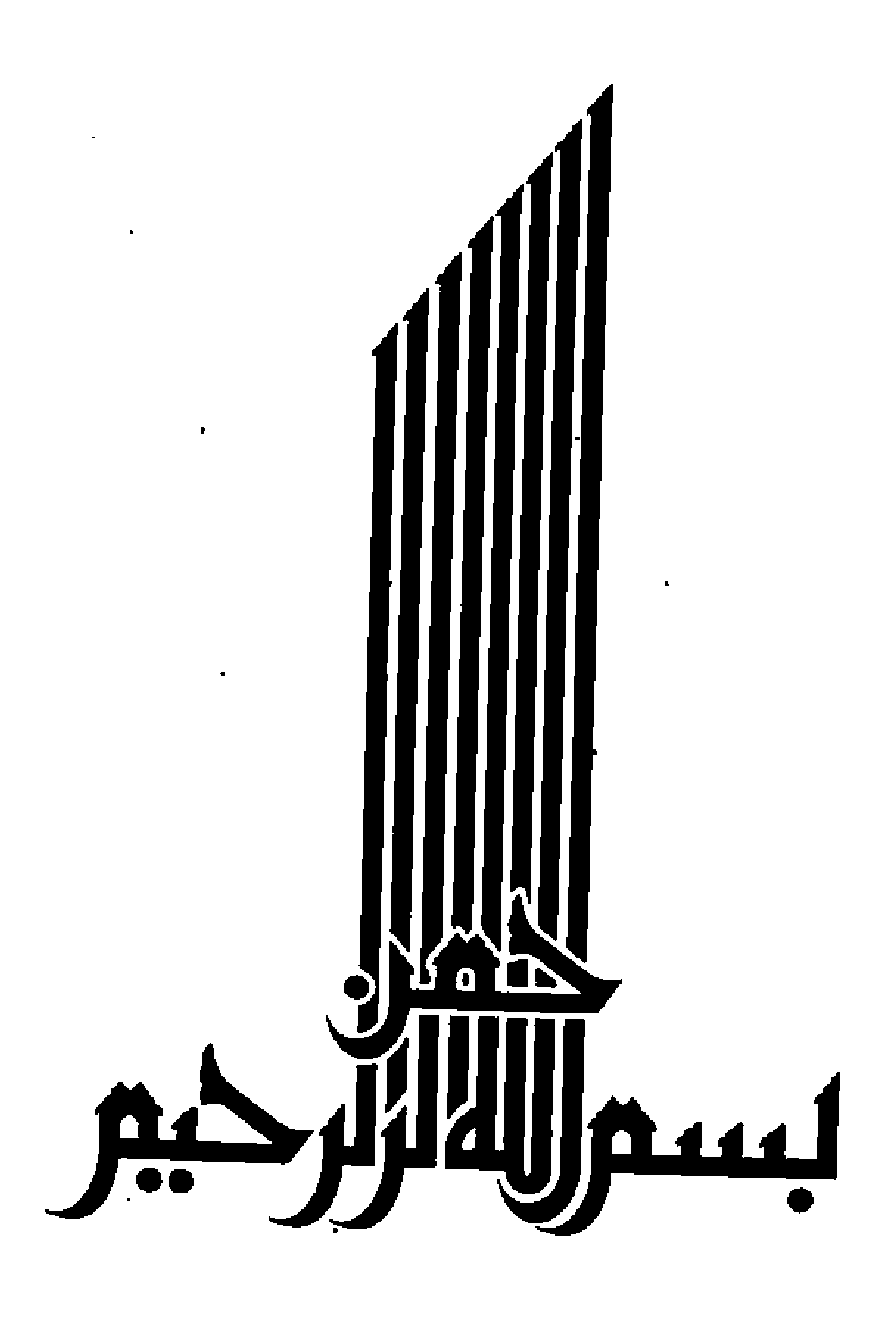
حضرت لوط علیہ السلام

حضرت یعقوب علیہ السلام

حضرت یوسف علیہ السلام

حضرت شعیب علیہ السلام

حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام


بسم الله الرحمن الرحيم

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کائنات میں بسنے والوں کے لئے ایک ایسی نعمت ہے جس کا شکر ادا کرنے سے انسانیت قاصر ہے، یہ کلام الٰہی ہے، ضابطۂ حیات ہے، یہ نصیحت وموعظت ہے۔ آج تک جتنے انسانوں نے اس پر ایمان لانے کے ساتھ اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھا اس کے اوامر کو پورا کیا اور اس کے منہیات سے اپنے کو روکا اس کی نصائح اور مواعظ کو گوش حق نیوش سے سنا اور عبرت حاصل کر کے سابقہ معتوب امتوں کی روش سے اپنے آپ کو بچایا تو ایسے لوگ دنیا وآخرت کی کامیابی کا پروانہ حاصل کرنے میں کامیاب وبامراد ہوئے۔

قرآن پاک میں مذکور انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے حالات و واقعات کو نصیحت حاصل کرنے کی غرض سے لکھنے کا قدیم زمانہ سے رواج ہے۔ بہت سے علماء ومؤرخین نے اس میدان میں قدم رکھا اور اپنی اپنی معلومات کے مطابق بہت سے انبیاء علیہم السلام سے متعلق بڑی گراں قدر معلومات جمع کر کے اپنی سعادت کا سامان کیا لیکن بعض مؤرخین نے واقعات کو نقل کرنے میں اچھے خاصے تساہل کو روا رکھا اور توریت وانجیل سے بہت سا رطب ویابس جمع کر کے حقائق واقعیہ کے ساتھ شامل کر دیا جو کہ کسی طرح بھی لائق قبول نہ تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی بندۂ خدا قرآن وسنت کو بنیاد بنا کر انبیاء علیہم السلام کے حالات و واقعات کو ضبطِ تحریر میں لائے اور اس سلسلہ میں ملحدین ومستشرقین کے اٹھائے گئے بے بنیاد اعتراضات کو طشت ازبام کر دے لاکھوں مسلمانوں کی اپنی زبان اردو میں تذکرۃ الانبیاء علیہم السلام سے متعلق دسیوں کتب منظر عام پر آ چکی تھیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اس ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر تھی۔ لکھوکھا مسلمانوں کی جانب سے اللہ تعالیٰ ڈھیروں جزائے خیر عطا فرمائے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کو کہ انہوں نے آج سے دسیوں سال قبل وقت کی اس اہم ضرورت کو محسوس فرمایا اور اپنی دینی، ملی، سیاسی اور دعوتی مصروفیات کے باوجود سینکڑوں صفحات پر مشتمل کتاب قصص القرآن تحریر فرما کر امت مسلمہ کے تمام حلقوں پر احسان عظیم فرمایا۔

مولانائے مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف عطا فرمائے تھے جن کا آپ کی تحریرات خصوصاً پیش نظر کتاب قصص القرآن سے اندازہ ہوتا ہے اس کتاب سے جہاں آپ کی قرآن فہمی کا پتہ چلتا ہے وہیں دیگر کتب سماویہ کے انتہائی عمیق مطالعہ کا بھی احساس ہوتا ہے بہت سے مقامات پر مولانا کے ادبی ذوق کے سبب انشاء وادب کے جواہر پارے بھی نوک قلم پر آ گئے ہیں جن سے اہل فن اپنے ذوق کے مطابق بہت سا حصہ پا لیتے ہیں۔ اس کتاب کی افادیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مولانا نے جب

سے یہ کتاب تصنیف فرمائی ہے اس وقت سے اب تک بلا مبالغہ دسیوں، سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں نسخے چھپ کر عوام و خواص کو انبیاء علیہم السلام کی زندگی سے روشناس کرا چکے ہیں۔ لیکن اسے بخت و اتفاق کی عدم موافقت کہہ لیجئے یا کچھ اور کہ یہ کتاب ہر لحاظ سے جتنی قیمتی تھی اتنی ہی کتابت و طباعت میں ادائیگی حق سے محروم رہی۔ دسیوں مقامات پر کتابت کی ایسی اغلاط موجود تھیں کہ جن کے سبب بات کو سمجھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا، کئی مقامات پر آیات قرآنی غلط چھپی ہوئی تھیں اور بہت سے مقامات پر مس پرنٹنگ کے سبب پڑھنا بھی دشوار ہوتا تھا۔ کئی مرتبہ اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر خیال ہوا کہ اس کو نئے سرے سے کتابت کرا کر چھاپ دیا جائے تا کہ ایک مفید چیز بہتر سے بہتر صورت میں قارئین تک پہنچائی جا سکے اور تقریباً دو سال سے اس خیال کو بہت سے مخلص دوستوں کے مشوروں نے خاصی تقویت پہنچائی حتیٰ کہ یہ خیال عزم مصمم کی صورت اختیار کر گیا بالآخر بنام خدا کتاب قصص القرآن کے چاروں حصے کمپیوٹر پر کمپوز کرنے کے لیے دے دیئے تا کہ جدید تقاضوں کے عین مطابق قارئین کے سامنے اس کو پیش کیا جا سکے۔ الحمد للہ، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کمپیوٹر پر کتابت کے بعد اس کی دو مرتبہ تصحیح کرائی تا کہ اپنی حد تک کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تصحیح کا کام بھی بحسن و خوبی انجام کو پہنچا۔ کتاب قصص القرآن کی سابقہ تمام طباعتوں میں اکثر آیات قرآنیہ کے نمبر نہیں دیئے گئے یہ درست ہے کہ اہل علم خاص کر حفاظ کرام کو اس کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی مگر غیر حافظ قارئین کو آیات کی تلاش و جستجو میں خاصی وقت کا سامنا تھا، الحمد للہ ہم نے کتاب میں آنے والی تمام آیات مبارکہ کو مکمل حوالہ کے ساتھ پیش کر دیا ہے جس کے سبب کتاب ہٰذا کا ہر قاری تھوڑے سے وقت میں بڑی سہولت کے ساتھ ہر ہر آیت کو قرآن پاک سے تلاش کر سکتا ہے۔ ہمارے پروگرام کے مطابق تو بہت پہلے اس کتاب کو اپنی موجودہ مفید ترین شکل میں منظر عام پر آ جانا چاہیے تھا مگر جدید کتابت، معیاری طباعت اور خوبصورت جلد بندی ہر کام نے ہمارے وہم و خیال کے علی الرغم وقت سے خاصہ حصہ لیا اور اب کتاب قصص القرآن اپنی تمام تر ظاہری و معنوی خوبیوں کے ساتھ آپ کے ہاتھوں میں ہے اللہ تعالیٰ سے دُعاء ہے کہ اس کو قبول فرما کر مصنف کتاب، تصحیح کنندہ اور ناشر و قارئین سب کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین

مقبول الرحمٰن



چند باتیں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ۱۰ جنوری ۱۹۰۱ء (۱۳۱۸ھ) کو سیوہارہ ضلع بجنور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے محلے کا نام "محلہ مولویاں" تھا۔ والد کا اسم گرامی مولوی حاجی شمس الدین صدیقی تھا جو اپنے علاقے کے اچھے خاصے زمیندار، نہایت نیک، خوش عقیدہ اور علمائے حق کے گرویدہ تھے۔ ریاست بھوپال اور ریاست بیکانیر میں اسسٹنٹ انجینئر کے عہدے پر مامور رہے۔ ان کے چار بیٹے تھے۔

ایک مولوی فخرالدین جو ڈپٹی کلکٹر کے منصب تک پہنچے۔

دوسرے مولوی بدرالدین جنہوں نے وکالت پاس کی اور اپنے علاقے اور عہد کے بہت اچھے وکیل ہوئے۔

تیسرے مولوی صلاح الدین جنہیں علم طب پڑھایا گیا اور انہوں نے مولوی حکیم صلاح الدین کے نام سے شہرت پائی۔

چوتھے معزالدین تھے جن کو اللہ نے بڑی عزت وتکریم سے نوازا۔ ان کا تاریخی نام "حفظ الرحمٰن" تھا اور یہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔

دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی کا نام بتول فاطمہ اور چھوٹی کا عظیم النساء تھا۔ بڑی بیٹی کی شادی مولوی انوارالحسن نائب صوبے دار ریاست گوالیار سے اور چھوٹی بیٹی کی حافظ محمد ابراہیم سے ہوئی تھی۔ یہ وہی حافظ محمد ابراہیم ہیں جو آزادی کے بعد ہندوستان کے وزیر آب پاشی و برقیات بنائے گئے تھے، اور صدر ایوب کے زمانہ میں جب ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے پاکستان کا دورہ کیا تھا تو نہری پانی کے سلسلے میں حکومت پاکستان سے گفتگو کرنے کی غرض سے حافظ محمد ابراہیم بھی ان کے ساتھ پاکستان آئے تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کے والد مکرم نے تین بیٹوں کو دنیوی تعلیم دلائی اور وہ اس میں کامیاب رہے، لیکن چوتھے بیٹے (حفظ الرحمٰن) کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کا فیصلہ کیا، اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں دلائی پھر مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد میں داخل کرا دیئے گئے، چند کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد مدرسہ فیض عام سیوہارہ میں چلے گئے اور اس زمانے کے درس نظامی کی تکمیل وہیں کی۔ یہ مرحلہ طے ہو چکا تو دارالعلوم دیوبند کا عزم کیا اور وہاں حضرت مولانا محمد انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اساتذہ سے استفادے کے مواقع میسر آئے۔ دیوبند سے فراغت کے بعد وہیں تدریسی خدمات سرانجام دینے لگے۔

ان کے وعظ وتقریر کی اثر انگیزیوں کی شہرت عالم جوانی ہی میں دور دراز علاقوں میں پہنچ گئی تھی اور لوگ نہایت شوق سے ان کے تبلیغی جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

۱۹۱۸ء یعنی اٹھتی جوانی میں انہوں نے سیاسیات کے میدان میں قدم رکھا اور اپنی بے پناہ سرگرمیوں کی بناء پر بہت جلد ملک کے معروف وممتاز رہنماؤں میں ان کا شمار ہونے لگا۔

اس زمانے کے لوگوں میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کا جذبہ بڑا تیز تھا۔ مدراس کے روساء وامراء کی اس باب میں دلچسپیاں

خاص طور سے بہت مشہور تھیں۔ وہاں ایک بزرگ سیٹھ یعقوب سکونت پذیر تھے۔ انہوں نے مولانا ممدوح سے مدراس تشریف لے جانے اور وہاں اسلام کی تبلیغ کرنے کی درخواست کی، چنانچہ اپنے اساتذہ کے مشورے سے ۱۹۲۶ء میں وہ یہ خدمت سرانجام دینے کے لیے مدراس گئے اور کچھ مدت وہاں فریضہ تبلیغ ادا کرتے رہے۔

۱۹۲۸ء میں دارالعلوم (دیوبند) کے انتظامی معاملات میں شدید کشمکش کا سلسلہ شروع ہوا، جس کے نتیجے میں حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے وہاں کی سکونت ترک کر کے ڈابھیل جانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت ان بزرگان گرامی قدر کے ساتھ جن لوگوں نے رخت سفر باندھا ان میں مولانا بدر عالم میرٹھی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان حضرات کی یہ نوجوانی کا زمانہ تھا اور یہ مولانا انور شاہ کے لائق و ذہین شاگرد تھے جو اس وقت مدرسین کی جماعت میں شامل ہو چکے تھے۔ ڈابھیل وہ گوشۂ عزلت تھا جس میں مولانا حفظ الرحمٰن اور ان کے رفقائے کرام کی صلاحیتوں میں بڑا اضافہ ہوا اور انہوں نے وہاں خوب تن دہی سے کام کیا۔

۱۹۳۴ء میں مولانا حفظ الرحمٰن کلکتے چلے گئے اور دو سال وہاں اقامت گزیں رہے، وہاں انہوں نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع کر دیا، جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس سے متاثر ہو کر انہوں نے ایک مستقل تصنیفی ادارے کے قیام کا فیصلہ کیا۔

۱۹۳۸ء میں انہوں نے دہلی میں "ندوۃ المصنفین" کے نام سے تصنیفی ادارہ قائم کیا، جس کا دفتر فیض روڈ (قرول باغ) کی ایک بہت بڑی کوٹھی میں تھا۔ ندوۃ المصنفین کے قیام کے ساتھ ہی انہوں نے ایک ماہانہ رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا جس کا نام "برہان" رکھا گیا ندوۃ المصنفین کا قیام مندرجہ ذیل حضرات کی رفاقت سے عمل میں آیا تھا۔

① مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (رفیق اعلیٰ) ② مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (ناظم ندوۃ المصنفین)
③ مولانا بدر عالم میرٹھی (رفیق) ④ مولانا سعید احمد اکبرآبادی (رفیق و ایڈیٹر ماہنامہ "برہان")
⑤ مولانا حامد الانصاری غازی (رفیق) ⑥ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی (رفیق)

یہ اصحاب ستہ یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور ان میں سب سے بعد میں سفر آخرت اختیار کرنے والے قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی تھے، جنہوں نے تصنیفی خدمات بھی انجام دیں، میرٹھ کی شاہی مسجد کا منصب خطابت بھی سنبھالے رکھا اور جامعہ ملیہ دہلی میں مسند تدریس پر بھی فائز رہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے تصنیفی ادارے میں بڑی محنت اور انہماک و توجہ سے کام کا آغاز کیا اور محققانہ کتابیں تصنیف کیں، جن کا مختصر الفاظ میں یہاں تعارف کرایا جاتا ہے۔

① قصص القرآن: یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے اور کم و بیش دو ہزار صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ہر جلد کے مشمولات اس قسم کے ہیں۔

جلد اول: اس میں حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت موسیٰ علیہ السلام تک کے انبیائے کرام کے واقعات و حالات معرض تحریر میں لائے گئے ہیں۔

جلد دوم: حضرت یوشع سے حضرت یحییٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے سوانح حیات اور ان کی دعوت و تبلیغ کی مکمل تفصیل اس جلد میں

بیان کردی گئی ہے۔

جلد سوم : اس جلد میں بعض انبیائے کرام علیہم السلام کے سوانح زندگی کے علاوہ متعدد دیگر واقعات قرآنی بیان کیے گئے ہیں، مثلاً اصحاب کہف ورقیم، اصحاب القریہ، اصحاب السبت، اصحاب الرس، بیت المقدس اور قوم یہود، اصحاب الاخدود، اصحاب الفیل، اصحاب الجنہ، ذوالقرنین اور سد سکندری۔ علاوہ ازیں سباء اور سیل عرم وغیرہ کا محققانہ اور مؤرخانہ اسلوب میں ذکر کیا گیا ہے۔

جلد چہارم : یہ جلد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور رسول اللہ ﷺ کی مقدس سیرتوں کے بیان پر محیط ہے جو قرآن مجید کی روشنی میں ضبط تحریر میں لائی گئی ہیں۔ اس جلد میں بعض دیگر مباحث بھی آ گئے ہیں۔

قصص القرآن جو اس وقت قارئین کرام کے زیر مطالعہ ہے اپنے موضوع کی نہایت اہم تصنیف ہے۔ اس کی بہت بڑی خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ ہر مقام پر اسلاف کے نقطۂ نظر کو پیش نگاہ رکھا گیا ہے اور قرآن کے بعض قصص و واقعات پر جن لوگوں نے کوئی اعتراض کیا یا غلط تاویل سے کام لیا ہے، اس کا دلائل سے جواب دیا گیا ہے۔ اُردو زبان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے جو کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔

اس کتاب کی ایک نمایاں صفت یہ ہے کہ بیک وقت یہ قرآن کی تفسیر بھی ہے، امم سابقہ کی تاریخ بھی ہے، ان کے اعمال و کردار کے جو نتائج نکلے، اس کی پوری تفصیل بھی اس میں بیان کردی گئی ہے۔ پھر قرآن نے جس خوبصورت پیرائے میں اظہار واقعہ کیا ہے۔ اُردو زبان میں نہایت حسن و خوبی سے اس کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ آیات کے ترجے میں گرائمر کے نقطۂ نگاہ کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب اس درجہ گوناگوں خصائص کی حامل ہے کہ اس کے مطالعہ سے قرآن کے تمام اہم مقامات نظر و بصر کے زاویوں میں آ جاتے ہیں۔

② **اسلام کا اقتصادی نظام :** محنت اور سرمایہ کی یا مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش کسی نہ کسی صورت میں یوں تو ہمیشہ جاری رہی ہے، مگر چند سالوں سے اس میں زیادہ ہی شدت پیدا ہوگئی ہے اور اس سلسلے میں سیاسی اور اقتصادی خطوط پر بہت سے مسائل ابھر آئے ہیں، جنہوں نے ساری دنیا کو ایک قسم کے میدان جنگ میں لا کھڑا کیا ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے اس موضوع پر بہت ہی احتیاط اور توازن کے ساتھ اظہار خیال فرمایا ہے۔ انہوں نے اس بنیادی مسئلے میں اسلامی احکام کی بھی وضاحت کی ہے اور موجودہ نظاموں کو بھی پیش نگاہ رکھا ہے۔ اُردو میں اس موضوع کی یہ ایک جامع اور مدلل کتاب ہے۔

③ **اخلاق اور فلسفہ اخلاق :** اخلاقیات کو اسلام کے جامع اور ہمہ گیر نظام زندگی میں ایک اہم باب کی حیثیت حاصل ہے۔ مولانا سیوہاروی رحمہ اللہ نے اس ضخیم کتاب میں اس موضوع پر بسط و تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس میں سابق انبیائے کرام علیہم السلام کے اقوال و ارشادات اور عمل و کردار کا تذکرہ بھی کیا ہے، اسلام کے احکام بھی بیان کیے ہیں اور حکمائے اسلام نے اخلاقیات کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس کی تفصیل بھی درج کی ہے، مثلاً امام رازی، امام غزالی، مولانا رومی، حافظ ابن قیم، شیخ سعدی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہم اللہ وغیرہم نے جس نہج سے اس مسئلے کو ہدف نظر ٹھہرایا ہے، اس کی صاف ستھرے انداز میں وضاحت کی ہے۔

④ **البلاغ المبین فی مکاتیب سید المرسلین :** اس کتاب میں فاضل مصنف نے رسول اکرم ﷺ کے وہ خطوط و مکاتیب جمع کر

دیے ہیں جو آپ ﷺ نے اپنے عہد کے امراء و سلاطین کے نام تحریر فرمائے۔ مولانا سیوہاروی رحمہ اللہ نے ان خطوط کا پس منظر اور ضروری تشریحات اس طرح پیش کی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا طریق دعوت و تبلیغ کھل کر قارئین کے سامنے آ جائے اور علماء و مبلغین اسے اپنے لیے اسوہ اور نمونہ بنا سکیں۔

⑤ **نور البصر فی سیرة خیر البشر:** اس کتاب کا دوسرا نام "سیرت رسول کریم ﷺ" ہے اور یہ اسی نام سے مشہور ہے۔ اس میں نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب انہوں نے قیام ڈابھیل کے زمانے میں لکھی تھی۔

بلاشبہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہ اللہ جلیل القدر عالم بہت بڑے مقرر اور ممتاز مصنف تھے۔

آزادیِ برصغیر کے بعد وہ کئی سال ہندوستان کی پارلیمنٹ کے رکن رہے اور انہوں نے وہاں کے مسلمانوں کی بے حد خدمت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سے اوصاف سے مالا مال کیا تھا۔ ان کی خدمات اور مسلمانوں کے لیے مسلسل مساعی کی بنا پر انہیں "مجاہد ملت" کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔

زندگی کے آخری دور میں انہیں پھیپھڑے کا سرطان ہو گیا تھا۔ وہ دہلی اور بمبئی کے ماہر معالجوں کے زیر علاج رہے احباب اور مخلصین کے اصرار سے علاج کے لیے امریکہ بھی گئے، لیکن صحت یاب نہ ہوئے۔ آخر ۲ اگست ۱۹۶۲ء (۳۰ صفر ۱۳۸۲ھ) کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

محمد اسحاق بھٹی

لاہور



پیش لفظ

(طبع اوّل)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمدللہ الّذی ھدانا بالکتاب المبین، و انزل علینا القرآن بلسانٍ عربیّ مبین، وقص فیہ احسن القصص موعظۃ و ذکریٰ للمؤمنین، والصّلوٰۃ والسّلام علی النبیّ الصادق الامین۔ محمّد رسول اللہ و خاتم النبیّین۔ وعلیٰ آلہٖ واصحابہ الذین ھم ھداۃٌ للمتّقین۔

امابعد! قرآن عزیز میں حق تعالیٰ نے دنیا انسانی کی ہدایت کے لیے جومختلف معجزانہ اسلوب بیان اختیار فرمائے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ گذشتہ قوموں کے واقعات وقصص کے ذریعہ ان کے نیک و بداعمال اوران اعمال کے ثمرات ونتائج کو یاددلائے اور عبرت وبصیرت کا سامان مہیا کرے، اسی لئے وہ تاریخی اسلوب بیان کے درپے نہیں ہوتا بلکہ ابلاغ حق اور دعوت الی اللہ کے اہم مقصد کے پیش نظر صرف انہی وقائع کو سامنے لاتا ہے جواس غرض وغایت کو پورا کرتے ہوں اوراسی لئے قرآن عزیز میں ان کی تکرار پائی جاتی ہے تاکہ سامعین کے دل میں وہ گھر کرسکیں اورفطری اورطبعی رجحانات کوان حقائق کی جانب متوجہ کیا جاسکے، اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ ایک بات کومختلف پیرایہ بیان اورمناسب حال اسلوب نگارش سے بار بار دہرایا جائے اورخوابیدہ قوائے فکریہ کو پے بہ پے بیدارکیا جائے۔

قرآن مجید کے قصص وواقعات کا سلسلہ بیشتر گذشتہ اقوام اوران کی جانب بھیجے ہوئے پیغمبروں سے وابستہ ہے اورجستہ جستہ بعض اورواقعات بھی اس ضمن میں آگئے ہیں، اور یہ تمام ترحق و باطل کے مجادلوں، اوراولیاء اللہ واولیاء الشیطان کے معرکوں کا ایک عبرت آموز اوربصیرت خیز بےمثل ذخیرہ ہے۔

لیکن دوسروں کا کیاذکرہم مسلمانوں میں بھی بہت کم ہیں جوخدائے تعالیٰ کے اس مکمل ترین اورآخری قانون (قرآن عزیز) سے استفادہ کرتے اوراپنے مردہ دلوں میں ایمان ویقین کی زندگی پیدا کرتے ہوں اس لئے کہ یہ خدا کا قانون ہے اورہم اس کے امتثال پر مامور ہیں اورمعانی ومطالب پرغورکرتے ہوں یہ سمجھ کرکہ یہ رہتی دنیا تک حیات ابدی وسرمدی اوردارین کی فلاح وسعادت کا مکمل دستور ہے۔

نزول قرآن کے وقت پیغمبرخدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکوں کی معاندانہ روش سے تنگ آکر یہ شکایت کی تھی۔

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۝﴾ (الفرقان:۳۰)

رسول اللہ ﷺ نے کہا: "اے میرے پروردگار! بے شبہ میری قوم نے قرآن کو مہجور (جھک جھک) بنالیا ہے۔"

لیکن اس چودھویں صدی میں اگر ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں تو دعوائے اسلام اور قرآن کو خدا کا کلام یقین کرنے کے باوجود کتنے ہیں جو اس کلام الٰہی کو اپنی زندگی کے لئے بہترین نظام عمل بناتے اور اس نظر سے اس کی تلاوت کرتے ہوں۔

اپنی اور اپنی قوم کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے جی چاہا کہ اس سرمایہ عبرت و بصیرت کو اُردو میں منتقل کیا جائے تا کہ نقل سے محظوظ ہونے کے بعد خود بخود اصل کی جانب رغبت پیدا ہو اور اس طرح سعادت دارین کا سراغ ملے۔

اپنی سادہ طرز نگارش کے باوجود اس مجموعے میں چند خصوصیات کا خاص طور پر لحاظ کیا گیا۔

① کتاب میں تمام واقعات کی اساس و بنیاد قرآن عزیز کو بنایا گیا ہے اور احادیث صحیحہ اور واقعات تاریخی سے اس کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔

② تاریخ اور کتب عہد قدیم کے درمیان اور قرآن عزیز کے "یقین محکم" کے درمیان اگر کہیں تعارض آ پڑا ہے تو اس کی روشن دلائل و براہین کے ذریعہ یا تطبیق دی گئی ہے اور یا پھر صداقت قرآن کو وضاحت سے ثابت کیا گیا ہے۔

③ اسرائیلی خرافات اور معاندین کے اعتراضات کی خرافت کو حقائق کی روشنی میں ظاہر کیا گیا ہے۔

④ خاص خاص مقامات پر تفسیری، حدیثی اور تاریخی اشکالات پر بحث و تمحیص کے بعد سلف صالحین کے مسلک کے مطابق ان کا حل پیش کیا گیا ہے۔

⑤ ہر پیغمبر کے حالات قرآن عزیز کی کن کن سورتوں میں بیان ہوئے ہیں ان کو نقشہ کی شکل میں ایک جگہ دکھایا گیا ہے۔

⑥ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ "نتائج و عبر" یا "عبر و بصائر" کے عنوان سے اصل مقصد اور حقیقی غرض و غایت یعنی عبرت و بصیرت کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔

خادم ملت

محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی

مرقومہ ۲۲ رجب المرجب ۱۳۶۰ھ



دیباچہ طبع ثانی

قصص القرآن حصہ اول و دوم عرصہ ہوا کہ ختم ہو گئے تھے مگر کاغذ کی قلت، کنٹرول کی پابندیوں اور طباعت کی گونا گوں مشکلات نے موقع نہ دیا کہ دوسرا ایڈیشن جلد طبع ہوسکتا، تاہم سعی بلیغ کے بعد طبع دوم کی نوبت آ ہی گئی اور اب اصحاب کے ہاتھوں میں حصہ اول کا دوسرا ایڈیشن پہنچ رہا ہے۔ فالحمد للہ علی ذلك۔

ارادہ تھا کہ اس مرتبہ نظر ثانی کر کے کتاب کو نئے اسلوب پر ترتیب دیا جائے، لیکن حصہ اول کی کتابت اس وقت ہوئی جبکہ میں مراد آباد اور بریلی کی جیلوں میں اسارت سے لطف اندوز ہو رہا تھا اس لئے یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا۔ پھر بھی یہ ترمیم ضروری خیال کی گئی کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا پورا واقعہ پہلے ہی حصہ میں آ جائے اور پہلے ایڈیشن کی طرح نصف دوسرے حصہ کے لئے باقی نہ رہے، چنانچہ اس ایڈیشن میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کے مکمل حالات و واقعات یکجا ہو گئے ہیں۔

دیباچہ طبع ثالث

ولی مرحوم کے "مرحوم" ہونے کے بعد کسے گمان تھا کہ قرول باغ میں برباد شدہ ادارہ "ندوۃ المصنفین" دوبارہ زندگی کے سانس لے سکے گا، لیکن مشیت ایزدی نے اس کو روح تازہ بخشی اور سابق کی طرح علمی و دینی خدمت کے لئے اس کو ایک مرتبہ پھر شاہراہ افادیت پر گامزن کیا۔ تاہم ناسازگار حالات اور نامساعد ساعات نے مسلمانان ہند کی جن نت نئی خدمات سے دوچار کیا، ان کی وجہ سے وہ منصوبہ آج بھی پورا نہ ہوسکا کہ قصص القرآن جلد اوّل کو نئے اسلوب پر ترتیب دیا جائے۔

حق تعالیٰ نے توفیق بخشی تو بعد کے ایڈیشن میں اس عزم کو پورا کیا جا سکے گا۔

محمد حفظ الرحمٰن

۱۵ شعبان ۶۹ ۱۳ھ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"قصص القرآن" کا شمار "ندوۃ المصنفین" کی مقبول ترین کتابوں میں ہوتا ہے، علمی اور تحقیقی اعتبار سے بھی اس کا پایہ نہایت بلند ہے، اسی لئے اس کو اب تک بہتر سے بہتر طریقے پر شائع کرنے کی کوشش کی گئی، پھر بھی یہ خلش باقی تھی کہ سعی بلیغ کے باوجود کتاب اپنی حیثیت اور درجے کے مطابق طبع نہیں ہوسکی، شکر ہے اس دفعہ یہ خلش مٹ گئی، اور اب یہ دل آویز اور دیدہ زیب ایڈیشن آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے جس کی کتابت بھی نفیس اور دل کش ہے اور طباعت بھی صاف، سبک اور خوبصورت ہے۔

ظاہری خوبیوں سے قطع نظر اس ایڈیشن کی سب سے اہم خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کو مصنف مرحوم کی مکمل نظر ثانی کے بعد شائع کیا جارہا ہے۔

مرحوم برسوں سے کتاب کی جلد اوّل اور جلد ثانی پر وسیع اور عمیق نظر ثانی کے خیال میں تھے، مگر ۴۷ء کے انقلاب کے بعد کی غیر معمولی مشغولیات نے ان کو اس کا موقع نہیں دیا تھا، یہاں تک کہ سفر آخرت سے دو سال قبل اس خدمت کے لئے کچھ اس طرح مستعد ہوئے کہ سفر و حضر میں جب بھی موقع ملتا کام کرتے، کبھی کبھی تو صبح سے شام تک اسی کام میں منہمک رہتے تھے۔ نظر ثانی کے وقت اسلوب اور طرز ادا میں رد و بدل کے علاوہ بعض نہایت اہم اور مفید اضافے بھی کئے گئے ہیں، ان اضافوں کے بعد قدرتی طور پر کتاب کا پایہ تحقیق اور بھی بلند ہوگیا ہے۔

صد افسوس کہ مرحوم کی زندگی میں یہ ایڈیشن جلوہ افروز نہ ہوسکا، دیکھتے تو کس قدر مسرور ہوتے لیکن

مَا كُلُّ مَا يَتَمَنَّى الْمَرْءُ يُدْرِكُهُ
تَجْرِي الرِّيَاحُ بِمَا لَا تَشْتَهِي السُّفُنُ

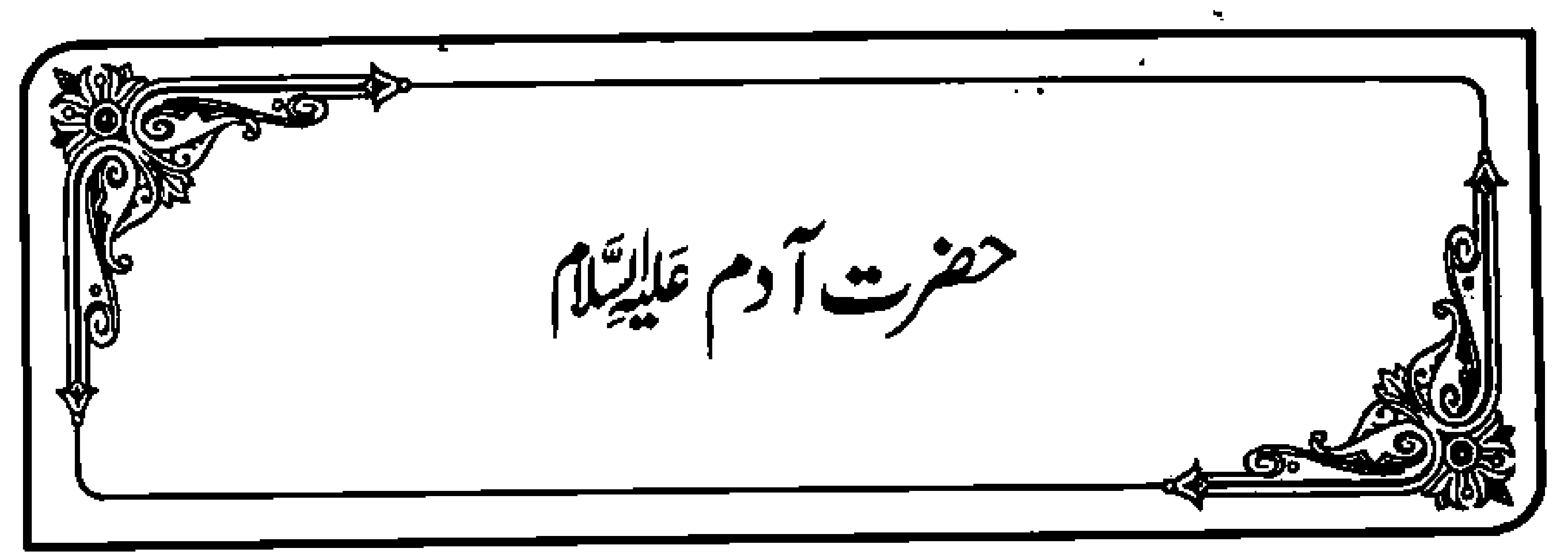
اس وقت کی یہ سطریں زیر قلم ہیں مرحوم کی یاد تیز اور اونچی آواز سے دل پر دستک دے رہی ہے اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔

اُمید ہے قارئین کرام کتاب کے مطالعہ کے وقت مرحوم کے لئے ایصال ثواب کا خاص خیال رکھیں گے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۲۰ نومبر ۱۹۶۴ء





حضرت آدم علیہ السلام

انسانِ اوّل:

حضرت آدم (علیہ السلام) کے متعلق قرآن عزیز نے جو حقائق بیان کیے ہیں ان کے تفصیلی تذکرہ سے پہلے یہ واضح ہو جانا ضروری ہے کہ انسان کے عالم وجود میں آنے کا مسئلہ آج علمی نقطہ نگاہ سے بحث کا ایک نیا دروازہ کھولتا ہے یعنی ارتقاء (Evolution) کا یہ دعویٰ ہے کہ موجودہ انسان اپنی ابتدائی تخلیق وتکوین ہی سے انسان پیدا نہیں ہوا بلکہ کائنات ہست و بود میں اس نے بہت سے مدارج طے کر کے موجودہ انسانی شکل حاصل کی ہے، اس لیے کہ مبدأ حیات نے جمادات ونباتات کی مختلف شکلیں اختیار کر کے ہزاروں لاکھوں برس بعد درجہ بدرجہ ترقی کر کے اوّل "لبونہ" (پانی کی جونک) کا لباس پہنا اور پھر ایسی ہی طویل مدت کے بعد حیوانات کے مختلف چھوٹے بڑے طبقات سے گزر کر موجودہ انسان کی شکل میں وجود پذیر ہوا۔

اور مذہب یہ کہتا ہے کہ خالق کائنات نے انسان اول کو آدم (علیہ السلام) کی شکل میں ہی پیدا کیا اور پھر اس کی طرح ایک ہم جنس مخلوق حوّا کو وجود دے کر کائنات ارض پر نسل انسان کا سلسلہ قائم کیا، اور یہی وہ انسان ہے جس کو خالق کائنات نے عالم مخلوق پر برتری اور بزرگی عطا فرمائی اور امانت الٰہی کا بار گراں اس کے سپرد فرمایا اور کل کائنات کو اس کے ہاتھ میں مسخر کر کے خلافت ونیابت الٰہی کا شرف اس ہی کو بخشا۔

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝﴾ (التین: ۴)

"بلاشبہ ہم نے انسانوں کو بہترین اندازہ سے بنایا ہے۔"

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ﴾ (بنی اسرائیل: ۷۰)

"بے شبہ ہم نے نسل آدم کو تمام کائنات پر بزرگی اور برتری بخشی۔"

﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ (البقرہ:۳۰)

"میں زمین پر (آدم کو) اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں"۔

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ﴾ (الاحزاب:۷۲)

"ہم نے بارِامانت کو آسمانوں اور زمین پر پیش کیا تو انہوں نے (کل کائنات) امانت الٰہی کے بار کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس بارِگراں کو اٹھالیا"۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ نظریہ ارتقاء (Evolution) اور مذہب کے درمیان اس خاص مسئلہ میں علمی تضاد ہے یا تطبیق کی گنجائش نکل سکتی ہے خصوصاً جبکہ علم اور تجربہ نے یہ حقیقت واشگاف کر دی ہے کہ دینی اور مذہبی حقائق اور علم کے درمیان کسی بھی موقف پر تضاد نہیں ہے اور اگر ظاہر سطح میں کہیں ایسا نظر بھی آتا ہے تو وہ علم کے بعض حقائق مستور ہونے کی وجہ سے نظر آتا ہے کیونکہ بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ جب بھی علم کے مستور حقائق سے پردہ اٹھا تو اسی وقت تضاد بھی جاتا رہا اور وہی حقیقت نکھر کر سامنے آ گئی جس کا اظہار وحی الٰہی کے ذریعہ ہو چکا تھا۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیجئے کہ علم اور مذہب کے درمیان اگر کسی وقت بھی تضاد نظر آیا تو نتیجہ میں علم کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑی اور وحی الٰہی کا فیصلہ اپنی جگہ اٹل رہا۔

اس بناء پر اس جگہ بھی قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آ جاتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں حقیقت حال کیا ہے اور کس طرح ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس موقف پر بھی علم (ارتقاء) اور مذہب کے درمیان تضاد نہیں ہے البتہ یہ مسئلہ چونکہ دقیق نکتہ سنجیوں کا حامل ہے اس لئے یہ مقام اس کے تفصیلی مباحث کا متحمل نہیں ہو سکتا اور اسی کتاب کے کسی دوسرے مقام پر زیر بحث آ سکے گا۔

تاہم اس جگہ یہ حقیقت ضرور پیش نظر رہنی چاہیے کہ انسان اوّل (جو کہ موجودہ نسل آدم کا باوا آدم ہے) خواہ ارتقائی (Evolution) نظریہ کے مطابق درجہ بدرجہ انسانی شکل تک پہنچا ہو یا ابتداء تخلیق ہی کے وقت سے انسانی صورت میں وجود پذیر ہوا ہو علم اور مذہب دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ موجودہ انسان ہی اس کائنات کی سب سے بہتر مخلوق ہے اور عقل و دانش کا یہ پیکر ہی اپنے اعمال و کردار کے لیے جوابدہ ہے اور دستور قانون کا مکلف!

یا اس طرح تعبیر کر لیجئے کہ انسانی کردار اور اس کے علمی و عملی نیز اخلاقی عوامل و محرکات کے پیش نظر اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ اس کی تخلیق و تکوین اور عالم وجود میں آنے کی تفصیلات کیا ہیں بلکہ اہمیت کا موقف یہ ہے کہ اس عالم کون و مکان میں اس کا وجود یونہی بے معنی اور بے مقصد وجود میں آیا ہے یا اس کی ہستی اپنے اندر عظیم مقصد لے کر وجود پذیر ہوئی ہے؟ کیا اس کے افعال و اقوال اور کردار و گفتار کے اثرات لایعنی ہیں؟ کیا اس کی مادی اور روحانی قدریں سب کی سب مہمل اور بے نتیجہ ہیں یا بیش بہا ثمرات کی حامل اور پُراز حکمت ہیں؟ اور کیا اس کی زندگی اپنے اندر کوئی روشن و تابناک حقیقت رکھتی ہے یا تیرہ و تاریک مستقبل کا پتہ دیتی

ہے اور اس کا ماضی اور حال اپنے مستقبل سے بے بہرہ ہے؟۔

پس اگر ان حقائق کا جواب نفی میں نہیں بلکہ اثبات میں ہے تو پھر قدرتی طور پر یہ تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ اس کی کیفیت پیدائش پر بحث کی بجائے اس کے وجود کے مقصد پر پوری نگاہ رکھی جائے اور یہ تسلیم کیا جائے کہ اس اشرف المخلوقات ہستی کا وجود بلاشبہ مقصد عظیم کا پتہ دیتا ہے اور اس لیے اس کی اخلاقی قدروں کا ضرور کوئی "مثل اعلیٰ" اور اس کی تخلیق کی کوئی غایت ہے۔

قرآن عزیز نے اسی لیے حضرت انسان سے متعلق مثبت اور منفی ہر دو پہلو کو واضح کر کے انسانی ہستی کی عظمت کا اعلان کیا ہے اور بتلایا ہے کہ خالق کائنات کی قدرت تخلیق و تکوین میں انسان کی تخلیق "احسن تقویم" کا درجہ رکھتی ہے اور اسی وجہ سے وہ تمام کائنات کے مقابلہ میں "تکریم و تعظیم" کا مستحق ہے اور اپنے حسن تقویم اور لائق تکریم ہونے کی بناء پر بلاشبہ وہی امانت الٰہی کا علمبردار ہو کر (خلیفۃ اللہ) کے منصب پر فائز ہونے کا حق رکھتا ہے اور جب یہ سب کچھ اس میں ودیعت ہے تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی ہستی کو یونہی بے مقصد اور بے نتیجہ چھوڑ دیا جاتا۔

﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴾ (القیامۃ:۳۶)

"کیا خیال رکھتا ہے انسان کہ چھوٹا رہے گا بے قید۔"

اور ضروری ہے کہ عقل و شعور کے اس پیکر کو تمام کائنات سے ممتاز بنا کر نیک و بد کی تمیز عطا کی جائے اور برائی سے پرہیز اور بھلائی کے اختیار کا مکلف بنایا جائے۔

﴿ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴾ (طٰہٰ:۵۰)

"(اللہ تعالیٰ نے) انسان کو پیدا کیا اور پھر (نیک و بد کی) راہ دکھائی۔"

﴿ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴾ (البلد:۱۰)

"پھر ہم نے انسان کو دونوں راستے (نیک و بد کے) دکھلائے۔"

غرض قرآن عزیز کی تذکیر و دعوت، اوامر و نواہی، اور رشد و ہدایت کا مخاطب اور مبدأ و معاد کا محور و مرکز صرف یہی ہستی ہے جس کو "انسان" کہتے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن عزیز نے انسانِ اوّل کے تخلیقی کوائف و تفصیلات کو نظر انداز کر کے اس کے "مبدء و معاد" کے مسائل ہی کو اہمیت دی ہے۔

ذکر آدم علیہ السلام سے متعلق آیات قرآنی:

قرآن عزیز میں حضرت آدم علیہ السلام کا نام پچیس مرتبہ پچیس آیات میں آیا ہے جو ذیل کے جدول سے ظاہر ہوتا ہے۔

شمار	آیات	نام سورۃ	نمبر سورۃ
۵	۳۱۔۳۳۔۳۴۔۳۵۔۳۷	البقرۃ	۲

۳	آل عمران	۳۳-۵۹	۲
۵	المائدۃ	۲۷	۱
۷	الاعراف	۱۱-۱۹-۲۶-۲۷-۳۱-۳۵-۱۷۲	۷
۱۷	الاسراء	۶۱-۷۰	۲
۱۸	الکھف	۵۰	۱
۱۹	مریم	۵۸	۱
۲۰	طٰہٰ	۱۱۵-۱۱۶-۱۱۷-۱۲۰-۱۲۱	۵
۳۶	یٰسٓ	۶۰	۱

قرآن عزیز میں انبیاء علیہم السلام کے تذکروں میں سب سے پہلا تذکرہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کا ہے اور حسب ذیل سورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔

سورۂ بقرہ، اعراف، اسراء، کہف اور طٰہٰ میں نام اور صفات دونوں کے ساتھ اور سورۂ حجر وصٓ میں فقط ذکر صفات کے ساتھ اور آل عمران، مائدہ، مریم اور یٰسین میں صرف ضمنی طور پر نام لیا گیا ہے۔

یہ واقعہ اوپر کی تمام سورتوں اور آیتوں میں اگرچہ اسلوب بیان، طرز ادا، لطیف تعبیر کے اعتبار سے مختلف نظر آتا ہے لیکن مقصد اور واقعہ کے اعتبار سے ایک ہی حقیقت ہے جو مختلف تعبیرات میں موعظت وعبرت کے پیش نظر حسب موقعہ بیان کی گئی ہے۔

قرآن عزیز ان تاریخی واقعات کو محض اس لیے نہیں بیان کرتا کہ وہ واقعات ہیں جن کا ایک تاریخ میں درج ہونا ضروری ہے بلکہ اس کا مقصد وحید یہ ہے کہ وہ ان واقعات سے پیدا شدہ نتائج کو انسانی رشد و ہدایت کے لیے موعظت وعبرت بنائے اور انسانی عقل و جذبات سے اپیل کرے کہ وہ نوامیس وقوانین فطرت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ان تاریخی نتائج سے سبق حاصل کریں اور ایمان لائیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور اس کا یدقدرت ہی اس تمام ہست و بود پر کارفرما ہے، اور اسی مذہب کے احکام کی پیروی میں فلاح ونجات اور ہر قسم کی ترقی کا راز مضمر ہے جس کا نام مذہب فطرت یا اسلام ہے۔

قرآن عزیز کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ وہ ایک ہی واقعہ کو مختلف سورتوں میں ان سورتوں کے مضامین کے مناسب نئے اور اچھوتے انداز میں بیان کرنے کے باوجود واقعہ کی اصل حقیقت اور اس کی متانت وسنجیدگی میں ادنیٰ سا فرق بھی نہیں آنے دیتا کہیں واقعہ کی تفصیل ہے کہیں اجمال، کسی مقام پر اس کا ایک پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہے تو دوسرے مقام پر اسی کو سب سے زیادہ نمایاں حقیقت دی گئی ہے، ایک جگہ اسی واقعہ سے مسرت و انبساط اور لذت و سرور پیدا کرنے والے نتائج نکالے گئے ہیں تو دوسری جگہ واقعہ میں معمولی سا تغیر لیے بغیر خوف و دہشت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے، بلکہ بعض مرتبہ ایک ہی مقام پر لذت والم دونوں کا مظاہرہ نظر آتا ہے، مگر موعظت وعبرت کے اس تمام ذخیرہ میں ناممکن ہے کہ نفس واقعہ کی حقیقت اور متانت میں معمولی سا بھی تغیر پیدا ہو جائے۔

بلاشبہ یہ کلام الٰہی کے ہی شایان شان ہے اور اعجاز قرآن کے عنوان سے معنون، اور متضاد صفات کے حامل (حضرت انسان)

کی فصاحت و بلاغت کے مدارج علیا کی دسترس سے باہر!

﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ ﴾ (النساء: ۸۲)

"کیا وہ قرآن کے متعلق غور و فکر سے کام نہیں لیتے ؟ اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے سواء کسی غیر کا کلام ہوتا تو بلاشبہ وہ اس میں (قسم قسم کے) تضاد و اختلاف کو پاتے۔"

پیدائش آدم، فرشتوں کو سجدہ کا حکم، شیطان کا انکار:

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا، اور ان کا خمیر تیار ہونے سے قبل ہی اس نے فرشتوں کو یہ اطلاع دی کہ عنقریب وہ مٹی سے ایک مخلوق پیدا کرنے والا ہے جو بشر کہلائے گی، اور زمین میں ہماری خلافت کا شرف حاصل کرے گی۔

آدم علیہ السلام کا خمیر مٹی سے گوندھا گیا اور ایسی مٹی سے گوندھا گیا جو نت نئی تبدیلی قبول کر لینے والی تھی، جب یہ مٹی پختہ ٹھیکری کی طرح آواز دینے اور کھنکھنانے لگی تو اللہ تعالیٰ نے اس جسد خاکی میں روح پھونکی اور وہ یک بیک گوشت پوست، ہڈی، پٹھے کا زندہ انسان بن گیا اور ارادہ، شعور، حس، عقل اور وجدانی جذبات و کیفیات کا حامل نظر آنے لگا۔

تب فرشتوں کو حکم ہوا کہ تم اس کے سامنے سربسجود ہو جاؤ، فوراً تمام فرشتوں نے تعمیل ارشاد کی مگر ابلیس (شیطان) نے غرور و تمکنت کے ساتھ صاف انکار کر دیا۔ قرآن عزیز کی ان آیات میں واقعہ کے اسی حصہ کو بیان کیا گیا ہے۔

﴿ وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ ٭ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَ قُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾ (البقرہ: ۳۴-۳۵)

"اور پھر (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ آدم علیہ السلام کے آگے سربسجود ہو جاؤ، وہ جھک گئے، مگر ابلیس کی گردن نہیں جھکی، اس نے نہ مانا، اور گھمنڈ کیا، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ کافروں میں سے تھا پھر (ایسا ہوا کہ) ہم نے آدم سے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو، جس طرح چاہو، کھاؤ پیو، امن چین کی زندگی بسر کرو، مگر دیکھو وہ جو ایک درخت ہے، تو کبھی اس کے پاس نہ پھٹکنا، اگر تم اس کے قریب گئے تو (نتیجہ یہ نکلے گا کہ) حد سے تجاوز کر بیٹھو گے، اور ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو زیادتی کرنے والے ہیں۔"

﴿ وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ٭ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ ﴾ (الاعراف: ۱۱)

"اور (دیکھو یہ ہماری ہی کارفرمائی ہے کہ) ہم نے تمہیں پیدا کیا (یعنی تمہارا وجود پیدا کیا) پھر تمہاری (یعنی نوع انسانی کی) شکل و صورت بنا دی، پھر (وہ وقت آیا کہ) فرشتوں کو حکم دیا (آدم کے آگے جھک جاؤ) اس پر سب جھک گئے، مگر ابلیس کہ جھکنے والوں میں سے نہ تھا۔"

﴿وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۚ وَ الْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۞ وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۞ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۞ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۙ اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰۤی اَنْ یَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ ۞﴾ (الحجر: ۲۶۔۳۱)

"اور بلا شبہ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا، جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے اور ہم "جن" کو اس سے پہلے جلتی ہوئی ہوا کی گرمی سے پیدا کر چکے تھے، اور (اے پیغمبر) جب ایسا ہوا تھا کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا "میں خمیر اٹھے ہوئے گارے سے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں (یعنی نوع انسانی پیدا کرنے والا ہوں) تو جب ایسا ہو کہ میں اسے درست کر دوں (یعنی وہ وجود تکمیل کو پہنچ جائے) اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو چاہیے کہ تم سب اس کے آگے سربسجود ہو جاؤ چنانچہ جتنے فرشتے تھے سب اس کے آگے سربسجود ہو گئے، مگر ایک ابلیس، اس نے انکار کیا کہ سجدہ کرنے والوں میں سے ہو۔"

﴿وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّیَّتَهٗۤ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا ۞﴾ (الکھف: ۵۰)

"اور جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا" آدم کے آگے جھک جاؤ" اور سب جھک گئے تھے مگر ابلیس نہیں جھکا تھا، وہ جن میں سے تھا۔ پس اپنے پروردگار کے حکم سے باہر ہو گیا پھر کیا تم مجھے چھوڑ کر (کہ تمہارا پروردگار ہوں) اسے اور اس کی نسل کو کارساز بناتے ہو، حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟ (دیکھو) ظلم کرنے والوں کے لیے کیا ہی بری تبدیلی ہوئی!"۔

﴿اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۞ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۞ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۙ اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ۞﴾

(ص: ۷۱۔۷۴)

"اور وہ وقت یاد کرو جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا میں مٹی سے بشر کو پیدا کرنے والا ہوں، پس جب میں اس کو بنا سنوار لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو سب فرشتے اس کے لیے سربسجود ہو جاؤ پس سب ہی نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہ مانا، گھمنڈ کیا اور وہ (علم الٰہی میں پہلے ہی) کافروں میں سے تھا۔"

سجدہ سے انکار کرنے پر ابلیس کا مناظرہ:

اللہ تعالیٰ اگر چہ عالم الغیب اور دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے اور ماضی، حال اور استقبال سب اس کے لیے یکساں ہیں مگر اس نے امتحان و آزمائش کے لیے ابلیس (شیطان) سے سوال کیا:

﴿مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ﴾ (الاعراف:۱۲)

"کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا؟"

ابلیس نے جواب دیا:

﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾ (الاعراف:۱۲)

"اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے"۔

شیطان کا مقصد یہ تھا کہ میں آدم سے افضل ہوں، اس لیے کہ تو نے مجھ کو آگ سے بنایا اور آگ بلندی و رفعت چاہتی ہے اور آدم مخلوق خاکی، بھلا خاک کو آگ سے کیا نسبت؟ اے خدا! پھر یہ تیرا حکم کہ ناری، خاکی کو سجدہ کرے کیا انصاف پر مبنی ہے؟ میں ہر حالت میں آدم سے بہتر ہوں، لہٰذا وہ مجھے سجدہ کرے نہ کہ میں اس کے سامنے سربسجود ہوں، مگر بد بخت شیطان اپنے غرور و تکبر میں یہ بھول گیا کہ جب تو اور آدم علیہ السلام دونوں خدا کی مخلوق ہو، تو مخلوق کی حقیقت خالق سے بہتر خود وہ مخلوق بھی نہیں جان سکتی، وہ اپنی تمکنت اور گھمنڈ میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ مرتبہ کی بلندی و پستی اس مادہ کی بناء پر نہیں ہے جس سے کسی مخلوق کا خمیر تیار کیا گیا ہے بلکہ اس کی ان صفات پر ہے جو خالق کائنات نے اس کے اندر ودیعت کی ہیں۔

بہر حال شیطان کا جواب چونکہ غرور و تکبر کی جہالت پر مبنی تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس پر واضح کر دیا کہ جہالت سے پیدا شدہ کبر و نخوت نے تجھ کو اس قدر اندھا کر دیا ہے کہ تو اپنے خالق کے حقوق اور احترام خالقیت سے بھی منکر ہو گیا، اس لیے مجھ کو ظالم قرار دیا اور یہ نہ سمجھا کہ تیری جہالت نے تجھ کو حقیقت کے سمجھنے سے درماندہ و عاجز بنا دیا ہے پس تو اب اس سرکشی کی وجہ سے ابدی ہلاکت کا مستحق ہے اور یہی تیرے عمل کی قدرتی پاداش ہے۔

ابلیس کی طلب مہلت:

ابلیس نے جب دیکھا کہ خالق کائنات کے حکم کی خلاف ورزی، تکبر و رعونت اور خدائے تعالیٰ پر ظلم کے الزام نے ہمیشہ کے لیے مجھ کو رب العالمین کی آغوش رحمت سے مردود اور جنت سے محروم کر دیا، تو توبہ اور ندامت کی جگہ اللہ تعالیٰ سے یہ استدعاء کی کہ تا قیام قیامت مجھ کو مہلت عطا کر اور اس طویل مدت کے لیے میری زندگی کی رسی کو دراز کر دے۔

حکمت الٰہی کا تقاضا بھی یہی تھا، لہٰذا اس کی درخواست منظور کر لی گئی، یہ سن کر اب اس نے پھر ایک مرتبہ اپنی شیطنت کا مظاہرہ کیا، کہنے لگا! جب تو نے مجھ کو راندۂ درگاہ کر ہی دیا تو جس آدم کی بدولت مجھے یہ رسوائی نصیب ہوئی میں بھی آدم کی اولاد کی راہ ماروں گا اور ان کے پس و پیش، اردگرد اور چہار جانب سے ہو کر ان کو گمراہ کروں گا، اور ان کی اکثریت کو تیرا ناسپاس اور ناشکر گزار بنا چھوڑوں گا، البتہ تیرے "مخلص بندے" میرے اغوا کے تیر سے گھائل نہ ہو سکیں گے اور ہر طرح محفوظ رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم کو اس کی کیا پرواہ، ہماری فطرت کا قانون "مکافات عمل پاداش عمل" اٹل قانون ہے، پس جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا اور جو بنی آدم مجھ سے روگردانی کر کے تیری پیروی کرے گا وہ تیرے ہی ساتھ عذاب الٰہی (جہنم) کا سزاوار

ہوگا جا اپنی ذلت ورسوائی اور شومئ قسمت کے ساتھ یہاں سے دور ہو اور اپنی اور اپنے پیرووں کی ابدی لعنت (جہنم) کا منتظر رہ۔
قرآن عزیز کی حسب ذیل آیات ان ہی تفصیلات پر روشنی ڈالتی ہیں:

﴿قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۞ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۞ قَالَ اَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۞ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۞ قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ۞ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۞ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۞﴾ (اعراف: ۱۲۔۱۸)

"کہا کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا؟ کہا "اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اسے مٹی سے" فرمایا جنت سے نکل جا: تیری یہ ہستی نہیں کہ یہاں رہ کر سرکشی کرے۔ یہاں سے نکل دور ہو یقیناً تو ان میں سے ہوا جو ذلیل وخوار ہیں) ابلیس نے کہا "مجھے اس وقت تک کے لیے مہلت دے جب لوگ (مرنے کے بعد) اٹھائے جائیں گے"۔ "تجھے مہلت ہے" اس پر ابلیس نے کہا چونکہ تو نے مجھ پر راہ بند کردی، تو اب میں بھی ایسا ضرور کروں گا تیری سیدھی راہ سے بھٹکانے کے لیے بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں گا، پھر سامنے سے پیچھے سے، داہنے سے، بائیں سے (غرضیکہ ہر طرف سے) ان پر آؤں گا اور تو ان میں سے اکثروں کو شکر گزار نہ پائے گا، خدا نے فرمایا "یہاں سے نکل جا، ذلیل اور ٹھکرایا ہوا، بنی آدم میں سے جو کوئی تیری پیروی کرے گا تو (وہ) تیرا ساتھی ہوگا۔ اور میں البتہ ایسا کروں گا کہ (پاداش عمل میں) تم سب سے جہنم بھر دوں"۔

﴿قَالَ يٰۤاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۞ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۞ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۙ۞ وَّ اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۞ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۞ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۙ۞ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۞ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ۞ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۞ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ۞ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۞ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ۞﴾ (الحجر ۳۲۔۴۳)

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے ابلیس تجھے کیا ہوا کہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا؟ کہا "مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ ایسے بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا ہے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے" حکم ہوا "اگر ایسا ہے تو یہاں سے نکل۔

جا، کہ تو راندہ ہوا اور جزاء کے دن تک تجھ پر لعنت ہوئی" اس نے کہا" خدایا! مجھے اس دن تک مہلت دے جب انسان (دوبارہ) اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا: "اس مقررہ وقت کے دن تک تجھے مہلت دی گئی" اس نے کہا" خدایا! چونکہ تو نے مجھ پر (نجات وسعادت) کی راہ بندی کردی، تو اب میں ضرور ایسا کروں گا کہ زمین میں ان کے لیے جھوٹی خوشنمائیاں بنادوں اور (راہ حق سے) گمراہ کردوں، ہاں ان میں جو تیرے مخلص بندے ہوں گے (میں جانتا ہوں) میرے بہکانے میں آنے والے نہیں" فرمایا بس یہی سیدھی راہ ہے جو مجھ تک پہنچانے والی ہے۔ جو میرے (مخلص) بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں چلے گا تیرا زور صرف انہی پر چلے گا جو (بندگی) کی راہ سے بھٹک گئے اور ان سب کے لیے جہنم کے عذاب کا وعدہ ہے" (جو کبھی ٹلنے والا نہیں)۔

﴿وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ﴿۶۱﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۫ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾ وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿۶۵﴾﴾

(بنی اسرائیل: ۶۱۔۶۵)

"اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو (حکم دیا) " آدم علیہ السلام کے آگے جھک جاؤ" اس پر سب جھک گئے مگر ایک ابلیس نہ جھکا۔ اس نے کہا" کیا میں ایسی ہستی کے آگے جھکوں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے؟" نیز اس نے کہا" کیا تیرا یہی فیصلہ ہے کہ تو نے اس (حقیر) ہستی کو مجھ پر بڑائی دی؟" اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے دے تو میں ضرور اس کی نسل کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ کے رہوں، تھوڑے آدمی اس ہلاکت سے بچیں، اور کوئی نہ بچے" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "جا اپنی راہ لے، جو کوئی بھی ان میں سے تیرے پیچھے چلے گا، تو اس کے لیے اور تیرے لیے جہنم کی سزا ہوگی پوری پوری سزا، ان میں سے جس کسی کو تو اپنی صدائیں سنا کر بہکا سکتا ہے بہکانے کی کوشش کرلے، اپنے لشکر کے سواروں اور پیادوں سے حملہ کر، ان کے مال اور اولاد میں شریک ہوجا، ان سے (طرح طرح کی باتوں کے) وعدے کر، اور شیطان کے وعدے تو اس کے سواء کچھ نہیں ہیں کہ سراسر دھوکا" جو میرے (سچے) بندے ہیں ان پر تو قابو پانے والا نہیں تیرا پروردگار کارسازی کے لیے بس کرتا ہے۔"

﴿قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۷۶﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۚ﴿۷۷﴾ وَّ اِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۷۸﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۷۹﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ

الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۸۱﴾ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۲﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۸۳﴾ قَالَ فَالْحَقُّ وَ الْحَقَّ اَقُوْلُ ﴿۸۴﴾ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَ مِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۵﴾ (ص: ۷۵۔۸۵)

"فرمایا اے ابلیس! کس چیز نے روک دیا تجھ کو کہ سجدہ کرے اس کو جس کو میں نے بنایا اپنے (قدرت کے) ہاتھوں سے، یہ تو نے غرور کیا یا تو بڑا تھا درجہ میں، بولا میں بہتر ہوں اس سے مجھ کو بنایا آگ سے اور اس کو بنایا مٹی سے، فرمایا تو نکل یہاں سے کہ تو مردود ہوا اور تجھ پر میری پھٹکار ہے اس جزاء کے دن تک، بولا، اے رب! مجھ کو ڈھیل دے جس دن تک مردے جی اٹھیں۔ فرمایا تجھ کو ڈھیل ہے۔ اسی وقت کے دن تک جو معلوم ہے۔ بولا تو قسم ہے تیری عزت کی میں گمراہ کروں گا ان سب کو، مگر جو بندے ہیں تیرے ان میں چنے ہوئے، فرمایا، تو ٹھیک بات یہ ہے اور میں ٹھیک ہی کہتا ہوں۔ مجھ کو بھرنا ہے دوزخ تجھ سے اور جو ان میں تیری راہ چلیں ان سب سے۔"

خلافت آدم علیہ السلام:

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں کو اطلاع دی کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں، جو اختیار و ارادہ کا مالک ہوگا، اور میری زمین پر جس قسم کا تصرف کرنا چاہے گا کر سکے گا، اور اپنی ضروریات کے لیے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکے گا، گویا وہ میری قدرت اور میرے تصرف و اختیار کا "مظہر" ہوگا۔

فرشتوں نے یہ سنا تو حیرت میں رہ گئے، اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا اگر اس ہستی کی پیدائش کی حکمت یہ ہے کہ وہ دن رات تیری تسبیح وتہلیل میں مصروف رہے اور تیری تقدیس و بزرگی کے گن گائے، تو اس کے لیے ہم حاضر ہیں، جو ہر لحہ تیری حمد وثناء کرتے اور بے چوں و چرا تیرا حکم بجالاتے ہیں، ہم کو تو اس "خاکی" سے فتنہ وفساد کی بو آتی ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ تیری زمین میں خرابی اور خون ریزی بپا کردے؟ بارِ الٰہا! تیرا یہ فیصلہ آخر کس حکمت پر مبنی ہے؟

بارگاہِ الٰہی سے اوّل ان کو یہ ادب سکھایا گیا کہ مخلوق کو خالق کے معاملات میں جلد بازی سے کام نہ لینا چاہیے، اور اس کی جانب سے حقیقتِ حال کے اظہار سے قبل ہی شک وشبہ کو سامنے نہ لانا چاہیے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اس میں اپنی برتری اور بڑائی کا پہلو نکلتا ہو، خالق کائنات ان حقائق کو جانتا ہے جس سے تم بے بہرہ ہو، اور اس کے علم میں وہ سب کچھ ہے جو تم نہیں جانتے۔

﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾﴾ (البقرہ: ۳۰)

"اور جب ایسا ہوا تھا کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا۔ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، فرشتوں نے کہا: کیا ایسی ہستی کو خلیفہ بنایا جارہا ہے جو زمین میں خرابی پھیلائے گی اور خونریزی کرے گی، حالانکہ ہم تیری حمد وثناء کرتے ہوئے تیری پاکی و قدوسی کا اقرار کرتے ہیں (کہ تیری مشیت برائی سے پاک اور تیرا کام نقصان سے منزہ ہے!) اللہ نے

کہا، میری نظر جس حقیقت پر ہے، تمہیں اس کی خبر نہیں"۔

تعلیم آدم علیہ السلام اور فرشتوں کا اقرارِ عجز:

یہ سمجھنا سخت غلطی ہے کہ اس مقام پر فرشتوں کا سوال اس لیے تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مناظرہ یا اس کے فیصلہ کے متعلق موشگافی کریں بلکہ وہ آدم کی تخلیق کا سبب معلوم کرنا چاہتے تھے اور یہ کہ اس کے خلیفہ بنانے میں کیا حکمت ہے ان کی خواہش تھی کہ اس حکمت کا راز ان پر بھی کھل جائے، اس لیے ان کے طرز ادا اور تعبیر مقصد میں کوتاہی پر تنبیہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ ان کے اس سوال کا جواب جو بظاہر حضرت آدم علیہ السلام کی تحقیر پر مبنی ہے۔ عمل و فعل کے ذریعہ اس طرح دیا جائے کہ ان کو خود بخود آدم علیہ السلام کی برتری اور حکمت الٰہی کی بلندی و رفعت کا نہ صرف اعتراف کرنا پڑے بلکہ اپنی درماندگی اور عجز کا بھی بدیہی طور پر مشاہدہ ہو جائے، لہٰذا حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی سب سے عظیم المرتبت صفت "علم" سے نوازا اور ان کو علم اشیاء عطا فرمایا۔ اور پھر فرشتوں کے سامنے پیش کر کے ارشاد فرمایا کہ تم ان اشیاء کے متعلق کیا علم رکھتے ہو؟ وہ لاعلم تھے کیا جواب دیتے۔ مگر چونکہ بارگاہ صمدیت سے قرب رکھتے تھے سمجھ گئے کہ ہمارا امتحان مقصود نہیں ہے کیونکہ اس سے قبل ہم کو ان کا علم ہی کب دیا گیا ہے کہ آزمائش کی جاتی بلکہ یہ تنبیہ مقصود ہے کہ "خلافتِ الٰہیہ" کا مدار کثرت تسبیح و تہلیل اور تقدیس و تمجید پر نہیں بلکہ صفت "علم" پر ہے، اس لیے کہ ارادہ و اختیار، قدرت تصرف اور قدرت اختیار یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ حکومت ارضی صفت "علم" کے بغیر ناممکن ہے، پس جبکہ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت علم کا مظہر اتم بنایا ہے تو بلا شبہ وہی خلافت ارضی کا مستحق ہے نہ کہ ہم، اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ملائکۃ اللہ چونکہ اپنی خدمات مفوضہ کے علاوہ ہر قسم کی دنیوی خواہشوں اور ضرورتوں سے بے نیاز ہیں، اس لیے وہ ان کے علم سے بھی ناآشنا تھے اور آدم علیہ السلام کو چونکہ ان سب سے واسطہ پڑنا تھا اس لیے ان کا علم اس کے لیے ایک فطری امر تھا جو رب العالمین کی ربوبیت کاملہ کی بخشش و عطا سے عطا ہوا اور اس کو وہ سب کچھ بتا دیا گیا جو اس کے لیے ضروری تھا۔

﴿وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۙ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾ (البقرہ: ۳۱-۳۳)

"(پھر جب ایسا ہوا کہ مشیت الٰہی نے جو کچھ چاہا تھا، ظہور میں آ گیا) اور آدم علیہ السلام نے (یہاں تک معنوی ترقی کی کہ) تعلیم الٰہی سے تمام چیزوں کے نام معلوم کر لیے، تو فرشتوں کے سامنے وہ (تمام حقائق) پیش کر دیئے اور فرمایا، اگر (اپنے شبہ میں) درستی پر ہو تو بتلاؤ، ان (حقائق) کے نام کیا ہیں؟ فرشتوں نے عرض کیا۔ خدایا ساری پاکیاں اور بڑائیاں تیرے ہی لیے ہیں ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں سکھلا دیا ہے، علم تیرا علم ہے اور حکمت تیری حکمت جب فرشتوں نے اس طرح اپنے عجز کا اعتراف کر لیا تو حکم الٰہی ہوا "اے آدم تم (اب) فرشتوں کو ان (حقائق) کے نام بتلا دو۔ جب

آدم علیہ السلام نے بتلا دیئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمان وزمین کے تمام غیب مجھ پر روشن ہیں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی میرے علم میں ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ بھی مجھ سے مخفی نہیں"۔

حضرت آدم علیہ السلام کے اس شرف علم کے متعلق مفسرین کی دو رائے ہیں ایک یہ کہ کائنات کی وہ تمام اشیاء جو ماضی سے مستقبل تک وجود میں آنے والی تھیں ان سب کے نام اور ان کی حقیقت کا علم حضرت آدم علیہ السلام کو دے دیا گیا، دوسری رائے یہ ہے کہ اس وقت جس قدر اشیاء بھی عالم کائنات میں موجود تھیں اور حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے ان کا مظاہرہ کیا گیا تھا ان سب کا علم عطا کیا گیا، اور ﴿الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ "تمام چیزوں کے نام" کا اطلاق جس طرح کائنات کی ماضی و مستقبل کی تمام اشیاء پر ہوتا ہے اسی طرح اس وقت کی تمام موجودہ اشیاء پر بھی بغیر کسی تاویل کے ہو سکتا ہے، اور یہ کہ ﴿اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ﴾ سے اکثر موجود و محسوس یعنی حاضر ہی کی جانب اشارہ مقصود ہوا کرتا ہے۔ اور اگر یہ کہہ دیا جائے کہ آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اشیاء کی تمام جزئیات وتفصیلات کا علم بخشا گیا تھا بلکہ اشیاء کی بنیاد و نہاد اور اصول و اساس کا علم عطا کیا گیا تب بھی ﴿الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ کے منافی نہیں ہے۔

بہر حال حضرت آدم علیہ السلام کو صفت "علم" سے اس طرح نوازا گیا کہ فرشتوں کے لیے بھی ان کی برتری اور استحقاق خلافت کے اقرار کے علاوہ چارہ کار نہ رہا، اور یہ ماننا پڑا کہ اگر ہم زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلیفہ بنائے جاتے تو کائنات کے تمام بھیدوں سے نا آشنا رہتے اور قدرت نے جو خواص اور علوم ودیعت کیے ہیں ان سے یکسر ناواقف ہوتے اس لیے کہ نہ ہم خورد و نوش کے محتاج ہیں کہ زمین میں ودیعت شدہ رزق اور خزانوں کی جستجو کرتے نہ ہمیں غرق کا اندیشہ کہ کشتیوں اور جہازوں کی ایجاد کرتے، نہ مرض کا خوف کہ قسم قسم کے معالجات، اشیاء کے خواص، کیمیائی مرکبات، فوائد طبیعات وفلکیات، طبی ایجادات علوم نفسیات وجدانیات اور اسی طرح کے بیش بہاء اور بیشمار علوم وفنون کے اسرار اور ان کی حکمتوں سے واقف ہو سکتے، بلاشبہ یہ صرف حضرت انسان ہی کے لیے موزوں تھا کہ وہ زمین پر خدا کا خلیفہ بنے اور ان تمام حقائق و معارف اور علوم وفنون سے واقف ہو کر نیابت الٰہی کا صحیح حق ادا کرے۔

حضرت آدم علیہ السلام کا قیام جنت اور حواء کی زوجیت:

حضرت آدم علیہ السلام ایک عرصہ تک تنہا زندگی بسر کرتے رہے مگر اپنی زندگی اور راحت و سکون میں ایک وحشت اور خلاء محسوس کرتے تھے اور ان کی طبیعت اور فطرت کسی مونس و ہمدم کی جویا نظر آتی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حواء کو پیدا کیا اور حضرت آدم علیہ السلام اپنا ہمدم و رفیق پا کر بے حد مسرور ہوئے اور اطمینان قلب محسوس کیا۔ حضرت آدم وحواء علیہما السلام کو اجازت تھی کہ وہ جنت میں رہیں اور اس کی ہر چیز سے فائدہ اٹھائیں، مگر ایک درخت کو معین کر کے بتایا گیا کہ اس کو نہ کھائیں بلکہ اس کے پاس تک نہ جائیں۔

آدم علیہ السلام کا خلد سے نکلنا:

اب ابلیس کو ایک موقعہ ہاتھ آیا اور اس نے حضرت آدم وحواء علیہما السلام کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ شجر "شجر خلد" ہے، اس کا پھل کھانا جنت میں سرمدی آرام و سکونت اور قرب الٰہی کا ضامن ہے اور قسمیں کھا کر ان کو باور کرایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، دشمن نہیں ہوں یہ سن کر حضرت آدم علیہ السلام کے انسانی اور بشری خواص میں سب سے پہلے نسیان (بھول چوک) نے ظہور کیا اور وہ یہ فراموش کر بیٹھے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم، حکم امتناعی تھا، نہ کہ مربیانہ مشورہ، اور آخر کار جنت کے دائمی قیام اور قربت الٰہی کے عزم میں لغزش پیدا کر

دی اور انہوں نے اس درخت کا پھل کھا لیا، اس کا کھانا تھا کہ بشری لوازم ابھرنے لگے، دیکھا تو ننگے ہیں اور لباس سے محروم، جلدی جلدی (آدم وحوا علیہما السلام) دونوں پتوں سے ستر ڈھانکنے لگے گویا انسانی تمدن کا یہ آغاز تھا، کہ اس نے تن ڈھانکنے کے لیے سب سے پہلے پتوں کو استعمال کیا۔

ادھر یہ ہو رہا تھا کہ خدائے تعالیٰ کا عتاب نازل ہوا اور آدم علیہ السلام سے باز پرس ہوئی کہ ممانعت کے باوجود یہ عدول حکمی کیسی؟ آدم آخر آدم تھے، مقبول بارگاہ الٰہی تھے، اس لیے شیطان کی طرح مناظرہ نہیں کیا اور اپنی غلطی کو تاویلات کے پردے میں چھپانے کی سعی نامشکور سے باز رہے ندامت و شرمساری کے ساتھ اقرار کیا کہ غلطی ضرور ہوئی لیکن اس کا سبب تمرد و سرکشی نہیں ہے بلکہ بربنائے بشریت بھول چوک اس کا باعث ہے، تاہم غلطی ہے، اس لیے توبہ و استغفار کرتے ہوئے عفو و درگذر کا خواستگار ہوں۔

حضرت حق نے ان کے اس عذر کو قبول فرما لیا اور معاف کر دیا، مگر وقت آ گیا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام خدا کی زمین پر "حق خلافت" ادا کریں، اس لیے بہ تقاضائے حکمت ساتھ ہی یہ فیصلہ سنایا کہ تم کو اور تمہاری اولاد کو ایک معین وقت تک زمین پر قیام کرنا ہوگا، اور تمہارا دشمن ابلیس بھی اپنے تمام سامان عداوت کے ساتھ وہاں موجود رہے گا اور تم کو اس طرح ملکوتی اور طاغوتی دو متضاد طاقتوں کے درمیان زندگی بسر کرنی ہوگی اس کے باوجود اگر تم اور تمہاری اولاد مخلص بندے اور سچے نائب ثابت ہوئے تو تمہارا اصلی وطن "جنت" ہمیشہ کے لیے تمہاری ملکیت میں دے دیا جائے گا، لہٰذا تم اور حواء دونوں یہاں سے جاؤ اور میری زمین پر جا کر بسو اور اپنی مقررہ زندگی تک حق عبودیت ادا کرتے رہو۔ اور اس طرح انسانوں کے باپ اور خدائے تعالیٰ کے خلیفہ آدم علیہ السلام نے اپنی رفیقہ حیات حواء علیہا السلام کے ساتھ خدا کی زمین پر قدم رکھا۔

﴿وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾ (البقرہ: ۳۵-۳۸)

"پھر (ایسا ہوا کہ) ہم نے آدم سے کہا، اے آدم! تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو، جس طرح چاہو کھاؤ پیو، امن چین کی زندگی بسر کرو، مگر دیکھو، وہ جو ایک درخت ہے، تو کبھی اس کے پاس نہ پھٹکنا، اگر تم اس کے پاس گئے تو (نتیجہ یہ نکلے گا کہ) حد سے تجاوز کر بیٹھو گے اور ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو زیادتی کرنے والے ہیں پھر (ایسا ہوا کہ) شیطان کی وسوسہ اندازی نے ان دونوں کے قدم ڈگمگا دیئے اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جیسی کچھ (راحت و سکون کی) زندگی بسر کر رہے تھے اس سے نکلنا پڑا، خدا کا حکم ہوا کہ یہاں سے نکل جاؤ تم میں سے ہر وجود دوسرے کا دشمن ہے، اب تمہیں (جنت کی جگہ) زمین میں رہنا ہے، اور ایک خاص وقت تک کے لیے (جو علم الٰہی میں مقرر ہو چکا ہے) اس سے فائدہ اٹھانا ہے پھر ایسا ہوا کہ آدم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کے القاء سے چند کلمات معلوم کر لیے (جن کے لیے اس کے حضور قبولیت تھی) پس اللہ

تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کر لی اور بلاشبہ وہی ہے جو رحمت سے درگزر کرنے والا ہے۔ اور اس کے درگزر کی کوئی انتہا نہیں (آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوگئی لیکن جس زندگی سے وہ نکل چکا تھا وہ دوبارہ نہیں مل سکتی تھی) پس ہمارا حکم ہوا، اب تم سب یہاں سے نکل جاؤ (اور جس نئی زندگی کا دروازہ تم پر کھولا جا رہا ہے اسے اختیار کر لو، لیکن (یاد رکھو) جب کبھی ایسا ہوگا کہ ہماری جانب سے تم پر راہ (حق) کھولی جائے گی، تو تمہارے لیے دو ہی راہیں ہوں گی، جو کوئی ہدایت کی پیروی کرے گا اس کے لیے (کامیابی وسعادت ہوگی) کسی طرح کا کھٹکا نہیں، کسی طرح کی غمگینی نہیں۔"

﴿وَ يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَ قَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝ وَ قَاسَمَهُمَاۤ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَ نَادٰىهُمَا رَبُّهُمَاۤ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَ اَقُلْ لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٜ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۹۔۲۵)

"اے آدم! تو اور تیری بیوی، دونوں جنت میں رہو سہو اور جس جگہ سے جو چیز پسند آئے شوق سے کھاؤ، مگر دیکھو وہ جو ایک درخت ہے، تو اس درخت کے قریب بھی نہ جانا، اگر گئے تو یاد رکھو، تم زیادتی کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے، لیکن پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کے ستر جو ان سے چھپے تھے ان پر کھول دے، اس نے کہا تمہارے پروردگار نے اس درخت سے جو تمہیں روکا ہے تو صرف اس لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو، تم فرشتے بن جاؤ یا دائمی زندگی تمہیں حاصل ہو جائے، اس نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ میں تم دونوں کو خیر خواہی سے نیک بات سمجھانے والا ہوں۔ غرضیکہ (شیطان اس طرح کی باتیں سنا سنا کر بالآخر) انہیں فریب میں لے آیا۔ پھر جوں ہی ایسا ہوا کہ انہوں نے درخت کا پھل چکھا۔ ان کے ستر ان پر کھل گئے (اور جب انہیں اپنی برہنگی دیکھ کر شرم محسوس ہوئی تو) باغ کے پتے اوپر تلے رکھ کر اپنے جسم پر چپکانے لگے، اس وقت ان کے پروردگار نے پکارا: "کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہیں روک دیا تھا، اور کیا میں نے نہیں کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟" انہوں نے عرض کیا "پروردگار ہم نے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا، اگر تو نے ہمارا قصور نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا، تو ہمارے لیے بربادی کے سوا کچھ نہیں! فرمایا: "یہاں سے نکل جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اب تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور یہ کہ ایک خاص وقت تک وہاں سروسامان زندگی سے فائدہ اٹھاؤ گے اور فرمایا: تم اسی میں جیو گے اسی میں مرو گے پھر اسی سے (مرنے کے بعد) نکالے جاؤ گے۔"

﴿وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۝ وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰى ۝ فَقُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا یُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ۝ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَ لَا تَعْرٰى ۝ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَ لَا تَضْحٰى ۝ فَوَسْوَسَ اِلَیْهِ الشَّیْطٰنُ قَالَ یٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا یَبْلٰى ۝ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ٘ وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ وَ هَدٰى ۝ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِیْعًۢا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى ۙ۬ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَ لَا یَشْقٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۱۱۵-۱۲۳)

"اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے آدم کو پہلے سے جتا کر عہد لے لیا تھا پھر وہ بھول گیا، اور ہم نے (نافرمانی کا) قصد اس میں نہیں پایا تھا اور پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا" آدم کے آگے جھک جاؤ" سب جھک گئے تھے مگر ابلیس نہیں جھکا، اس نے انکار کیا اس پر ہم نے کہا اے آدم (دیکھ لے) یہ "ابلیس" تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے ایسا نہ ہو یہ تمہیں جنت سے نکال کے رہے اور تم محنت میں پڑ جاؤ۔ تمہارے لیے اب ایسی زندگی ہے کہ نہ تو اس میں بھوکے رہتے ہو نہ برہنہ، نہ تمہارے لیے پیاس کی جلن ہے نہ سورج کی تپش (اگر اس سے نکلے تو سرتاسر محنت میں مبتلا ہو جاؤ گے) لیکن پھر شیطان نے آدم علیہ السلام کو وسوسہ میں ڈالا اس نے کہا "اے آدم" میں تجھے ہمیشگی کے درخت کا نشان دے دوں؟ اور ایسی بادشاہی جو کبھی زائل نہ ہو؟ چنانچہ دونوں نے (یعنی آدم اور اس کی بیوی نے) اس درخت کا پھل کھا لیا، اور دونوں کے ستر ان پر کھل گئے تب ان کی حالت ایسی ہو گئی کہ باغ کے پتے توڑنے لگے اور ان سے اپنا جسم ڈھانکنے لگے غرضیکہ آدم اپنے پروردگار کے کہنے پر نہ چلا۔ پس وہ (جنت کی زندگی سے) بے راہ ہو گیا۔ (لیکن) پھر اس کے پروردگار نے اسے برگزیدہ کیا۔ اس پر (اپنی رحمتوں سے) لوٹ آیا۔ اس پر (زندگی و عمل کی) راہ کھول دی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا "تم دونوں اکٹھے یہاں سے نکل چلو تم میں سے ایک دوسرے کا دشمن ہوا (اب تم پر ایک دوسری زندگی کی راہ کھلے گی) پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس (یعنی تمہاری نسل کے پاس) کوئی پیام ہدایت آیا تو (اس بارے میں میرا قانون یاد رکھو) جو کوئی میری ہدایت پر چلے گا، وہ نہ تو راہ سے بے راہ ہوگا نہ دکھ میں پڑے گا۔"

واقعہ سے متعلق چند اہم مسائل:

واقعہ کی اس تفصیل کے بعد چند ایسے اہم مسائل پر بھی روشنی ڈالنا ضروری ہے جو واقعہ کی تفصیلات میں بڑی حد تک معین و مددگار ثابت ہوں۔

تخلیق آدم علیہ السلام:

① یہ مسئلہ بھی لائق فکر و نظر ہے کہ انسان اوّل حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کب ہوئی، کیا کائنات ارضی و سماوی کے ساتھ ساتھ یا

غیر معین مدت کے بعد اس کی ہستی عالم وجود میں آئی؟

علماء یہود و نصاریٰ اور بعض علماء اسلام کا قول ہے کہ حق تعالیٰ نے تخلیق و تکوین کائنات کے بارے جو ﴿سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ (چھ دن) کی تعبیر اختیار فرمائی ہے ان ہی ایام میں سے ایک دن حضرت آدم علیہ السلام نے بھی لباس وجود پہنا اور وہ جمعہ کا دن ہے۔

﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ (الاعراف:۵۴)

"کچھ شک نہیں کہ تمہارا پروردگار خدا ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر چھا گیا۔"

لیکن یہ مسلک درست نہیں ہے نہ علمی و تاریخی اعتبار سے اور نہ دینی و مذہبی روایات کے لحاظ سے، یہود و نصاریٰ کے متعلق تو معلوم نہیں کہ انہوں نے کس بنیاد پر یہ کہا، اور اس کے لیے ان کے پاس کیا دلیل ہے مگر علامہ سبکیؒ سے ضرور یہ تعجب ہے کہ انہوں نے اس بے دلیل بات کو کس طرح قبول فرمایا اور یہ مسلک کیوں اختیار کیا۔

کافی غور و فکر کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ سبکی رحمہ اللہ کو یہ مغالطہ غالباً صحیح مسلم کی اس حدیث سے ہوا ہے جو فضائل جمعہ میں مذکور ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش جمعہ کے دن ہوئی۔ اس روایت میں صرف اسی قدر مذکور ہے مگر سبکی رحمہ اللہ نے اپنی جانب سے اضافہ کر لیا کہ یہ جمعہ ﴿سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ میں شامل جمعہ کا دن ہے اور یہی مغالطہ ہے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ قرآن عزیز نے متعدد جگہ خلق کائنات کا ذکر کیا ہے لیکن کسی ایک جگہ بھی خلق آدم علیہ السلام کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ارض و سماوات سے زیادہ حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر ضروری تھا جو قرآن ہی کی زبان میں اشرف المخلوقات، اور ﴿خَلِيْفَةُ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ﴾ ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس قدر اہم شخصیت کو ﴿سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ ہی میں سے کسی دن (یوم) وجود بخشا جائے اور اس کا ذکر تک نہ کیا جائے کیونکہ ان آیات میں صرف دو ہی باتیں ذکر کی گئی ہیں ایک ارض و سماوات کی پیدائش کا معاملہ اور دوسرا ﴿اسْتَوَاء عَلَى الْعَرْشِ﴾ کا، مگر حضرت آدم علیہ السلام کی ولادت سے متعلق صراحت تو کجا اشارہ تک موجود نہیں ہے پھر مستزاد یہ کہ قرآن عزیز نے جس جس موقعہ پر حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر کسی بھی نہج سے کیا ہے ان میں سے کسی ایک مقام پر بھی یوم پیدائش کا ذکر نہیں ہے تب بات واضح ہے کہ اصل حقیقت یہی ہے کہ خلق سماوات و ارض سے ہزاروں، لاکھوں بلکہ غیر معین مدت کے بعد (جس کا علم صرف عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ہی کو ہے) حضرت آدم علیہ السلام کو کسی جمعہ میں خلعت وجود عطا کیا گیا اور ﴿سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ کے جمعہ کے دن کسی کی بھی تخلیق و تکوین نہیں ہوئی بلکہ ﴿اسْتَوَاء عَلَى الْعَرْشِ﴾ ✽ کا مظاہرہ ہوا اور اس لیے جمعہ کا دن، جشن یا تعطیل کا دن قرار پایا۔

(۲) آدم و حوا (علیہما السلام) عربی نام ہیں یا عجمی؟ اور یہ نام کسی مناسبت سے رکھے گئے ہیں یا صرف نام ہی کی حیثیت میں ہیں۔؟

پہلے سوال کے متعلق مشہور محدث حافظ ابن حجر مکی رحمہ اللہ کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ "سریانی" نام ہے اور بائبل میں الف کے مد اور دال کے طول کے ساتھ پڑھا جاتا ہے یعنی آدام اور علامہ جوہریؒ اور جوالیقیؒ یہ کہتے ہیں کہ یہ عربی نام ہیں اور دوسرے سوال کے متعلق ثعلبی کا قول ہے کہ عبرانی زبان میں آدام مٹی کو کہتے ہیں، چونکہ ان کی تخلیق مٹی سے ہوئی، اس لیے آدم یا آدام نام رکھا گیا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ ادمتہ سے ماخوذ ہے اس لیے کہ وہ "ادیم الارض" یعنی صفحہ زمین سے پیدا کیے گئے ہیں، اور بعض علماء کہتے ہیں کہ

✽ استواء علی العرش اور ستۃ کی تعبیر کے لئے قصص القرآن کی دوسری جلد ملاحظہ فرمائیں۔

"ادمت" بمعنی خلطت سے ماخوذ ہے اور چونکہ ان کا خمیر پانی اور مٹی کو ملا کر اور خلط ملط کر کے بنایا گیا ہے اس لیے اس مناسبت سے ان کو آدم کہا گیا۔ اسی طرح حواء اس لیے نام پڑا کہ وہ ہر "انسان حی" (زندہ انسان) کی ماں ہیں اور مبالغہ کا صیغہ بنا کر ان کا نام رکھ دیا گیا۔ [1]

③ بہر حال نام اور معنی میں مناسبت کا یہ سوال نکتہ اور لطیفہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے بیان کردہ تمام وجوہ بیک وقت بھی صحیح ہو سکتی ہیں اور کسی ایک وجہ کو دوسری پر ترجیح بھی دی جا سکتی ہے، کیونکہ یہ بات بہت وسیع ہے۔

④ اللہ تعالیٰ نے سجدہ کا جو حکم دیا تھا وہ فرشتوں کو دیا تھا اور ابلیس فرشتوں کی جنس میں داخل نہیں تو پھر اس پر عتاب الٰہی کیوں ہوا اور وہ نافرمانی کا مرتکب کس لیے قرار دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ ابلیس ملائکہ کی جنس سے نہ تھا۔ قرآن عزیز میں تصریح ہے۔

﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ﴾ (الکہف: ۵۰)

وہ "جن" سے تھا پس اس نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی۔"

مگر جب اللہ تعالیٰ نے سجدہ کا حکم فرمایا تو اس وقت وہ اس مجلس میں موجود تھا اور غیر معلوم مدت تک فرشتوں کے ساتھ تسبیح و تہلیل میں مشغول رہنے کی وجہ سے وہ بھی اس حکم کا مخاطب تھا اور وہ بھی خود کو مخاطب سمجھتا تھا اسی لے جب خدائے تعالیٰ نے اس سے دریافت کیا تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا تو اس نے یہ جواب نہیں دیا کہ میں فرشتہ نہیں ہوں اس لیے اس حکم کا مخاطب ہی نہ تھا کہ سجدہ کرتا، بلکہ از راہ غرور کہا تو یہ کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں اس لیے سجدہ سے باز رہا۔

یہی جواب صحیح اور درست ہے۔ ورنہ تو ایک ضعیف اور کمزور رائے یہ بھی ہے کہ ملائکۃ اللہ میں سے ایک قسم کو "جن" بھی کہا جاتا ہے اور یہ انہیں میں سے ایک تھا۔ مگر اس رائے کی تائید نہ قرآن عزیز سے ملتی ہے اور نہ صحیح احادیث سے۔

⑤ ابلیس جب جنت سے مردود ہو کر نکال دیا گیا تو پھر وہ حضرت آدم و حواء (علیہما السلام) کو کس طرح بہکا سکا؟

علماء اسلام سے اس کے دو جواب منقول ہیں اور دونوں کسی تاویل کے بغیر چسپاں ہیں۔

اگرچہ ابلیس جنت سے نکال دیا گیا لیکن پھر بھی اس کا ایک گنہگار اور نابکار مخلوق کی حیثیت میں جنت کے اندر داخل ہونا اس کے مردود ہونے کے منافی نہیں ہے۔ اس لیے اس نے اسی حیثیت سے اندر جا کر حضرت آدم و حواء (علیہما السلام) سے یہ گفتگو کی اور ان کو لغزش میں ڈال دیا آیت ﴿اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا﴾ اسی کی تائید کرتی ہے کہ عاصی کی حیثیت سے ابھی تک اس کا داخلہ ممنوع نہیں تھا۔

⑥ جس طرح ایک آواز ٹیلی فون اور ریڈیو کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ دور جا سکتی ہے یا جس طرح لاسلکی (وائرلیس) میں صرف شعاعوں اور آواز کی لہروں کے ذریعہ سے ایک پیغام ہزاروں میل دور پہنچایا جا سکتا ہے اسی طرح یہ بھی کیوں ممکن نہیں کہ قربت یا بالمشافہ مخاطبت کے بغیر ہی شیطان کا وسوسہ نفس انسانی تک پہنچ جائے اور اس پر اثر انداز ہو تب واقعہ کی صورت یہ ہوئی کہ شیطان نے جنت سے باہر ہی رہ کر حضرت آدم و حوا (علیہما السلام) کے قلوب میں یہ وسوسہ ڈالا اور ان کے بہکانے کی کوشش کی، آیت

---

[1] فتح الباری ج ۲ کتاب حدیث الانبیاء چونکہ یہ تمام اقوال تخمینی ہیں اس لئے سب کو نقل کر دیا گیا ہے اور کسی ایک قول کو ترجیح دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

﴿فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ﴾ سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

⑦ حواء علیہا السلام کی پیدائش کس طرح ہوئی؟ قرآن عزیز میں اس کے متعلق صرف اسی قدر مذکور ہے۔

﴿وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ (النساء:۱)

"اور اس (نفس) سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا"۔

یہ نظم قرآنی حواء کی پیدائش کی حقیقت کی تفصیل نہیں بتاتی، اس لیے دونوں احتمال ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ حواء علیہا السلام حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہوئی ہوں جیسا کہ مشہور ہے اور بائبل میں بھی اسی طرح مذکور ہے، دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کو اس طرح پیدا کیا کہ مرد کے ساتھ اس کی جنس سے ایک دوسری مخلوق بھی بنائی جس کو عورت کہا جاتا ہے اور جو مرد کی رفیقہ حیات بنتی ہے۔

آیت کی تفسیر میں محققین کی رائے اس دوسری تفسیر کی جانب مائل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن عزیز صرف حضرت حواء علیہا السلام کی تخلیق کا ذکر نہیں کر رہا بلکہ "عورت کی تخلیق کے متعلق" اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ بھی مرد ہی کی جنس سے ہے اور اسی طرح مخلوق ہوئی ہے، البتہ بخاری و مسلم کی روایتوں میں یہ ضرور آتا ہے کہ عورت پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

((استوصوا بالنساء فان المرأة خلقت من ضلع)). (الحدیث)

"عورتوں کے ساتھ نرمی اور خیر خواہی سے پیش آؤ اس لیے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے"۔

اس کا مطلب ابن اسحاق نے تو یہ بیان کیا ہے کہ حواء علیہا السلام آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئیں، مگر ابن اسحاق سے زیادہ محقق اور نقاد علامہ قرطبی نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ دراصل عورت کو پسلی سے تشبیہ دی گئی ہے اور بتایا ہے کہ عورت کی خلقت کی ابتداء پسلی سے کی گئی ہے اس کا حال پسلی ہی کی طرح ہے، اگر اس کی کجی کو سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی تو جس طرح پسلی کے ترچھے پن کے باوجود اس سے کام لیا جاتا ہے اور اس کے خم کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی اسی طرح عورتوں کے ساتھ نرمی اور رفق کا معاملہ کرنا چاہیے ورنہ سختی کے برتاؤ سے خوشگواری کی جگہ تعلق کی شکست و ریخت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔[1]

⑧ حضرت آدم (علیہ السلام) جس جنت میں مقیم تھے اور جہاں سے انہیں زمین پر اترنے کا حکم دیا گیا وہ جنت کون سی جنت ہے "جنت الماویٰ؟" جو بعد قیامت اہل ایمان کا مستقر ہے یا "جنت ارضی" جو اسی سرزمین میں کسی بلند پُر فضا مقام پر آدم علیہ السلام کی حکومت کے لیے بنائی گئی تھی، جمہور علماء اسلام کا مسلک یہ ہے کہ یہ "جنت الماویٰ" ہے جس کا وعدہ آخرت میں مسلمانوں کے لیے کیا گیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ آیات و احادیث کا ظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً:

﴿وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ (البقرہ:۳۵)

"ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی (حواء) جنت میں رہو"۔

اس جگہ جنت کو عربی قاعدہ سے (الجنۃ) الف لام کے ساتھ ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اسی مشہور جنت کا ذکر ہے جس

---

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۲۸۳۔

کو جگہ جگہ قرآن عزیز میں قیام قیامت کے بعد مومنوں کا وطن بتایا گیا ہے ورنہ اگر کسی نئے مقام کا تذکرہ ہوتا تو پہلے اس کی حقیقت ۃ
اظہار ہوتا پھر اس کو جانی پہچانی چیز کی طرح ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا جاتا۔

﴿اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا﴾ (البقرہ:۳۸)

"تم وہاں سے ایک ساتھ اترو۔"

ہبوط: (اترنا) بلندی سے پستی کی طرف ہوتا ہے، اس لیے یہ جنت ارضی نہیں ہو سکتی بلکہ "جنت الماویٰ" ہی ہو سکتی ہے۔

⑨ مسلم شریف میں ایک طویل حدیث ہے جس میں یہ جملہ موجود ہے۔

((یجمع اللہ الناس فیقوم المؤمنون حین تزدلف لهم الجنة فیأتون ادم فیقولون یاابانا استفتح لنا الجنة فیقول: وهل اخرجكم من الجنة الا خطیئة ابیكم)). (الحدیث)

"اللہ تعالیٰ لوگوں کو جمع کرے گا، پس اہل ایمان کھڑے ہوں گے جب جنت ان کے قریب ہوگی۔ پھر وہ آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے، اے ہمارے باپ ہمارے لیے اس جنت کو کھولیے اس پر حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے کیا تم کو جنت سے تمہارے باپ کی خطا کاری ہی نے نہیں نکالا تھا۔"

اس کے برعکس علماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ (جنت) دنیا ہی کے مقامات میں سے کسی مقام پر تھی "جنت الماویٰ" نہ تھی، اور اپنے قول کی تائید میں یہ کہتے ہیں کہ آیات قرآنی ظاہر کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم و حواء علیہما السلام کو وہاں کھانے پینے کا مکلف بنایا اور ایک درخت کے نہ کھانے کی تکلیف دی، پھر وہاں آدم خواب راحت میں بھی رہتے تھے اور وہاں ابلیس بھی آتا جاتا رہتا تھا، اور اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکا بھی دیا۔ اور پھر آدم و حواء علیہما السلام اور ابلیس وہاں سے نکالے بھی گئے، تو یہ تمام وہ امور ہیں جو دنیا کے ساتھ مخصوص ہیں اور "جنت الماویٰ" میں ان کا وجود نہیں ہے، نہ وہ عالم تکلیف ہے اور نہ اس میں داخلہ کے بعد اخراج ہے، یہ قول بھی بڑے بڑے علماء اسلام کی طرف منسوب ہے، اور ان دو رایوں کے علاوہ اس سلسلہ میں دو رائیں اور بھی ہیں اور اس طرح اس مسئلہ میں چار اقوال جاتے ہیں۔

❶ یہ جنت الماویٰ ہے۔

❷ یہ جنت ارضی ہے۔

❸ یہ جنت الماویٰ اور جنت ارضی کے علاوہ ایک اور جنت ہے جو صرف اسی غرض سے تیار کی گئی تھی۔

❹ اس معاملہ میں توقف اور سکوت کرنا چاہیے، اور اسے خدا کے حوالہ کر دینا چاہیے یہ بحث بہت طویل ہے اور حافظ عماد الدین بن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ میں اس کو بڑے شرح و بسط سے بیان کیا ہے اور تمام اقوال کے مفصل دلائل اور نظائر کو بھی نقل کیا ہے۔[1] تفصیل دیکھنے کے لیے اس کی مراجعت کرنی چاہیے۔

بہر حال حقیقت حال کا عالم تو اللہ ہی ہے لیکن تمام دلائل و براہین کے دیکھنے کے بعد ہماری رائے تو یہی ہے کہ یہ معاملہ بلاشبہ

[1] البدایۃ والنہایۃ ج۱ص ۷۵تا۸۱

"جنت الماویٰ" ہی میں پیش آیا ہے اور کھانے، سونے اور شیطان کے وسوسہ ڈالنے کے لیے تمام معاملات "جنت الماویٰ" میں اس وقت پیش آئے ہیں جبکہ انسان ابھی تک عالم تکلیف میں نہیں آیا تھا۔ پس یہ جو کچھ ہوا مشیت الٰہی کی حکمت بالغہ کے زیر اثر اس لیے ہوا کہ یہ تمام تکوینی امور انسان کے زمین پر آباد ہونے اور "خلافت الٰہیہ" کے حقدار بننے کے لیے ضروری تھے۔ پس اگر یہی راجح قول ہے کہ اس جگہ جنت سے مراد "جنت الماویٰ" ہی ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حواء علیہما السلام زمین کے کس حصے پر اتارے گئے تو بعض ضعیف رایتوں میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان کی سرزمین پر اور حضرت حواء علیہا السلام جدہ کی سرزمین پر اتارے گئے اور پھر چل کر دونوں عرفات (حجاز) کے میدان میں ایک دوسرے سے جا ملے اسی لیے اس میدان حج کا نام عرفات ہوا کیونکہ دونوں نے اسی مقام پر ایک دوسرے کو پہچانا۔

لیکن قرآن عزیز نے اس حصہ کو نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ اس کا اظہار رشد و ہدایت سے غیر متعلق تھا، البتہ قلبی رجحان اور نفسیاتی برہان اس جانب توجہ دلاتے ہیں کہ آدم وحواء علیہما السلام ایک ہی جگہ اتارے گئے ہوں گے تاکہ حق تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے زیر اثر جلد ہی نسل انسانی کی افزائش اپنا کام کر سکے اور اس عالم خاکی کے وارث وکمین خدا کی زمین کو آباد کر کے انسانیت کے سب سے بڑے شرف "خلافت ارضی" کا پورا پورا حق ادا کر سکے۔

ظریفانہ نقطہ:

جو علماء اس کے قائل ہیں کہ یہ "جنت الماویٰ" ہے ان پر دوسرے علماء کا یہ اعتراض ہے کہ اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے (اور یہ ظاہر ہے کہ اسی کا دوسرا نام جنت الخلد ہے) تو حضرت آدم علیہ السلام سے ابلیس کا یہ کہنا کہ میں تمہیں شجر خلد کا پتہ بتاؤں کیا معنی رکھتا ہے؟

لیکن اول الذکر علماء ان حضرات سے جو جنت ارضی کے قائل ہیں پلٹ کر یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر یہ جنت ارضی تھی تو اس دار فانی میں ابلیس حضرت آدم علیہ السلام سے ایسی بحث ہی کیسے کر سکتا تھا کہ دنیا اور اس کی تمام اشیاء تو فانی ہیں مگر اس میں ایک شجر خلد بھی ہے۔ دار فانی میں خلود کہاں اس کو تو معمولی عقل کا انسان بھی تسلیم نہیں کر سکتا چہ جائیکہ حضرت آدم علیہ السلام۔

جنت ارضی علماء طبقات الارض کی نظر میں

جو علماء اس جنت کو "جنت ارضی" بتاتے ہیں ان میں سے علماء طبقات الارض کا یہ دعویٰ ہے کہ ربع مسکون میں سے جس خطہ پر جنت قائم تھی وہ آج کائنات ارضی پر موجود نہیں ہے۔ یہ حصہ "قارۂ مو" کے نام سے اس دنیا میں آباد تھا مگر مختلف حوادث اور پیہم زلزلوں کے باعث بحر ہند میں ہزاروں سال ہوئے کہ غرق ہو گیا، اور یہ کہ جب یہ حادثہ پیش آیا تھا تو اس خطہ پر بسنے والی انسانی آبادی تقریباً ساٹھ ملین (چھ کروڑ) کی تعداد میں ہلاک ہو گئی۔

اور بائبل کے سفر تکوین اصحاح میں اس کا مقام وقوع وہ بتایا گیا ہے جہاں سے دجلہ اور فرات نکلتے ہیں۔

⑩ کیا حضرت آدم علیہ السلام نبی اور رسول ہیں؟

شریعت اسلامی میں "نبی" اس ہستی کو کہتے ہیں جس کو حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے چن لیا ہو اور وہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوتی ہو اور "رسول" اس نبی کو کہا جاتا ہے جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے نئی شریعت اور نئی کتاب بھیجی گئی ہو۔

چونکہ حضرت آدم علیہ السلام دنیائے انسانی کے باپ ہیں تو خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ جس طرح اپنی نسل کی دنیوی سعادت وفلاح کے لیے رہنما اور ہادی تھے اسی طرح اخروی سعادت وفلاح کے لیے پیغمبر تھے یا نہیں؟

اس کا جواب ایک ہی ہوسکتا ہے کہ وہ بلاشبہ خدا کے سچے پیغمبر اور نبی برحق تھے اور اس مسئلہ میں امت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں اور اسی لیے کبھی یہ مسئلہ موضوع بحث نہیں بنا مگر اس مسئلہ میں اس وقت سے اہمیت پیدا ہوئی جبکہ مصر کے قریہ ومنہور کے ایک شخص نے حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا اور اپنے دعوے کی دلیل میں یہ پیش کیا کہ قرآن عزیز میں کسی مقام پر بھی حضرت آدم علیہ السلام کو دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح "نبی" نہیں کہا گیا۔ [1]

اس شخص کا یہ کہنا کہ قرآن عزیز نے حضرت آدم علیہ السلام کو کسی جگہ لفظ "نبی" سے مخاطب نہیں کیا، لفظی اعتبار سے اگرچہ صحیح ہے لیکن حقیقت نبوت کے اعتبار سے بالکل غلط ہے اس لیے کہ نبوت کے جو معنی اسلامی اصطلاح میں بیان کئے گئے ہیں بغیر کسی تاویل کے اس کا اطلاق حضرت آدم علیہ السلام پر نظم قرآنی میں بہت سے مقامات میں موجود ہے، جگہ جگہ یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی واسطہ کے حضرت آدم علیہ السلام سے ہمکلام ہوتا رہا ہے اور اس تمام مخاطبت اور بات چیت میں امر ونہی اور حلال وحرام کے احکام دیتا رہا ہے اور ان احکام کے لیے آدم کے پاس کسی کو نبی ورسول بنا کر نہیں بھیجا بلکہ براہ راست انہی سے خطاب فرمایا گیا، پس جبکہ نبوت کی حقیقت بھی یہی ہے تو حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت کا انکار قطعاً باطل اور بے معنی ہے، نیز ان کے رسول ہونے نہ ہونے کی بحث بھی کچھ زیادہ اہم نہیں ہے اس لیے کہ جب وہ پہلے انسان ہیں تو انسانی آبادی کے لیے خدا کی وحی کے ذریعہ جو پیغامات بھی انہوں نے سنائے وہی ان کی شریعت سمجھی جائے گی اور اس لیے وہ رسول بھی ہیں، بہرحال ان کی نبوت پر یقین رکھنے اور قلب میں اطمینان پیدا کرنے کے لیے نظم قرآنی کی وہ تمام آیات کافی وشافی دلیل ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کے درمیان براہ راست گفتگو اور مکالمت و مخاطبت کی شکل میں نظر آتی ہیں۔

⑪ حضرت آدم علیہ السلام جبکہ نبی ہیں تو ان سے خدا کے حکم کی خلاف ورزی کے کیا معنی، نبی تو معصوم ہوتا ہے اور "عصمت" نافرمانی اور گناہ کے متضاد ہے؟

حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت پر بحث کرنے سے قبل مختصر الفاظ میں "عصمت" کے معنی اور اس کا مفہوم معلوم ہو جانا ضروری ہے تاکہ آئندہ بھی ایسے مقامات میں گنجلک اور ریب وشک کی گنجائش باقی نہ رہے۔

عصمت نبی کے معنی:

خالق کائنات نے انسان کی تخلیق متضاد قوتوں کے ساتھ فرمائی ہے یعنی اس کو نیک و بد دونوں قسم کی قوتیں عطا کی گئی ہیں، وہ گناہ بھی کرسکتا ہے اور نیکی بھی، وہ ارادۂ بد کا بھی حامل ہے اور ارادۂ خیر کا بھی، اور یہی اس کے انسانی شرف کا طغرائے امتیاز ہے۔

---

[1] حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے بتائیے کیا آدم علیہ السلام نبی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں وہ نبی تھے اور رسول بھی، انہیں اللہ رب العالمین سے شرف تخاطب وتکلم حاصل ہوا ہے" روایت کے الفاظ یہ ہیں:
((عن ابی ذر قال: قلت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارای ادم انبیاء کان قال نعم نبینا رسولا یکلم اللہ قبیلا)) (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۴ قدیم)

ان متضاد قوتوں کے حامل "انسان" میں سے حضرت حق، انسانی رشد وہدایت، اور وصول الی اللہ کے لیے کبھی کبھی کسی شخص کو چن لیتے اور اس کو اپنا رسول، نبی اور پیغمبر بنا لیتے ہیں اور اس سلسلہ کی آخری کڑی ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اور جب یہ ہستی "نبوت" کے لیے چن لی جاتی ہے تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ عمل وارادہ کی زندگی میں ہر قسم کے گناہ سے پاک اور ہمہ قسم کی نافرمانیوں سے منزہ ہو، تا کہ پیغام الٰہی کے منصب میں خدا کی صحیح نیابت ادا کر سکے۔ اور:

"او خویشتن گم است کرا رہبری کند"

کا مصداق نہ ثابت ہو، اس طرح وہ ایک انسان اور بشر بھی ہے کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے اور اہل وعیال کی زندگی سے بھی وابستہ ہے اور وہ ہر قسم کے عملی اور ارادی گناہوں سے پاک بھی ہے کیونکہ وہ ہر قسم کی نیکی کے لیے ہادی ومرشد اور خدا کا نائب ہے، اور اگرچہ وہ دوسرے انسانوں کی طرح متضاد قوتوں کا حامل ضرور ہے لیکن عمل اور ارادہ میں اس سے ہر قسم کی بدی کے ظہور کو ناممکن اور محال کر دیا گیا ہے تا کہ اس کا ہر ایک ارادہ اور ہر ایک عمل اور ہر ایک قول، غرض ہر ایک حرکت وسکون، کائنات کے لیے اسوہ اور نمونہ بن سکے، البتہ بشریت وانسانیت سے متصف ہونے کی بنا پر سہو، نسیان، اور لغزش کا امکان باقی رہتا اور کبھی کبھی عمل شکل بھی اختیار کر لیتا ہے مگر فوراً ہی اس پر متنبہ کر دیا جاتا ہے اور وہ اس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔

سہو اور نسیان تو اپنے مفہوم میں ظاہر ہیں مگر زلۃ (لغزش) کیا ہے؟ تو اس کا اطلاق ایسی حقیقت پر ہوتا ہے کہ جہاں نہ عمل اور کردار میں تمرد اور سرکشی کا دخل ہو اور نہ قصد وارادہ کے ساتھ حکم کی خلاف ورزی کا اور ساتھ ہی وہ عمل اپنی حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے قبیح، بد اور شر بھی نہ ہو بلکہ ان تمام امور کے پیش نظر وہ اپنی ذات میں اگرچہ اباحت اور جواز کا درجہ رکھتا ہو مگر کرنے والے کی ہستی کے شایان شان نہ ہو بلکہ اس کے عظیم رتبہ کے سامنے سبک اور ہلکا نظر آتا ہو، باایں ہمہ اس لیے عمل میں آ گیا کہ عمل کرنے والے کی نگاہ میں اس کا اس طرح کرنا خدائے تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہ تھا لیکن نبی پر چونکہ خدائے تعالیٰ کی مستقل حفاظت ونگرانی رہتی ہے اس لیے فوراً ہی اس کو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ عمل تمہاری جلالت قدر اور عظمت ومرتبہ کے شایان شان نہیں ہے اور قطعی غیر مناسب ہے، اسی فرق مراتب کو عربی کی اس مثل میں ظاہر کیا گیا ہے۔

" نیکوکار انسانوں کی عام خوبیاں مقربین بارگاہِ الٰہی کے حق میں برائیاں ہوتی ہیں۔"

مگر اس لیے کہ ایک مقرب بارگاہِ الٰہی کو خدا کی مرضی کے سمجھنے میں بھی یہ لغزش کیوں پیش آئی سنۃ اللہ یہ جاری ہے کہ وہ انبیاء ومرسلین (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی اس قسم کی لغزشوں پر جب ان کو متنبہ کرتا ہے تو اول نہایت سخت اور مجرمانہ عمل کی حیثیت میں اس لغزش کا ذکر کرتا ہے مگر پھر کسی دوسرے مقام پر اس معاملہ کی اصل حقیقت کو ظاہر کر کے "نبی ورسول" کے عمل کو لغزش ہی کی حد میں لے آتا، اور ان کی جانب سے خود ہی معذرت کر دیتا ہے تا کہ کسی ملحد اور زندیق کو کسی بھی نبی ورسول کی جانب گناہ کے الزام لگانے کی بے جا جرأت نہ ہو سکے۔

اسی مجموعہ حقیقت کا نام "عصمت انبیاء" ہے اور یہی اسلامی عقائد میں سے ایک بنیادی عقیدہ ہے، یہ مسئلہ اگرچہ بحث وکاوش کے اعتبار سے بہت اہم اور معرکۃ الآراء مسئلہ ہے، مگر دلائل وبراہین اور بحث ونظر کے بعد مسئلہ کی حقیقت اور اس کا خلاصہ یہی ہے جو یہاں سپرد قلم کیا گیا اور اس مقام پر اسی قدر کافی وشافی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت:

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اب حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ پر غور کیجئے اور نظر ڈالیے کہ قرآن عزیز "سورۂ بقرہ" میں جب یہ واقعہ بیان کیا گیا تو صاف طور پر واضح کر دیا گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی یہ غلطی نہ گناہ تھی اور نہ نافرمانی بلکہ معمولی قسم کی لغزش تھی۔

﴿فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ﴾ (البقرہ:۳۶)

"شیطان نے ان دونوں سے لغزش کرا دی۔"

اور اس کے بعد سورۂ "اعراف" اور "طٰہٰ" میں دو جگہ اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے "وسوسہ" سے تعبیر کیا:

﴿فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ﴾ (الاعراف:۲۰)

"شیطان نے ان کو پھسلا دیا۔"

اور "طٰہٰ" میں تیسری جگہ اس لغزش اور وسوسہ کا خود ہی سبب بیان کر کے حضرت آدم علیہ السلام کو ہر قسم کے ارادی اور عملی گناہ سے پاک ظاہر کیا اور ان کی عصمت کے مسئلہ کو زیادہ سے زیادہ محکم اور مضبوط بنا دیا۔

﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴾ (طٰہٰ:۱۱۵)

"اور بلاشبہ ہم نے آدم سے ایک اقرار لیا تھا پس وہ اس کو بھول گیا اور ہم نے اس کو پختہ ارادہ کا نہیں پایا (یا ہم نے اس کو اقرار کے پورا نہ کرنے میں اس کے ارادہ اور قصد کا دخل نہیں پایا)۔"

یہ آیات صاف طور پر واضح کرتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں کیا جس حد تک معاملہ پیش آیا اس میں بھی ان کے قصد و ارادہ سے خلاف ورزی کا مطلق کوئی دخل نہیں ہے بلکہ وہ ایک وسوسہ تھا جو لغزش کی شکل میں ان سے صادر ہو گیا اور وہ بھی نسیان اور بھول چوک کے ساتھ۔ ان تمام تصریحات کے بعد اب سورۂ طٰہٰ کی مسطورہ ذیل آیت کا مقصد خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔

﴿وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴾ (طٰہٰ:۱۲۱)

"اور آدم نے اپنے پروردگار کا حکم پورا نہ کیا اور وہ بہک گیا۔"

ہم نے اس جگہ عصیان اور غوایت کے وہ معنی نہیں لیے جو عام بول چال میں بولے جاتے ہیں یعنی "گناہ" اور "گمراہی" اور ایسا تاویل بعید یا دور از کار توجیہ کے لیے نہیں کیا گیا بلکہ لغت اور علم معانی کے عام اصول کے زیر نظر ہی کیا گیا ہے اس لیے کہ لغت عربی کی مشہور کتاب "لسان العرب" اور "اقرب الموارد" وغیرہ میں "المعصیة، مصدر و قد تطلق علی الزلة مجازًا" (معصیۃ مصدر ہے اور کبھی مجاز کے طور پر لغزش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) اسی طرح "غوٰی" کے معنی یہاں ضل یا خاب کے ہیں، پس اگر یہاں ضل مراد ہیں تو اس کا اردو ترجمہ "بہک گیا" کیا جائے گا اور خاب مراد ہیں تو نقصان میں پڑ گیا فصیح ترجمہ ہے۔

بہر حال واقعہ سے متعلق ان تمام آیات کو اوران آیات کو جو حضرت آدم کی جلالت قدر، صفوت و برگزیدگی اور خلعت خلافت سے سرفرازی کو ظاہر کرتی ہیں، جدا جدا کر کے نہ دیکھا جائے" جیسا کہ معترضین کا عام قاعدہ ہے اور جو اکثر قرآن فہمی میں گمراہی کا سبب بنتا ہے" اور سب کو یکجا کر کے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت کا مسئلہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور اس میں قطعی کسی شائبہ ریب وشک کی گنجائش نہیں ہے۔

اور بالفرض اگر ﴿عَصٰی﴾ اور ﴿غَوٰی﴾ کو عام معنی میں لیا جائے تب بھی وہ اصول پیش نظر رکھنا ضروری ہے جو مسئلہ "عصمت" کی حقیقت کے سلسلہ میں ابھی بیان ہو چکا ہے کہ جب نصوص قرآن حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت، صفوت اور خلافت جیسے عظیم الشان مراتب کا اظہار کرتی ہیں تو اس آیت میں ان کی اس لغزش کو ان سخت الفاظ کے ساتھ اس لیے یاد کیا گیا کہ آدم علیہ السلام مقرب بارگاہ الٰہی کے لیے کہ جس کو خود اللہ تعالیٰ کی براہ راست ہم کلامی کا شرف حاصل ہے، یہ لغزش اور نسیان بھی اس کے مرتبہ سے نازل اور غیر موزوں ہے لہٰذا زیادہ سے زیادہ قابل گرفت ہے اگرچہ ابرار و نیکوکار انسانوں کے حق میں اس قسم کی غلطی ایک معمولی بات ہی کیوں نہ ہو۔

⑫ حضرت آدم علیہ السلام دنیائے انسانی میں پہلے انسان اور کائنات بشری کے پہلے ابوالبشر ہیں یا اس سے بھی پہلے اس قسم کی دنیائے انسانی کا وجود اس کائنات میں رہا ہے اور اس کے لیے بھی اسی طرح ایک آدم ابوالبشر کی ہستی رہی ہے؟

اس مسئلہ کے متعلق اگرچہ بعض علماء طبقات الارض نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ انسانی دنیا سے قبل بھی ربع مسکون پر عالم انسانی کا وجود رہا ہے اور آج سے تیس ہزار سال قبل کی اس جنس بشری کا نام "تیاندرتال" تھا اور اس کا موجودہ نسل انسانی سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا بلکہ وہ مستقل نسل تھی جو ہلاک ہو گئی اور اس کے بعد موجودہ نسل انسانی نے جنم لیا مگر ان کی یہ تحقیق تخمینی اور قیاسی ہے جو انسانی ڈھانچوں اور ان کی ہڈیوں کی تحقیق (ریسرچ) پر مبنی ہے اور کسی یقین اور علم حقیقی پر مبنی نہیں ہے اور قرآن عزیز نے ہم کو اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی، نہ کسی موقع پر اس کے بارہ میں کوئی اشارہ کیا اور نہ نبی کریم ﷺ سے اس مسئلہ میں کوئی تصریح موجود ہے لہٰذا ہمارے یقین اور اعتقاد کے لیے اسی قدر کافی ہے جو ہم کو قرآن کے یقینی علم اور وحی الٰہی کی صاف اور صریح اطلاع سے حاصل ہوا ہے۔

دراصل اس قسم کے مباحث علمیہ کے لیے اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو مسائل علم یقین اور مشاہدہ کی حد تک پہنچ چکے ہیں اور قرآنی علوم اور وحی الٰہی ان حقائق کا انکار نہیں کرتے" کیونکہ قرآن عزیز مشاہدہ اور بداہت کا کبھی بھی انکار نہیں کرتا" تو ان کو بلاشبہ تسلیم کیا جائے اس لیے کہ ایسے حقائق کا انکار بیجا تعصب اور تنگ نظری کے سواء اور کچھ نہیں، اور جو مسائل ابھی تک یقین اور جزم کی اس حد تک نہیں پہنچے جن کو مشاہدہ اور بداہت کہا جا سکے جیسا کہ مسئلہ "زیر بحث" تو ان کے متعلق قرآن عزیز کے مطالب میں تاویلات نہیں کرنی چاہئیں اور خواہ مخواہ ان کو جدید تحقیقات کے سانچہ میں ڈھالنے کی سعی ہرگز جائز نہیں، بلکہ وقت کا انتظار کرنا چاہیے کہ وہ مسائل اپنی حقیقت کو اس طرح آشکارا کر دیں کہ ان کے انکار سے مشاہدہ اور بداہت کا انکار لازم آ جائے، اس لیے کہ یہ حقیقت ہے کہ مباحث علمیہ کو تو بارہا اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا ہے، مگر علوم قرآنی کو کبھی ایک مرتبہ بھی اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور جب کبھی مسائل علمیہ بحث و نظر کے بعد یقینیات اور مشاہدات کی حد تک پہنچے ہیں وہ ایک نقطہ بھی اس سے آگے نہیں گئے جس کو قرآن

نے پہلے سے واضح کر دیا ہے۔

البتہ اگر کسی مفسر نے ایک آیت کی ایسی تفسیر کر دی ہے جو اس مسئلہ کی اصل حقیقت کے خلاف پڑتی ہے تو بلاشبہ اس کے بیان کردہ معانی کو نظر انداز کر دینا اور آیت قرآن کو اصل حقیقت کے مطابق ظاہر کرنا قرآن عزیز کا اپنا مطالبہ ہے جو تعقل، تفکر اور تدبر کی بار بار دعوت سے ظاہر ہوتا ہے: ﴿ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ ۝ اَفَلَا يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾

لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ یہ بحث صرف ان ہی مسائل سے متعلق ہے جو تاریخی، جغرافیائی اور طبعی حقائق سے تعلق رکھتے ہیں اور قرآن عزیز نے اس حد تک ان کی طرف توجہ کی ہے جس سے اس کے مقصد ارشاد و ہدایت کو مدد مل سکے، باقی وہ تمام مسائل جس کا تعلق ایک مسلمان کے "مسلم" ہونے اور عقائد و اعمال کے اعتبار سے اس کے "مومن" کہلانے سے ہے۔ سو ان کو قرآن عزیز نے جس یقین اور علم حقیقی (وحی الٰہی) کے ذریعہ بیان کر دیا ہے ان میں مطلق کسی قسم کے تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں ہے، اور نہ وہ کسی تحقیق اور ریسرچ کے محتاج، مثلاً خدا کی ہستی آخرت کے وجود، ملائکۃ اللہ، تقدیر اور انبیاء و رسل سے متعلق ایمان و اعتقاد یا نماز روزہ کی اصل حقیقت، حج و زکوٰۃ کے معنی و مفہوم وغیرہ یہ تمام مسائل ایک مسلمان کے لیے مطلق کسی جدید تحقیق کے محتاج نہیں ہیں بلکہ ان کے حقائق کے متعلق نصوص نے ہم کو دوسروں سے قطعی بے نیاز کر دیا ہے اور اس کا دیا ہوا علم، علم یقین (وحی الٰہی) پر مبنی ہے جو اپنی ابدیت کے ساتھ اصل اور غیر متبدل ہے۔

⑬ توراۃ و انجیل (بائبل) میں اس قصہ سے متعلق جو واقعات مذکور ہیں مثلاً سانپ اور طاؤس کا قصہ یا اسی قسم کی اور باتیں جو قرآن عزیز اور صحیح روایات حدیث میں نہیں پائی جاتیں ان کے متعلق کیا حکم ہے؟

یہ سب اسرائیلیات کہلاتی ہیں اور بے اصل ہیں، ان کی پشت پر نہ علم یقین اور علم صحیح (وحی الٰہی) کی سند ہے اور نہ عقل و تاریخ کی شہادت، اس لیے من گھڑت اور بے سروپا باتیں ہیں، بعض مفسرین بھی ایسی روایات کے نقل میں سہل انگاری برتتے ہیں، جس سے بہت بڑا نقصان یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام نہیں بلکہ خواص بھی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان روایات کو اسلامی روایات میں دخل ہے اور یہ بھی صحیح روایات کی طرح صحیح اور قابل قبول ہیں، اس لیے ازبس ضروری ہے کہ تردید کے ارادہ سے علاوہ تفسیر قرآن میں ہرگز ان کو جگہ نہ دی جائے اور نہ صرف کتب تفسیر و حدیث بلکہ کتب سیرت کو بھی ان سے پاک رکھا جائے۔

⑭ حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں "ملک" "فرشتہ" اور "جن" کا ذکر بھی آیا ہے، یہ دونوں خدائے تعالیٰ کی مستقل مخلوق ہیں یا صرف دو قوتوں کا نام ہے جو قوت ملکوتی اور قوت شیطانی سے موسوم ہیں؟

فرشتہ:

قرآن عزیز اور احادیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو کچھ ہم کو بتایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ہم "فرشتہ" کی نہ حقیقت تخلیقی سے واقف کئے گئے ہیں اور نہ وہ ہم کو نظر آتے ہیں، البتہ ہمارے لیے یہ یقین و اعتقاد ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ہم ان کے وجود کو تسلیم کریں اور ان کو مستقل مخلوق یقین کریں، اس لیے کہ قرآن عزیز اور احادیث صحیح نے ان میں سے بعض کے ناموں کی تصریح تک کی ہے اور جنس ملائکہ کی جن صفات کا تذکرہ فرمایا ہے وہ ان کے ایک مستقل مخلوق ہونے کی صراحت کرتی ہیں، ذیل کی آیات ان ہی حقائق کو واضح کرتی ہیں۔

﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾(البقرہ:۹۷)

"تو کہہ دے، جو کوئی دشمن ہو جبریل کا سو اس نے تو اتارا ہے یہ کلام تیرے دل پر اللہ کے حکم سے۔"

﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ ۝﴾(البقرہ:۹۸)

"جو کوئی دشمن ہو اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبریل اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے ان کافروں کا۔"

﴿يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ﴾(النحل:۲)

"وہ اتارتا ہے فرشتوں کو بھید دے کر اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے۔"

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا أُولِي أَجْنِحَةٍ مَّثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۚ يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝﴾(فاطر:۱)

"سب خوبی اللہ کو ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین، جس نے ٹھہرایا فرشتوں کو پیغام لانے والا جن کے پر ہیں دو دو اور تین تین اور چار چار، بڑھا دیتا ہے وہ پیدائش میں جو چاہے بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے۔"

﴿تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ﴾(المعارج:۴)

"چڑھیں گے فرشتے اور روحیں اس کے آگے۔"

﴿وَالْمَلَكُ عَلَىٰ أَرْجَائِهَا ۚ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ ۝﴾(الحاقۃ:۱۷)

"اور فرشتے ہوں گے (قیامت کے دن) اس (آسمان) کے کناروں پر اور اٹھائیں گے عرش تیرے رب کا اپنے اوپر اس دن آٹھ (فرشتے)۔"

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا﴾
(البقرہ:۳۰)

"اور جب کہا تیرے پروردگار نے فرشتوں سے میں بنانے والا ہوں زمین میں خلیفہ تو انہوں نے کہا کیا تو اس میں ایسے کو بنائے گا جو اس زمین میں فساد پھیلائے گا۔"

ان آیات کو غور سے پڑھنے کے بعد خود انصاف کیجئے کہ جن ملحدوں نے فرشتوں کے مستقل مخلوق ہونے سے انکار کیا ہے ان کی باطل تاویلات اور قرآن عزیز میں معنوی تحریفات کس حد تک قابل قبول بلکہ لائق ذکر ہیں۔

قرآن عزیز میں ملک اور ملائکہ کا ذکر ۸۶ آیات میں ۸۸ مرتبہ آیا ہے جو ذیل کے جدول سے ظاہر ہے:

نمبر سورہ	نام سورہ	تعداد آیات
۲	البقرہ	۳۰_۳۱_۳۴_۹۸_۱۰۲_۳ ۱۶۱_۱۷۷_۲۱۰_۲۴۸_۲۸۵
۴	النساء	۹۷_۱۳۶_۱۶۶_۱۷۲_۶
۷	الاعراف	۱۱_۲۰
۱۱	ھود	۱۲_۳۱
۱۳	الرعد	۱۳_۲۳
۱۶	النحل	۲_۲۸_۳۲_۳۳_۴۹
۱۸	الکہف	۵۰
۲۱	الانبیاء	۱۰۳
۲۳	المؤمنون	۲۴
۳۲	السجدہ	۱۱
۳۴	سباء	۴۰
۳۷	الصافات	۱۵۰
۳۹	الزمر	۷۵
۴۲	الشوریٰ	۵
۴۷	محمد	۲۷
۶۶	التحریم	۴_۶
۷۰	المعارج	۴
۷۸	النباء	۳۸
۹۷	القدر	۴

نمبر سورہ	نام سورہ	تعداد آیات
۳	آل عمران	۱۸_۳۹_۴۲_۴۵_۸۰_۸۷_ ۱۲۴_۱۲۵
۶	الانعام	۸_۹_۵۰_۹۳_۱۱۱_۱۵۸
۸	الانفال	۹_۱۲_۵۰
۱۲	یوسف	۳۱
۱۵	الحجر	۷_۸_۲۸_۳۰
۱۷	الاسراء	۴۰_۶۱_۹۲_۹۵
۲۰	طٰہٰ	۱۱۶
۲۲	الحج	۷۵
۲۵	الفرقان	۷_۲۱_۲۲_۲۵
۳۳	الاحزاب	۴۳_۵۶
۳۵	فاطر	۱
۳۸	صٓ	۷۱_۷۳
۴۱	فصلت	۱۴
۴۳	الزخرف	۱۹_۵۳_۶۰
۵۳	النجم	۲۶_۲۷
۶۹	الحاقہ	۱۷
۷۴	المدثر	۳۱
۷۹	الفجر	۲۲

نیز احادیث صحیحہ اور قدیم آسمانی کتابوں توراۃ، زبور، انجیل وغیرہ میں بھی فرشتوں کا تذکرہ موجود ہے اور ان کو مستقل مخلوق بھی بتایا گیا ہے، خصوصاً بخاری اور مسلم کی روایات میں بکثرت اس کی شہادتیں موجود ہیں۔

جن:

اسی طرح "جن" بھی خدائے تعالیٰ کی مستقل مخلوق ہے جس کی حقیقت تخلیق سے ہم پوری طرح آگاہ نہیں ہیں اور نہ عام

انسانی آبادی کی طرح وہ ہم کو نظر آتے ہیں لیکن قرآن عزیز نے جو تصریحات اس مخلوق کے متعلق کی ہیں وہ ہمارے لیے ضروری قرار دیتی ہیں کہ ہم یہ اعتقاد اور یقین رکھیں کہ وہ بھی انسان کی طرح مستقل مخلوق ہیں اور اسی کی طرح شریعت کے مکلف بھی، ان میں توالد و تناسل کا بھی سلسلہ ہے اور ان میں نیک و بد بھی ہیں۔

قرآن عزیز کی یہ آیات ان ہی حقائق کو واضح اور ظاہر کرتی ہیں۔

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝﴾ (الذاریات: ۵۶)

"اور نہیں پیدا کیا ہم نے جن اور انسان کو مگر تا کہ وہ عبادت گزار ہوں۔"

﴿قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۝ يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ ۖ وَلَن نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا ۝﴾ (الجن: ۱۔۲)

"اور اے پیغمبر سب لوگوں کو جتا دو کہ میرے پاس خدا کی طرف سے اس بات کی وحی آئی ہے کہ جنات میں سے چند شخصوں نے مجھے قرآن پڑھتے سنا اور اس نے پیچھے اپنے لوگوں سے جا کر کہا کہ ہم نے عجیب طرح کا قرآن سنا جو نیک راہ دکھاتا ہے سو ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم تو کسی کو اپنے پروردگار کا شریک ٹھہرائیں گے نہیں۔"

﴿وَأَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُونَ وَمِنَّا الْقَاسِطُونَ ۖ﴾ (الجن: ۱۴)

"اور بلاشبہ کچھ ہم میں سے فرماں بردار ہیں اور کچھ بے انصاف۔"

﴿إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۗ﴾ (الاعراف: ۲۷)

"بیشک وہ (شیطان) اور اس کی ذریات تم کو ادھر سے دیکھتے رہتے ہیں جدھر سے تم ان کو نہیں دیکھتے۔"

﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ ۗ﴾ (الکہف: ۵۰)

"اور تھا (ابلیس) جنات میں سے پس نافرمانی کی اس نے اپنے رب کی۔"

ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان بھی "جن" ہی کی نسل میں سے ہے، اور ابلیس (شیطان) نے خدائے تعالیٰ کے سامنے خود یہ اقرار کیا کہ اس کی تخلیق نار (آگ) سے ہوئی ہے۔

مسطورۂ بالا آیات کے علاوہ لفظ جن، جان اور جنۃ بتیس (۳۲) مرتبہ قرآن حکیم کی اکتیس (۳۱) آیات میں مذکور ہوئے ہیں، جو ذیل کے جدول سے ظاہر ہیں۔

نمبر سورہ	نام سورہ	تعداد آیات
۶	الانعام	۱۰۰۔۱۱۲۔۱۲۸۔۱۳۰
۱۱	ھود	۱۱۹

نمبر سورہ	نام سورہ	تعداد آیات
۷	الاعراف	۳۸۔۱۷۹
۱۵	الحجر	۲۷

۱۷	الاسراء	۸۸
۲۷	النمل	۱۷-۳۹
۳۴	السباء	۱۲-۱۴-۴۱
۴۱	فصلت	۲۵-۲۹
۵۱	الذاریات	۵۶
۷۲	الجن	۱-۵-۶

۱۸	الکہف	۵۰
۳۲	السجدہ	۱۳
۳۷	الصافات	۱۵۸
۴۶	الاحقاف	۱۸-۲۹
۵۵	الرحمٰن	۱۵-۳۳-۳۹-۵۶-۷۴
۱۱۴	الناس	۶

حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن عزیز اور نبی معصوم ﷺ نے ہم کو یہ اطلاع دی ہے کہ "ملائکہ" اور "جن" اگرچہ ہماری ان نگاہوں سے پوشیدہ ہیں، لیکن بلاشبہ وہ مستقل مخلوق ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ مشاہدہ میں تو غلطی کا امکان بھی ہے اور بارہا ہوتا رہتا ہے لیکن "وحی الٰہی" اور "نبی معصوم" کی اطلاع میں غلطی کی مطلق گنجائش نہیں لہٰذا ہمارا ایمان ہے کہ وہ خدا کی مستقل مخلوق ہیں، اس کے علاوہ عقلی اعتبار سے بھی ان کا مستقل مخلوق ہونا ناممکن نہیں ہے بلکہ امکان عقلی کے دائرہ میں ہے۔

پس جو چیز عقل کے نزدیک ناممکن نہ ہو اور نقل یعنی "وحی الٰہی" اس کا یقین دلاتی ہو تو اس کا انکار "علم" اور "حقیقت" کا انکار ہے، اور تنگ نظری اور ہٹ دھرمی کی زندہ مثال۔

رہا یہ امر کہ وہ ہمارے مشاہدات و محسوسات سے باہر ہیں اور ہم ان کو نہیں دیکھتے تو یہ بھی انکار کی کوئی معقول وجہ نہیں ہوسکتی اس لیے کہ آج کی دوربینوں اور سائنس کے آلات سے پہلے ہزاروں برس تک ہم کو وہ بہت سی اشیاء محسوس نہیں ہوتی تھیں اور نہ آنکھیں ان کو دیکھ سکتی تھیں جن کا وجود اس وقت بھی موجود تھا مگر آج وہ نظر بھی آتی ہیں اور محسوس بھی ہوتی ہیں تو کیا ہزاروں سال پہلے جن لوگوں نے ان کے وجود کا انکار کیا وہ حقیقی علم پر مبنی تھا یا کوتاہی علم اور ذرائع معلومات و تحقیقات سے ناواقفیت کا نتیجہ، اسی طرح ہم آج بھی بجلی، مقناطیس اور روشنی کی صحیح حقیقت سے ناآشنا ہیں اور ان کو صرف ان کے آثار و علامات ہی سے پہچانتے ہیں۔

اسی طرح مادیین اور ملاحدہ کا انکار کسی علم اور یقین پر مبنی نہیں ہے بلکہ محسوسات و مشاہدات میں نہ آنے کی بنا پر "عدم علم" کی وجہ سے ہے جو کسی طرح عدم وجود کی دلیل نہیں بن سکتا، نیز علم دو ہی طرح حاصل ہوسکتا ہے، ایک علوم و فنون کے ذریعہ جو کسب و اکتساب کا محتاج ہے اور دوسرے موہبت اور عطیہ الٰہی کی راہ سے اور اس کا سب سے بلند درجہ وحی الٰہی ہے، پس اگر کوئی شئے علوم و فنون کی راہ سے ہم نہ معلوم کرسکیں گے مگر عقل اس کے وجود کو ناممکن نہ سمجھتی ہو اور "وحی الٰہی" اس کے وجود کا اعلان کرتی ہے تو ہر ذی ہوش اور ذی عقل کا فرض ہے کہ وہ علوم و فنون کی درماندگی کے اعتراف کے ساتھ اس کو تسلیم کرے، البتہ اگر اس کو اس اطلاع کے وحی الٰہی ہونے ہی میں انکار ہو یا وہ سرتاسر وحی الٰہی کا ہی منکر ہو تو اب اس کے لیے اس اطلاع پر ایمان لانے سے قبل ان دلائل کا مطالعہ ضروری ہے جو اس سلسلہ میں قرآن عزیز نے بیان کیے ہیں، اور جن میں بتایا گیا ہے کہ وہ بلاشبہ "کلام اللہ" اور "وحی الٰہی" ہے۔

قصہ آدم علیہ السلام میں چند اہم عبرتیں:

یوں تو حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں بے شمار پند و نصائح اور مسائل کا ذخیرہ موجود ہے اور ان کا احاطہ اس مقام پر ناممکن

ہے تاہم چند اہم عبرتوں کی جانب اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

① اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے بھید بے شمار اور ان گنت ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی ہستی بھی خواہ وہ کتنی ہی مقربین بارگاہ الٰہی میں سے کیوں نہ ہو، ان تمام بھیدوں پر واقف ہو جائے اسی لیے ملائکۃ اللہ انتہائی مقرب ہونے کے باوجود خلافت آدم کی حکمت سے آشنا نہ ہو سکے اور جب تک معاملہ کی پوری حقیقت سامنے نہ آگئی وہ حیرت ہی میں غرق رہے۔

② اللہ تعالیٰ کی عنایت وتوجہ اگر کسی حقیر شئے کی جانب بھی ہو جائے تو وہ بڑے سے بڑے مرتبہ اور جلیل القدر منصب پر فائز ہو سکتی اور خلعت شرف ومجد سے نوازی جا سکتی ہے۔

ایک مشت خاک کو دیکھئے اور پھر "خلیفۃ اللہ" کے منصب پر نظر ڈالیے اور پھر اس کے منصب نبوت و رسالت کو ملاحظہ فرمایئے، مگر اس کی توجہ کا فیضان بخت واتفاق کی بدولت یا خالی از حکمت نہیں ہوتا بلکہ اس شئے کی استعداد کے مناسب بے نظیر حکمتوں اور مصلحتوں کے نظام سے منظم ہوتا ہے۔

③ انسان کو اگرچہ ہمہ قسم کا شرف عطا ہوا اور ہر طرح کی جلالت و بزرگی نصیب ہوئی، تاہم اس کی خلقی اور طبعی کمزوری اپنی جگہ اسی طرح قائم رہی اور بشریت وانسانیت کا وہ نقص پھر بھی باقی رہا یہی وہ چیز تھی جس نے حضرت آدم علیہ السلام پر بایں جلالت قدر و منصب عظیم پر نسیان طاری کر دیا اور وہ ابلیس کے وسوسہ سے متاثر ہو گئے۔

④ خطا کار ہونے کے باوجود اگر انسان کا دل ندامت وتوبہ کی طرف مائل ہو تو اس کے لیے باب رحمت بند نہیں ہے اور اس درگاہ تک رسائی میں ناامیدی کی تاریک گھاٹی نہیں پڑتی، البتہ خلوص اور صداقت شرط ہے اور جس طرح حضرت آدم علیہ السلام کے نسیان ولغزش کا عفو اسی دامن سے وابستہ ہے، اسی طرح ان کی تمام نسل کے لیے بھی عفو ورحمت عالم کا دامن وسیع ہے۔

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ (الزمر ۵۳)

"کہہ دے، اے میرے وہ بندو جو اپنے نفسوں کے بارے میں حد سے گزر گئے ہو (گناہ کر کے نفسوں پر ظلم کیا ہے) تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بے شک اللہ سب گناہوں کو بخش دینے والا رحم کرنے والا ہے۔"

⑤ بارگاہ الٰہی میں گستاخی یا بغاوت بڑی سے بڑی نیکی اور بھلائی کو بھی تباہ کر دیتی، اور ابدی ذلت وخسران کا باعث بن جاتی ہے، ابلیس کا واقعہ عبرتناک واقعہ ہے اور اس کی ہزاروں سال کی عبادت گزاری کا جو حشر بارگاہِ الٰہی میں گستاخی اور بغاوت کی وجہ سے ہوا وہ بلاشبہ سرمایہ صد ہزار عبرت ہے۔

پس عبرت حاصل کرو اے چشم عبرت رکھنے والو



قابیل وہابیل

ان دونوں کا واقعہ بھی چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کا ایک حصہ ہے، اس لیے یہاں قابل ذکر ہے۔

قرآن عزیز نے حضرت آدم علیہ السلام کے ان دونوں صاحبزادوں کا نام ذکر نہیں کیا صرف ﴿ابنی ادم﴾ (آدم کے دو بیٹے) کہہ کر مجمل چھوڑ دیا ہے، البتہ توراۃ میں ان کے یہی نام بیان کیے گئے ہیں جو عنوان میں درج ہیں، ان کے واقعہ کے متعلق حافظ حدیث عماد الدین بن کثیر نے اپنی تاریخ میں سدی سے سند کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے اس کا مضمون یہ ہے، دنیائے انسانی میں اضافہ کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کا یہ دستور تھا کہ حواء علیہا السلام سے توام (جڑواں) پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کا عقد دوسرے پیٹ سے پیدا ہونے والے توام بچوں کے ساتھ کر دیا کرتے تھے، اسی دستور کے مطابق قابیل اور ہابیل کی شادی کا معاملہ پیش تھا، قابیل عمر میں بڑا تھا اور اس کی ہمشیر ہابیل کی ہمشیر سے زیادہ حسین وخوبرو تھی، اس لیے قابیل کو یہ انتہائی ناگوار تھا کہ دستور کے مطابق ہابیل کی ہمشیر سے اس کی شادی ہو اور ہابیل کی اس کی ہمشیر سے، معاملہ کو ختم کرنے کے لیے حضرت آدم علیہ السلام نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دونوں اپنی اپنی قربانی حق تعالیٰ کی جناب میں پیش کریں جس کی قربانی منظور ہو جائے وہی اپنے ارادہ کے پورا کر لینے کا مستحق ہے۔

جیسا کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں قربانی (نذر) کی قبولیت کا یہ الہامی دستور تھا کہ نذر و قربانی کی چیز کسی بلند جگہ پر رکھ دی جاتی اور آسمان سے آگ نمودار ہو کر اس کو جلا دیتی تھی، اس قانون کے مطابق ہابیل نے اپنے ریوڑ میں سے ایک بہترین دنبہ خدا کی نذر کیا اور قابیل نے اپنی کھیتی کے غلہ میں سے ردی قسم کا غلہ قربانی کے لیے پیش کیا، دونوں کی حسن نیت اور نیت بد کا اندازہ اسی عمل سے ہو گیا، لہٰذا حسب دستور آگ نے آکر ہابیل کی نذر کو جلا دیا اور اس طرح قبولیت کا شرف اس کے حصہ میں آیا۔

قابیل اپنی اس توہین کو کسی طرح برداشت نہ کر سکا اور اس نے غیظ وغضب میں آکر ہابیل سے کہا کہ میں تجھ کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑوں گا تاکہ تو اپنی مراد کو نہ پہنچ سکے۔ ہابیل نے جواب دیا، میں تو کسی طرح تجھ پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا، باقی تیری جو مرضی آئے وہ کر، رہا قربانی کا معاملہ سو خدا کے ہاں تو نیک نیت ہی کی نذر قبول ہو سکتی ہے وہاں بدنیت کی نہ دھمکی کام آ سکتی ہے اور نہ بے وجہ کا غم وغصہ، قابیل پر اس نصیحت کا اُلٹا اثر پڑا اور اس نے غصہ سے مشتعل ہو کر اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا۔ [1]

مگر قرآن عزیز میں شادی کا قصہ مذکور نہیں ہے، صرف قربانی (نذر) کا ذکر ہے، اور اس روایت سے زائد ہابیل کی نعش کے دفن کے متعلق یہ اضافہ ہے۔

قتل کے بعد قابیل حیران تھا کہ اس نعش کا کیا کرے، ابھی تک نسل آدم موت سے دوچار نہیں ہوئی تھی اور اسی لیے حضرت آدم علیہ السلام نے مردے کے بارہ میں کوئی حکم الٰہی نہیں سنایا تھا، یکایک اس نے دیکھا کہ ایک کوے نے زمین کرید کرید کر گڑھا کھودا،

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۹۳

قابیل کو تنبہ ہوا کہ مجھے بھی اپنے بھائی کے لیے اسی طرح گڑھا کھودنا چاہیے اور بعض روایات میں ہے کہ کوّے نے دوسرے مردہ کوّے کو اس گڑھے میں چھپا دیا۔

قابیل نے یہ دیکھا تو اپنی ناکارہ زندگی پر بے حد افسوس کیا اور کہنے لگا کہ میں اس حیوان سے بھی گیا گزرا ہوں کہ اپنے اس جرم کو چھپانے کی بھی اہلیت نہیں رکھتا، ندامت سے سر جھکا لیا اور پھر اسی طرح اپنے بھائی کی نعش کو سپرد خاک کر دیا۔

﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۝ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ ﴾ (المائدہ: ۲۷-۳۲)

"اور سنا ان کو حال واقعی آدم کے دو بیٹوں کا جب نذر کی دونوں نے کچھ نذر اور مقبول ہوئی ایک کی اور نہ مقبول ہوئی دوسرے کی، کہا: میں تجھ کو مار ڈالوں گا، وہ بولا اللہ قبول کرتا ہے پرہیزگاروں سے، اگر تو ہاتھ چلائے گا مجھ پر مارنے کو میں نہ ہاتھ چلاؤں گا تجھ پر مارنے کو، میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو پروردگار ہے سب جہان کا، میں چاہتا ہوں کہ (اس اقدام پر) تو میرا گناہ بھی حاصل کر لے، اور اپنا گناہ بھی، پھر ہو جائے تو دوزخ والوں میں سے اور یہی سزا ہے ظالموں کی، پس اس کو راضی کیا اس کے نفس نے خون پر اپنے بھائی کے پھر اس کو مار ڈالا۔ سو ہو گیا نقصان اٹھانے والوں میں، پھر بھیجا اللہ نے ایک کوا جو کریدتا تھا زمین کو تاکہ اس کو دکھلا دے کس طرح چھپاتا ہے لاش اپنے بھائی کی، بولا ہائے افسوس مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اس کوّے جیسا ہی ہوتا کہ چھپا لیتا لاش اپنے بھائی کی، پھر لگا پچھتانے۔"

اسی سبب سے لکھا ہم نے، بنی اسرائیل پر کہ جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے یا بغرض فساد کرنے کے ملک میں تو گویا قتل کر ڈالا ان سب لوگوں کو اور جس نے زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ کر دیا سب لوگوں کو۔"

امام احمد نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک روایت کی ہے:

((قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تقتل نفس ظلما الا کان علی ابن آدم الاول کفل من دمها لانه کان اول من سن القتل)) (مسند احمد)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا میں جب بھی کوئی ظلم سے قتل ہوتا ہے تو اس کا گناہ حضرت آدم علیہ السلام کے پہلے بیٹے

(قابیل) کی گردن پر ضرور ہوتا ہے اس لیے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ظالمانہ قتل کی ابتداء کی اور یہ ناپاک سنت جاری کی۔"

دمشق کے شمال میں جبل قاسیون پر ایک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے جو مقتل ہابیل کے نام سے مشہور ہے، اور اس کے متعلق ابن عساکر نے احمد بن کثیر کے تذکرہ میں ان کا ایک خواب نقل کیا ہے جس میں مذکور ہے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا اور آپ ﷺ کے ساتھ ہابیل بھی تھے، ہابیل نے بقسم کہا کہ میرا مقتل یہی ہے اور آپ نے ان کے قول کی تصدیق فرمائی، بہرحال یہ خواب ہی کی باتیں ہیں اور خواب کے سچے ہونے کے باوجود بھی اس سے کوئی شرعی یا تاریخی حکم ثابت نہیں ہوسکتا۔

مقامِ عبرت:

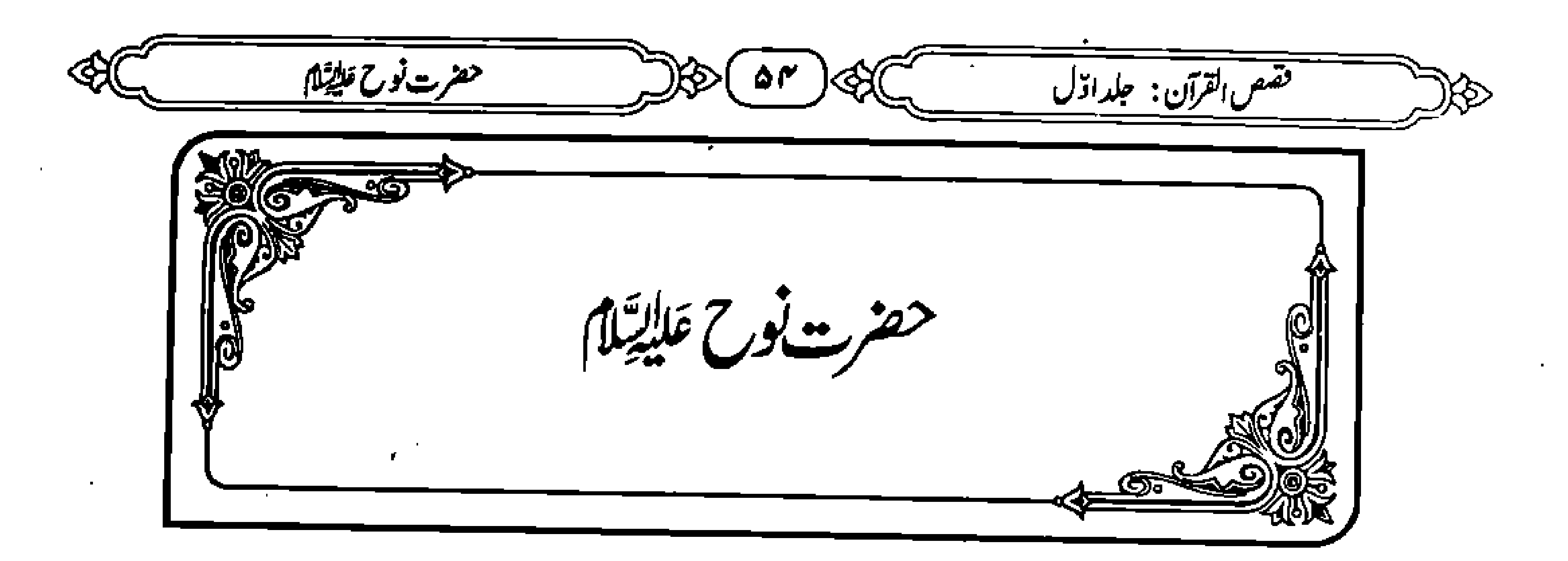
سورۂ مائدہ کی بیان کردہ آخری آیت اور مسطورہ بالا حدیث ہم پر یہ حقیقت آشکارا کرتی ہے کہ انسان کو اپنی زندگی میں ہرگز کسی گناہ کی ایجاد نہ کرنی چاہیے تاکہ وہ کل کو بدکاروں اور ظالموں کے لیے ایک نئے حربہ کا کام نہ دے، ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ کائنات میں جو شخص بھی آئندہ اس "بدعت" کا اقدام کرے گا تو بانی بدعت بھی برابر اس گناہ کا حصہ دار بنتا رہے گا اور موجد ہونے کی وجہ سے ابدی ذلت وخسران کا مستحق ٹھہرے گا، گناہ بہرحال گناہ ہے لیکن گناہ کی ایجاد موجد کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کا وبال سر سے باندھ دیتی ہے۔ (نعوذ باللہ من ذلک)

② ہابیل خدائے تعالیٰ کا مقبول بندہ تھا اور قابیل بارگاہ الٰہی کا راندہ ہوا، اس لیے ضرورت تھی کہ ہابیل کے پاک جسم کی توہین نہ ہو، اور نسل آدم کی کرامت و بزرگی قائم رکھنے کے لیے بعد مردن "تدفین" کی سنت قائم ہو جائے اور تقاضائے انصاف تھا کہ قابیل کی اس کمینہ حرکت پر اس کو دنیا میں بھی ذلیل کیا جائے، اور اس قابل بنا دیا جائے کہ خود اس کو اپنی بے مائیگی عقل و دانش اور کمینگی کا احساس ہو جائے ان لیے نہ اس کو الہام بخشا گیا اور نہ اس کمینہ حرکت کو چھپانے کے لیے عقل کی روشنی عطا کی گئی بلکہ ایک ایسے حیوان کو اس کا رہنما بنایا گیا جو عیاری و مکاری میں طاق اور دنائت طبع میں ضرب المثل ہے، اور آخر کار قابیل کو یہ کہتے ہی بنا۔

﴿يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ﴾ (المائدہ:۳۱)

"ہائے افسوس! کیا میں ایسا گیا گزرا ہوگیا کہ اس کوّے جیسا بھی نہ بن سکا۔"

نوٹ: ارباب سیر و تاریخ کی عام روش یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر کرتے ہیں، اور حضرت نوح علیہ السلام کا اس کے بعد، مگر ہم نے ان اختلافات کے پیش نظر جو حضرت ادریس علیہ السلام سے متعلق عنقریب ذکر ہونے والے ہیں عام روش کے خلاف ان کا تذکرہ حضرت نوح علیہ السلام کے تذکرہ کے بعد کیا ہے، تاہم جن ارباب ذوق کو یہ گراں گزرے وہ حضرت آدم علیہ السلام کے تذکرہ کے بعد حضرت ادریس علیہ السلام کے تذکرہ کا مطالعہ کریں اور پھر حضرت نوح علیہ السلام کا۔



حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں:

حضرت آدم علیہ السلام کے بعد یہ پہلے نبی ہیں جن کو "رسالت" [1] سے نوازا گیا۔صحیح مسلم باب شفاعت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت ہے، اس میں یہ تصریح ہے:

یا نوح انت اوّل الرسل الی الارض.

"اے نوح تو زمین پر سب سے پہلا رسول بنایا گیا۔"

نسب نامہ:

علم الانساب کے ماہرین نے حضرت نوح علیہ السلام کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے۔نوح بن لامک بن متوشالح بن اخنوخ یا خنوح بن یارد بن مہللیل بن قینان بن انوش بن شیث (علیہ السلام) بن آدم (علیہ السلام)۔

اگرچہ مؤرخین اور تورات (سفر تکوین) نے اسی کو صحیح مانا ہے لیکن ہم کو اس کی صحت میں شک اور تردد ہے، بلکہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان ان بیان کردہ سلسلوں سے زیادہ سلسلے ہیں، تورات میں خلق آدم علیہ السلام اور ولادت حضرت نوح علیہ السلام نیز وفات آدم اور ولادت نوح علیہ السلام کی درمیانی مدت کا جو تذکرہ ہے ہم اس کو بھی نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں، البتہ یہ بات پیش نظر رہے کہ تورات کے عبرانی، سامی اور یونانی زبان کے نسخوں میں بہت زیادہ اختلاف ہے اور اس مبحث پر علامہ شیخ مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی ہندی قدس سرہ (کیرانہ ضلع مظفر نگر) کی مشہور کتاب "اظہار حق" قابل مطالعہ ہے، بہر حال تورات سے منقول نقشہ حسب ذیل ہے:

[1] جس انسان پر خدا کی "وحی" نازل ہوتی ہے وہ "نبی" ہے اور جس کو جدید شریعت بھی عطا کی گئی ہو وہ "رسول" ہے۔

نقشہ نمبر ۱

سال	عمر بوقت ولادت پسر
۱۳۰	آدم علیہ السلام بوقت ولادت شیث علیہ السلام
۱۵۰	شیث علیہ السلام بوقت ولادت انوش
۹۰	انوش بوقت ولادت قینان
۷۰	قینان بوقت ولادت مہلیل
۶۵	مہلیل بوقت ولادت یارد
۱۶۲	یارد بوقت ولادت اخنوخ
۶۵	اخنوخ بوقت ولادت متوشالح
۱۸۷	متوشالح بوقت ولادت لامک
۱۸۲	لامک بوقت ولادت نوح علیہ السلام

نقشہ نمبر ۲

مدت درمیان خلق آدم علیہ السلام وولادت نوح علیہ السلام	۱۰۵۶
عمر آدم علیہ السلام ولادت نوح علیہ السلام	۹۳۰
مدت درمیان وفات آدم علیہ السلام وولادت نوح علیہ السلام	۱۰۲۶

آپ اگر ان دونوں نقشوں کے درمیان حسابی مطابقت کرنا چاہیں تو کامیاب نہ ہوسکیں گے اس لیے کہ سطور بالا سے یہ قت واضح ہو چکی ہے کہ یہ سب تخمین وظن پر مبنی ہے اور اسی وجہ سے اس مسئلہ میں تورات کے مختلف نسخوں میں بھی کافی اختلاف و ار پایا جاتا ہے۔

ان عزیز میں حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ:

قرآن عزیز کے معجز نما نظم کلام کی یہ سنت ہے کہ وہ تاریخی واقعات میں سے جب کسی واقعہ کو بیان کرتا ہے تو اپنے "مقصد وتذکیر" کے پیش نظر واقعہ کی ان ہی جزئیات کو نقل کرتا ہے جو مقصد کے لیے ضروری ہیں اور اجمال وتفصیل اور تکرار واقعہ میں بھی ایک ہی مقصد اس کے سامنے ہوتا ہے اور وہ یہی "موعظت وعبرت" کا مقصد ہے، چنانچہ اسی اسلوب بیان کے مطابق قرآن نے حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کا اجمالی وتفصیلی ذکر تینتالیس (۴۳) جگہ کیا ہے، جس کا ثبوت مسطورۂ ذیل جدول سے ہوتا ہے۔

نام سورت	آیات	نام سورت	آیات	نام سورت	آیات
آل عمران	۳۳	مریم	۵۸	غافر	۵_۳۱
النساء	۱۶۳	الانبیاء	۷۶	الشوریٰ	۱۳
انعام	۸۴	الحج	۴۲	قٓ	۱۲
اعراف	۵۹_۶۹	المومنون	۲۳	الذاریات	۴۶
التوبہ	۷۰	الفرقان	۳۷	النجم	۵۲
یونس	۷۱	الشعراء	۱۰۵_۱۰۶_۱۱۶	القمر	۹
ھود	۲۵_۳۲_۳۶_۴۲	العنکبوت	۱۴	الحدید	۲۶
	۴۵_۴۶_۴۸_۸۹	الاحزاب	۱۰	التحریم	۹
ابراہیم	۷	الصافات	۱_۲۱_۲۶	نوح	۳_۱۷
الاسراء	۷۵_۷۹	صٓ	۱۲		

لیکن اس واقعہ کی اہم تفصیلات صرف سورۂ اعراف، ہود، مومنون، شعراء، قمر، اور سورۂ نوح ہی میں بیان ہوئی ہیں، ان سے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے متعلق جس قسم کی تاریخ بنتی ہے وہی ہمارا موضوع بیان ہے۔

قوم نوح علیہ السلام:

حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے تمام قوم خدا کی توحید اور صحیح مذہبی روشنی سے یکسر ناآشنا ہو چکی تھی اور حقیقی خدا کی جگہ خود ساختہ بتوں نے لے لی تھی، غیر اللہ کی پرستش اور اصنام پرستی ان کا شعار تھا۔

دعوت و تبلیغ اور قوم کی نافرمانی:

آخر سنت اللہ کے مطابق ان کے رشد و ہدایت کے لیے بھی ان ہی میں سے ایک ہادی اور خدا کے سچے رسول نوح علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو راہ حق کی طرف پکارا اور سچے مذہب کی دعوت دی، لیکن قوم نے نہ مانا اور نفرت و حقارت کے ساتھ انکار پر اصرار کیا، امراء اور رؤساء قوم نے ان کی تکذیب و تحقیر کا کوئی پہلو نہ چھوڑا اور ان کے پیروؤں نے ان ہی کی تقلید و پیروی کے ثبوت میں ہر قسم کی تذلیل و توہین کے طریقوں کو حضرت نوح علیہ السلام پر آزمایا، انہوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ جس کو نہ ہم پر دولت و ثروت میں برتری حاصل ہے اور نہ وہ انسانیت کے رتبہ سے بلند "فرشتہ ہیکل" ہے، اس کو کیا حق ہے کہ وہ ہمارا پیشواء بنے، اور ہم اس کے احکام کی تعمیل کریں؟

وہ غریب اور کمزور افراد قوم کو جب حضرت نوح علیہ السلام کا تابع اور پیرو دیکھتے تو مغرورانہ انداز میں حقارت سے کہتے "ہم ان کی طرح نہیں ہیں کہ تیرے تابع فرمان بن جائیں اور تجھ کو اپنا مقتدا مان لیں" وہ سمجھتے تھے کہ یہ کمزور اور پست لوگ نوح کے اندر

مقلد ہیں، نہ یہ ذی رائے ہیں کہ ہماری طرح اپنی جانچی پرکھی رائے سے کام لیتے اور نہ ذی شعور ہیں کہ حقیقت حال کو سمجھ لیتے، اور اگر وہ حضرت نوح علیہ السلام کی بات کی طرف کبھی توجہ بھی دیتے تو ان سے اصرار کرتے کہ پہلے ان پست اور غریب افراد قوم کو اپنے پاس سے نکال دے تب ہم تیری بات سنیں گے کیونکہ ہم کو ان سے گھن آتی ہے اور ہم اور یہ ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتے۔

حضرت نوح علیہ السلام اس کا ایک ہی جواب دیتے کہ ایسا کبھی نہ ہوگا کیونکہ یہ خدا کے مخلص بندے ہیں۔ اگر میں ان کے ساتھ ایسا معاملہ کروں جس کے تم خواہش مند ہو تو خدا کے عذاب سے میرے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ میں اس کے دردناک عذاب سے ڈرتا ہوں، اس کے یہاں اخلاص کی قدر ہے، امیر و غریب کا وہاں کوئی سوال نہیں ہے۔ نیز ارشاد فرماتے کہ میں تمہارے پاس خدا کی ہدایت کا پیغام لے کر آیا ہوں، نہ میں نے غیب دانی کا دعویٰ کیا ہے اور نہ فرشتہ ہونے کا، خدا کا برگزیدہ پیغمبر اور رسول ہوں اور دعوت و ارشاد میرا مقصد و نصب العین ہے، اس کو سرمایہ دارانہ بلندی، غیب دانی، یا فرشتہ ہیکل ہونے سے کیا واسطہ؟ یہ کمزور و نادار افراد قوم جو خدا پر سچے دل سے ایمان لائے ہیں تمہاری نگاہ میں اس لیے حقیر و ذلیل ہیں کہ وہ تمہاری طرح صاحب دولت و مال نہیں ہیں اور اسی لیے تمہارے خیال میں یہ نہ خیر حاصل کر سکتے ہیں اور نہ سعادت، کیونکہ یہ دونوں چیزیں دولت و حشمت کے ساتھ ہیں نہ کہ نکبت و افلاس کے ساتھ۔

سو واضح رہے کہ خدا کی سعادت و خیر کا قانون ظاہری دولت و حشمت کے تابع نہیں ہے اور نہ اس کے یہاں سعادت و ہدایت کا حصول و ادراک سرمایہ کی رونق کے زیر اثر ہے بلکہ اس کے برعکس طمانیت نفس، رضاء الٰہی، غناء قلب اور اخلاص نیت و عمل پر موقوف ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے یہ بھی بارہا تنبیہ کی کہ مجھ کو اپنی اس ابلاغ دعوت و ارسال ہدایت میں نہ تمہارے مال کی خواہش ہے نہ جاہ و منصب کی، میں اجرت کا طلبگار نہیں ہوں، اس خدمت کا حقیقی اجر و ثواب تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، اور وہی بہترین قدردان ہے۔ غرض سورۂ ہود حق و تبلیغ کے ان تمام مکالموں، مناظروں اور پیغامات حق کے ان ہی ارشادات عالیہ کا ایک غیر فانی ذخیرہ ہے۔

﴿فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَ مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝ وَ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ لٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝ وَ يٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ لَاۤ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّ لَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْۤ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۚ

اِنِّیْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۱﴾ (ھود: ۲۷-۳۱)

"اس پر قوم کے ان سرداروں نے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی کہا: "ہم تو تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں ان میں بھی ان لوگوں کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا جو ہم میں ذلیل وحقیر ہیں اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو لیے ہیں ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے، بلکہ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو" نوح علیہ السلام نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن پر ہوں، اور اس نے اپنے حضور سے ایک رحمت بھی مجھے بخش دی ہو (یعنی راہ حق دکھا دی ہو) مگر وہ تمہیں دکھائی نہ دے (تو میں اس کے سوا کیا کر سکتا ہوں جو کر رہا ہوں؟) کیا ہم جبراً تمہیں راہ دکھا دیں، حالانکہ تم اس سے بیزار ہو، لوگو! یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں تو اس پر مال و دولت کا تم سے طالب نہیں، میری خدمت کی مزدوری جو کچھ ہے، صرف اللہ پر ہے، اور یہ بھی سمجھ لو کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں (وہ تمہاری نظروں میں کتنے ہی ذلیل ہوں مگر) میں ایسا کرنے والا نہیں کہ اپنے پاس سے انہیں ہنکا دوں انہیں بھی اپنے پروردگار سے (ایک دن) ملنا ہے (اور وہ ہم سب کے اعمال کا حساب لینے والا ہے) لیکن (میں تمہیں سمجھاؤں تو کس طرح سمجھاؤں) میں دیکھتا ہوں کہ تم ایک جماعت ہو (حقیقت سے) جاہل اے میری قوم کے لوگو! مجھے بتاؤ، اگر میں ان لوگوں کو اپنے پاس سے نکال باہر کروں (اور اللہ کی طرف سے مواخذہ ہو جس کے نزدیک معیار قبولیت ایمان وعمل ہے، نہ تمہاری گھڑی ہوئی شرافت ورذالت تو اللہ کے مقابلہ میں کون ہے جو میری مدد کرے گا؟ (افسوس تم پر) کیا تم غور نہیں کرتے؟ اور دیکھو، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں، نہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں، میں یہ بھی نہیں کہتا کہ جن لوگوں کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو، اللہ انہیں بھلائی نہیں دے گا (جیسا کہ تمہارا اعتقاد ہے) اللہ ہی بہتر جانتا ہے جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں ہے، اگر میں تمہاری خواہش کے مطابق ایسا کہوں، تو جونہی ایسی بات کہی، میں ظالموں میں سے ہو گیا!"

بہر حال حضرت نوح علیہ السلام نے انتہائی کوشش کی کہ بدبخت قوم سمجھ جائے اور رحمت الٰہی کی آغوش میں آ جائے مگر قوم نے نہ مانا اور جس قدر اس جانب سے تبلیغ حق میں جدوجہد ہوئی اسی قدر قوم کی جانب سے بغض وعناد میں سرگرمی کا اظہار ہوا، اور ایذا رسانی اور تکلیف دہی کے تمام وسائل کا استعمال کیا گیا اور ان کے بڑوں نے عوام سے صاف صاف کہہ دیا کہ تم کسی طرح ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر جیسے بتوں کی پرستش کو نہ چھوڑو۔ یہی وہ مباحث ہیں جن کو سورۂ نوح میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور جو بلاشبہ ہدایت و ضلالت کے مہم مسائل کو آشکارا کرتے ہیں۔

﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲﴾ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۳﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ

لَيْلًا وَّنَهَارًا ۝ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا ۝ وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّيْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝﴾ (نوح: ۱۔۱۰)

"ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف کہ ڈرا اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ پہنچے ان پر عذاب دردناک، بولا اے قوم میری میں تم کو ڈر سناتا ہوں کھول کر کہ بندگی کرو اللہ کی اور اس سے ڈرو اور میرا کہا مانو تا کہ بخشے وہ تم کو کچھ گناہ تمہارے اور ڈھیل دے تم کو ایک مقررہ وعدہ تک، وہ جو وعدہ کیا ہے اللہ نے، جب آپہنچے گا اس کو ڈھیل نہ ہوگی اگر تم کو سمجھ ہے، بولا اے رب میں بلاتا رہا اپنی قوم کو رات اور دن، پھر میرے بلانے سے اور زیادہ بھاگنے لگے، اور میں نے جب کبھی ان کو بلایا تا کہ تو ان کو بخشے، ڈالنے لگے انگلیاں اپنے کانوں میں اور لپیٹنے لگے اپنے اوپر کپڑے، اور ضد کی اور غرور کیا بڑا غرور، پھر میں نے ان کو بلایا برملا، پھر میں نے ان کو کھول کر کہا اور چھپ کر کہا چپکے سے تو میں نے کہا گناہ بخشواؤ اپنے رب سے بیشک وہ ہے بخشنے والا۔"

﴿وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ڏ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۝﴾ (نوح: ۲۳)

"اور انہوں نے (اپنے عوام سے) کہا ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑو اور ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو نہ چھوڑو۔"

اور آخر میں زچ ہو کر کہنے لگے: "اے نوح علیہ السلام! اب ہم سے جنگ وجدل نہ کر اور ہمارے اس انکار پر اپنے خدا کا جو عذاب لا سکتا ہے لے آ۔"

﴿قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝﴾ (ھود: ۳۲)

"وہ کہنے لگے: "اے نوح (علیہ السلام) تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑا کیا" اب اس کو ختم کر" اور جو تو نے ہم سے (عذاب الٰہی کا) وعدہ کیا ہے وہ لے آ"۔

حضرت نوح علیہ السلام نے یہ سن کر ان کو جواب دیا کہ عذاب الٰہی میرے قبضہ میں نہیں ہے وہ تو اس کے قبضہ میں ہے جس نے مجھ کو رسول بنا کر بھیجا ہے، وہ چاہے گا تو یہ سب کچھ بھی ہو جائے گا۔

﴿قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝﴾ (ھود: ۳۳)

"نوح نے کہا ضرور اگر اللہ چاہے گا تو اس عذاب کو بھی لے آئے گا اور تم اس کو تھکا دینے والے نہیں ہو"۔

بہر حال جب قوم کی ہدایت سے حضرت نوح علیہ السلام بالکل مایوس ہو گئے اور اس کی باطل کوشی اور عناد اور ہٹ دھرمی ان پر واضح ہو گئی اور قرآنی تصریح کے مطابق ساڑھے نو سو سال کی پیہم دعوت وتبلیغ کا ان پر کوئی اثر نہ دیکھا تو سخت ملول اور پریشان خاطر ہوئے تب خدائے تعالیٰ نے ان کی تسلی کے لیے فرمایا:

﴿وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝﴾ (ھود: ۳۶)

"اور نوح (علیہ السلام) پر وحی کی گئی کہ جو ایمان لے آئے وہ لے آئے اب ان میں سے کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے پس ان کی حرکات پر غم نہ کر۔"

جب حضرت نوح علیہ السلام کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے ابلاغ حق میں کوتاہی نہیں ہے بلکہ خود نہ ماننے والوں کی استعداد کا قصور ہے، اور ان کی اپنی سرکشی کا نتیجہ، تب ان کے اعمال اور کمینہ حرکات سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں یہ دعا فرمائی۔

﴿وَ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝﴾ (نوح: ۲۶۔۲۷)

"کہا نوح علیہ السلام نے: "اے پروردگار تو کافروں میں سے کسی کو بھی زمین پر باقی نہ چھوڑ اگر تو ان کو یونہی چھوڑ دے گا تو یہ تیرے بندوں کو بھی گمراہ کریں گے اور ان کی نسل بھی انہی کی طرح نافرمان پیدا ہوگی۔"

بناء سفینہ:

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی، اور اپنے قانون جزاء اعمال کے مطابق سرکشوں کی سرکشی اور متمردوں کے تمرد کی سزا کا اعلان کر دیا، اور حفظ ماتقدم کے لیے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کو ہدایت فرمائی کہ وہ ایک کشتی تیار کریں، تاکہ اسباب ظاہری کے اعتبار سے وہ اور مومنین قانتین اس عذاب سے محفوظ رہیں، جو خدا کے نافرمانوں پر نازل ہونے والا ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے جب حکم رب میں کشتی بنانی شروع کی تو کفار نے ہنسی اڑانا اور مذاق بنانا شروع کر دیا۔ اور جب کبھی ان کا ادھر سے گزر ہوتا تو کہتے کہ "خوب! جب ہم غرق ہونے لگیں گے تب تو اور تیرے پیرو اس کشتی میں محفوظ رہ کر نجات پا جائیں گے، کیسا احمقانہ خیال ہے" حضرت نوح علیہ السلام بھی ان کو انجام کار سے غفلت اور خدا کی نافرمانی پر جرأت دیکھ کر ان ہی کے طرز پر جواب دیتے اور اپنے کام میں مشغول رہتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

﴿وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝﴾ (ھود: ۳۷)

"اے نوح تو ہماری حفاظت میں ہماری وحی کے مطابق سفینہ تیار کئے جا اور اب مجھ سے ان کے متعلق کچھ نہ کہو، یہ بلاشبہ غرق ہونے والے ہیں۔"

آخر سفینہ نوح (علیہ السلام) بن کر تیار ہو گیا۔ اب خدا کے وعدۂ عذاب کا وقت قریب آیا اور حضرت نوح علیہ السلام نے اس پہلی علامت کو دیکھا جس کا ذکر ان سے کیا گیا تھا، یعنی زمین کی تہہ میں سے پانی کا چشمہ ابلنا شروع ہو گیا۔ تب وحی الٰہی نے ان کو حکم سنایا کہ کشتی میں اپنے خاندان کو بیٹھنے کا حکم دو اور تمام جانداروں میں سے ہر ایک کا جوڑا بھی کشتی میں پناہ گیر ہو، اور وہ مختصر جماعت (تقریباً چالیس نفر) بھی جو تجھ پر ایمان لا چکی ہے کشتی میں سوار ہو جائے۔

جب وحی الٰہی کی تعمیل پوری ہو گئی تو اب آسمان کو حکم ہوا کہ پانی برسنا شروع ہو، اور زمین کے چشموں کو امر کیا گیا کہ وہ پوری طرح اُبل پڑیں۔ خدا کے حکم سے جب یہ سب کچھ ہوتا رہا تو کشتی بھی اس کی حفاظت میں پانی پر ایک مدت تک محفوظ تیرتی رہی

تا آنکہ تمام منکرین و معاندین غرق آب ہو گئے اور خدائے تعالیٰ کے قانون "جزاء اعمال" کے مطابق اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے۔

پسر نوح علیہ السلام:

اس مقام پر ایک مسئلہ خاص طور پر قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے طوفانی عذاب کے وقت خدائے تعالیٰ سے اپنے بیٹے کی نجات کے متعلق سفارش کی اور خدائے تعالیٰ نے ان کو اس سفارش سے روک دیا، اس مسئلہ کی اہمیت قرآن عزیز کی حسب ذیل آیات سے پیدا ہوتی ہے۔

﴿وَ نَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ۝ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَ تَرْحَمْنِیْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَیْكَ وَ عَلٰۤی اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ﴾ (ہود: ۴۵-۴۸)

"اور نوح (علیہ السلام) نے اپنے رب کو پکارا اور کہا اے پروردگار میرا بیٹا میرے اہل ہی میں سے ہے، اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو بہترین حاکموں میں سے ہے، اللہ تعالیٰ نے کہا اے نوح! یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے، یہ بد کردار ہے، پس تجھ کو ایسا سوال نہ کرنا چاہیے جس کے بارہ میں تجھ کو علم نہ ہو، میں بلا شبہ تجھ کو نصیحت کرتا ہوں کہ تو نادانوں میں سے نہ بن، نوح نے کہا: "اے رب میں بلا تردد" اس بارہ میں کہ جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو تجھ سے سوال کروں تیری پناہ چاہتا ہوں اور اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ کیا تو میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوں گا۔ نوح علیہ السلام سے کہہ دیا گیا: "اے نوح (علیہ السلام)! ہماری جانب سے تو اور تیرے ہمراہی ہماری سلامتی اور برکتوں کے ساتھ زمین پر اترو"۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے خدا کا وعدہ تھا کہ وہ ان کے اہل کو نجات دے گا، اس لیے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے (کنعان) کے لیے دعا مانگی جس پر رب العالمین کی جانب سے عتاب ہوا کہ تم کو جس شئے کا علم نہ ہو اس کے متعلق اس طرز سے سوال کرنے کا حق نہیں ہے اس پر حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور خدائے تعالیٰ سے مغفرت و رحمت طلب کی اور اس کی جانب سے بھی خواہش کے مطابق جواب ملا۔

تو اب غور طلب بات یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا سوال کس وعدہ پر مبنی تھا؟ اور آیا وہ وعدہ پورا ہوا یا نہیں اور حضرت نوح علیہ السلام کو اس وعدہ کے سمجھنے میں کس قسم کی غلط فہمی ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی تنبیہ پر انہوں نے کس طرح اصل حقیقت کو سمجھ لیا؟

اس سوال کے جواب میں حسب ذیل آیت قابل توجہ ہے۔

﴿حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ ۝﴾ (ہود: ۴۰)

”تا آنکہ جب ہمارا حکم (عذاب) آ پہنچا اور تنور سے پانی اُبل پڑا تو ہم نے (نوح سے) کہا کہ ”ہر جاندار میں سے ایک ایک جوڑا کشتی میں اٹھا لو اور اس کے علاوہ جس پر خدا کا فرمان ناطق ہو چکا ہے“ اپنے اہل کو بھی اور جو تجھ پر ایمان لائے ہیں ان کو بھی اور وہ بہت تھوڑے ہیں“۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے حق تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ تم اپنی اس کشتی میں جو اہل نجات کے لیے تیار کی گئی ہے اپنے اہل کو بٹھاؤ لیکن تمہارا پورا کنبہ نجات یافتہ نہیں ہے بلکہ بعض ایسے بھی ہیں جن پر خدا کے عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے“ الا من سبق علیہ القول“۔

چونکہ حضرت نوح علیہ السلام اپنی بیوی کے سابقہ کافرانہ عقائد و اعمال کی بنا پر اس بات سے مایوس ہو چکے تھے کہ وہ خدائے برحق پر ایمان لائے اور توحید کی آواز پر لبیک کہے! اس لیے اس استثناء کا مصداق صرف اسی کو سمجھے اور بیٹے کی محبت میں یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ نوعمر ہے شاید کشتی میں مومنین کی صحبت سے فائدہ اٹھا کر ایمان لے آئے اور کافروں کی مجالس کے اثرات کو محو کر دے، خدائے تعالیٰ کے ارشاد ﴿وَ اَهْلَكَ﴾ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے درگاہِ الٰہی میں کنعان کی نجات کی دعا کی، مگر اللہ تعالیٰ کو اپنے جلیل القدر پیغمبر کا یہ ”قیاس“ پسند نہ آیا اور ان کو تنبیہ کی کہ جو ہستی خدا کی ”وحی“ سے ہر وقت مستفیض ہوتی رہتی ہو اس کو جذبہ محبت پدری میں اس قدر سرشار نہ ہونا چاہیے کہ وحی الٰہی کا انتظار کئے بغیر خود ہی قیاس آرائی کر کے انجام تک کا فیصلہ کر بیٹھے؟ حالانکہ وعدہ نجات صرف مومنین کے لیے مخصوص ہے اور کنعان کافروں کے ساتھ کافر ہی رہے گا، بلاشبہ تمہارا اس قسم کا سوال منصب رسالت و نبوت کے شایان شان نہیں ہے۔

گویا حضرت نوح علیہ السلام سے خدائے تعالیٰ کا یہ خطاب دراصل عتاب نہیں تھا بلکہ مشاہدۂ حقیقت کے لیے ایک پکار تھی جس کو انہوں نے سنا اور اپنی بشریت و عبدیت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ مغفرت کے طالب ہوئے اور خدا کی سلامتی اور برکت حاصل کر کے شاد کام و بامراد بنے، پس یہ سوال نہ معصیت کا سوال تھا اور نہ عصمت انبیاء کے منافی، اس لیے خطاب الٰہی نے اس کو ”نادانی“ سے تعبیر کیا نہ کہ گناہ اور نافرمانی سے۔

بہر حال حضرت نوح علیہ السلام کے سامنے یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ وعدہ نجات کا منشاء نسل و خاندان نہیں ہے بلکہ ”ایمان باللہ“ ہے، اس لیے انہوں نے اپنا رخ بدل کر کنعان کو مخاطب کیا اور اپنا منصب دعوت ادا کرتے ہوئے چاہا کہ وہ بھی ”مومن“ بن کر ”نجات الٰہی“ سے بہرہ ور ہو، مگر اس بدبخت نے جواب دیا:

﴿قَالَ سَاٰوِیْۤ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ ؕ﴾ (ھود: ۴۳)

”میں بہت جلد کسی پہاڑ کی پناہ لیتا ہوں کہ وہ مجھ کو غرقابی سے بچالے گا“۔

حضرت نوح علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا:

﴿قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَیْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ ۝﴾ (ھود: ۴۳)

"آج کوئی خدا کے حکم سے بچانے والا نہیں ہے صرف وہی بچے گا جس پر خدا کا رحم ہو جائے اس دوران میں ان دونوں کے درمیان موج حائل ہو گئی اور وہ غرق ہونے والوں میں سے ایک ہو گیا"۔

کوہ جودی:

غرض جب حکم الٰہی سے عذاب ختم ہوا تو سفینہ نوح "جودی" پر جا کر ٹھہر گیا۔

﴿وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝﴾ (هود: ٤٤)

"اور حکم پورا ہوا اور کشتی جودی پر جا ٹھہری اور اعلان کر دیا گیا کہ قوم ظالمین کے لیے ہلاکت ہے"۔

توراۃ میں جودی کو اراراط کے پہاڑوں میں سے بتایا گیا ہے، اراراط درحقیقت جزیرہ کا نام ہے یعنی اس علاقہ کا نام جو فرات و دجلہ کے درمیان دیار بکر سے بغداد تک مسلسل چلا گیا ہے۔

پانی آہستہ آہستہ خشک ہونا شروع ہو گیا اور ساکنان کشتی نے دوسری بار امن و سلامتی کے ساتھ خدا کی سرزمین پر قدم رکھا، اسی بناء پر حضرت نوح علیہ السلام کا لقب "ابوالبشر ثانی" یا "آدم ثانی" (یعنی انسانوں کا دوسرا باپ) مشہور ہوا، اور غالباً اسی اعتبار سے حدیث میں ان کو "اول الرسل" کہا گیا۔

اگرچہ یہاں پہنچ کر واقعہ کی تفصیلات ختم ہو جاتی ہیں تاہم اس اہم واقعہ میں جو علمی اور تاریخی سوالات پیدا ہوتے ہیں یا پیدا کیے گئے ہیں وہ بھی قابل ذکر و مذاکرہ ہیں جو ترتیب وار درج ذیل ہیں۔

طوفان نوح علیہ السلام عام تھا یا خاص:

کیا طوفان نوح تمام کرۂ ارضی پر آیا تھا یا کسی خاص خطہ پر؟ اس کے متعلق علماء قدیم و جدید میں ہمیشہ سے دو رائیں رہی ہیں علمائے اسلام میں سے ایک جماعت علماء یہود و نصاریٰ، اور بعض ماہرین علوم فلکیات، طبقات الارض اور تاریخ طبیعات کی یہ رائے ہے کہ یہ طوفان تمام کرۂ ارضی پر نہیں آیا تھا بلکہ صرف اسی خطہ میں محدود تھا جہاں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم آباد تھی اور یہ علاقہ مساحت کے اعتبار سے ایک لاکھ چالیس ہزار کلومیٹر مربع ہوتا ہے۔

ان کے نزدیک طوفان نوح کے خاص ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ طوفان عام تھا تو اس کے آثار کرۂ ارضی کے مختلف گوشوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر ملنے چاہئیں تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، نیز اس زمانہ میں انسانی آبادی بہت ہی محدود تھی اور وہی خطہ تھا جہاں حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم آباد تھی ابھی حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کا سلسلہ اس سے زیادہ وسیع نہ ہوا تھا جو کہ اس علاقہ میں آباد تھا، لہٰذا وہی مستحق عذاب تھے اور ان ہی پر طوفان کا یہ عذاب بھیجا گیا، باقی کرۂ زمین کو اس سے کوئی علاقہ نہ تھا۔

اور بعض علماء اسلام اور ماہرین طبقات الارض اور علماء طبیعات کے نزدیک یہ طوفان تمام کرۂ ارضی پر حاوی تھا اور ایک یہ ہی نہیں بلکہ ان کے خیال میں اس زمین پر متعدد ایسے طوفان آئے ہیں، ان ہی میں سے ایک یہ بھی تھا اور وہ پہلی رائے کے تسلیم کرنے والوں کو "آثار" سے متعلق سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ "جزیرہ" یا عراق عرب کی اس سرزمین کے علاوہ بلند پہاڑوں پر بھی ایسے حیوانات کے ڈھانچے اور ہڈیاں بکثرت پائی گئی ہیں جن کے متعلق ماہرین علم طبقات الارض کی یہ رائے ہے کہ یہ حیوانات مائی ہی ہیں

اور صرف پانی ہی میں زندہ رہ سکتے ہیں، پانی سے باہر ایک لحہ بھی ان کی زندگی دشوار ہے، اس لیے کرۂ ارض کے مختلف پہاڑوں کی ان بلند چوٹیوں پر ان کا ثبوت اس کی دلیل ہے کہ کسی زمانہ میں پانی کا ایک ہیبت ناک طوفان آیا جس نے پہاڑوں کی ان چوٹیوں کو بھی اپنی غرقابی سے نہ چھوڑا۔

ان ہر دو خیالات و آراء کی ان تمام تفصیلات کے بعد جن کا مختصر خاکہ مضمون زیر بحث میں درج ہے اہل تحقیق کی یہ رائے ہے کہ صحیح مسلک یہی ہے کہ طوفان خاص تھا عام نہ تھا۔ اور یہ مسئلہ بھی محل نظر ہے کہ تمام کائنات انسانی صرف حضرت نوح علیہ السلام کی نسل سے ہے، اور آیت ﴿اِنْ تَذَرْهُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَكَ﴾ (نوح: ۲۷) بھی کچھ اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

البتہ قرآن عزیز نے "سنت اللہ" کے مطابق صرف ان ہی تفصیلات پر توجہ کی ہے جو موعظت و عبرت کے لیے ضروری تھے اور باقی مباحث سے قطعاً کوئی تعرض نہیں کیا اور ان کو انسانی علوم کی ترقی کے حوالہ کر دیا، وہ تو صرف یہ بتانا چاہتا ہے کہ تاریخ کا یہ واقعہ اہل عقل و شعور کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ آج سے ہزاروں سال قبل ایک قوم نے خدا کی نافرمانی پر اصرار کیا اور اس کے بھیجے ہوئے ہادی حضرت نوح علیہ السلام کے رشد و ہدایت کے پیغام کو جھٹلایا، ٹھکرایا، اور قبول کرنے سے انکار کر دیا تو خدائے تعالیٰ نے اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا اور ایسے سرکشوں اور متمردوں کو طوفان باد و باراں میں غرق کر کے تباہ و برباد کر دیا، اور اسی حالت میں حضرت نوح اور مختصر سی ایمان دار جماعت کو محفوظ رکھ کر نجات دی۔ ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَلْبَابِ﴾

پسر نوح (علیہ السلام) کی نسبی بحث:

بعض علماء نے حضرت نوح علیہ السلام کے اس بیٹے کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ حقیقی بیٹا نہ تھا اور پھر اس بارہ میں دو جدا جدا دعوے کئے ایک جماعت کہتی ہے کہ وہ "ربیب" تھا یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کے پہلے شوہر کا لڑکا تھا جو حضرت نوح علیہ السلام سے نکاح کے بعد ان کی آغوش میں پلا بڑھا، اور دوسری جماعت حضرت نوح علیہ السلام کی اس کافرہ بیوی پر خیانت عصمت کا الزام لگاتی ہے۔

ان علماء کو ان غیر مستند اور دور از صواب تاویلوں کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ ان کے خیال میں پیغمبر کا بیٹا کافر ہو، یہ بہت مستبعد اور عجیب معلوم ہوتا ہے؟

مگر تعجب ہے کہ وہ اس نص قرآنی کو کیوں فراموش کر جاتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ "آزر" بت تراش و بت پرست کافر تھے، پس اگر ایک جلیل القدر پیغمبر کے باپ کے کفر سے رسول خدا کی جلالت و عظمت اور منصب رسالت و نبوت میں مطلق فرق نہیں آتا تو پھر عظیم المرتبت رسول و نبی کے بیٹے کے کفر سے اس پیغمبر کی عظمت و جلالت قدر میں کیا نقص آ سکتا ہے بلکہ ایک حقیقت بین نگاہ اور حقیقت شناس کے نزدیک تو یہ رب العالمین اور خالق کائنات کی قدرت کاملہ کا مظہر اتم ہے کہ وہ بنجر زمین میں گلاب اُگا دیتا، اور گلاب کے مہکتے ہوئے پھولوں کے ساتھ خار پیدا کر دیتا ہے۔ ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ﴾

پس جبکہ قرآن عزیز نے یہ تصریح کی ہے کہ کنعان حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا تھا تو بلا وجہ ان رکیک اور بے سند تاویلات کی کیا حاجت؟

ایک اخلاقی مسئلہ:

اس مقام پر اگرچہ علامہ عبدالوہاب نجار نے قرآن عزیز کی تصریح ہی کو تسلیم کیا ہے، تاہم ان کے نزدیک حضرت نوح علیہ السلام

کی بیوی بصراحت قرآن اگر کافر ہوسکتی ہے تو اس پر خیانت عصمت کا الزام عائد کرنا بھی کوئی ناواجب بات نہیں ہے۔

مگر مجھ کو ان جیسے تمام مقامات میں ان بزرگوں سے ہمیشہ اختلاف رہتا ہے اور میں ورطۂ حیرت و تعجب میں پڑ جاتا ہوں کہ ان علماء کے پیش نظر "نبی و رسول" کے معاملہ میں ان تمام نزاکتوں کا لحاظ کیوں نہیں، جو اخلاق، معاشرت، اور تہذیب و تمدن کی زندگی سے وابستہ ہیں۔

مثلاً اسی مقام کو لیجئے کہ صاحب قصص الانبیاء اور بعض دوسرے علماء کہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی جب کافر ہوسکتی ہے تو خائن عصمت کیوں نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ دوسرا عمل پہلے سے کم درجہ رکھتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس کو تسلیم کر لینے کے باوجود کہ کفر زنا سے بہت زیادہ برا اور قبیح عمل ہے، مجھے اس سے سخت اختلاف ہے کہ کسی پیغمبر و نبی کی بیوی ان کے حبالۂ عقد میں رہتے ہوئے خائن عصمت ہو اور نبی و رسول اس کی اس حرکت سے غافل رہے، اس لیے کہ اگر کسی نیک اور صالح انسان کی بیوی شوہر سے چھپ کر اس قسم کی بدعملی میں مبتلاء ہو جائے تو یہ ممکن ہے کیونکہ وہ ناواقف رہ سکتا ہے اور جب تک اس کے علم میں یہ بدعملی نہ آئے اس کی ثقاہت و تقویٰ پر کوئی حرف نہیں آتا، مگر ایک نبی و رسول کا معاملہ اس سے جدا ہے، اس کے پاس صبح و شام خدائے برتر کی وحی آتی ہے اور وہ خدائے برتر کی ہمکلامی سے مشرف ہوتا ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی کے گھر میں ایک فاحشہ و زانیہ اس کی رفیق حیات بھی رہے اور خدا کی وحی اس سے قطعاً خاموش ہو۔

خدا کے برگزیدہ پیغمبر جب اصلاح و ہدایت کے لیے بھیجے جاتے ہیں تو ظاہری و باطنی ہر قسم کے عیوب سے معصوم اور پاک رکھے جاتے ہیں تاکہ کوئی ایک شخص بھی ان کے حسب و نسب اور اخلاق و معاشرت پر نکتہ چینی نہ کر سکے۔ لہٰذا یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ وحی الٰہی اور رب اکبر کی ہمکلامی کے مدعی کے گھر میں بداخلاقی کا جریمہ مستقل ہو رہا ہو اور اس کو بے خبر اور غافل چھوڑ دیا جائے۔

ہمارے سامنے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ دلیل راہ ہے، ان ہوئی کو ہوئی کرنے والوں اور بے پر کی اڑانے والوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سمع مبارک نے بھی سنا۔ چند روز بدبخت و خوش بخت بننے والوں کے لیے آزمائش کے بھی ملے۔ مگر آخر کار وحی الٰہی نے معاملہ کو اس طرح صاف کر دیا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر رہ گیا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ (العیاذ باللہ) پیغمبر اور نبی کی بیوی سے زنا سرزد ہو جائے کیونکہ وہ نبی کی طرح معصوم نہیں ہے لیکن یہ محال اور ناممکن ہے کہ اس ارتکاب کے بعد وہ نبی کی بیوی رہے اور وحی الٰہی نبی اور پیغمبر کو اس کی بداخلاقی سے غافل رکھے۔

کفر، بلاشبہ سب سے بڑا جریمہ اور گناہ ہے لیکن وہ معاشرتی اور اخلاقی بول چال میں بداخلاقی اور فحش نہیں ہے بلکہ ایک عقیدہ ہے جو عقیدۂ بد کہلانے کا مستحق ہے، اس لیے بعض اسلامی مصالح کی بناء پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل کی شریعتوں اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں کافر سے مناکحت کو ممنوع قرار نہیں دیا گیا البتہ مدنی زندگی کے دور میں قرآن عزیز کی نص نے مشرک و مسلم کے درمیان رشتۂ مناکحت کو ہمیشہ کے لیے ممنوع قرار دے دیا، لیکن زنا کسی حال اور کسی وقت میں بھی جائز نہیں رکھا گیا۔

پس اس معاملہ میں کفر و زنا کے تقابل کا سوال صحیح نہیں ہوسکتا بلکہ معاشرتی بدکرداری و نیک کرداری کی بقاء و قیام کا سوال پیدا ہوتا ہے لہٰذا میرے نزدیک حضرت نوح علیہ السلام کی زندگی پاک کے ساتھ زانیہ رفیقہ کا تعلق ناممکن تھا۔ اگر امراۃ نوح ایک مرتبہ بھی ایسا اقدام کرتی تو وحی الٰہی فوراً نبی کو مطلع کر کے تفریق کرا دیتی، یا کم از کم ﴿تَوْبَةً نَّصُوْحًا﴾ پر جا کر معاملہ ٹھہرتا۔ میں اس سے آگے بڑھ

کر یہ جرأت کرتا ہوں کہ اگر خدانہ کردہ کسی روایت میں بھی اس قسم کے معاملات کا اشارہ پایا جاتا تو بھی ہمارا فرض تھا کہ اس کی صحیح توجیہ تلاش کر کے اصل حقیقت کو سامنے لاتے، چہ جائیکہ نہ قرآن عزیز اس کے متعلق کچھ کہتا ہے اور نہ صحیح وضعیف روایات میں سے کوئی روایت حدیث وسیرت اس کا ذکر کرتی ہے تو پھر خواہ مخواہ اس قسم کی دور از کار تاویلات سے عوام ومتوسطین موافقین ومخالفین کے دل ودماغ پر غلط نقوش نقش کرنے سے بجز مضرت ونقصان کے اور کیا حاصل ہے۔

بہرحال صحیح یہی ہے کہ کنعان حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا تھا مگر اس پر حضرت نوح علیہ السلام کی ہدایت ورشد کی جگہ اپنی کافر والدہ کی آغوش تربیت اور خاندان وقوم کے ماحول نے برا اثر ڈالا، اور وہ نبی کا بیٹا ہونے کے باوجود کافر ہی رہا۔

پسر نوح بابداں بہ نشست خاندان نبوتش گم شد

نبی وپیغمبر کا کام فقط رشد وہدایت کا پیغام پہنچانا ہے۔ اولاد، بیوی، خاندان، قبیلہ اور قوم پر اس کو زبردستی عائد کرنا اور ان کے قلوب کو پلٹ دینا نہیں ہے۔

﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴾ (غاشیہ: ٢٢)

"تو ان (کافروں پر) مسلط نہیں کیا گیا۔"

﴿ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ﴾ (ق: ٤٥)

"اور تو ان کو (قبول حق کے لیے) مجبور نہیں کر سکتا۔"

ارباب تاریخ نے حضرت نوح علیہ السلام کے اس بیٹے کا نام کنعان بتایا، یہ تورات کی روایت کے مطابق ہے، قرآن عزیز اس کے نام کی صراحت سے ساکت ہے جو نفس واقعہ کے لیے غیر ضروری تھا۔

چند ضمنی مسائل:

① طوفان نوح علیہ السلام خاص حصہ زمین سے وابستہ رہا ہو یا تمام کرۂ زمین سے، مذاہب عالم کی تاریخ اور علم آثار ارض سے یہ قطعی ثابت ہو چکا ہے کہ یہ واقعہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے، اور اس کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ تورات کے علاوہ قدیم ہندو مذہب کی کتابوں میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے اور اگرچہ قرآن عزیز کے بیان کیے ہوئے سادہ اور صاف واقعات کے مقابلہ میں ان میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم نفس واقعہ کے اظہار میں یہ سب متفق نظر آتی ہیں۔

مولانا سید ابو نصر احمد حسین بھوپالی نے اپنی کتاب "تاریخ الادب الہندی" میں تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو نقل کیا ہے، جس کا عنوان ہے "برہمانا داو بانیشاء" اس میں حضرت نوح علیہ السلام کو مانو کہا گیا ہے، جس کے معنی "خدا کا بیٹا" یا "نسل انسانی کا جد اعلیٰ" بتائے جاتے ہیں۔

② قرآن عزیز نے صراحت کی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم میں ساڑھے نوسو (٩٥٠) سال تبلیغ ودعوت کا فرض انجام دیا۔

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا﴾ (عنکبوت : ۱۴)

"اور بلاشبہ ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اس کی قوم کی جانب رسول بنا کر بھیجا، پس وہ رہا ان میں پچاس کم ایک ہزار سال۔"

یہ عمر، موجودہ عمر طبعی کے اعتبار سے بعید از عقل معلوم ہوتی ہے لیکن محال اور ناممکن نہیں ہے اس لیے کہ کائنات کی ابتداء میں ہموم وافکار اور امراض کی یہ فراوانی نہیں تھی جو چند ہزار برسوں میں انسانی تمدن کے مصنوعی سامانوں نے پیدا کر دی ہے، اور تاریخ قدیم بھی یہ اقرار کرتی ہے کہ چند ہزار سال قبل کی طبعی عمر کا تناسب موجودہ تناسب سے بہت زیادہ تھا۔ نیز حضرت نوح علیہ السلام کی عمر طبعی کا معاملہ اسی قسم کی مستثنیات میں سے ہے جو انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں موہبت الٰہی اور آیت اللہ کی فہرست میں شمار ہوتی ہیں، اور جن کی حکمت وغایت کا معاملہ خود خدائے تعالیٰ کے سپرد ہے۔

قرآن عزیز نے کسی نبی اور پیغمبر کی دعوت وتبلیغ کی مدت کا صراحت کے ساتھ اس طرح تذکرہ نہیں فرمایا جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ میں مذکور ہے، لہٰذا آج تقریباً سات ہزار سال قبل کی طویل عمر کے تاریخی شواہد کے اعتبار سے اگر اس کو صحیح تسلیم کیا جائے، تو اس کی پوری گنجائش ہے اور اگر تاریخ کی ان شہادتوں کو غیر وقیع مان کر انکار کر دیا جائے تب بھی اس واقعہ کو مخصوص حالات کے زیر اثر ایک عطیہ الٰہی سمجھنا چاہیے جو رسول اور پیغمبر کی دعوت وتبلیغ کی حکمتوں سے وابستہ ہے، حق اور صحیح مسلک یہی ہے اور اس مدت کو گھٹانے کے لیے دور از کار تاویلات کی قطعاً ضرورت نہیں۔

مشہور شاعر ابو العلاء معری اپنے چند اشعار میں یہ بیان کرتا ہے کہ قدیم زمانہ میں یہ دستور تھا کہ لوگ سنہ، عام (سال) بول کر شہر (مہینہ) مراد لیا کرتے تھے، اس قول کے پیش نظر بعض مؤرخین کا یہ خیال ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغی خدمات کی عمر اسی سال ہوتی ہے اور ان کی کل عمر ڈیڑھ سو سال سے آگے نہیں بڑھتی۔

لیکن یہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اگر ابو العلاء کا یہ قول تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ عرب کے کسی غیر معروف حساب کا تذکرہ سمجھا جائے گا کیونکہ قرآن عزیز کے نزول کے وقت عرب کے کسی قبیلہ کے متعلق یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ (سنہ) یا عام بول کر (شہر مہینہ) مراد لیا کرتے تھے لہٰذا قرآن عزیز کی بیان کردہ تعبیر پر اس قول کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔

نیز سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ قرآن عزیز نے جس انداز میں اس مدت کا ذکر کیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نوح علیہ السلام کی غیر معمولی تبلیغی مدت کے اظہار کو خاص اہمیت دیتا رہتا ہے، ورنہ قرآن عزیز کی عام سنت یہ ہے کہ وہ سخت اہم ضرورت کے بغیر واقعات وحالات کی اس قسم کی جزئیات سے بہت ہی کم تعرض کرتا ہے۔

Ⓒ بعض مفسرین نے اسرائیلیات (تورات و یہود کی روایات) سے یہ نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طوفان نوح علیہ السلام سے چالیس سال قبل قوم نوح کی عورتوں کو بانجھ کر دیا تھا کہ جدید نسل عالم وجود میں نہ آئے۔ مگر یہ روایت "غپ شپ" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور غالباً اسے اس لیے گھڑا گیا ہے کہ یہ اعتراض پیدا نہ ہو کہ طوفان نوح کی صورت میں بچوں نے کیا قصور کیا تھا کہ وہ لقمہ اجل ہو گئے۔

ان احتیاط پسند حضرات کو شاید یہ بات فراموش ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کا قانون جس کا نام (سنة الله) ہے اس بارہ میں کیا ہے؟ ورنہ ان کو ایسی لایعنی روایت کے بیان کی ضرورت پیش نہ آتی جو اکثر یہود کے غلط افکار وعقائد کی مخلوق ہوتی ہیں۔

کائنات ہست و بود میں (عادۃ اللہ) یہ جاری ہے کہ امراء، وباء، طوفان اور زلزلے جیسے امور جب بھی کسی سبب سے نمودار ہوتے ہیں "خواہ وہ عذاب کے لیے ہوں یا عام حالات زندگی کے اعتبار سے کسی خارجی سبب کے ذریعہ ظاہر ہوئے ہوں" تو جس مقام پر وہ نازل ہوتے ہیں، وہاں کی آبادی میں نیک و بد، ولی و شیطان، زاہد و عابد، اور فاسق و فاجر کے مابین کوئی تمیز نہیں کرتے بلکہ اسباب عادیہ کے زیر اثر مسببات کو وجود میں لانے کے لیے منجانب اللہ مامور ہیں، اور دنیوی زندگی کے اعتبار سے ان کی لپیٹ میں ہر وہ انسان آ جاتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے ان اسباب کا مسبب بن گیا ہے۔

البتہ عالم آخرت کے اعتبار سے یہ امتیاز نمایاں رہتا ہے کہ فاسق و فاجر اور خدا کے دشمن کے لیے یہ اسباب عذاب الٰہی بن جاتے ہیں اور مطیع و فرماں بردار اور نیک کردار انسان کے لیے موجب سعادت اور درجات عالیہ کا مستوجب ہوتے ہیں۔

کیا ہماری نگاہیں روزمرہ یہ مشاہدہ نہیں کرتیں کہ جب زلزلہ آتا ہے تو نیک و بد دونوں پر یکساں اثر کرتا ہے، وباء پھیلتی ہے تو نیک کردار و بد کردار دونوں ہی اس کی زد میں آ جاتے ہیں اور دونوں کے رشتہ حیات کے لیے وہ یکساں مہلک ثابت ہوتی ہے۔

البتہ یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ جب کبھی اس قسم کا عذاب نبی اور پیغمبر کی پیہم نافرمانی کی وجہ سے کسی قوم پر نازل ہوتا ہے تو پیغمبر کو بذریعہ وحی اس کی اطلاع دے دی جاتی ہے اور یہ حکم ہو جاتا ہے کہ وہ مع اپنے پیروؤں کے جو اسلام کے دامن سے وابستہ ہو گئے ہیں عذاب کی اس بستی سے باہر چلا جائے، اور بانگ دہل یہ کہہ کر جائے کہ یا قوم اس کے لائے ہوئے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دے ورنہ خدا کے عذاب کو قبول کرے، اور اس طرح مومنین اس عذاب کی زد سے محفوظ رہتے ہیں۔

بہر حال مفسرین نے جس احتیاط کی خاطر اسرائیلیات کے اس ذخیرہ سے مدد لینی چاہی ہے وہ قطعاً بے ضرورت ہے۔

پس طوفان نوح علیہ السلام کے مرد و عورت بوڑھے جوان، بچے اور بچیاں سب ہی طوفان کی ہلاکت خیزی کا شکار ہوئے اور دنیائے کفر کا وہ حصہ سب ہی برباد کر دیا گیا، اب یہ معاملہ خدا کے سپرد ہے کہ جن عاقل و بالغ انسانوں نے نافرمانی کی تھی ان کے حق میں یہ دائمی اور سرمدی عذاب بنے اور جو معصوم اور غیر عاقل تھے وہ آخرت کے عذاب سے مامون و محفوظ قرار پائیں۔

④ سفینہ نوح علیہ السلام کے بعد کس مقام پر ٹھہرا؟ توراۃ نے اس کا نام اراراط بتایا ہے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ اس سرزمین سے وابستہ تھی جو دجلہ اور فرات کے درمیان واقع ہے اور یہ دونوں دریا آرمینیا کے پہاڑوں سے نکلے ہیں، اور جدا جدا بہہ کر عراق کے حصہ زیریں میں آ کر مل گئے ہیں، پھر خلیج فارس میں سمندر میں جا گرے ہیں، آرمینیا کے یہ پہاڑ اراراط کے علاقہ میں واقع ہیں، اسی لیے توراۃ میں ان کو اراراط کا پہاڑ کہا ہے، مگر قرآن عزیز نے اس پورے علاقہ کی بجائے صرف اس خاص مقام کا تذکرہ کیا ہے جہاں کشتی جا کر ٹھہری تھی یعنی جودی کا، توراۃ کے شارحین کا یہ خیال ہے کہ جودی اس سلسلہ کوہ کا نام ہے جو اراراط اور جارجیا کے پہاڑی سلسلہ کو باہم ملاتا ہے اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سکندر اعظم کے زمانہ کی یونانی تحریرات بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں، اور اس تاریخی واقعہ کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آٹھویں صدی مسیحی تک اس جگہ ایک معبد اور ہیکل موجود تھا جو "کشتی کا معبد" کہا جاتا تھا۔

⑤ ایک مفسر نے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کنعان کے نجات نہ پانے کے متعلق لطیف اشارہ کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر اور مستجاب الدعوات تھے، انہوں نے دعاء اور بددعاء دونوں حالتوں میں خود اپنے بیٹے کو فراموش کر

دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ کافر بیٹے کی سرکشی، پاداش عمل کی صورت میں نمودار ہوئی اور وہ بھی ہالکین کے ساتھ غرق دریا ہو کر رہ گیا۔

حضرت نوح علیہ السلام نے جبکہ وہ قوم کو راہ راست پر لانے سے عاجز آ گئے تھے سب سے پہلے یہ دعاء کی:

﴿وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوٓا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝﴾ (نوح: ۲۶-۲۷)

"اور کہا نوح علیہ السلام نے اے پروردگار! تو اس زمین پر کسی بسنے والے کافر کو زندہ نہ چھوڑ اس لیے کہ اگر تو ان کو زندہ چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کرتے رہیں گے اور ان کی اولاد کا سلسلہ بھی گمراہی اور کفر ہی پر قائم رہے گا۔"

اور یہ قطعاً فراموش کر دیا کہ اس موقع پر کنعان کو مستثنیٰ کر کے اس کے لیے قبول ہدایت کی دُعاء مانگنا چاہیے یا اس وقت ان کو بیٹے کے کفر کا علم ہی نہ تھا۔ دوسری مرتبہ جناب باری تعالیٰ میں یہ دُعاء کی:

﴿رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ﴾ (نوح: ۲۸)

"اے پروردگار مجھ کو اور میرے ماں باپ کو بخش دے اور اس شخص کو بھی بخشش سے نواز جو مومن ہو کر میرے گھر میں داخل ہوا اور مومنین و مومنات کو بھی بخش دے۔"

اس موقعہ پر بھی انہوں نے کنعان کا استثناء نہیں کیا اور اس کے مومن ہو کر گھر میں داخل ہونے کی دعاء نہیں فرمائی۔

تیسری مرتبہ پھر یہ دعاء کی:

﴿وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ إِلَّا تَبَارًا ۝﴾ (نوح: ۲۸)

"اور ظالموں کے لیے ہلاکت کے سوا کچھ اضافہ نہ کر۔"

کنعان ظالم تھا اس لیے کہ کافر تھا، موقعہ تھا کہ استثناء کر کے اس کے لیے ظالم نہ رہنے کی دعاء بھی فرما لیتے اور اگر معلوم نہ تھا تو یہ بدقسمت بیٹے کی بدقسمتی پر ازلی مہر تھی جو ثابت ہو کر رہی۔

پس جب وقت قبولیت دعاء آ پہنچا اور کنعان کی سرکشی بدستور رہی تو اب محبت پدری کا جوش خدا کے عادلانہ فیصلہ کے سامنے نہ ٹھہر سکا، اور اس کی نجات کی دعاء پر اپنی نادانی کے اعتراف کے ساتھ عذر خواہی کرنی پڑی، اور بایں ہمہ جلالت قدر خدا کے سامنے اپنی بندگی کے اظہار ہی کو بہتر سمجھ کر عبد کامل ہونے کا ثبوت پیش فرمایا، اور درگاہ الٰہی سے شرف مغفرت اور قربت الٰہی کو حاصل کیا۔

اہم نتائج:

① ہر ایک انسان اپنے کردار و عمل کا خود ہی جواب دہ ہے، اس لیے باپ کی بزرگی بیٹے کی نافرمانی کا مداوا اور علاج نہیں بن سکتی ورنہ بیٹے کی سعادت باپ کی سرکشی کا بدل ہو سکتی ہے، حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت و پیغمبری کنعان کے کفر کی پاداش کے آڑے نہ آ سکی اور حضرت ابراہیم کی پیغمبرانہ جلالت قدر شرک آزر کے لیے نجات کا باعث نہ ہو سکی۔

﴿كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ﴾ (بنی اسرائیل: ۸۴) "ہر شخص اپنے اپنے ڈھنگ پر کام کرتا ہے۔"

② بُری صحبت زہر ہلاہل سے بھی زیادہ قاتل ہے اور اس کا ثمرہ و نتیجہ ذلت و خسران اور تباہی کے علاوہ کچھ نہیں ہے، انسان کے لیے جس طرح نیکی ضروری شئے ہے اس سے زیادہ صحبت نیکاں ضروری ہے، اور جس طرح بدی سے بچنا اس کی زندگی کا نمایاں امتیاز ہے اس سے کہیں زیادہ بروں کی صحبت سے خود کو بچانا ضروری ہے۔

پسر نوح بابداں بہ نشست خاندان نبوتش گم شد

سگ اصحاب کہف روزے چند پئے نیکاں گرفت مردم شد

صحبت صالح ترا صالح کند صحبت طالح ترا طالح کند

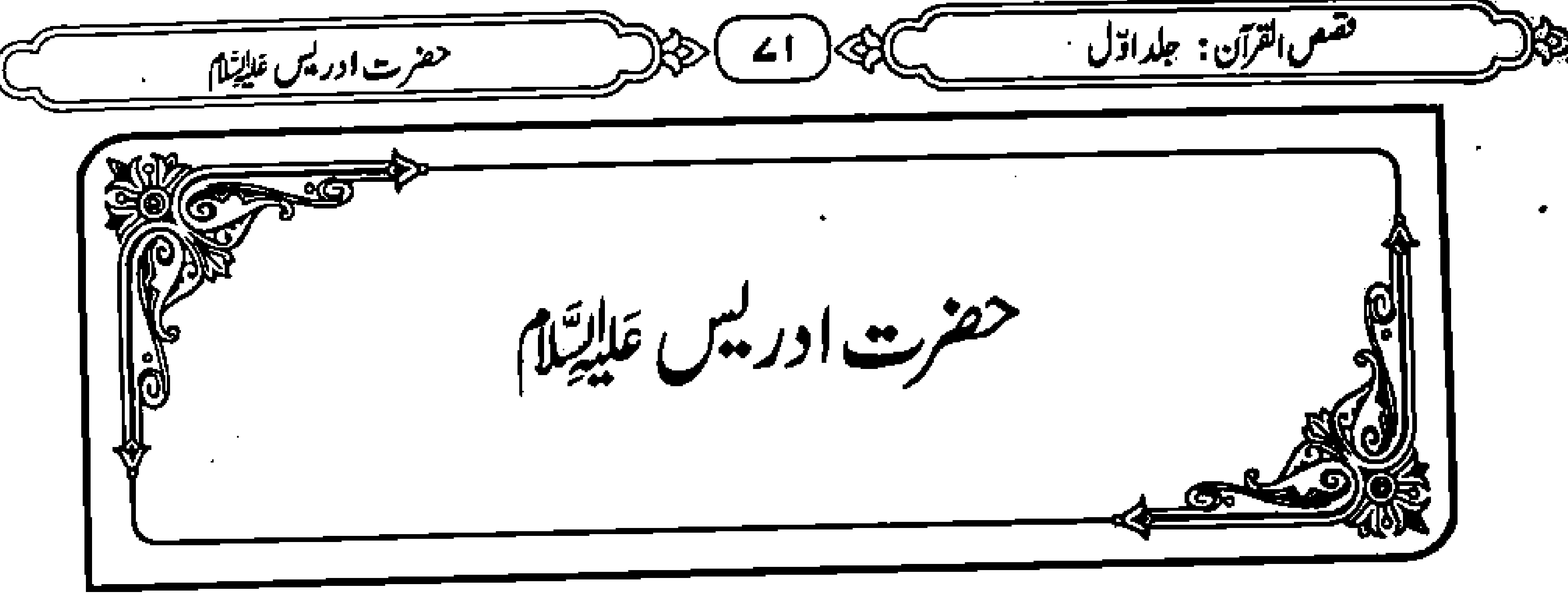
③ خدائے تعالیٰ پر صحیح اعتماد اور بھروسہ کے ساتھ ظاہری اسباب کا استعمال توکل کے منافی نہیں ہے بلکہ توکل علی اللہ کے لیے صحیح طریق کار ہے، تب ہی تو طوفان نوح سے بچنے کے لیے کشتی نوح ضروری ٹھہری۔

④ انبیاء علیہم السلام سے "پیغمبر خدا اور معصوم ہونے کے باوجود" بہ تقاضائے بشریت لغزش ہوسکتی ہے مگر وہ اس پر قائم نہیں رہتے بلکہ منجانب اللہ ان کو تنبیہ کر دی جاتی ہے اور اس سے بنا لیا جاتا ہے، حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات اس کے لیے شاہد عدل ہیں، نیز وہ عالم الغیب بھی نہیں ہوتے جیسا کہ اسی واقعہ میں ﴿فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ﴾ سے واضح ہے۔

⑤ اگرچہ پاداش علم کا خدائی قانون کائنات کے ہر گوشہ میں اپنا کام کر رہا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر جرم اور ہر طاعت کی سزا یا جزاء اسی عالم میں مل جائے، کیونکہ یہ کائنات عمل کی کشت زار ہے اور پاداش کردار کے لیے معاد اور عالم آخرت کو مخصوص کیا گیا ہے تاہم ظلم اور غرور ان دو بدعملیوں کی سزا کسی نہ کسی نہج سے یہاں دنیا میں بھی ضرور ملتی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ظالم اور متکبر اپنی موت سے قبل ہی اپنے ظلم و کبر کی کچھ نہ کچھ سزا ضرور پاتا اور ذلت و نامرادی کا منہ دیکھتا ہے، چنانچہ خدا کے سچے پیغمبروں سے اُلجھنے والی قوموں اور تاریخ کی ظالم و مغرور ہستیوں کی عبرت ناک ہلاکت و بربادی کی داستانیں اس دعوے کی بہترین دلیل ہیں۔





حضرت ادریس علیہ السلام

○ قرآن عزیز میں ذکر مبارک ○ نام و نسب ○ اختلاف روایات ○ نبوت
○ تبلیغ و تعلیم ○ فلاسفہ کی بے سند باتیں ○ محاکمہ۔

حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر قرآن میں:

قرآن عزیز میں حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر صرف دو جگہ آیا ہے، سورۂ مریم میں اور سورۂ انبیاء میں۔

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝﴾ (مریم: ۵۶-۵۷)

"اور یاد کر قرآن میں ادریس (علیہ السلام) کو بلاشبہ وہ تھے سچے نبی اور بلند کیا ہم نے ان کا مقام۔"

﴿وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۸۵)

"اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل ان میں سے ہر ایک تھا صبر کرنے والا۔"

نام و نسب اور زمانہ:

حضرت ادریس علیہ السلام کے نام، نسب اور زمانہ کے متعلق مؤرخین کو سخت اختلاف ہے اور تمام اختلافی وجوہ کو سامنے رکھنے کے بعد بھی کوئی فیصلہ کن یا کم از کم راجح رائے نہیں قائم کی جا سکتی، وجہ یہ ہے کہ قرآن عزیز نے تو اپنے مقصد رشد و ہدایت کے پیش نظر تاریخی بحث سے جدا ہو کر صرف ان کی نبوت، رفعت مرتبت اور ان کی صفات عالیہ کا ذکر کیا ہے اور اسی طرح حدیثی روایات بھی اس سے آگے نہیں جاتیں، اس لیے اس سلسلہ میں جو کچھ بھی ہے وہ اسرائیلی روایات ہیں اور وہ بھی تضاد و اختلاف سے معمور، ایک جماعت کہتی ہے کہ وہ نوح علیہ السلام کے جد امجد ہیں، اور ان کا نام اخنوخ ہے اور ادریس لقب ہے یا عربی زبان میں ادریس اور عبرانی یا سریانی میں ان کا نام اخنوخ ہے اور ان کا نسب نامہ یہ ہے۔

خنوخ یا اخنوخ (ادریس) بن یارد بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم علیہ السلام، ابن اسحاق رحمہ اللہ کا رجحان اسی جانب ہے اور دوسری جماعت کا خیال ہے کہ وہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہیں اور الیاس و ادریس ایک ہی ہستی کے نام اور لقب ہیں اور ان دونوں روایات کے پیش نظر بعض علماء نے یہ تطبیق دینے کی سعی کی ہے کہ جد نوح علیہ السلام کا نام اخنوخ ہے اور ادریس لقب اور بنی اسرائیل کے پیغمبر کا نام ادریس ہے اور الیاس لقب، مگر یہ رائے بے سند اور بے دلیل ہے، بلکہ قرآن عزیز کا الیاس اور ادریس کو جدا

جدا بیان کرنا شاید اس کو متحمل نہ ہو سکے۔ [1]

صحیح ابن حبان میں روایت ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم کو استعمال کیا، ایک حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے رمل کے خطوط کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ علم ایک نبی کو دیا گیا تھا، پس اگر کسی شخص کے نقوش اس کے مطابق آ جاتے ہیں تو نشانہ صحیح بیٹھ جاتا ہے ورنہ نہیں۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر ان روایات کے ساتھ یہ بھی نقل فرماتے ہیں کہ بہت سے علماء تفسیر و احکام کا یہ خیال ہے کہ حضرت ادریس ہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے رمل کے کلمات ادا کئے [2] اور وہ ان کو "ہرمس [3] الہرامسہ" کا لقب دیتے ہیں اور ان کی جانب بہت سی غلط باتیں اسی طرح منسوب کرتے ہیں جس طرح ان کے علاوہ بہت سے انبیاء، علماء حکماء اور اولیاء اللہ کے متعلق منسوب کی گئی ہیں۔

معراج کی صحیحین [4] والی حدیث میں صرف اسی قدر ذکر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ادریس علیہ السلام سے چوتھے آسمان پر ملاقات کی۔ مگر مشہور مفسر ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں ہلال بن یساف کی سند سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کعب احبار سے دریافت کیا کہ حضرت ادریس علیہ السلام سے متعلق اس آیت ﴿وَ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ کا کیا مطلب ہے؟ تو کعب نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریس علیہ السلام پر ایک مرتبہ یہ وحی نازل فرمائی۔ اے ادریس (علیہ السلام) تمام اہل دنیا جس قدر روزانہ نیک عمل کریں گے ان سب کے برابر میں تجھ کو ہر دن اجر عطا کروں گا۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے یہ سنا تو ان کی یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرے اعمال میں روز افزوں اضافہ ہو اور اس لیے عمر کا حصہ طویل ہو جائے تو اچھا ہے، انہوں نے وحی الٰہی اور اپنے اس خیال کو ایک رفیق فرشتہ پر ظاہر کر کے کہا کہ اس معاملہ میں فرشتہ موت سے گفتگو کر تاکہ مجھ کو نیک اعمال کے اضافہ کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے، اس فرشتہ نے جب یہ سنا تو حضرت ادریس علیہ السلام کو اپنے بازوں پر بٹھا کر لے اُڑا، جب یہ چوتھے آسمان سے گزر رہے تھے تو فرشتہ موت زمین کے لیے اتر رہا تھا وہیں دونوں کی ملاقات ہوئی، دوست فرشتہ نے فرشتہ موت سے حضرت ادریس علیہ السلام کے معاملہ کے متعلق گفتگو کی، فرشتہ موت نے دریافت کیا۔ ادریس ہیں کہاں؟ اس نے کہا میری پشت پر سوار ہیں، فرشتہ موت کہنے لگا درگاہِ الٰہی سے یہ حکم ہوا ہے کہ ادریس علیہ السلام کی روح چوتھے آسمان پر قبض کروں، اس لیے میں سخت حیرت و تعجب میں تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے جبکہ ادریس علیہ السلام زمین میں ہیں، اسی وقت فرشتہ موت نے حضرت ادریس علیہ السلام کی روح قبض کر لی۔

یہ واقعہ نقل کر کے کعب احبار نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ﴿وَ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ کی یہی تفسیر ہے، ابن جریر رحمہ اللہ کی طرح ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

ان ہر دو نقول کو روایت کرنے کے بعد حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ سب اسرائیلی خرافات ہیں اور ان میں

---

[1] ان اختلافات کے مطالعہ کے بعد غالباً آپ اس نوٹ سے اتفاق فرمائیں گے جو صفحہ ۵۸ پر درج ہے، حضرت ادریس سے متعلق مزید اختلافی بحث کے لئے فتح الباری جلد ۶ ص ۲۸۸ اور البدایہ والنہایہ ابن کثیر ص ۳۶۔۳۷ قابل مطالعہ ہے۔

[2] البدایہ والنہایہ ابن کثیر جلد اول ص ۹۹۔

[3] ہرمس علم نجوم کے ماہر عالم کو کہتے ہیں، اس لئے ہرمس الہرامسہ کے معنی یہ ہیں کہ ماہرین علم نجوم کا استاذ اول، ہرمیس یونان کا ایک مشہور منجم گذرا ہے۔

[4] صحیح بخاری باب الاسراء، مسلم جلد اول باب الاسراء۔

روایتی اعتبار سے بھی "نکارت" یعنی نا قابلِ اعتبار اچنبھا ہے، اس لیے صحیح تفسیر وہی ہے جو آیت کے ترجمہ میں بیان کی گئی۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ منقول ہے کہ الیاس علیہ السلام نبی کا نام ہی ادریس علیہ السلام ہے اور ان کے اس قول کی وجہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جو زہری رحمۃ اللہ علیہ نے معراج کے سلسلہ میں بیان کی ہے اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء علیہم السلام کی آسمان پر ملاقات کا جو ذکر ہے اس میں کہا گیا ہے کہ جب آپ کی ملاقات حضرت ادریس علیہ السلام سے ہوئی تو انہوں نے فرمایا: "مرحبا بالاخ الصالح" (برادر نیک تمہارا آنا مبارک) پس اگر حضرت ادریس، اخنوخ ہوتے تو حضرت آدم علیہ السلام و حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح "بالابن الصالح" کہتے یعنی نیک بھائی کی جگہ "نیک بیٹے" کے ساتھ خطاب کرتے۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ دلیل کمزور ہے اس لیے کہ اوّل تو یہ امکان ہے کہ اس طویل حدیث میں راوی الفاظ کی پوری حفاظت نہ کر سکا ہو، دوم ہو سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت قدر اور رفعت مرتبت کے پیش نظر انہوں نے پدری انتساب کو نمایاں نہ کیا ہو اور از راہ تواضع برادرانہ حیثیت کو ہی ظاہر کرنا مناسب سمجھا ہو۔

رہا حضرت آدم علیہ السلام و حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاملہ سو ایک ابو البشر ہیں اور دوسرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ جلیل القدر اور رفیع الشان پیغمبر جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے: ﴿فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا﴾ (آل عمران: ۹۵)۔ لہٰذا ان کا "ابن" کے ساتھ خطاب کرنا ہر طرح موزوں اور برمحل ہے۔

ابن کثیر نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام سے قبل کے نبی نہیں ہیں بلکہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے ایک نبی ہیں، اور الیاس ہی ادریس علیہ السلام ہیں۔

تورات میں ان مقدس نبی کے متعلق صرف اسی قدر لکھا ہے:

"اور حنوک (اخنوخ) پینسٹھ برس کا ہوا کہ اس سے متوشلح پیدا ہوا اور متوشلح کی پیدائش کے بعد حنوک تین سو برس خدا کے ساتھ چلتا تھا، اور اس سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں اور حنوک کی ساری عمر تین سو پینسٹھ برس کی ہوئی اور حنوک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا، اور غائب ہو گیا، اس لیے کہ خدا نے اسے لے لیا۔" [1]

حضرت ادریس علیہ السلام حکماء اور فلاسفہ کی نظر میں:

علامہ جمال الدین قفطی نے تاریخ الحکماء [2] میں حضرت ادریس علیہ السلام کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے، حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق علماء تفسیر اور ارباب تاریخ و قصص نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ بہت مشہور ہے، اس لیے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں، البتہ حکماء اور فلاسفہ نے خصوصیت کے ساتھ ان کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت ادریس علیہ السلام کا مولد و منشاء (جائے ولادت و پرورش) کہا ہے، اور انہوں نے نبوت سے پہلے کس سے علم حاصل

---

[1] باب پیدائش آیت ۲۱ - ۲۲

[2] اس تاریخ کا پورا نام "المنتخبات الملتقطات من کتاب اخبار العلماء اخبار الحکماء" ہے اور علامہ جمال الدین ابو الحسن علی بن یوسف قفطی کی تصنیف ہے اور مختصر زوزنی کے نام سے مشہور ہے۔

کیا؟ حکماء اور فلاسفہ کے اقوال ان مسائل میں مختلف ہیں۔

ایک فرقہ کی رائے ہے کہ ان کا نام ہرمس الہرامسہ ہے اور مصر کے قریہ منف میں پیدا ہوئے، یونانی ہرمس کو ارمیس کہتے ہیں، ارمیس کے معنی عطارد ہیں۔ [1]

اور دوسری جماعت کا خیال ہے کہ ان کا نام یونانی میں طرمیس، عبرانی میں خنوخ اور عربی میں اخنوخ ہے، اور قرآن عزیز میں ان کو اللہ تعالیٰ نے ادریس کہا ہے یہی جماعت کہتی ہے کہ ان کے استاد کا نام غوثاذیمون یا اغوثاذیمون (مصری) ہے، وہ غموثاذیمون کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتاتے کہ وہ یونان یا مصر کے انبیاء میں سے ایک نبی ہیں، اور یہ جماعت ان کو ادرین دوم اور حضرت ادریس علیہ السلام کو ادرین سوم کا لقب دیتی ہے، اور غوثاذیمون کے معنی "سعد اور بہت نیک بخت" ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہرمس نے مصر سے نکل کر اقطاع عالم کی سیر کی اور تمام دنیا کو چھان ڈالا اور جب مصر واپس ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بیاسی سال کی عمر میں اپنی جانب اٹھالیا۔

ایک تیسری جماعت یہ کہتی ہے کہ ادریس علیہ السلام بابل میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی، اور اوائل عمر میں انہوں نے حضرت شیث بن آدم علیہ السلام سے علم حاصل کیا، علم کلام کے مشہور عالم علامہ شہرستانی کہتے ہیں کہ اغثاذیمون حضرت شیث علیہ السلام ہی کا نام ہے۔

بہرحال حضرت ادریس علیہ السلام سن شعور کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت سے سرفراز فرمایا، تب انہوں نے شریر اور مفسدوں کو راہ ہدایت کی تبلیغ شروع کی مگر مفسدوں نے ان کی ایک نہ سنی اور حضرت آدم و شیث علیہما السلام کی شریعت کے مخالف ہی رہے، البتہ ایک چھوٹی سی جماعت مشرف بہ اسلام ہوگئی۔

حضرت ادریس علیہ السلام نے جب یہ رنگ دیکھا تو وہاں سے ہجرت کا ارادہ کیا اور اپنے پیرؤوں کو بھی ہجرت کی تلقین فرمائی، پیروان ادریس نے جب یہ سنا تو ان کو ترک وطن بہت شاق گزرا اور کہنے لگے کہ بابل جیسا وطن ہم کو کہاں نصیب ہوسکتا ہے۔ [2] حضرت ادریس علیہ السلام نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم یہ تکلیف اللہ کی راہ میں اٹھاتے ہو تو اس کی رحمت وسیع ہے وہ اس کا نعم البدل ضرور عطا کرے گی، پس ہمت نہ ہارو اور خدا کے حکم کے سامنے سر نیاز جھکا دو۔

مسلمانوں کی رضامندی کے بعد حضرت ادریس علیہ السلام اور ان کی جماعت مصر کی جانب ہجرت کر گئی۔ جماعت نے جب نیل کی روانی اور اس کی سرزمین کی شادابی دیکھی تو بہت خوش ہوئی، اور حضرت ادریس علیہ السلام نے یہ دیکھ کر اپنی جماعت سے فرمایا، بابلیون [3] (تمہارے بابل کی طرح شاداب مقام) اور ایک بہترین جگہ منتخب کر کے نیل کے کنارے بس گئے حضرت ادریس علیہ السلام کے اس جملہ "بابلیون" نے ایسی شہرت پائی کہ عرب کے علاوہ قدیم اقوام بھی اس سرزمین کو بابلیون ہی کہنے لگیں، البتہ عرب نے اس کا نام مصر بتایا

---

[1] ارمیس یا ہرمیس یونان کا ایک مشہور منجم اور ماہر فلکیات حکیم تھا اسی لئے اس کو ارمیس (عطارد کہتے تھے، یونانی غلطی سے ادریس اور ارمیس کو ایک ہی شخص تسلیم کرتے ہیں حالانکہ ایسی فاش غلطی ہے جس کے لئے کوئی دلیل نہیں)۔

[2] بابل کے معنی نہر کے ہیں اور چونکہ بابل دجلہ وفرات کی نہروں سے سرسبز و شاداب تھا اس لئے اس نام سے موسوم ہوا، یہ عراق کا مشہور شہر تھا جو فنا ہوگیا۔

[3] بابلیون کے معنی میں مختلف اقوال ہیں، مثلاً تمہاری طرح کی نہر، مبارک نہر، مگر سب سے بہتر قول یہ ہے کہ "یون" سریانی میں تفضیل کی علامت ہے اور معنی ہیں "بڑی نہر"۔

اور اس کی وجہ تسمیہ یہ سنائی کہ طوفان نوح علیہ السلام کے بعد یہ مصر بن حام کی نسل کا مسکن و موطن بنا ہے۔

حضرت ادریس علیہ السلام اور ان کی پیرو جماعت نے جب مصر میں سکونت اختیار کر لی تو یہاں بھی انہوں نے پیغام الٰہی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دینا شروع کر دیا کہا جاتا ہے کہ ان کے زمانہ میں بہتر (۷۲) زبانیں بولی جاتی تھیں، اور اللہ تعالیٰ کی عطاء و بخشش سے یہ وقت کی تمام زبانوں کے زبان دان تھے، اور ہر ایک جماعت کو اسی کی زبان میں تبلیغ فرمایا کرتے تھے۔

حضرت ادریس علیہ السلام نے دین الٰہی کے پیغام کے علاوہ سیاست مدن، شہری زندگی اور بود و ماند کے متمدن طریقوں کی بھی تعلیم و تلقین کی اور اس کے لیے انہوں نے ہر ایک فرقہ جماعت سے طلبہ جمع کئے اور ان کو مدنی سیاست اور اس کے اصول و قواعد سکھائے جب یہ طلبہ کامل و ماہر بن کر اپنے قبائل کی طرف لوٹے تو انہوں نے شہر اور بستیاں آباد کیں جن کو مدنی اصول پر بسایا، ان شہروں کی تعداد کم و بیش دو صد کے قریب تھی، جن میں سب سے چھوٹا شہر [1] "رہا" تھا، حضرت ادریس علیہ السلام نے ان طلبہ کو دوسرے علوم کی بھی تعلیم دی جس میں علم حکمت اور علم نجوم جیسے علوم بھی شامل ہیں۔

حضرت ادریس علیہ السلام پہلی ہستی ہیں جنہوں نے علم حکمت و نجوم کی ابتداء کی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو افلاک اور ان کی ترکیب، کواکب اور ان کے اجتماع و افتراق کے نقاط اور ان کے باہم کشش کے رموز و اسرار کی تعلیم دی، اور ان کو علم عدد و حساب کا عالم بنایا، اور اگر اس پیغمبر خدا کے ذریعہ ان علوم کا انکشاف نہ ہوتا تو انسانی طبائع کی وہاں تک رسائی مشکل تھی، انہوں نے مختلف گروہوں اور امتوں کے لیے ان کے مناسب حال قوانین و قواعد مقرر فرمائے اور اقطاع عالم کو چار حصوں میں منقسم کر کے ہر ربع کے لیے ایک حاکم مقرر کیا جو اس حصہ زمین کی سیاست و ملوکیت کا ذمہ دار قرار پایا، اور ان چاروں کے لیے ضروری قرار دیا کہ تمام قوانین سے مقدم شریعت کا وہ قانون رہے گا جس کی تعلیم وحی الٰہی کے ذریعے میں نے تم کو دی ہے، اس سلسلہ کے سب سے پہلے چار بادشاہوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

❶ ایلاوس (بمعنی رحیم) ❷ زوس ❸ اسقلبیوس ❹ زوس امون یا ایلاوس امون یا بسیلوس۔

حضرت ادریس علیہ السلام کی تعلیم کا خلاصہ:

خدا کی ہستی اور اس کی توحید پر ایمان لانا، صرف خالق کائنات کی پرستش کرنا، آخرت کے عذاب سے رستگاری کے لیے اعمالِ صالحہ کو ڈھال بنانا، دنیا سے بے التفاتی اور تمام امور میں عدل و انصاف کو پیش نظر رکھنا، اور مقررہ طریقہ پر عبادت الٰہی ادا کرنا، اور ایام بیض [2] کے روزے رکھنا، دشمنانِ اسلام سے جہاد کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، طہارت و نظافت سے رہنا، خصوصیت کے ساتھ جنائت، کتے اور سور سے اجتناب کرنا، ہر نشہ آور شئے سے پرہیز کرنا ان کی تعلیم کا لُب لباب ہے۔

انہوں نے اپنے پیروؤں کے لیے بحکم الٰہی سال میں چند دن عید کے مقرر فرمائے اور چند مخصوص اوقات میں نذر اور قربانی دینا فرض قرار دیا، ان میں سے بعض رویت ہلال پر ادا کی جاتی تھیں اور بعض اس وقت جبکہ سورج کسی برج میں داخل ہونے لگا ہو، اور بعض جبکہ سیارے اپنے بیوت و برج شرف میں داخل ہوں اور بعض سیارے بعض سیاروں کے مقابل آ جائیں۔

---

[1] یہ شہر صفحہ عالم سے مٹ گیا مگر اس کے کھنڈرات باقی ہیں۔ [2] ہر ماہ قمری کی ۱۴، ۱۵، ۱۶ تاریخ۔

نذر الٰہی کے طریقے:

اللہ تعالیٰ کے سامنے نذر و قربانی پیش کرنے کے لیے ان کے یہاں تین چیزیں اہمیت رکھتی تھیں، خوشبوؤں کی دھونی، جانوروں کی قربانی اور شراب * اور ان کے علاوہ میووں، پھلوں اور پھولوں وغیرہ میں سے موسم کی پہلی چیز کی نذر ضروری تھی، اور میووں میں سے سیب کو، اناج میں سے گیہوں کو، اور پھولوں میں سے گلاب کو ترجیح حاصل تھی۔

بعد میں آنے والے نبیوں کے متعلق بشارت:

حضرت ادریس علیہ السلام نے اپنی امت کو یہ بھی بتایا کہ میری طرح اس عالم کی دینی و دنیوی اصلاح کے لیے بہت سے انبیاء علیہم السلام تشریف لائیں گے اور ان کی نمایاں خصوصیات یہ ہوں گی۔ ① وہ ہر ایک بُری بات سے بَری اور پاک ہوں گے۔ ② قابل ستائش اور فضائل میں کامل ہوں گے، زمین و آسمان کے احوال سے اور ان امور سے کہ جن میں کائنات کے لیے شفاء ہے یا مرض، وحی الٰہی کے ذریعہ اس طرح واقف ہوں گے کہ کوئی سائل تشنہ کام نہ رہے گا، وہ مستجاب الدعوات ہوں گے اور ان کے مذہب کی دعوت کا خلاصہ اصلاح کائنات ہوگا۔

حضرت ادریس علیہ السلام کی خلافت ارضی:

جب حضرت ادریس علیہ السلام خدا کی زمین کے مالک بنا دیے گئے تو انہوں نے علم و عمل کے اعتبار سے خدا کی مخلوق کو تین طبقات میں تقسیم کر دیا۔ کاہن، بادشاہ اور رعیت، اور حسب ترتیب ان کے مراتب مقرر فرمائے، کاہن سب سے پہلا اور بلند درجہ قرار پایا اس لیے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے سامنے اپنے نفس کے علاوہ بادشاہ اور رعیت کے معاملات میں بھی جوابدہ ہے اور بادشاہ کا دوسرا درجہ رکھا گیا، اس لیے کہ وہ اپنے نفس اور امور مملکت کے متعلق جواب دہ ہے اور رعیت صرف اپنے نفس ہی کے لیے جواب دہ ہے، اس لیے وہ تیسرے طبقہ میں شامل ہے، لیکن یہ طبقات فرائض کے اعتبار سے تھے نہ کہ نسل و خاندان کے امتیازات کے لحاظ سے، بہرحال حضرت ادریس علیہ السلام "رفع الی اللہ" تک انہی قوانین شریعت و سیاست کی تبلیغ فرماتے رہے۔

مذکورہ بالا چار بادشاہوں میں سے اسقلیبوس بہت پختہ عزم و ارادہ کا بادشاہ تھا، اس نے حضرت ادریس علیہ السلام کے کلمات کی حفاظت اور قوانین شریعت کی نگہداشت خوب کی اور حضرت ادریس علیہ السلام کے اٹھا لیے جانے پر بے حد حزن و ملال کا اظہار کیا اور ہیکلوں میں ان کی اور ان کے رفع کی حالت کی تصاویر بنوائیں۔

اسقلیبوس اس خطہ پر حکومت کرتا تھا جو طوفان نوح کے بعد خطہ یونان کہلایا۔ یونانیوں نے طوفان کی تباہ کاریوں سے بچے ہوئے ٹوٹے پھوٹے ہیکلوں میں جب حضرت ادریس علیہ السلام کے مجسمہ اور ان کے رفع کی تصویر کو دیکھا اور ساتھ ہی اسقلیبوس کی عظمت اور ہیکلوں میں حکمت و فلسفہ کی تدوین کا شہرہ سنا تو ان کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ اسقلیبوس ہی وہ ہستی ہے جس کا رفع ہوا، حالانکہ یہ صریح غلطی ہے جو محض اٹکل و تخمین سے انہوں نے اختیار کی۔

---

* حکماء کا یہ تضاد بیان حیرت میں ڈالتا ہے کہ ایک جانب تو وہ شریعت ادریسی میں شراب کو حرام بتاتے ہیں اور دوسری جانب خدا کی جناب میں شراب کی قربانی و نذر کو قبول کہتے ہیں۔ (ان ھذا لشیٔ عجاب)

حضرت ادریس علیہ السلام کا حلیہ:

حضرت ادریس علیہ السلام کا حلیہ یہ ہے، گندم گوں رنگ، پورا قد و قامت، سر پر بال کم، خوبصورت و خوبرو، گھنی داڑھی، رنگ و روپ اور چہرہ کے خطوط میں ملاحت مضبوط بازو، چوڑے مونڈھے، مضبوط ہڈی، دبلے پتلے، سرگیں چمکدار آنکھیں، گفتگو باوقار، خاموشی پسند سنجیدہ اور متین، چلتے ہوئے نیچی نظر، انتہائی فکر و خوض کے عادی، غصہ کے وقت سخت غضبناک باتیں کرنے میں شہادت کی انگلی سے بار بار اشارہ کے عادی، حضرت ادریس علیہ السلام نے بیاسی سال کی عمر پائی۔

ان کی انگوٹھی پر یہ عبارت کندہ تھی۔

الصبر مع الایمان باللہ یورث الظفر.

"اللہ پر ایمان کے ساتھ صبر، فتح مندی کا باعث ہے"۔

اور کمر سے باندھنے والے پٹکہ پر یہ تحریر تھا:

الاعیاد فی حفظ الفروض والشریعۃ من تمام الدین و تمام الدین کمال المروۃ.

"حقیقی عیدیں اللہ تعالیٰ کے فرائض کی حفاظت میں پوشیدہ ہیں اور دین کا کمال شریعت سے وابستہ ہے اور مروت میں کمال دین کی تکمیل ہے۔"

اور نماز جنازہ کے وقت جو پٹکہ باندھتے اس پر حسب ذیل جملے ثبت ہوتے:

السعید من نظر لنفسہ و شفاعتہ عند ربہ اعمالہ الصالحۃ.

"سعادت مند وہ ہے جو اپنے نفس کی نگرانی کرے اور پروردگار کے سامنے انسان کے شفیع اس کے اپنے نیک اعمال ہیں۔"

حضرت ادریس علیہ السلام کے بہت سے پند و نصائح اور آداب و اخلاق کے جملے مشہور ہیں جو مختلف زبانوں میں ضرب المثل اور رموز و اسرار کی طرح مستعمل ہیں، ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

① خدا کی بیکراں نعمتوں کا شکر یہ انسانی طاقت سے باہر ہے۔

② جو علم میں کمال اور عمل صالح کا خواہش مند ہو اس کو جہالت کے اسباب اور بدکرداری کے قریب بھی نہ جانا چاہیے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہر فن مولا کاریگر اگر سینے کا ارادہ کرتا ہے تو سوئی ہاتھ میں لیتا ہے نہ کہ برما، پس ہر وقت یہ پیش نظر رہے۔

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں		ایں خیال است و محال است و جنوں

③ دنیا کی بھلائی "حسرت" ہے اور برائی "ندامت"۔

④ خدا کی یاد، اور عمل صالح کے لیے خلوص نیت شرط ہے۔

⑤ نہ جھوٹی قسمیں کھاؤ، نہ اللہ تعالیٰ کے نام کو قسموں کے لیے تختہ مشق بناؤ اور نہ جھوٹوں کو قسمیں کھانے پر آمادہ کرو، کیونکہ ایسا کرنے سے تم بھی شریک گناہ ہو جاؤ گے۔

⑥ ذلیل پیشوں کو اختیار نہ کرو (جیسے سینگی لگانا، جانوروں کے جفتی کرانے پر اجرت لینا وغیرہ)۔

⑦ اپنے بادشاہوں کی (جو کہ پیغمبر کی جانب سے احکام شریعت کے نفاذ کے لیے مقرر کئے جاتے ہیں) اطاعت کرو اور اپنے بڑوں،

کے سامنے پست رہو، اور ہر وقت حمد الٰہی میں اپنی زبان کو تر رکھو۔

⑧ حکمت روح کی زندگی ہے۔

⑨ دوسروں کی خوش عیشی پر حسد نہ کرو اس لیے کہ ان کی یہ مسرور زندگی چند روزہ ہے۔

⑩ جو ضروریات زندگی سے زیادہ طالب ہوا وہ کبھی قانع نہ رہا۔

تاریخ الحکماء کے ج ۱ ص ۳۴۸ پر ہرمس ثالث کے تذکرہ میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ علماء کی ایک جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ طوفان نوح علیہ السلام سے قبل دنیا میں جس قدر علوم شائع ہوئے ان سب کے معلم اوّل یہی ہرمس اوّل ہیں جو مصر کے حصہ اعلیٰ کے باشندہ تھے اور عبرانی حضرات ان کو خنوخ نبی مانتے ہیں اور جو اپنے نسب میں حضرت آدم علیہ السلام کے پر پوتے ہیں۔

یعنی خنوخ (ادریس) بن یارد بن مہلائیل بن قینان، بن انوش، بن شیث، بن آدم (علیہم السلام)۔

ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ فلسفہ کی کتابوں میں جن علمی جواہر اور حرکات نجوم کا تذکرہ آتا ہے سب سے پہلے ان کا ذکر ان ہی کی زبان سے ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ہیکلوں کی تعمیر، علم طب کی ایجاد، ارضی و سماوی اشیاء کے متعلق موزوں قصائد کے ذریعہ اظہار خیال بھی ان ہی کی اولیات میں سے ہیں، اور انہوں نے ہی سب سے پہلے طوفان کی اطلاع دے کر بندگان خدا کو ڈرایا اور بتایا کہ ان کو دکھایا گیا ہے کہ ایک آسمانی آفت سے جو زمین کو پانی اور آگ میں لپیٹ رہی ہے، انہیں یہ دیکھ کر علوم کی بربادی اور صنعت و حرفت کی تباہی کا خوف ہوا اور اس لیے انہوں نے مصر میں اہرام اور برابی ✿ بنائے اور ان میں تمام صنائع اور نو ایجاد آلات کی تصاویر بنوائیں اور تمام علوم کے حقائق و اوصاف کو منقش کیا تا کہ یہ علوم و صناعات تا ابد باقی رہیں اور فنا کا ہاتھ ان کو گزند نہ پہنچا سکے۔ ✿

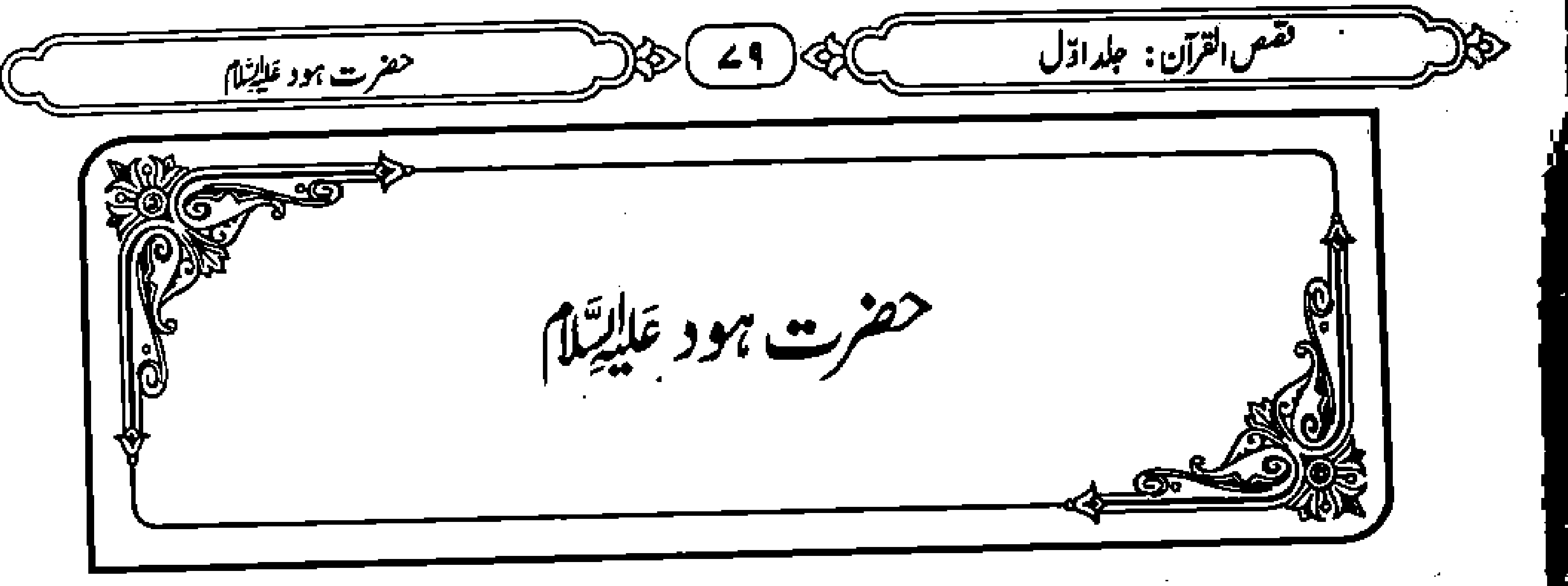
محاکمہ:

فلاسفہ اور حکمت و فلسفہ کی قدیم کتابوں کی (بعض باتوں سے قطع نظر) ان یاوہ گویوں اور بے سروپا باتوں کا یہ خلاصہ ہے جو حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق افسانوی حیثیت میں گھڑا گیا ہے کہ جس کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ نقل اس کی تائید میں ہے بلکہ تحقیق اور صحیح علم تاریخ کے حقائق ان میں سے اکثر باتوں کی خرافات کو آج اس طرح ظاہر کر رہے ہیں کہ جس کا انکار حقیقت کے انکار کے مترادف ہے مثلاً اہرام و برابی کی تاریخ آج جدید اکتشافات کی بدولت ہمارے سامنے بے نقاب ہے اور اہرام اور ان مقابر کی کھدائی نے علوم و نقوش، اور صنائع کی تصویر کے بنانے والوں، اور ان کے مختلف زمانوں میں مختلف مدارج کے ترقی دینے والوں کے نام ان کے اجسام اور ان کے زور جواہر کے خزانوں اور مختلف زمانوں کی تحریروں، اور رسم الخط کی ترکیبوں کو سامنے لا کر روز روشن کی طرح آشکارا کر دیا ہے، کہاں وہ حقیقتیں اور کہاں یہ دور از کار باتیں، آج مینا، خوفو، منقرع اور طوطامن خامن وغیرہ بادشاہوں کے حالات سے کون آشنا نہیں ہے۔

تاہم ان بے سروپا باتوں کو بھی نقل کر دینا اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ یہ آگاہی رہے کہ ان پیغمبر کے متعلق حکماء کی کتابوں میں بھی کس قسم کی دور از کار باتیں درج ہیں۔

اس سلسلہ میں بس اسی قدر سچ اور حق ہے جس کو ہم قرآن عزیز اور احادیث صحیحہ سے نقل کر آئے ہیں یا توقف کے درجہ میں وہ چند جملے جو تورات سے نقل کیے گئے ہیں، یا وہ اقوال جو پیغمبرانہ تعلیمات کے شایان شان ہیں۔

✿ برابی ایسے ہیکل جو چلہ کشی کے لئے چہار جانب سے بند ہوں۔ ✿ تاریخ الحکماء جلد ا



حضرت ہود علیہ السلام

○ قرآن عزیز میں ہود علیہ السلام کا ذکر ○ ہود علیہ السلام کا نسب ○ عاد کی بستیاں اور ان کا طریق عبادت
○ عاد کی ہلاکت ○ ہود علیہ السلام اور قوم ہود کے واقعات سے حصول عبرت۔

قرآن عزیز میں ہود علیہ السلام کا ذکر:

قرآن عزیز میں حضرت ہود علیہ السلام کا سات جگہ ذکر آیا ہے جو ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے:

نمبر شمار	نام سورہ	تعداد آیات
۱	اعراف	۶۵
۲	ہود	۵۰۔۵۳۔۵۸۔۶۰۔۸۹
۳	شعراء	۱۲۴

قرآن عزیز میں عاد کا ذکر:

اور عاد کا ذکر نو سورتوں میں ہوا ہے، یعنی اعراف، ہود، مومنون، شعراء، فصّلت، احقاف، الذاریات، القمر اور الحاقّہ میں۔

قوم عاد:

اس سے قبل کہ ہم عاد کے متعلق تفصیلی بحث کریں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ قرآن عزیز کے علاوہ کوئی تاریخ کی کتاب یا توراۃ عاد کے متعلق روشنی نہیں ڈالتی، اس لیے اس قوم کے حالات کا نقشہ یا قرآن عزیز کے ذریعہ بن سکتا ہے اور یا پھر ان اثریات کے ذریعہ جو محققین علم الآثار نے اس بارہ میں حاصل کی ہیں۔

پہلا ذریعہ چونکہ قطعی اور یقینی ہے اس لیے اس کے بیان کردہ حقائق کو بھی بلاشبہ قطعیت حاصل ہے اور دوسرا ذریعہ تخمینی اور قیاسی، اس لیے اس کے بیان کردہ واقعات کی حیثیت ظن و تخمین سے آگے نہیں جاتی۔

عاد، عرب کے قدیم قبیلہ یا امم سامیہ کے صاحب قوت و اقتدار افراد جماعت کا نام ہے، تاریخ قدیم کے بعض یورپی مستشرقین عاد کو ایک فرضی کہانی (میتھالوجی) یقین کرتے ہیں، مگر ان کا یہ یقین بالکل غلط اور سراسر وہم ہے، اس لیے کہ جدید تحقیقات کا مسلّم فیصلہ ہے کہ عرب کے قدیم باشندے کثرت افراد و قبائل کے اعتبار سے ایک باعظمت و سطوت جماعت کی حیثیت میں تھے جو عرب سے نکل کر شام، مصر اور بابل کی طرف بڑھے اور وہاں زبردست حکومتوں کی بنیادیں قائم کیں، اب فرق صرف اس قدر ہے کہ

عرب ان باشندوں کو امم بائدہ (ہلاک ہو جانے والی قومیں) یا عرب عاربہ (خالص عرب) اور ان کی مختلف جماعتوں کے افراد کو عاد، ثمود، طسم اور جدیس کہتے ہیں ❶ اور مستشرقین یورپ (امم سامیہ) نام رکھتے ہیں، پس اصطلاحات و تعبیرات کے فرق سے حقیقت واقعہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہو جاتی، اس لیے قرآن عزیز نے ان کو عاد اولی کہا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ عرب کی قدیم قوم بنو سام اور عاد اولی ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔

اہل جغرافیہ کا قول ہے کہ لفظ عرب دراصل عربہ تھا جس کے معنی صحراء اور بادیہ کے ہیں، خود عربی زبان میں اعراب اہل بادیہ کو کہتے ہیں اور عرابہ کے معنی بدویت کے آتے ہیں۔

اور بعض اہل تحقیق کی رائے یہ ہے کہ عرب اصل میں غرب (غین معجمہ کے ساتھ) تھا اور چونکہ اس کا جائے وقوع فرات کے غرب میں ہے اس لیے وہ آرامی قومیں (امم سامیہ) جو کہ فرات غربی پر آباد تھیں، اوّل غرب اور پھر غین کے نقطہ کے سقوط کے بعد عرب کہلائیں۔

ان میں سے عرب کی وجہ تسمیہ جو بھی صحیح ہو یہ حقیقت ہے کہ یہ مقام قدیم امم سامیہ یا بدوی جماعتوں یا عاد کا مسکن تھا۔ اس لیے عاد بغیر کسی اختلاف کے عرب نژاد تھے، اور لفظ عاد عربی ہے نہ کہ عجمی جس کے معنی عبرانی میں "بلند و مشہور" کے ہیں، قرآن عزیز میں عاد کے ساتھ ارم کا لفظ لگا ہوا ہے اور ارم (سام) کے معنی بھی "بلند و مشہور" ہی کے ہیں، انہی عاد کو تورات کی غلط پیروی میں کہیں کہیں عمالقہ بھی کہا گیا ہے۔

عاد کا زمانہ:

عاد کا زمانہ تقریباً دو ہزار قبل حضرت مسیح علیہ السلام مانا جاتا ہے، اور قرآن عزیز میں عاد کو "من بعد قوم نوح" کہہ کر قوم نوح کے خلفاء میں سے شمار کیا ہے، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شام کی دوبارہ آبادی کے بعد امم سامیہ کی ترقی عاد ہی سے شروع ہوتی ہے۔

عاد کا مسکن:

عاد کا مرکزی مقام ارض احقاف ہے، یہ حضر موت کے شمال ❷ میں اس طرح واقع ہے کہ اس کے شرق میں عمان ہے اور شمال میں ربع الخالی، مگر آج یہاں ریت کے ٹیلوں کے سواء کچھ نہیں ہے، اور بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ ان کی آبادی عرب کے سب سے بہترین حصہ حضر موت اور یمن میں خلیج فارس کے سواحل سے حدود عراق تک وسیع تھی اور یمن ان کا دار الحکومت تھا۔

عاد کا مذہب:

عاد بت پرست تھے اور اپنے پیشرو قوم نوح کی طرح صنم پرستی اور صنم تراشی میں ماہر تھے، تاریخ قدیم کے بعض ماہرین کہتے ہیں کہ ان کے معبودانِ باطل بھی قوم نوح کی طرح ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر ہی تھے، اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے

---

❶ معجم البلدان ص ۱۲۹ جلد ۶

❷ عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ مجھ سے سید عبداللہ بن احمد بن عمر بن یحیٰی علوی نے (جو حضر موت کے باشندہ ہیں) بیان کیا کہ وہ ایک جماعت کے ساتھ ان ہلاک شدہ قوموں کے قدیم مساکن کے کھوج میں حضر موت کے شمالی میدان میں مقیم تھے، طویل جد و جہد کے بعد ہم نے سنگ مرمر کے بعض ظروف کو ریت کے ٹیلوں کی کھدائی میں حاصل کیا جس پر خط مسماری میں تحریر تھا، مگر افسوس کہ مالیہ کی کمی نے اس عظیم الشان مہم کو پورا نہ ہونے دیا۔

ایک اثر منقول ہے، اس میں ہے کہ ان کے ایک صنم کا نام صمود اور ایک کا نام ہتار تھا۔ [1]

حضرت ہود علیہ السلام:

عاد اپنی مملکت کی سطوت و جبروت، جسمانی قوت وصولت کے غرور میں ایسے چمکے کہ انہوں نے خدائے واحد کو بالکل بھلا دیا اور اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کو اپنا معبود مان کر ہر قسم کے شیطانی اعمال بے خوف و خطر کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے ایک پیغمبر حضرت ہود (علیہ السلام) کو مبعوث فرمایا، حضرت ہود علیہ السلام عاد کی سب سے زیادہ معزز شاخ خلود کے ایک فرد تھے، سرخ سفید رنگ اور وجیہ تھے، ان کی داڑھی بڑی تھی۔ [2]

تبلیغ اسلام:

انہوں نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عبادت کی طرف دعوت دی اور لوگوں پر ظلم و جور کرنے سے منع فرمایا، مگر عاد نے ایک نہ مانی اور ان کو سختی کے ساتھ جھٹلایا اور غرور و تکبر کے ساتھ کہنے لگے ﴿مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾ (السجدہ:۱۵) آج دنیا میں ہم سے زیادہ شوکت و جبروت کا کون مالک ہے؟ مگر حضرت ہود علیہ السلام مسلسل اسلام کی تبلیغ میں لگے رہے، وہ اپنی قوم کو عذاب الٰہی سے ڈراتے اور غرور و سرکشی کے نتائج بتا کر قوم نوح کے واقعات یاد دلاتے اور کبھی ارشاد فرماتے:

"اے قوم! اپنی جسمانی طاقت اور حکومت کے جبروت پر گھمنڈ نہ کر بلکہ خدا کا شکر ادا کر کہ اس نے تجھ کو یہ دولت بخشی، قوم نوح کی تباہی کے بعد تجھ کو زمین کا مالک بنایا، خوش عیشی، فارغ البالی اور خوش حالی عطاء کی لہٰذا اس کی نعمتوں کو نہ بھول اور خود ساختہ بتوں کی پرستش سے باز آ جو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ دکھ دے سکتے ہیں، موت و زیست، نفع و ضرر سب ایک خدا ہی کے ہاتھ میں ہے، اے افراد قوم! مانا کہ تم عرصہ تک سرکشی اور اس کی نافرمانی میں مبتلاء رہے ہو مگر آج بھی اگر توبہ کر لو، اور باز آ جاؤ تو اس کی رحمت وسیع ہے اور دروازۂ توبہ بند نہیں ہوا، اس سے مغفرت چاہو وہ بخش دے گا، اس کی طرف رجوع ہو جاؤ وہ معاف کر دے گا، تقویٰ و طہارت کی زندگی اختیار کر لو، وہ تم کو دن دونی، رات چوگنی ترقی عطا کرے گا، بیش از بیش عزت دے گا، اور مال و عزت میں سرفرازی بخشے گا۔"

حضرت ہود علیہ السلام اپنی تبلیغ کے اور پیغام حق کے ساتھ ساتھ بار بار یہ بھی دہراتے کہ میں تم سے کسی اجر و عوض کا خواہاں نہیں، میرا اجر تو خدا ہی کے پاس ہے، اور یہ نبی کی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے، ان کو کوئی یہ تہمت نہیں لگا سکتا کہ وہ مال کی طلب میں ایسا کرتے ہیں، یا عزت و جاہ اور ریاست کے طالب ہیں، وہ نہ قوم سے اپنی ریاست و عزت کے طالب ہوتے ہیں اور نہ مال و منال کے، ان کے سامنے تو صرف ایک ہی نقطہ ہوتا ہے اور وہ ادائے فرض اور اپنے مالک حقیقی کے احکام کی پیغمبری ہے۔

عاد میں ایمان دار تو چند ہی تھے باقی تمام سرکش اور متمرد انسانوں کا گروہ تھا، ان کو حضرت ہود علیہ السلام کی یہ نصائح سخت شاق گزرتی تھیں، اور وہ یہ نہیں برداشت کر سکتے تھے کہ ان کے خیالات، ان کے عقائد و اعمال، غرض ان کے کسی ارادہ میں بھی کوئی شخص حائل ہو ان کے لیے ناصح مشفق بنے، اس لیے اب انہوں نے یہ روش اختیار کی کہ حضرت ہود علیہ السلام کا مذاق اڑایا، ان کو بے وقوف

---

[1] صدا بھی ان کا مشہور بت تھا، البدایہ والنہایہ جلد ۱۔ [2] عینی جلد ۷ کتاب الانبیاء

گردانا اور ان کی معصومانہ حقانیتوں اور صداقتوں کے تمام یقینی دلائل و براہین کو جھٹلانا شروع کر دیا اور حضرت ہود علیہ السلام سے کہنے لگے:

﴿قَالُوا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ (هود: ۵۳)

"کہا اے ہود (علیہ السلام)! تو ہمارے پاس ایک دلیل بھی نہ لایا، اور تیرے کہنے سے ہم اپنے خداؤں کو چھوڑنے والے نہیں، اور نہ ہم تجھ پر ایمان لانے والے ہیں۔"

ہم اس ڈھونگ میں آنے والے نہیں کہ تجھ کو خدا کا رسول مان لیں اور اپنے خداؤں کی عبادت چھوڑ کر یہ یقین کر لیں کہ وہ خدائے اکبر کے سامنے ہمارے سفارشی نہیں ہوں گے۔"

حضرت ہود علیہ السلام نے ان سے کہا کہ "نہ میں بے وقوف ہوں اور نہ پاگل، بلاشبہ خدا کا رسول اور پیغمبر ہوں" اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے بیوقوف کو منتخب نہیں کیا کرتا کہ اس کا نقصان اس کے نفع سے بڑھ جائے اور ہدایت کی جگہ گمراہی آ جائے، وہ اس عظیم الشان خدمت کے لیے اپنے بندوں میں سے ایسے شخص کو چنتا ہے جو ہر طرح اس کا اہل ہو اور اس خدمت حق کو بخوبی انجام دے سکے۔

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ (الانعام: ۱۲۴)

"اور اللہ خوب جاننے والا ہے کہ اپنے منصب رسالت کو کس جگہ رکھے۔"

مگر قوم کی سرکشی اور مخالفت بڑھتی ہی رہی اور ان پر آفتاب سے زیادہ روشن دلائل و نصائح کا مطلق اثر نہ ہوا، اور وہ حضرت ہود علیہ السلام کی تکذیب و تذلیل کے اور زیادہ در پے ہو گئے اور (العیاذ باللہ) مجنون اور خبطی کہہ کر اور زیادہ مذاق اڑانے لگے، اور کہنے لگے اے ہود! جب سے تو نے ہمارے معبودوں کو برا کہنا اور ہم کو ان کی عبادت سے باز رہنے کے لیے تلقین کرنا شروع کیا ہے ہم دیکھتے ہیں اس وقت سے تیرا حال خراب ہو گیا ہے اور ہمارے خداؤں کی بد دعا سے تو پاگل و مجنون ہو گیا ہے تو اب ہم اس کے علاوہ تجھ کو اور کیا سمجھیں؟

ان کو اپنی اسی گستاخانہ جرأت و تہمت سے یہ خیال ہو چلا تھا کہ اب کوئی شخص حضرت ہود علیہ السلام کی طرف دھیان نہ دے گا، اور ان کی باتوں کو توجہ سے نہ سنے گا۔ حضرت ہود علیہ السلام نے یہ سب کچھ نہایت ضبط و صبر سے سنا اور پھر ان سے یوں مخاطب ہوئے:

"میں خدا کو اور تم سب کو گواہ بنا کر سب سے پہلے یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں اس اعتقاد سے قطعاً بری ہوں کہ ان بتوں میں یہ قدرت ہے کہ مجھ کو یا کسی کو کسی قسم کی بھی کوئی برائی پہنچا سکتے ہیں اس کے بعد تم کو اور تمہارے ان معبودانِ باطلہ کو تحدی (چیلنج) کرتا ہوں کہ اگر ان میں ایسی قدرت ہے تو وہ مجھ کو نقصان پہنچانے میں جلدی سے اقدام کریں، میں اپنے خدا کے فضل و کرم سے صاحب عقل و خرد ہوں، فراست و کیاست کا مالک ہوں اور حکمت و دانائی کا حامل۔ میں تو صرف اپنے اس خدا ہی پر بھروسہ کرتا ہوں اور اسی پر وثوق رکھتا ہوں جس کے قبضہ و قدرت میں کائنات کے تمام جانداروں کی پیشانیاں ہیں اور حیات و ممات کا مالک ہے، وہ ضرور میری مدد کرے گا اور ہر نقصان پہنچانے والے کے نقصان سے محفوظ رکھے گا۔"

آخر حضرت ہود علیہ السلام نے ان کی مسلسل بغاوت و سرکشی کے خلاف یہ اعلان کر دیا کہ اگر عاد کا رویہ یہی رہا اور حق سے

اعراض وروگردانی کی روش میں انہوں نے کوئی تبدیلی نہ کی، اور میری پند ونصائح کو گوشِ دل سے نہ سنا تو میں اگرچہ اپنی مفوضہ خدمت کے لیے ہر وقت چست کمر اور باہمت ہوں مگر ان کے لیے ہلاکت یقینی ہے، اللہ تعالیٰ عنقریب ان کو ہلاک کر دے گا، اور ایک دوسری قوم کو زمین کا مالک بنا کر ان کی جگہ قائم کر دے گا، اور بلاشبہ وہ اللہ تعالیٰ کو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے، وہ تو ہر شئے پر قادر و مسلط اور ہر شئے کا حافظ ونگہبان ہے، اور تمام کائنات اس کے یدِ قدرت میں مسخر ہے۔

اے قوم! اب بھی سمجھ اور عقل و ہوش سے کام لے، قوم نوح کے حالات سے عبرت حاصل کر اور خدا کے پیغام کے سامنے سرِ نیاز جھکا دے، ورنہ قضاء وقدر کا ہاتھ ظاہر ہو چکا ہے اور بہت قریب ہے وہ زمانہ کہ تیرا یہ سارا غرور و گھمنڈ خاک میں مل جائے گا، اور اس وقت ندامت سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

حضرت ہود علیہ السلام نے بار بار ان کو یہ بھی باور کرایا کہ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں دوست ہوں، تم سے زر وسیم اور ریاست کا طالب نہیں ہوں بلکہ تمہاری فلاح ونجاح چاہتا ہوں، میں اللہ تعالیٰ کے پیغام کے بارہ میں خائن نہیں بلکہ امین ہوں، وہی کہتا ہوں جو مجھ سے کہا جاتا ہے۔ جو کچھ کہتا ہوں قوم کی سعادت اور حسنِ حال ومال کے لیے کہتا ہوں، بلکہ دائمی وسرمدی نجات کے لیے کہتا ہوں۔ تم کو اپنی ہی قوم کے ایک انسان پر خدا کے پیغام نازل ہونے سے تعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ قدیم سے خدا کی سنت جاریہ ہے کہ انسانوں کی ہدایت وسعادت کے لیے ان ہی میں سے ایک شخص کو چن لیتا اور اپنا رسول بنا کر اس کو خطاب کرتا ہے اور اپنی مرضیات و نامرضیات سے اس کی معرفت اپنے بندوں کو مطلع کرتا رہتا ہے، اور فطرت کا تقاضا بھی تو یہی ہے کہ کسی قوم کے رشد وہدایت کے لیے ایسے شخص کا ہی انتخاب کیا جائے جو بول چال میں ان ہی کی طرح ہو، ان کے اخلاق و عادات کا واقف و دانا ہو، ان کے خصوصی امتیازات سے آشنا، اور ان ہی کے ساتھ زندگی گزارتا رہا ہو کہ اسی سے قوم مانوس ہو سکتی ہے اور وہی ان کا صحیح ہادی مشفق بن سکتا ہے۔

عاد نے جب یہ سنا تو وہ عجیب حیرت میں پڑ گئے، ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایک خدا کی پرستش کے کیا معنی؟ وہ غم وغصہ میں آ گئے کہ کس طرح ہم باپ دادا کی ریت "اصنام پرستی" کو چھوڑ دیں؟ یہ تو ہماری اور ہمارے باپ دادا کی سخت توہین ہے، ان کا غیظ وغضب بھڑک اٹھا کہ ان کو کافر اور مشرک کیوں کہا جاتا ہے جبکہ وہ بتوں کو خدا کے سامنے اپنا شفیع مانتے ہیں؟ ان کے نزدیک ہود علیہ السلام کی بات مان لینے میں ان کے معبودوں اور بزرگوں کی توہین وتحقیر تھی جن کو وہ خدائے اکبر کی بارگاہ میں اپنا وسیلہ اور شفیع مانتے تھے اور اسی لیے ان تصویروں اور مجسموں کو پوجتے تھے کہ وہ خوش ہو کر ہماری سفارش کریں گے اور عذابِ الٰہی سے نجات دلائیں گے۔

آخر وہ شعلہ کی طرح بھڑک اٹھے اور حضرت ہود علیہ السلام سے بگڑ کر کہنے لگے تو نے "ہم کو اپنے خدا کے عذاب کی دھمکی دی اور ہم کو اس سے یہ کہہ کر ڈرایا"۔

﴿إِنِّيٓ أَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيمٍ ۝﴾ (الشعراء: ۱۳۵)

"میں تمہارے اوپر بڑے دن کے عذاب آنے سے ڈرتا ہوں (کہ کہیں تم اس کے مستحق نہ ٹھہر جاؤ)۔"

تو اے ہود (علیہ السلام)! اب ہم سے تیری روز روز کی نصیحتیں نہیں سنی جاتیں، ہم ایسے ناصح مشفق سے باز آئے، اگر تو واقعی اپنے قول میں سچا ہے تو وہ عذاب جلد لے آ کہ ہمارا تیرا قصہ پاک ہو۔

﴿فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ إِن كُنتَ مِنَ الصّٰدِقِينَ ۝﴾(الاعراف:۷۰)

"پس لا تو ہمارے پاس اس شئے کو جس کا تو ہم سے وعدہ کرتا ہے اگر تو واقعی سچوں میں سے ہے"۔

حضرت ہود علیہ السلام نے جواب دیا کہ اگر میری مخلصانہ اور صادقانہ نصائح کا یہی جواب ہے تو بسم اللہ اور تم کو عذاب کا اگر اتنا ہی شوق ہے تو وہ بھی کچھ دور نہیں۔

﴿قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ ۖ﴾ (الاعراف:۷۱)

"بلاشبہ تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر عذاب و غضب آ پہنچا"۔

تم کو شرم نہیں آتی کہ تم چند خود ساختہ بتوں کو ان کے نام گھڑ کر پکارتے ہو اور تم اور تمہارے آباؤ اجداد ان کو خدا کی دی ہوئی دلیل کے بغیر من گھڑت طریقہ پر ان کو اپنا شفیع اور سفارشی مانتے ہو، اور میرے روشن دلائل سے انحراف اور سرکشی کر کے عذاب کے طالب ہوتے ہو، اگر ایسا ہی شوق ہے تو اب تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں کہ وقت قریب آ پہنچا۔

﴿أَتُجَادِلُونَنِي فِي أَسْمَاءٍ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا نَزَّلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ ۚ فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ ۝﴾(الاعراف:۷۱)

"کیا تم مجھ سے ان من گھڑت ناموں (بتوں) کے بارہ میں جھگڑتے ہو جس کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے گھڑ لیا ہے کہ جس کے متعلق تمہارے پاس خدا کی کوئی حجت نہیں آئی پس اب تم (عذاب الٰہی کا) انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"۔

الحاصل قوم ہود (عاد) کی انتہائی شرارت و بغاوت اور اپنے پیغمبر کی تعلیم سے بے پناہ بغض و عناد کی پاداش عمل اور قانون جزاء کا وقت آ پہنچا اور غیرت حق حرکت میں آئی اور عذاب الٰہی نے سب سے پہلے خشک سالی کی شکل اختیار کی، عاد سخت گھبرائے پریشان ہوئے اور عاجز و درماندہ نظر آنے لگے تو حضرت ہود علیہ السلام کو جوش ہمدردی نے اُکسایا اور مایوسی کے بعد پھر ایک مرتبہ ان کو سمجھایا کہ راہ حق اختیار کرلو، میری نصائح پر ایمان لے آؤ کہ یہی نجات کی راہ ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ورنہ پچھتاؤ گے، لیکن بدبخت و بدنصیب قوم پر کوئی اثر نہ ہوا، بلکہ بغض و عناد اور دوبالا ہو گیا۔ ہولناک عذاب نے ان کو آ گھیرا، آٹھ دن اور سات راتیں پیہم تیز و تند ہوا کے طوفان اُٹھے اور ان کو اور ان کی آبادی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا، تنومند اور قوی ہیکل انسان جو اپنی جسمانی قوتوں کے گھمنڈ میں سرمست سرکشی تھے اس طرح بے حس و حرکت پڑے نظر آتے تھے جس طرح آندھی سے تناور درخت بے جان ہو کر گر جاتا ہے، غرض ان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا تا کہ آنے والی نسلوں کے لیے عبرت بنیں اور دنیا و آخرت کی لعنت اور عذاب ان پر مسلط کر دیا گیا کہ وہ اس کے مستحق ✽ تھے اور حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے مخلص پیروان اسلام خدا کی رحمت و نعمت میں عذاب الٰہی

✽ ان ہلاک شدگان کی تعداد مفسرین نے تین سے چار ہزار تک بتائی ہے جیسا کہ روح المعانی وغیرہ میں مذکور ہے لیکن قرآن عزیز نے جس طرح ان کی شوکت و حکومت کا تذکرہ کیا ہے اور بنو سام کی قدیم تاریخ سے جیسا پتہ چلتا ہے اس اعتبار سے یہ تعداد بہت زیادہ ہونی چاہئے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

سے محفوظ رہے اور سرکش قوم کی سرکشی وبغاوت سے مامون ہو گئے۔

یہ ہے عاد اولیٰ کی وہ داستان عبرت جو اپنے اندر چشم عبرت بیں کے لیے بیشمار پندونصائح رکھتی اور خدائے برتر کے احکام کی تعمیل اور تقویٰ وطہارت کی زندگی کی جانب دعوت دیتی ہے شرارت، سرکشی اور خدا کے احکام سے بغاوت کے انجام بد سے آگاہ کرتی اور وقتی خوش عیشی پر گھمنڈ کر کے نتیجہ کی بدبختی پر مذاق اڑانے سے ڈراتی اور باز رکھتی ہے۔

غرض ہود علیہ السلام کے اس واقعہ کا تفصیلی ذکر قرآن عزیز نے جس عبرت آموز طریقہ پر کیا ہے اس کو پڑھیے اور موعظت و عبرت، اور گراں مایہ پندونصائح کا سامان فراہم کیجیے کہ دنیا وآخرت کی سعادت وفلاح کا یہی بہترین ذخیرہ ہے۔

﴿وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ۝ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَاۗءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰي رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ۭ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ۭ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَاۗءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۶۵-۷۲)

"اور اسی طرح ہم نے قوم عاد میں اس کے بھائی بندوں میں سے ہود (علیہ السلام) کو بھیجا، اس نے کہا: "اے قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا معبود نہیں، کیا تم (انکار وبدعملی کے نتائج سے) نہیں ڈرتے؟ اس پر قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا تھا، کہا: "ہمیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تم حماقت میں پڑ گئے ہو اور ہمارا خیال یہ ہے کہ تم جھوٹ بولنے والوں میں سے ہو، ہود نے کہا بھائیو! میں احمق نہیں ہوں میں تو اس کی طرف سے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے فرستادہ ہوں میں اس کا پیام تمہیں پہنچاتا ہوں اور یقین کرو کہ تمہیں دیانت داری کے ساتھ نصیحت کرنے والا ہوں کیا تمہیں اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ ایک ایسے آدمی کے ذریعہ تمہارے پروردگار کی نصیحت تم تک پہنچی جو خود تم ہی میں سے ہے خدا یہ احسان یاد کرو کہ قوم نوح کے بعد تمہیں اس کا جانشین اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت توانائی بخشی، پس چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی یاد سے غافل نہ ہوتا کہ ہر طرح کامیاب ہو، انہوں نے کہا: "کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے کہ ہم صرف ایک ہی خدا کے پجاری ہو جائیں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں" اگر تم سچے

ہوتو وہ بات لادکھاؤ جس کا ہمیں خوف دلا رہے ہو" ہود علیہ السلام نے کہا: "یقین کرو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب واقع ہوگیا ہے (کہ عقلیں ماری گئی ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے کو تباہی کے حوالے کر رہے ہو) کیا ہے جس کی بناء پر تم مجھ سے جھگڑ رہے ہو؟ محض چند نام جو تم نے اور تمہارے بزرگوں نے اپنے جی سے گھڑ لیے ہیں اور جن کے لیے خدا نے کوئی سند نہیں اتاری، اچھا (آنے والے وقت کا) انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کروں گا۔ پھر ایسا ہوا کہ ہم نے ہود کو اور اس کے ساتھیوں کو اپنی رحمت سے بچالیا اور جنہوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائی تھیں ان کی بیخ و بنیاد تک اکھاڑ دی حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی ایمان لانے والے نہ تھے۔"

﴿وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝۵۰ یٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۵۱ وَ یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ یَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ ۝۵۲ قَالُوْا یٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَةٍ وَّ مَا نَحْنُ بِتَارِكِیْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَ مَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝۵۳ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْۤا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝۵۴ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝۵۵ اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝۵۶ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَیْكُمْ ؕ وَ یَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۚ وَ لَا تَضُرُّوْنَهٗ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ ۝۵۷ وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا هُوْدًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَ نَجَّیْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ ۝۵۸ وَ تِلْكَ عَادٌ ۙ۫ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ وَ اتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ۝۵۹ وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۝۶۰﴾ (ہود: ۵۰-۶۰)

"اور ہم نے (قوم) عاد کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے ہود (علیہ السلام) کو بھیجا ہود علیہ السلام نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں یقین کرو تم اس کے سواء کچھ نہیں ہو کہ (حقیقت کے خلاف) افتراء پردازیاں کر رہے ہو اے میری قوم کے لوگو! میں اس بات کے لیے تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا، میرا بدلہ تو اسی پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔ پھر کیا تم (اتنی صاف بات بھی) نہیں سمجھتے؟ اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے پروردگار سے (اپنے قصوروں کی) مغفرت مانگو اور (آئندہ کے لیے) اس کی جناب میں توبہ کرو، وہ تم پر برستے ہوئے بادل بھیجتا ہے (جس سے تمہارے کھیت اور باغ شاداب ہو جاتے ہیں) اور تمہاری قوتوں پر نئی نئی قوتیں بڑھاتا ہے (کہ روز بروز گھٹنے کی جگہ

بڑھتے جاتے ہو) اور (دیکھو) جرم کرتے ہوئے اس سے منہ نہ موڑو۔" (ان لوگوں نے کہا: "اے ہود تو ہمارے پاس کوئی دلیل لے کر تو آیا نہیں (جسے ہم دلیل سمجھیں) اور ہم ایسا کرنے والے نہیں کہ تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں، ہم تجھ پر ایمان لانے والے نہیں، ہم جو کچھ کہہ سکتے ہیں، وہ تو یہ ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی معبود کی تجھ پر مار پڑ گئی ہے (اسی لیے اس طرح کی باتیں کرنے لگا ہے) ہود علیہ السلام نے کہا: "میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ جن ہستیوں کو تم نے اس کا شریک بنا رکھا ہے، مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں تم سب مل کر میرے خلاف جو کچھ تدبیریں کر سکتے ہو ضرور کرو، اور مجھے (ذرا بھی مہلت نہ دو، پھر دیکھ لو، نتیجہ کیا نکلتا ہے؟) میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی، کوئی چلنے والا وجود نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی پیشانی کے بالوں سے پکڑ رکھا ہے (یعنی کوئی حرکت کرنے والی ہستی نہیں کہ اس کے قبضہ سے باہر ہو) میرا پروردگار (حق وعدل کی سیدھی راہ پر ہے) یعنی اس کی راہ ظلم کی راہ نہیں ہو سکتی، پھر اگر (اس پر بھی) تم نے روگردانی کی تو جس بات کے لیے میں بھیجا گیا تھا وہ میں نے پہنچا دی (اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے اور مجھے تو نظر آ رہا ہے) کہ میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دے دے گا، اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے، یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگران حال ہے۔ اور (دیکھو) جب ہماری ٹھہرائی ہوئی بات کا وقت آ پہنچا تو ہم نے اپنی رحمت سے ہود کو بچا لیا جو اس کے ساتھ (سچائی پر) ایمان لائے تھے، اور ایسے عذاب سے بچایا کہ بڑا ہی سخت عذاب تھا، یہ ہے سرگذشت عاد کی۔ انہوں نے اپنے پروردگار کی نشانیاں (ہٹ دھرمی اور سرکشی کرتے ہوئے) جھٹلائیں اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی، اور ہر متکبر و سرکش کے حکم کی پیروی کی! اور ایسا ہوا کہ دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت پڑی (یعنی رحمت الٰہی کی برکتوں سے محرومی ہوئی) اور قیامت کے دن بھی۔ تو سن رکھو کہ قوم عاد کے لیے محرومی کا اعلان ہوا جو ہود کی قوم تھی۔"

﴿ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۝ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۝ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ۝ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ اِۨفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝ قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ۝ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ (المومنون: ۳۱-۴۱)

"پھر ہم نے قوم نوح (علیہ السلام) کے بعد قوموں کا ایک دوسرا دور پیدا کر دیا۔ ان میں بھی اپنا رسول بھیجا جو خود انہی میں سے تھا

(اس کی پکار بھی یہی تھی) کہ "اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، کیا تم (انکار و فساد کے نتائج بد سے) ڈرتے نہیں؟" اس کی قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی اور آخرت کے پیش آنے سے منکر تھے اور جنہیں دنیا کی زندگی میں ہم نے آسودگی دے رکھی تھی کہنے لگے: "اس سے زیادہ اس کی کیا حیثیت ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے جو تم کھاتے ہو یہ بھی کھاتا ہے جو کچھ تم پیتے ہو یہ بھی پیتا ہے، اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی اطاعت کر لی تو بس سمجھ لو تم تباہ ہوئے، تم سنتے ہو یہ کیا کہتا ہے؟ یہ تمہیں اُمید دلاتا ہے کہ جب مرنے کے بعد محض مٹی اور ہڈیوں کا چورا ہو جاؤ گے تو پھر تمہیں موت سے نکالا جائے گا کیسی ان ہونی بات ہے جس کی تمہیں توقع باقی ہے، زندگی تو بس یہی زندگی ہے جو دنیا میں بسر کرتے ہیں یہیں مرنا ہے اور یہیں جینا ہے، ایسا کبھی ہونے والا نہیں کہ مر کر پھر جی اُٹھیں گے، کچھ نہیں یہ ایک مفتری آدمی ہے جس نے اللہ کے نام سے جھوٹ موٹ بات بنا دی، ہم کبھی اس پر یقین لانے والے نہیں، اس پر اس رسول نے دعا مانگی: "خدایا! انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے، پس تو میری مدد کر" حکم ہوا "عنقریب ایسا ہونے والا ہے کہ یہ اپنے کیے پر شرمسار ہوں گے" چنانچہ فی الحقیقت ایک ہولناک آواز نے انہیں آ پکڑا اور ہم نے خس و خاشاک کی طرح انہیں پامال کر دیا، تو محرومی ہو اس گروہ کے لیے کہ ظلم کرنے والا ہے"۔

﴿ كَذَّبَتْ عَادُ ۨالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۲۵﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾ وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۳۱﴾ وَ اتَّقُوا الَّذِيْۤ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّ بَنِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۱۳۴﴾ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۳۵﴾ قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَاۤ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۴۰﴾ ﴾ (الشعراء: ۱۲۳-۱۴۰)

"عاد نے (اللہ کے) پیغام لانے والوں کو جھٹلایا جب ان کے بھائی ہود علیہ السلام نے ان کو کہا: "کیا تم کو (خدا کا ڈر نہیں؟) میں تمہارے پاس پیغام لانے والا معتبر ہوں، سو ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میرا کہا مانو، اور نہیں مانگتا میں تم سے اس پر بدلہ میرا بدلہ اس جہان کے مالک پر ہے، کیا بناتے ہو تم ہر اونچی زمین پر ایک نشان کھیلنے کو، اور بناتے ہو کاریگریاں شاید تم ہمیشہ رہو گے اور جب ہاتھ ڈالتے ہو تو ظلم کا پنجہ ہی مارتے ہو، سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو، اور ڈرو اس سے جس نے تم کو پہنچائیں وہ چیزیں جو تم جانتے ہو، پہنچائے تم کو چوپائے اور بیٹے، اور باغ اور چشمے، میں ڈرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کی آفت سے"۔ وہ بولے "ہم کو برابر ہے تو نصیحت کرے یا نہ کرے اور کچھ نہیں ہیں یہ باتیں مگر عادت ہے اگلے لوگوں کی، اور ہم پر آفت آنے والی نہیں، پھر اس کو جھٹلانے لگے، تب ہم نے ان کو غارت کر دیا۔ اس بات میں البتہ نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ

ماننے والے نہیں، اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا"۔

﴿فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ قَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ ۞ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْۤ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِیْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰی وَ هُمْ لَا یُنْصَرُوْنَ ۞﴾ (حٰم السجدہ: ۱۵۔۱۶)

"سو وہ عاد تھے وہ تو غرور کرنے لگے ملک میں ناحق، اور کہنے لگے "کون ہے ہم سے زیادہ زور و قوت میں، کیا دیکھتے نہیں کہ اللہ جس نے ان کو بنایا وہ زیادہ ہے ان سے زور میں؟ اور تھے ہماری نشانیوں کے منکر، پھر بھیجی ہم نے ان پر ہوا بڑے زور کی کئی دن جو مصیبت کے تھے، تاکہ چکھائیں ان کی رسوائی کا عذاب دنیا کی زندگانی میں، اور آخرت کے عذاب میں تو پوری رسوائی ہے"۔

﴿وَ اذْكُرْ اَخَا عَادٍ ؕ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَ قَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖۤ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۞ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۞ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ٘ وَ اُبَلِّغُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ لٰكِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۞ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِیَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ؕ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ؕ رِیْحٌ فِیْهَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۞ تُدَمِّرُ كُلَّ شَیْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا یُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ ۞ وَ لَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِیْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِیْهِ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً ۖ٘ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَ لَاۤ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ كَانُوْا یَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۞﴾

(الاحقاف: ۲۱۔۲۶)

"اور یاد کر عاد کے بھائی کو جب ڈرایا اس نے اپنی قوم کو احقاف میں اور گزر چکے تھے ڈرانے والے اس کے سامنے سے اور پیچھے سے (یہ کہتے ہوئے) کہ بندگی نہ کرو کسی کی اللہ کے سوائے میں ڈرتا ہوں تم پر آفت سے ایک بڑے دن کی، بولے! کیا تو آیا ہمارے پاس کہ پھیر دے ہم کو ہمارے معبودوں سے، سو لے آ ہم پر جو وعدہ کرتا ہے اگر ہے تو سچا"۔ کہا یہ خبر تو اللہ ہی کو ہے اور میں تو پہنچا دیتا ہوں جو کچھ بھیج دیا ہے میرے ہاتھ، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ نافرمانی کرتے ہو، پھر جب دیکھا اس (عذاب کو) ابر سامنے آیا ہوا اپنی وادیوں کے، بولے! یہ ابر ہے ہمارے اوپر برسے گا" کوئی نہیں" یہ تو وہ چیز ہے جس کی تم جلدی کرتے تھے ہوا ہے جس میں عذاب ہے، دردناک، اکھاڑ پھینکے ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے،

پھر کل کے دن رہ گئے کہ کوئی نظر نہیں آتا تھا سوائے ان کے گھروں کے، یوں ہم سزا دیتے ہیں گنہگار لوگوں کو اور ہم نے مقدور دیا تھا ان کو ان چیزوں کا جن کا تم کو مقدور نہیں دیا اور ہم نے ان کو دیے تھے کان اور آنکھیں اور دل، پھر کام نہ آئے کان ان کے اور نہ آنکھیں ان کی اور نہ دل ان کے کسی چیز میں، اس لیے کہ منکر ہوتے تھے اللہ کی باتوں سے اور اُلٹ پڑی ان پر جس بات سے کہ وہ ٹھٹھا کرتے تھے۔"

﴿وَ فِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ۚ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴾(الذاریات: ۴۱۔۴۲)

اور قوم عاد (کے ہلاک ہونے میں بھی قدرت خدا کی بڑی نشانیاں ہیں) جب ہم نے ان پر ایک منحوس آندھی چلائی جس چیز سے ہو کر گزرتی اس کو بوسیدہ ہڈی کی طرح (چورا) کیے بدون نہ چھوڑتی۔"

﴿كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ۞ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ۞ تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ۞ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ۞﴾ (القمر: ۱۸۔۲۱)

"جھٹلایا عاد نے پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا۔ ہم نے بھیجی ان پر ہوا تند، ایک نحوست کے دن جو ٹلنے والی نہ تھی اکھاڑ پھینکا لوگوں کو گویا وہ جڑیں ہیں کھجور کی اکھڑی پڑی، پھر کیسا رہا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا۔"

﴿وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۞ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۞ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۞﴾(الحاقة: ۶۔۸)

"اور وہ جو عاد تھے سو برباد ہوئے ٹھنڈی سناٹے کی ہوا سے کہ نکلی جائے ہاتھوں سے، مقرر کر دیا اس کو ان پر سات رات اور آٹھ دن لگاتار، پھر تو دیکھے کہ وہ لوگ اس میں بچھڑ گئے گویا وہ جڑیں ہیں کھجور کی، پھر تو دیکھتا ہے کوئی ان میں اُن کا بچا؟"

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۞ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۞ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۞﴾(الفجر: ۶۔۸)

"تو نے دیکھا، کیسا کیا تیرے رب نے عاد ارم کے ساتھ جو تھے بڑے ستونوں والے کہ ان جیسی (چیز) سارے شہروں میں نہیں بنائی گئیں۔"

حضرت ہود علیہ السلام کی وفات:

اہل عرب حضرت ہود علیہ السلام کی وفات اور ان کی قبر مبارک کے متعلق مختلف دعوے کرتے ہیں، مثلاً اہل حضرموت کا دعویٰ ہے کہ عاد کی ہلاکت کے بعد وہ حضرموت کے شہروں میں ہجرت کر آئے تھے، وہیں ان کی وفات ہوئی اور وادی برہوت کے قریب حضرموت کے مشرقی حصہ میں شہر تریم سے قریباً دو مرحلے پر دفن ہوئے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک اثر منقول ہے کہ ان کی قبر حضرموت میں کثیب احمر (سرخ ٹیلہ) پر ہے اور ان کے سرہانے

جھاؤ کا درخت کھڑا ہے۔

اور اہل فلسطین کا دعویٰ ہے کہ وہ فلسطین میں دفن ہیں، اور انہوں نے وہاں ان کی قبر بھی بنا رکھی ہے اور اس کا سالانہ عرس بھی کرتے ہیں۔ [1]

مگر ان تمام روایات میں سے حضر موت کی روایت صحیح اور معقول معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ عاد کی بستیاں حضر موت ہی کے قریب تھیں، لہٰذا قرینہ یہی چاہتا ہے کہ ان کی تباہی کے بعد قریب ہی کی آبادیوں میں حضرت ہود (علیہ السلام) نے قیام فرمایا ہوگا اور وہیں پیغام اجل کو لبیک کہا اور وہ یہی حضر موت کا مقام ہے۔

چند عبرتیں:

علاوہ اس خاص عبرت کے جس کا ذکر اس طویل واقعہ میں ہو چکا ہے، یہ چند عبرتیں بھی قابل توجہ اور نظر التفات کے لائق ہیں۔

① جو شخص قوم عاد کے واقعہ کو پڑھتا ہے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسی ہستی کا تصور آ جاتا ہے جو وقار اور متانت کا مکمل مجسمہ ہے اور شرافت و نجابت چہرہ سے عیاں، جو کچھ کہتا ہے پہلے اس کو وزن کر لیتا ہے کہ اس کا انجام نیک ہے یا بد، قوم کی درشتی، تمسخر واستہزاء کا جواب ضبط و صبر سے دیتا اور پھر بھی ان کی بھلائی کا جویاں نظر آتا ہے، اخلاص اور حسن نیت اس کی پیشانی سے عیاں ہے، اس کی قوم کہتی ہے:

﴿إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ۝﴾ (الاعراف: ٦٦)

"بے شک ہم تجھ کو بے وقوف پاتے ہیں اور بیشک ہم تجھ کو جھوٹوں میں شمار کرتے ہیں۔"

مگر وہ اس کا جواب دیتا ہے:

﴿يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ ۝﴾ (الاعراف: ٦٧۔٦٨)

"اے قوم! میں بے وقوف نہیں ہوں، البتہ میں جہانوں کے پروردگار کی جانب سے رسول ہوں تم تک اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور میں تمہارے لیے امانت دار خیر خواہ ہوں۔"

یہ سوال و جواب ہم کو توجہ دلاتے ہیں کہ خدا کے برگزیدہ انسان جب کسی کی نیک خواہی کرتے اور کجرووں کی کجی کو سیدھا کرنے کے لیے نصیحت فرماتے ہیں تو کور چشموں اور بد باطنوں کی ہرزہ سرائی تمسخر و تحقیر کی پرواہ نہیں کرتے، دل گیر و رنجیدہ ہو کر امر حق سے منہ نہیں موڑتے ناراض ہو کر خیر خواہی اور نصیحت کوشی کو نہیں چھوڑتے، اور بلندی اخلاق اور نرمی و مہربانی کے ساتھ روحانی مریضوں کے علاج میں مشغول رہتے ہیں اور ان کی ان تمام خصوصیات میں نمایاں امتیاز یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس نصیحت و نیک خواہی کے لیے قوم سے مطلق کسی قسم کے نفع کے خواہش مند نہیں ہوتے اور ان کی زندگی بدلہ اور عوض سے یکسر بلند اور برتر ہوتی ہے۔

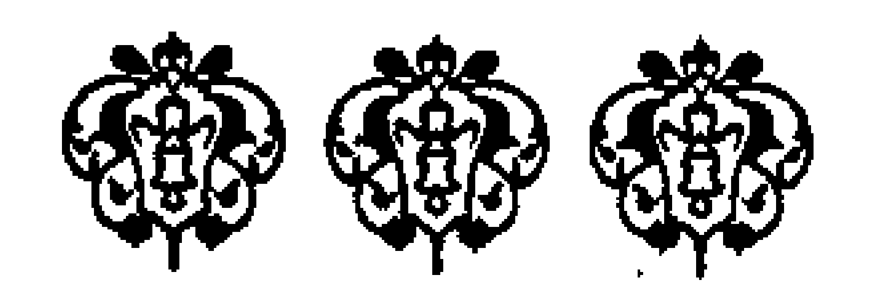
[1] قصص الانبیاء ص ۹۷

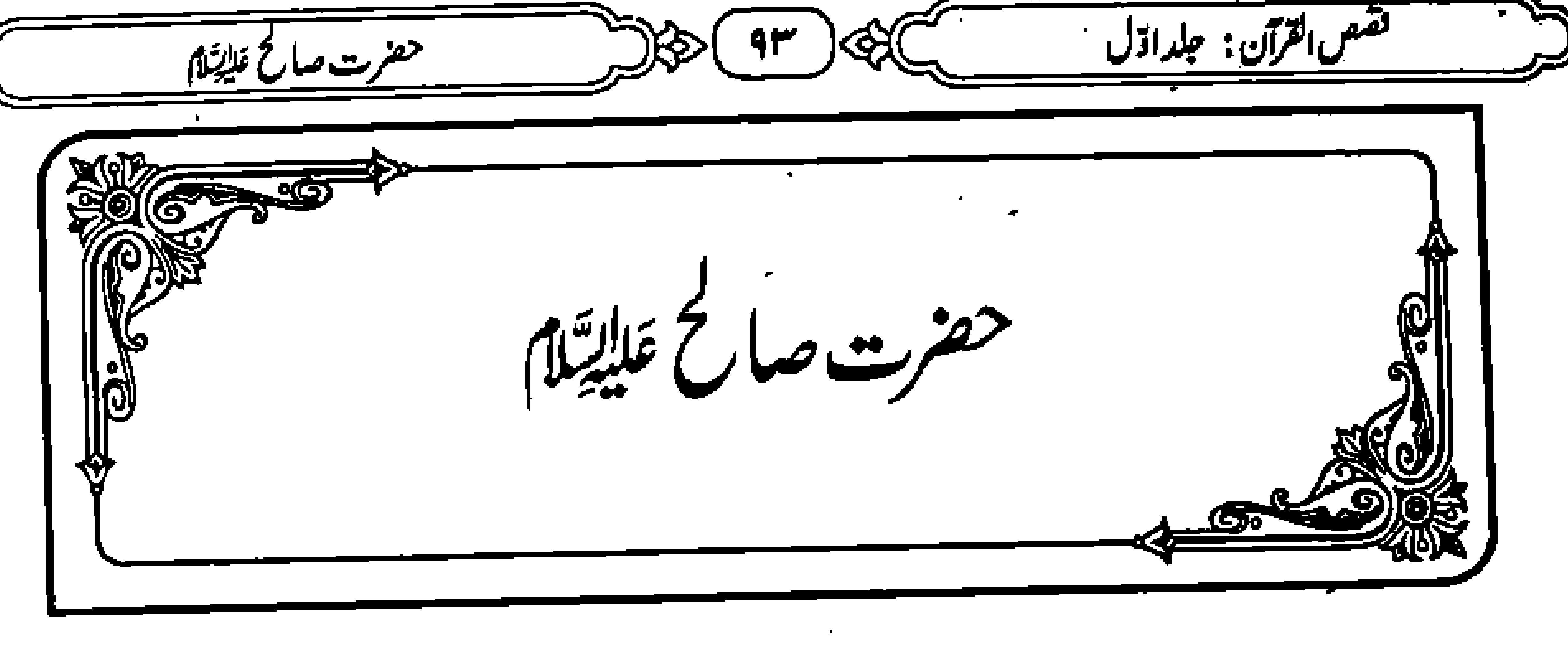
﴿لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ﴾ (ہود: ۲۹)

"اور میں تم سے اس نصیحت پر اجرت نہیں مانگتا میرا اجر تو صرف اللہ کے ذمہ ہے اور بس"۔

② حضرت ہود علیہ السلام نے لطف و مہربانی کے ساتھ اپنی قوم کو خدا کی وحدانیت پر ایمان لانے کی ترغیب دی، اس کی لازوال نعمتوں کو یاد دلایا اور آئندہ کے لیے وعدہ کیا مگر بدبخت قوم نے کسی طرح مان کر نہ دیا۔ اس کا سب سے بڑا سبب وہ جاہلانہ عقیدہ تھا کہ باپ دادا کی ریت و رسم اور ان کے خود ساختہ اصنام کی قہرمانیت کے خلاف جو شخص بھی آواز اٹھائے گا وہ ان بتوں کی پھٹکار میں آ جائے گا، یہ مہلک عقیدہ جن قوموں کے اندر اپنے جراثیم پیدا کر دیتا ہے ان قوموں کا اپنے مصلح اور اپنے نبی و پیغمبر کے ساتھ وہی سلوک ہوتا ہے جو قوم ہود اور قوم نوح کے تذکروں میں نظر آتا ہے، اپنے مصلحین اور انبیاء و صادقین کے خلاف قوموں کا بغض و عناد اسی ایک عقیدہ پر مبنی رہا ہے کہ ہمارے باپ دادا کی ریت و رسم اور ان کے خود ساختہ اصنام کی قہرمانیت کے خلاف کیوں کچھ کہا جاتا ہے، یونان کے مشہور حکیم سقراط کو زہر کا پیالہ اسی لیے پینا پڑا کہ وہ اپنی قوم کے معبودانِ باطل کی قہرمانیت کا کیوں انکار کرتا اور ان کو کس لیے ان کے غلبہ و اقتدار کا مخالف بناتا ہے۔ پس یہ جرثومہ اقوام کی روحانی زندگی کے لیے ہمیشہ تباہ کن اور ان کی فلاح و سعادت ابدی کے لیے ہلاکت آفریں رہا ہے۔

③ حضرت ہود علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی یہ سنت بہترین اسوہ ہے کہ تبلیغ و پیغامِ حق کی راہ میں بدی کا بدلہ نیکی سے دیا جائے اور تلخی کا جواب شیریں کلامی سے پورا کیا جائے، البتہ مبلغ ان کی بدکرداری اور مسلسل سرکشی پر اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون "جزائے عمل یا پاداشِ عمل" کو ضرور یاد دلائے اور آنے والے انجامِ بد پر یقیناً ان کو تنبیہ کرے اور یہ حقیقت بار بار سامنے لائے کہ جب کوئی قوم اجتماعی سرکشی، ظلم اور بغاوت پر آمادہ ہو جاتی اور اس پر پیہم اصرار کرتی رہتی ہے تو پھر خدائے تعالیٰ کا قہر و غضب اس کو صفحۂ عالم سے مٹا دیا کرتا ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے چنانچہ قوم نوح اور قوم ہود اس کی عبرت آموز مثالیں ہیں۔





حضرت صالح علیہ السلام

○ حضرت صالح (علیہ السلام) کا ذکر قرآن عزیز میں، ○ حضرت صالح اور ثمود کا نسب نامہ ○ ثمود کی آبادیاں ○ اہل ثمود کا دین ○ قرآن عزیز میں قصص کا مطلب معجزہ کی حقیقت ○ ناقہ کا واقعہ ○ ناقہ ثمود کے لیے خدا ایک نشان تھی ○ ثمود کے ہاتھوں ناقہ کی ہلاکت ○ واقعہ سے متعلق چند عبرتیں۔

حضرت صالح علیہ السلام اور ثمود کا ذکر قرآن عزیز میں:

قرآن عزیز میں صالح علیہ السلام کا نام آٹھ جگہ آیا ہے، حسب ذیل اعداد اس کی تصدیق کرتے ہیں:

نام سورہ	آیات	میزان
اعراف	۷۳، ۷۵، ۷۷	۳
ہود	۶۱، ۶۲، ۶۶، ۸۹	۴
شعراء	۱۴۲	۱
		کل = ۸

حضرت صالح علیہ السلام جس قوم میں پیدا ہوئے اس کو ثمود کہتے ہیں اور ثمود کا ذکر نو سورتوں میں کیا گیا ہے ذیل کا نقشہ اس کو واضح کرتا ہے۔

اعراف	ہود	حجر	نمل	فصلت	النجم	القمر	الحاقہ	الشمس

حضرت صالح علیہ السلام اور ثمود کا نسب نامہ:

علماء انساب قوم ثمود کے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کے نسب نامہ میں مختلف نظر آتے ہیں۔ مشہور حافظ حدیث امام بغوی نے آپ کا نسب اس طرح بیان کیا ہے۔ "صالح بن عبید بن آسف بن ماشح بن عبید بن حادر بن ثمود" اور وہب بن منبہ مشہور تابعی اس طرح نقل کرتے ہیں۔ "صالح بن عبید بن جابر بن ثمود"۔ [1]

اگرچہ بغوی زمانہ کے اعتبار سے وہب سے بہت بعد میں ہیں اور وہب تورات کے بہت بڑے عالم بھی ہیں تاہم حضرت

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ اعراف۔

صالح علیہ السلام سے ثمود تک نسب کی جو کڑیاں بغوی نے جوڑی ہیں علماء انساب کے نزدیک وہی تاریخی حیثیت سے راجح اور قرین صواب ہیں۔

اس نسب نامہ سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس قوم کو (جس کے ایک فرد حضرت صالح علیہ السلام بھی ہیں) ثمود اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے نسب نامہ کا جد اعلیٰ ثمود ہے، اور اسی کی جانب یہ قبیلہ یا قوم منسوب ہے۔

ثمود سے حضرت نوح علیہ السلام تک بھی دو قول ہیں۔ اوّل: ثمود بن عامر بن ارم بن سام۔ دوم: ثمود بن عاد بن عوص بن ادم بن سام بن نوح علیہ السلام۔

سید محمود آلوسی صاحب تفسیر روح المعانی فرماتے ہیں کہ امام ثعلبی دوسرے قول کو راجح سمجھتے ہیں۔ ❶

بہر حال ان دونوں روایتوں سے یہ باتفاق ثابت ہوتا ہے کہ قوم ثمود بھی سامی اقوام ہی کی ایک شاخ ہے اور غالباً بلکہ یقیناً یہی وہ افراد قوم ہیں جو عاد اولیٰ کی ہلاکت کے وقت حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ بچ گئے تھے اور یہی نسل عاد ثانیہ کہلائی، اور بلاشبہ یہ قوم بھی عرب بائدہ (ہلاکت شدہ عربی نسل) میں سے ہے۔

ثمود کی بستیاں:

ثمود کہاں آباد تھے اور کس خطہ میں پھیلے ہوئے تھے؟ اس کے متعلق یہ طے شدہ امر ہے کہ ان کی آبادیاں حجر میں تھیں، حجاز اور شام کے درمیان وادی قریٰ تک جو میدان نظر آتا ہے یہ سب ان کا مقام سکونت ہے، اور آج کل "فج الناقہ" کے نام سے مشہور ہے۔

ثمود کی بستیوں کے کھنڈرات اور آثار آج تک موجود ہیں، اور اس زمانہ میں بھی بعض مصری اہل تحقیق نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ان کا بیان ہے کہ وہ ایک ایسے مکان میں داخل ہوئے جو "شاہی حویلی" کہی جاتی ہے، اس میں متعدد کمرے ہیں اور اس حویلی کے ساتھ ایک بہت بڑا حوض ہے اور یہ پورا مکان پہاڑ کاٹ کر بنایا گیا ہے۔

عرب کا مشہور مؤرخ مسعودی لکھتا ہے:

و رممهم باقية و اثارهم بادية فی طريق من ورد من الشام. (ج ۳ ص ۱۳۹)

"جو شخص شام سے حجاز کو آتا ہے اس کی راہ میں ان کے مٹے نشان اور بوسیدہ کھنڈرات پڑتے ہیں"۔

حجر کا یہ مقام جو حجر ثمود کہلاتا ہے شہر مدین سے جنوب مشرق میں اس طرح واقع ہے کہ خلیج عقبہ اس کے سامنے پڑتی ہے اور جس طرح عاد کو عاد ارم کہا گیا ہے (حتیٰ کہ قرآن عزیز نے ارم کو ان کی مستقل صفت ہی بنا دیا) اسی طرح ان کی ہلاکت کے بعد ان کو ثمود ارم یا عاد ثانیہ کہا جاتا ہے۔

مشرق خصوصاً عرب کے بارہ میں یورپ کے مستشرقین ❷ جس طرح اپنی حذاقت و مہارت تاریخ کا ثبوت دیا کرتے ہیں اور تحقیق کے نام سے غلط دعاوی کرنے کے عادی ہیں اسی طرح انہوں نے ثمود کو بھی اپنی تحقیق کا تختہ مشق بنایا ہے، وہ سوال کرتے ہیں

---

❶ جلد اوّل ص ۱۴۲

❷ یورپ میں جو علماء مشرق کی تاریخ اور مشرقی علوم سے شغف رکھتے اور ان کے متعلق مباحث و نظریات قائم کرتے ہیں ان کو مستشرق کہتے ہیں، ان میں سے بعض اگرچہ حقیقتہً حذاقت و مہارت رکھتے ہیں، مگر اکثر محض ظنی اور تخمینی بلکہ من گھڑت نظریے قائم کر کے مشرق سے یا تعصب کا ثبوت دیتے ہیں یا اپنی کم مائیگی علم کا۔

کہ ثمود کی اصل کیا ہے اوران کا وجود کب ہوا اور کس زمانہ میں؟ اس سوال کے جواب میں ان کے دو گروہ ہیں۔ ایک فریق کہتا ہے کہ یہ یہود کا ایک گروہ تھا جو فلسطین میں داخل نہیں ہوا تھا اور یہیں بس گیا تھا، مگر یہ قول نہ صرف پایہ تحقیق سے گرا ہوا ہے بلکہ قطعاً غلط اور مہمل ہے، اس لیے کہ تمام مؤرخین باتفاق آراء یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ابھی وہ زمانہ قریب بھی نہ آیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکلتے کہ ثمود کی آبادیاں ہلاک و تباہ ہو چکی تھیں اور ان کا قلع قمع ہو چکا تھا، نیز قرآن عزیز تصریح کرتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قوم فرعون نے جھٹلایا تو آل فرعون ہی میں سے ایک مرد مومن نے یہ کہہ کر اپنی قوم کو ڈرایا کہ تمہاری اس تکذیب کا نتیجہ کہیں وہی نہ ہو جو تم سے پہلے قوم نوح، عاد اور ثمود اور ان کے بعد کی قوموں کا اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی وجہ سے ہوا تھا۔

مستشرقین کی دوسری جماعت کہتی ہے کہ یہ عمالقہ میں سے تھے اور فرات کے مغربی ساحل سے اُٹھ کر یہاں آباد ہو گئے تھے۔

ان میں سے بعض کا یہ خیال ہے کہ یہ عمالقہ میں سے تھے جن کو مصر کے بادشاہ اَحمس نے خارج البلد کر دیا تھا اور چونکہ مصر کے زمانہ میں فن سنگ تراشی میں انہوں نے کمال حاصل کر لیا تھا اس لیے حجر جا کر پہاڑوں اور پتھروں کو تراش کر بے نظیر عمارات تعمیر کیں اور عام رائج طریقہ پر بھی عالی شان محل بنائے۔

مگر ہم عاد کے واقعہ میں یہ ثابت کر آئے ہیں کہ عاد و ثمود سامی اقوام میں سے ہیں اور یہ کہ اہل عرب ان کو محض یہود کی غلط تقلید میں عمالقہ میں سے کہہ دیتے ہیں، حالانکہ عملیق بن ارد کا اس نسل سے کوئی رشتہ نہیں ملتا۔ اس لیے یہ قول بھی صحیح نہیں ہے۔

ان تمام آراء کے خلاف محققین کی رائے یہ ہے کہ یہ عاد کا بقیہ ہیں اور یہی صحیح اور راجح قول ہے، اور اہل حضرموت کا یہ دعویٰ کہ ثمود کی آبادیاں اور محلات عاد کی صناعی کا نتیجہ ہیں، اس قول کا مخالف نہیں ہے کہ ثمود فن تعمیر میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور یہ عمارات ان کی اپنی تعمیر ہیں، اس لیے کہ عاد اولیٰ اور عاد ثانیہ بہرحال عاد ہیں۔ حضرت صالح کا اپنی قوم سے یہ خطاب بھی اسی کا مؤید ہے۔

﴿وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا﴾ (الاعراف: ۷۴)

"اور تم اس وقت کو یاد کرو کہ تم کو خدا نے عاد کے بعد ان کا قائم مقام بنایا اور تم کو زمین پر جگہ دی کہ تم اس کی سطح اور نرم حصوں پر محلات بناتے ہو اور سنگ تراشی کر کے پہاڑوں میں مکان تراشتے ہو۔"

رہا ثمود کے زمانہ کا مسئلہ سو اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن منضبط وقت نہیں بتایا جا سکتا، اس لیے کہ تاریخ اس بارہ میں غیر مطمئن ہے، البتہ یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کا زمانہ ہے اور وہ اس جلیل القدر پیغمبر کی بعثت سے بہت پہلے ہلاک ہو چکے تھے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ثمود کی آبادیوں کے قریب بعض ایسی قبریں پائی جاتی ہیں کہ جن پر آرامی زبان کے کتبے لگے ہوئے ہیں اور ان کتبوں پر جو تاریخ کندہ ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے کی ہے، تو اس سے یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ یہ قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد وجود میں آئی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

یہ دراصل ان لوگوں کی قبریں ہیں جو اس قوم کی ہلاکت کے ہزاروں برس کے بعد اتفاقاً یہاں آ کر بس گئے ہیں اور انہوں

نے اپنے بزرگوں کے آثار کی قدامت ظاہر کرنے کے لیے آرامی خط میں (جو کہ قدیم خط ہے) اپنے کتبے لکھ کر لگا دیئے تا کہ یادگار رہیں ورنہ وہ قبریں نہ ثمود کی ہیں اور نہ ان کا یہ زمانہ ہے۔

مصر کا مشہور عیسائی مؤرخ جورجی زیدان اپنی کتاب "العرب قبل الاسلام" میں اسی کے قریب قریب لکھتا ہے، کہتا ہے:

"آثار و کتبات کے پڑھنے سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ صالح (علیہ السلام) کی قوم کی بستیاں ولادت مسیح سے کچھ پہلے نبطیوں کے اقتدار میں آ گئی تھیں، یہ لوگ بطرہ کے ساکنین میں سے تھے، (جن کا ذکر عنقریب کتاب میں آنے والا ہے) اور ان کے آثار اور ٹیلوں کو بہت سے مستشرقین نے خود دیکھا ہے اور مقدمہ کتاب میں اس کا ذکر تفصیل سے کر چکا ہوں، ان ہی کے آثار کو انہوں نے پڑھا ہے جو پتھروں پر کندہ ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم وہ کھنڈر ہیں جو قصر بنت، قبر باشا، قلعہ اور برج کے ناموں سے موسوم ہیں۔ ان پر جو کچھ تحریر ہے وہ نبطی تحریر میں ہے اور ان میں سے بعض یا سب کی سب وہی تحریریں ہیں جو قبروں پر کندہ ہیں۔"

مستشرقین نے یہاں جو کچھ پایا ان میں سے حسب ذیل ایک کتبہ بھی ہے جو پتھر پر نبطی حروف میں کندہ ہے اور ولادت مسیح علیہ السلام سے قریب زمانہ کا مکتوب ہے (کندہ عبارت کا مضمون یہ ہے) "مقبرہ کمکم بنت وائلہ بنت حرم نے اور کمکم کی بیٹی کلیبہ نے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے بنوایا ہے۔ اس کی بناء بہت اچھے مہینوں میں شروع کی گئی ہے، یہ نبطیوں کے بادشاہ حارث کی تخت نشینی کا نواں سال ہے، وہ حارث جو اپنے قبیلے کا عاشق صادق ہے۔

پس "عمی ذوالشری ✿ وعرشہ"؟ لات، عمند، منوت اور قیس کی ان پر لعنت ہو جو ان قبروں کو فروخت کرے یا رہن رکھے، یا ان سے کسی جسم کو یا عضو کو نکالے، یا کمکم، اس کی بیٹی اور اس کی اولاد کے علاوہ کسی کو دفن کرے۔

اور جو شخص بھی اس پر لکھے ہوئے کی مخالفت کرے اس پر ذوالشری ہبل، منوت کی پانچ لعنتیں ہوں، اور جو ساحر اس کے خلاف کرے اس پر ایک ہزار درہم حارثی کا تاوان واجب ہے مگر یہ کہ اس کے ہاتھ میں کمکم کلیبہ یا اس کی اولاد میں سے کسی کے ہاتھ کی تحریر ہو جس میں اس اجنبی قبر کے لیے صاف اور صریح الفاظ میں اجازت موجود ہو، اور وہ اصلی ہو جعلی نہ ہو۔

اس مقبرہ کو وہب اللاۃ بن عبادہ نے بنایا۔ ✿

اہل ثمود کا مذہب:

ثمود اپنے بت پرست پیشروؤں کی طرح بت پرست تھے، وہ خدائے واحد کے علاوہ بہت سے معبودانِ باطل کے پرستار اور شرک میں مبتلا تھے، اس لیے ان کی اصلاح اور احقاق حق کے لیے ان ہی کے قبیلہ میں سے حضرت صالح علیہ السلام کو ناصح پیغمبر اور رسول بنا کر بھیجا گیا تا کہ وہ ان کو راہ راست پر لائیں، ان کو خدا کی نعمتیں یاد دلائیں جن سے صبح و شام وہ محظوظ ہوتے رہتے ہیں اور ان پر واضح کریں کہ کائنات کی ہر شے خدا کی توحید اور یکتائی پر شاہد ہے اور یقینی دلائل اور مسکت براہین کے ساتھ ان کی گمراہی ظاہر کریں اور بتائیں کہ پرستش و عبادت کے لائق ذات اَحد کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں ہے۔

✿ سوالیہ نشان زدہ عربی عبارت کتبہ پر صاف نہیں پڑھی جا سکی اس لیے اصل الفاظ نقل کر دیے گئے۔ ✿ ص ۸۰

قرآن عزیز میں قصص کا مطلب:

قرآن عزیز کی یہ سنت ہے کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لیے گذشتہ اقوام اور ان کے ہادیوں کے واقعات وحالات بیان کر کے نصیحت وموعظت کا سامان مہیا کرتا ہے، اس کا موضوع حکایات وقصص بیان کرنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ خدائے تعالیٰ نے جبکہ انسان کو عقل کی روشنی عطا فرمائی ہے تو اس کی ہدایت ونجات اخروی کا کیا سامان مہیا کیا ہے تاکہ وہ ان اسباب کی مدد سے اپنی عقل سے کام لے اور خدا کی مرضیات ونامرضیات کو پہچانے؟ اس نے بتایا کہ خدائے تعالیٰ کی یہ سنت جاریہ ہے کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لیے ان ہی میں سے پیغمبر اور رسول بھیجتا ہے، وہ ان کو حق کی راہ بتاتے اور ہر قسم کی گمراہی سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں اور تائید میں اقوام امم کے واقعات بیان کرتا اور تاریخ ماضی کو دہراتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ جن اقوام نے اپنے رسولوں کی ہدایات کو تسلیم کیا انہوں نے دنیا وآخرت کی فلاح پائی اور جن امتوں نے ان کی تلقین کا انکار کیا، ان کا مذاق اڑایا اور ان کو جھٹلایا تو خدائے تعالیٰ نے اپنے سچے رسول کی تصدیق کے لیے کبھی بطور خود اور کبھی قوم کے مطالبہ پر ایسی نشانیاں نازل فرمائیں جو نبیوں اور رسولوں کی تصدیق کا باعث بنیں اور "معجزہ" کہلائیں۔

- لیکن اگر قوم نے اس نشانی "معجزہ" کے بعد بھی تکذیب کو نہ چھوڑا اور بغض وعناد سے وہ انکار پر اڑے رہے تو پھر "عذاب الٰہی" نے آ کر ان کو تباہ وہلاک کر دیا اور ان کے واقعات کو آنے والی اقوام کے لیے عبرت وموعظت کا سامان بنا دیا۔

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ۝﴾ (قصص: ۵۹)

"اور تیرا رب بستیوں کو اس وقت تک ہلاک کرنے والا نہیں جب تک نہ بھیج دے ان کے صدر مقام میں اپنا رسول جو پڑھ کر سنائے ان کو ہماری آیات اور ہم (اس وقت تک) بستیوں کو ہلاک نہیں کرتے جب تک ان کے بسنے والے خود ہی ظلم پر نہ اتر آئیں۔"

معجزہ کی حقیقت:

"معجزہ" لغت میں عاجز کر دینے اور تھکا دینے والی چیز کو کہتے ہیں اور اسلامی اصطلاح میں ایسے عمل کا نام ہے جو سلسلہ اسباب کے بغیر عالم وجود میں آ جائے، اس کو عام بول چال میں "خرق عادت" بھی کہتے ہیں، اور اسی بنا پر اس جگہ یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا "عادت اللہ" (کہ جس کو ناموس فطرت بھی کہا جاتا ہے) کا ٹوٹنا ممکن ہے؟

دوسرے الفاظ میں اس سوال کی تعبیر اس طرح کی جا سکتی ہے کہ کیا قانون قدرت میں تبدیلی ممکن ہے؟

اس سوال کا حل یہ ہے کہ معجزہ کی یہ تعبیر کہ وہ خارق عادت شئے کا نام ہے، غلط تعبیر ہے اس لیے کہ خدائے تعالیٰ کے قوانین قدرت یا نوامیس فطرت دراصل دو قسموں میں تقسیم ہیں، عادت عام اور عادت خاص۔ عادت عام سے قدرت کے وہ قوانین مراد ہیں جو باہم اسباب ومسببات کے سلسلہ میں جکڑے ہوئے ہیں مثلاً: آگ جلاتی ہے اور پانی خنکی پہنچاتا ہے، اور عادت خاص کا مطلب یہ ہے کہ اسباب ومسببات میں علاقہ پیدا کرنے والے ید قدرت نے کسی خاص مقصد کے لیے سبب اور مسبب کے درمیانی رشتہ کو کسی

شئے سے الگ کر دیا یا بغیر سبب کے مسبب کو وجود بخش دیا، جیسا کہ جلنے کے اسباب موجود ہونے کے باوجود کسی جسم کا آگ سے نہ جلنا، یا دو تین انسانوں کے قابل خوراک سے سو دو سو انسانوں کا شکم سیر ہو جانا اور اپنی اصل مقدار کی حد تک پھر بھی باقی بچ جانا۔

یہ دونوں باتیں چونکہ عام نگاہوں میں قانون قدرت کے خلاف ہیں اس لیے جب یہ اور اسی طرح کی کوئی شئے رونما ہوتی یا اس کے وجود پذیر ہو جانے کی اطلاع دی جاتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قدرت کے قانون یا عادت اللہ کے خلاف ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ قوانین فطرت کی پہلی قسم یعنی عام عادت کے خلاف تو ہوتا ہے مگر عادت خاص کے خلاف نہیں ہوتا اور وہ بھی قانون قدرت ہی کی ایک کڑی ہوتی ہے جو عام حالات سے الگ کسی خاص مقصد کے پورا کرنے کے لیے ظاہر کی جاتی ہے، اور اس جگہ وہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس طرح خدائے تعالیٰ اپنے سچے رسول اور پیغمبر کی صداقت وحقانیت کی تصدیق کرتا اور جھٹلانے والوں کو یہ باور کراتا ہے کہ اگر یہ مدعی رسالت اپنے دعوے میں صادق نہ ہوتا تو خدا کی تائید کبھی اس کے ساتھ نہ ہوتی، پس عام قانون قدرت سے جدا رسول و پیغمبر کا یہ عمل ظاہر کرتا ہے کہ درحقیقت یہ اس کا اپنا فعل نہیں ہے بلکہ یہ خدا کا فعل ہے جو عادت خاص کی صورت میں نبی کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوا تاکہ اس کی صداقت کی دلیل بن سکے۔

اور اس میں شک نہیں کہ اگر کسی نبی اور پیغمبر کو معجزہ نہ بھی دیا جاتا تب بھی پیغمبر کی پیغمبرانہ زندگی، کتاب ہدایت کی موجودگی، اور عقلی دلائل و براہین کی روشنی میں اس کی صداقت پر ایمان لانا ازبس ضروری ہوتا اور اس کا انکار مذہب کی اصطلاح میں کفر و جمود مانا جاتا تاہم یہ بھی ایک حقیقت تامہ ہے کہ آفتاب صبح سے زیادہ روشن عقلی و نقلی دلائل کے باوجود عوام کی فطرت اکثر و بیشتر حق وصداقت کے قبول کے لیے بھی دلائل سے زیادہ ایسے امور سے جلد متاثر ہوتی ہے جو عقل کو حیران اور دماغ کو مرعوب کر کے ان پر یہ ظاہر کر دے کہ دعوائے نبوت کے ساتھ نبی کا یہ عمل بلاشبہ خدا کی دی ہوئی ایسی طاقت رکھتا ہے جس کا مقابلہ انسانی طاقت سے بالاتر ہے اور اس کے مظاہرہ کے سامنے عاجز و درماندہ، اور وہ یقین کر لیتے ہیں کہ بے شک وشبہ اس ہستی کو خدا کی تائید حاصل ہے اور اس لیے یہ جو کچھ بھی کہتا ہے خدا کی جانب سے کہتا ہے۔

تب اس مرحلہ پر پہنچ کر "عقلیین" کا یہ کہنا کہ معجزہ دلیل نبوت نہیں ہے سراسر باطل اور حق تعالیٰ کی صداقت کو جھٹلانا ہے جو کسی طرح بھی ایمان کی علامت نہیں ہوسکتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب تک نبی اور رسول، معجزہ نہ دکھلائے نبی کی صداقت اس پر موقوف نہیں ہے لیکن اگر منکرین کے مطالبہ پر یا از خود پیغمبر خدا معجزہ کا مظاہرہ کرے تو یقیناً معجزہ دلیل نبوت ٹھہرے گا اور اس کا انکار صداقت وحقانیت کا انکار اور کفر و جمود کہلائے گا۔

پس ہر خاص و عام کے لیے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ انبیاء ورسل سے جو معجزات ثبوت اور دلالت کے اعتبار سے قطعی اور یقینی ثابت ہو چکے ہیں ان پر ایمان لائے اور ان کے وجود اور ان کی حقیقت کا اعتراف کرے۔ اس لیے کہ ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار درحقیقت اسلام سے انکار ہے۔

البتہ یہ حقیقت کبھی فراموش نہ ہونی چاہیے کہ کسی شخص سے صرف اس قسم کے خارق عادت عمل صادر ہونے کا نام معجزہ نہیں ہے اور محض اس عمل کے بروئے کار لانے سے وہ نبی نہیں ہوسکتا اس لیے کہ نبی اور رسول کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کی تمام زندگی اس طرح آزمائش و امتحان کی کسوٹی پر اتر چکی ہو کہ اس کا کوئی شعبہ زندگی ناقص اور قابل اعتراض نہ ہو بلکہ اس کی تمام

زندگی میں اخلاق کی بلندی، گناہوں سے معصومیت اور صداقت گفتار و کردار کا کمال ہی پایا جاتا ہو، پھر اگر ایسا شخص دعوائے نبوت کرتا اور اپنے دعوے کی صداقت میں علمی دلائل و براہین کے علاوہ خدا کے نشانات (معجزات) بھی پیش کرتا ہے تو بلاشبہ وہ نبی ہے اور بلاریب اس کا یہ فعل "معجزہ" ہے۔

ہم نے ابھی کہا کہ "معجزہ" درحقیقت نبی کا اپنا عمل نہیں ہوتا بلکہ وہ خدائے تعالیٰ کا فعل ہے جو نبی کے ہاتھوں سے ظاہر ہوتا اور معجزہ کہلاتا ہے، یہ اس لیے کہ نبی و رسول بھی ایک انسان اور بشر ہی ہوتا ہے اور کسی انسان کی قدرت میں یہ نہیں ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے قوانین عام و خاص میں دخل اندازی یا دراندازی کر سکے، یہ تو خدا ہی کی مرضی پر ہے کہ اگر وہ چاہے اور مناسب حال اور اقتضاء وقت سمجھے تو نبی اور رسول کے ہاتھ پر ایسے فعل کا ظہور کرا دے جو اس کے قوانین فطرت کی عادت خاص کی قسم میں داخل ہوں، اور اگر نہ چاہے تو نبی و رسول کے لیے بھی اس کا اظہار ناممکن اور محال ہے۔

غزوۂ بدر میں جبکہ تین سو تیرہ کے مقابلہ میں ساز و سامان سے مسلح ایک ہزار دشمنوں کا لشکر مسلمانوں پر یلغار کر کے آیا تھا تو آپ ﷺ نے ان کی جانب مٹھی بھر خاک پھینک دی جس کی وجہ سے ہر لشکری کی آنکھ میں خاک کے ریزے پہنچے اور وہ بے چین ہو کر آنکھیں ملنے لگا اور اس طرح مسلمانوں کو حملہ کر کے فتح حاصل ہوگئی، اس واقعہ کا مختصر اور معجزانہ انداز میں قرآن عزیز نے جس طرح تذکرہ کیا ہے وہ ہمارے اس دعویٰ کی قوی اور یقینی دلیل ہے۔

﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ﴾ (الانفال: ۱۷)

"اور تم نے (اے محمد ﷺ) وہ مٹھی بھر خاک نہیں پھینکی تھی جو تم نے (اپنے ہاتھ سے) پھینکی، لیکن وہ تو (حقیقت میں) اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی۔"

غور فرمائیے کہ اس مقام پر نبی کے اس عمل کا (جو ان کے ہاتھوں انجام پایا تھا) کس عجیب و غریب انداز سے معجزہ ہونا ثابت کیا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ اے پیغمبر! مٹھی بھر خاک بے شک تمہارے ہاتھ سے پھینکی گئی اس لیے کہ تمہارے ہاتھ میں تھی لیکن مٹی بھر خاک کا یہ اثر کہ دشمن کے محاذ کی دوری اور دشمن کے اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود ان سب کی آنکھوں میں جھونک دی گئی تمہارے ہاتھ سے ناممکن تھا، یہ درحقیقت خدا کا فعل تھا کہ اس کے ید قدرت نے ان تمام دشواریوں کو ایک لخت ختم کر کے اس مٹھی بھر خاک کو اس حالت تک پہنچا دیا کہ دشمنوں کا پورا لشکر ہزیمت کھا کر فرار کر گیا۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو آپ کے سامنے اس طرح واضح کیا گیا کہ معجزہ نبی کا اپنا فعل نہیں ہوتا بلکہ وہ براہ راست خدا کا فعل ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھوں سے اس کی تائید میں کیا جاتا ہے۔

﴿وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝﴾ (الزمر: ۷۸)

"اور کسی رسول کو طاقت میں نہیں کہ وہ کوئی نشانی (معجزہ) لا سکے خدا کی اجازت بغیر، پس جب خدا کا حکم آ پہنچتا ہے تو حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اس موقع پر جھٹلانے والے خسارہ میں پڑ جاتے ہیں۔"

﴿وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ مَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (الانعام:۱۰۹)

"اور وہ اللہ کی سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آ جائے تو اس پر ضرور ایمان لے آئیں گے (اے محمد ﷺ!) آپ کہہ دیجئے کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے قبضے میں ہیں۔ اور (اے مسلمانو! تم کو خبر نہیں کہ ان کے پاس اگر یہ نشانیاں آ بھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔"

معجزہ سے متعلق ہماری یہ بحث اسی شخص کے لیے باعث تسکین ہے جو مذہب کے اس بنیادی عقیدہ کا قائل ہو کہ تمام اشیاء کے خواص ان کے اپنے ذاتی خواص نہیں ہیں بلکہ کسی پیدا کرنے والے نے ان کو عطا کیے ہیں۔ پس جو شخص اس عقیدہ کا حامی ہے وہ بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ آگ میں جلانے کی خاصیت پیدا کرنے والے نے عام قانون قدرت اس کے لیے یہی رکھا ہے کہ جو شئے اس سے چھو جائے وہ جل جائے لیکن یہ عقلاً ناممکن نہیں ہے کہ وہ کسی اہم مقصد کی تکمیل کے لیے آگ کی اس خاصیت کو کسی خاص حالت میں سلب کر لے اور وہ اس کے قانون قدرت کی خاص حالت یا خاص عادت شمار ہو۔

لیکن جو شخص اس بنیاد ہی کو تسلیم نہیں کرتا اور ہر شئے کے خواص کو اس طرح اس کے ذاتی خواص مانتا ہے کہ کسی حالت اور کسی وقت میں بھی اس خاصیت کا اس شئے سے جدا ہونا ممکن نہیں ہے تو اس شخص سے اوّل یہ طے کرنا چاہیے کہ کیا عقل یہ باور کر سکتی ہے کہ جو شئے خود اپنے وجود میں دوسرے کی محتاج ہو اس کا کوئی خاصہ بھی ذاتی اور غیر منفک ہو سکتا ہے؟ "گذشتہ سال لندن اور امریکہ میں خدا بخش کشمیری نے دہکتی ہوئی آگ پر چلنے کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ خود بھی چلا اور دوسرے اشخاص کو بھی اپنے ساتھ آگ پر سے گزارا اور اس کے بعد تمام سائنس دانوں نے اس کے جسم کا طرح طرح سے تجربہ کر کے یہ معلوم کرنا چاہا کہ شاید وہ فائر پروف ہو مگر ناکام رہے اور ان کو اقرار کرنا پڑا کہ اس کا جسم اور آگ پر گزرنے والے دوسرے اشخاص کا جسم عام انسانوں کے جسم سے زیادہ کوئی خاص کیفیت نہیں رکھتا اور انتہائے حیرت و استعجاب کے ساتھ اس کا اعتراف کیا کہ وہ اس حقیقت کے سمجھنے سے عاجز ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ آگ موجود ہے اور نہیں جلاتی"۔ ✿ تو اس کا اس کے پاس کیا جواب ہے۔

پس علم کی فراوانی کے باوجود جبکہ ہمارے عجز کا یہ عالم ہے تو ہم کو کیا زیبا ہے کہ علم یقین (وحی) کی بیان کردہ حقیقت (معجزہ) کا اس لیے انکار کر دیں کہ ہماری عقل عام حالات میں سبب کے بغیر کسی مسبب کو دیکھنے کی عادی نہیں ہے۔

بہر حال ایسے شخص کو خدا اور اس کی صفات خصوصاً صفت قدرت پر پہلے بحث کرنی چاہیے، اس کے بعد اس مسئلہ کی نوبت آ سکتی ہے مگر اس کا اصل مقام یہ نہیں بلکہ "علم کلام" ہے۔

نَاقَةُ اللّٰهِ:

غرض حضرت صالح علیہ السلام قوم (ثمود) کو بار بار سمجھاتے اور نصیحت فرماتے رہے، مگر قوم پر مطلق اثر نہیں ہوا بلکہ اس کا بغض و عناد ترقی پاتا رہا اور ان کی مخالفت بڑھتی ہی رہی اور وہ کسی طرح بت پرستی سے باز نہ آئی، اگرچہ ایک مختصر اور کمزور جماعت نے

✿ لندن ٹائمز

ایمان قبول کرلیا اور وہ مسلمان ہو گئی، مگر قوم کے سردار اور بڑے بڑے سرمایہ دار اسی طرح باطل پرستی پر قائم رہے اور انہوں نے خدا کی دی ہوئی ہر قسم کی خوش عیشی اور رفاہیت کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے کفران نعمت کو شعار بنالیا، وہ حضرت صالح علیہ السلام کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کرتے کہ صالح! اگر ہم باطل پرست ہوتے، خدا کے صحیح مذہب کے منکر ہوتے اور اس کے پسندیدہ طریقہ پر قائم نہ ہوتے تو آج ہم کو یہ دھن دولت، سرسبز و شاداب باغات کی فراوانی، سیم وزر کی بہتات، بلند و عالی شان محلات کی رہائش، میوہ جات اور پھلوں کی کثرت، شیریں نہروں اور عمدہ مرغزاروں کی افزائش حاصل نہ ہوتی، تو خود کو اور اپنے پیروؤں کو دیکھ اور پھر ان کی تنگ حالی اور غربت پر نظر کر اور بتلا کہ خدا کے پیارے اور مقبول کون ہیں۔ ہم یا تم؟

حضرت صالح علیہ السلام فرماتے کہ تم اپنی اس رفاہیت اور عیش سامانی پر شیخی نہ مارو اور خدا کے سچے رسول اور اس کے دین برحق کا مذاق نہ اڑاؤ، اس لیے کہ اگر تمہارے کبر و غرور اور عناد کا یہی حال رہا تو پل بھر میں یہ سب کچھ فنا ہو جائے گا اور پھر نہ تم رہو گے اور نہ تمہارا یہ ساز و سامان، بیشک یہ سب کچھ خدا کی نعمتیں ہیں بشرطیکہ ان کو حاصل کرنے والے اس کا شکر ادا کریں اور اس کے سامنے سر نیاز جھکائیں اور بلاشبہ یہی سامان عذاب و لعنت ہیں اگر ان کا استقبال شیخی اور غرور کے ساتھ کیا جائے اس لیے یہ سمجھنا سخت غلطی ہے کہ ہر سامان عیش خوشنودی الٰہی کا ثمرہ ہے۔

ثمود کو یہ بھی حیرانی تھی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ہی میں کا ایک انسان خدا کا پیغمبر بن جائے اور وہ خدا کے احکام سنانے لگے، وہ سخت تعجب سے کہتے:

﴿ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَیْنِنَا﴾ (ص: ۸)

"کیا ہماری موجودگی میں اس پر (خدا کی) نصیحت اترتی ہے۔"

یعنی اگر ایسا ہونا ہی تھا تو اس کے اہل ہم تھے نہ کہ صالح، اور کبھی اپنی قوم کے کمزور افراد کو (جو کہ مسلمان ہو گئے تھے) خطاب کر کے کہتے:

﴿اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ (الاعراف: ۷۵)

"کیا تم کو یقین ہے کہ بلاشبہ صالح اپنے پروردگار کا رسول ہے؟"

مسلمان جواب دیتے:

﴿قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ﴾ (الاعراف: ۷۵)

"انہوں نے کہا بیشک ہم تو اس کے لائے ہوئے پیغام پر ایمان رکھتے ہیں۔"

یہ متکبرین غصہ میں کہتے:

﴿اِنَّا بِالَّذِیْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ﴾ (الاعراف: ۷۶)

"بلاشبہ ہم تو اس شئے کا جس پر تمہارا ایمان ہے انکار کرتے ہیں۔"

بہرحال حضرت صالح علیہ السلام کی مغرور اور سرکش قوم نے ان کی پیغمبرانہ دعوت و نصیحت کو یوں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور خدا کے نشان (معجزہ) کا مطالبہ کیا۔ تب صالح علیہ السلام نے درگاہِ الٰہی میں دعا کی اور قبولیت کے بعد اپنی قوم سے فرمایا کہ تمہارا مطلوبہ نشان اونٹنی کی شکل میں یہ موجود ہے۔ دیکھو! اگر تم نے اس کو ایذاء پہنچائی تو پھر یہی تمہاری ہلاکت کا نشان ثابت ہوگی، اور خدائے تعالیٰ نے تمہارے اور اس کے درمیان پانی کے لیے باری مقرر فرما دی ہے ایک دن تمہارا ہے اور ایک دن اس کا لہٰذا اس میں فرق نہ آئے۔

قرآن عزیز نے اس کو "ناقۃ اللہ" کا لقب دلایا [1] اور نیز اس کو ﴿لکم ایۃ﴾ کہہ یہ بھی بتایا کہ یہ نشانی اپنے اندر خاص اہمیت رکھتی ہے لیکن بدقسمت قوم ثمود زیادہ دیر تک اس کو برداشت نہ کر سکی اور ایک روز سازش کر کے قدار بن سالف کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ اس کے قتل میں پہل کرے اور باقی اعانت کریں۔ اور اس طرح ناقہ کو ہلاک کر ڈالا۔ حضرت صالح علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا تو آبدیدہ ہو کر فرمانے لگے:

"بدبخت قوم! آخر تجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ اب خدا کے عذاب کا انتظار کر، تین روز کے بعد وہ نہ ٹلنے والا عذاب آئے گا اور تم سب کو ہمیشہ کے لیے تہس نہس کر جائے گا۔"

سید آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی ج ۱ ص ۱۴۵، ۱۴۶ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ثمود پر عذاب آنے کی علامات اگلی صبح ہی سے شروع ہو گئیں یعنی پہلے روز ان سب کے چہرے اس طرح زرد پڑ گئے جیسا کہ خوف کی ابتدائی حالت میں ہو جایا کرتا ہے اور دوسرے روز سب کے چہرے سرخ تھے گویا خوف و دہشت کا یہ دوسرا درجہ تھا، اور تیسرے روز ان سب کے چہرے سیاہ تھے اور تاریکی چھائی ہوئی تھی، یہ خوف و دہشت کا وہ تیسرا مقام ہے جس کے بعد موت ہی کا درجہ باقی رہ جاتا ہے، تین دن کی ان علامات عذاب نے اگرچہ ان کے چہروں کو واقعی زرد، سرخ اور تاریک بنا دیا تھا، لیکن ان رنگوں کی ترتیبی خصوصیت یہ صاف بتا رہی ہے کہ ان کے دلوں کو صالح علیہ السلام کے سچے ہونے کا یقین تھا اور صرف حسد و بغض سے انکار کرتے تھے، اب جبکہ خدا کے حکم کے خلاف "جرم" کر چکے اور اس کی پاداش میں صالح علیہ السلام سے عذاب کی ہولناک خبر سنی تو ان پر خوف و دہشت کے وہ فطری رنگ اور نقوش نمایاں ہونے لگے جو موت کے یقین کے وقت خوف و دہشت سے مجرموں کے اندر پیدا ہوا کرتے ہیں۔

---

[1] قرآن عزیز سے اس سلسلہ میں صرف دو باتیں ثابت ہیں، ایک یہ کہ ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام سے نشان (معجزہ) طلب کیا اور حضرت صالح علیہ السلام نے "ناقہ" کو بطور نشانی پیش کیا، دوسرے یہ کہ حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ وہ اس کو ضرر نہ پہنچائے اور پانی کی باری مقرر کر لے کہ ایک روز ناقہ کا اور دوسرا قوم کا، اور اگر اس کو نقصان پہنچایا تو یہی قوم کی ہلاکت کا نشان ہوگا، چنانچہ انہوں نے "ناقہ" کو ہلاک کر دیا اور خدا کے عذاب سے خود بھی ہلاک ہو گئے۔

اس سے زائد جو کچھ ہے اس کا مدار یا ان روایات حدیثی پر ہے جو اخبار آحاد کے درجہ میں شمار ہیں اور یا بائبل اور تاریخ قدیم کی روایات پر، جہاں تک اخبار آحاد کا تعلق ہے محدثین کے نزدیک ان میں سے بعض صحیح روایات ہیں اور بعض ضعیف، اس لئے حافظ عماد الدین ابن کثیر نے سورۂ اعراف کی تفسیر میں "ناقۃ اللہ" کے وجود میں آنے کی روایات کو سند روایات کے اصول پر نقل نہیں فرمایا بلکہ ایک تاریخی واقعہ کی طرح تحریر فرمایا ہے۔

واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ قوم ثمود جب حضرت صالح علیہ السلام کی تبلیغ حق سے اُکتا گئی تو اس کے سرخیل اور سرگروہ افراد نے قوم کی موجودگی میں مطالبہ کیا کہ اے صالح (علیہ السلام)! اگر تو واقعی خدا کا فرستادہ ہے تو کوئی نشانی دکھا تاکہ ہم تیری صداقت پر ایمان لے آئیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ نشان آنے کے بعد بھی انکار پر مصر اور سرکشی پر قائم رہو، قوم کے ان سرداروں نے بتاکید وعدہ کیا کہ ہم فوراً ایمان لے آئیں گے۔ تب ⟸

= حضرت صالح علیہ السلام نے انہی سے دریافت کیا کہ وہ کس قسم کا نشان چاہتے ہیں، انہوں نے مطالبہ کیا کہ سامنے والے پہاڑ میں سے یا بستی کے اس پتھر میں سے جو کنارہ پر نصب ہے ایک ایسی اونٹنی ظاہر کر کہ جو گابھن ہو اور فوراً بچہ دے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے درگاہِ الٰہی میں دعاء کی اور اسی وقت ان سب کے سامنے پہاڑ یا پتھر میں سے حاملہ اونٹنی ظاہر ہوئی اور اس نے بچہ دیا۔ یہ دیکھ کر ان سرداروں میں سے جندع بن عمرو تو اسی وقت مشرف باسلام ہو گیا اور دوسرے سرداروں نے بھی جب ان کی پیروی میں اسلام لانے کا ارادہ کیا تو ان کے ہیکلوں اور مندروں کے مہنتوں ذواب بن عمرو اور جناب اور ان کے کاہن رباب بن صفر نے اس کو اس سے باز رکھا اور اسی طرح باقی دوسروں کو بھی اسلام لانے سے روکا۔

اب حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کے تمام افراد کو تنبیہ کی کہ دیکھو یہ نشانی تمہاری طلب پر بھیجی گئی ہے، خدا کا یہ فیصلہ ہے کہ پانی کی باری مقرر ہو، ایک دن اس ناقہ کا ہوگا اور ایک دن ساری قوم اور اس کے سارے چوپاؤں کا۔ اور خبردار اس کو کوئی اذیت نہ پہنچے، اگر اس کو آزار پہنچا تو پھر تمہاری بھی خیر نہیں۔

قوم نے اگرچہ اس حیرت ناک معجزہ کو دیکھ کر ایمان قبول نہ کیا لیکن دلوں کے اقرار نے اس کو آزار پہنچانے سے باز رکھا، اور یہ دستور جاری رہا کہ پانی کی باری ایک روز ناقہ کی رہتی اور تمام قوم اس کے دودھ سے فائدہ اٹھاتی اور دوسرے روز قوم کی باری ہوتی، اور ناقہ اور اس کا بچہ بغیر روک ٹوک چراگاہوں میں چرتے اور آسودہ رہتے، مگر آہستہ آہستہ یہ بات بھی ان کو کھٹکنے لگی اور آپس میں صلاح و مشورے ہونے لگے کہ اس ناقہ کا خاتمہ کر دیا جائے تو اس باری والے قصے سے نجات ملے، کیونکہ ہمارے چوپاؤں کے لئے اور خود ہمارے اپنے لئے یہ قید ناقابل برداشت ہے۔ یہ باتیں اگرچہ ہوتی رہتی تھیں لیکن کسی کو اس کے قتل کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی، پھر ایک حسین و جمیل مالدار عورت صدوق نے خود کو ایک شخص مصدع کے سامنے اور ایک مالدار عورت عنیزہ نے اپنی ایک خوبصورت لڑکی کو قدار کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا کہ اگر وہ دونوں ناقہ کو ہلاک کر دیں تو یہ تمہاری ملک ہیں، تم ان کو بیوی بنا کر عیش کرو۔ آخر قدار بن سالف اور مصدع کو اس کے لئے آمادہ کر لیا گیا۔ اور طے پایا کہ وہ راہ میں چھپ کر بیٹھ جائیں گے اور ناقہ جب چراگاہ جانے لگے تو اس پر حملہ کر دیں گے اور چند دوسرے آدمیوں نے بھی مدد کا وعدہ کیا۔

غرض ایسا ہی کیا گیا اور ناقہ کو اس طرح سازش کر کے قتل کر ڈالا اور پھر آپس میں حلف کیا کہ رات ہوتے پر ہم سب صالح علیہ السلام اور اس کے اہل و عیال کو بھی قتل کر دیں گے اور پھر اس کے اولیاء کو قسمیں کھا کر یقین دلائیں گے کہ یہ کام ہمارا نہیں ہے۔

اور بچہ یہ دیکھ کر بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا اور چیختا اور بولتا ہوا پہاڑی میں غائب ہو گیا۔ صالح علیہ السلام کو جب یہ خبر ہوئی تو حسرت و افسوس کے ساتھ قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آخر وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا، اب خدا کے عذاب کا انتظار کرو جو تین دن کے بعد تم کو تباہ کر دے گا، اور پھر بجلی کی چمک اور کڑک کا عذاب آیا اور اس نے رات میں سب کو تباہ کر دیا، اور آنے والے انسانوں کے لئے تاریخی عبرت کا سبق دے گیا۔

اس واقعہ کے ساتھ ساتھ محدث ابن کثیر نے چند روایات حدیثی بھی بیان فرمائی ہیں مثلاً:

غزوۂ تبوک کے موقعہ پر جب آپ کا گذر حجر پر ہوا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے ثمود کے کنوئیں سے پانی بھرا اور آٹا گوندھ کر روٹیاں تیار کرنے لگے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو پانی گرا دینے اور ہانڈیاں اوندھی کر دینے اور آٹا بیکار کر دینے کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ یہ وہ بستی ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا، یہاں نہ قیام کرو اور نہ یہاں کی اشیاء سے فائدہ اٹھاؤ، آگے بڑھ کر پڑاؤ ڈالو ایسا نہ ہو کہ تم بھی کسی بلا میں مبتلا ہو جاؤ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تم ان حجر کی بستیوں میں خدا سے ڈرتے عجز و زاری کرتے اور روتے ہوئے داخل ہوا کرو، ورنہ ان میں داخل ہی نہ ہوا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنی غفلت کی وجہ سے عذاب کی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حجر میں داخل ہوئے تو فرمایا کہ اللہ سے نشانیاں طلب نہ کیا کرو دیکھو صالح علیہ السلام کی قوم نے نشان طلب کیا تھا اور وہ ناقہ پہاڑ کی کھوہ سے نکلتی اور اپنی باری میں کھا پی کر وہیں واپس چلی جاتی اور جو اس کی باری کا دن تھا اس میں قوم ثمود کو اپنے دودھ سے سیراب کرتی تھی، مگر ثمود نے آخر کار سرکشی اور ناقہ کی کونچیں کاٹ کر اس کو ہلاک کر دیا اور یہ نکلا کہ خدا نے ان پر "صیحہ کا عذاب" مسلط کر دیا، اور وہ اس عذاب سے گھروں کے اندر ہی مردہ ہو کر رہ گئے، صرف ایک شخص ابورغال نامی باقی بچا جو حرم میں گیا ہوا تھا لیکن جب وہ حدودِ حرم سے باہر آیا تو فوراً اسی عذاب کا شکار ہو گیا۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تینوں روایات سند کے ساتھ مسند احمد سے نقل کر کے ان کی توثیق کی ہے۔ =

بہر حال ان تین دن کے بعد وقت موعود آ پہنچا اور رات کے وقت "ایک ہیبت ناک آواز" نے ہر شخص کو اسی حالت میں ہلاک کر دیا جس حالت میں وہ تھا، قرآن عزیز نے اس ہلاکت آفرین آواز کو کسی مقام پر صاعقہ (کڑک دار بجلی) اور کسی جگہ رجفہ (زلزلہ ڈال دینے والے شئے) اور بعض جگہ طاغیہ (دہشت ناک) اور بعض جگہ صیحہ (چیخ) فرمایا۔ اس لیے کہ یہ تمام تعبیرات ایک ہی حقیقت کے مختلف اوصاف کے اعتبار سے کی گئی ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ خدائے تعالیٰ کے اس عذاب کی ہولناکیاں کیسی گونا گوں تھیں، تم ایک ایسی کوندنے والی بجلی کا تصور کرو جو بار بار اضطراب کے ساتھ چمکتی، کڑکتی اور گرجتی ہو اور اس طرح کوندرہی ہو کہ کبھی مشرق میں ہے کبھی مغرب میں اور جب ان تمام صفات کے ساتھ چمکتی کوندتی، گرجتی، لرزتی، لرزاتی ہوئی کسی مقام پر ایک ہولناک چیخ کے ساتھ گرے تو اس مقام اور اس کے نواح کا کیا حال ہوگا؟ یہ ایک معمولی اندازہ ہے اس عذاب کا جو ثمود پر نازل ہوا اور ان کو اور ان کی بستیوں کو تباہ و برباد کر کے سرکشوں کی سرکشی اور مغروروں کے غرور کا انجام ظاہر کرنے کے لیے آنے والی نسلوں کے سامنے عبرت پیش کر گیا۔

ایک طرف ثمود پر یہ عذاب نازل ہوا اور دوسری جانب صالح علیہ السلام اور ان کے پیرو مسلمانوں کو خدا نے اپنی حفاظت میں لے لیا اور ان کو اس عذاب سے محفوظ رکھا۔ حضرت صالح علیہ السلام حزن و ملال کے ساتھ ہلاک شدگان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمانے لگے:

﴿يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۝﴾ (الاعراف:۷۹)

"اے قوم! بلاشبہ میں نے اپنے پروردگار کا پیغام تم تک پہنچایا اور تم کو نصیحت کی لیکن تم تو نصیحت کرنے والوں کو دوست ہی نہ رکھتے تھے۔"

ہلاک شدہ قوم کی جانب حضرت صالح علیہ السلام کا یہ خطاب اسی طرح کا خطاب تھا جس طرح بدر میں مشرکین مکہ کے سرداروں کی ہلاکت کے بعد مردہ نعشوں کے گڑھے پر کھڑے ہو کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((یا فلان بن فلان و فلان بن فلان ایسہ کم انکم اطعتم اللہ و رسولہ فانا قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقًا فھل وجدتم ما وعد ربکم حقًا)). (بخاری جلد ۶)

= اس پوری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ قرآن عزیز سے یہ تو یقین کے ساتھ ثابت ہے کہ "ناقۃ اللہ" خدا کا ایک نشان تھی اور اپنے اندر ضرور کوئی ایسی خصوصیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے وہ ایسی نشانیاں رکھ سکے جس کا ذکر قرآن عزیز اس اہمیت کے ساتھ کر رہا ہے ﴿هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً﴾ یہ ناقۃ اللہ تمہارے لئے ہے اور پھر پانی کی باری جس طرح ناقہ اور قوم ثمود کے درمیان تقسیم فرمائی وہ خود ایک مستقل دلیل ہے کہ یہ "ناقہ" ضرور اپنے اندر ایسی حیثیت رکھتی تھی جو نشان الٰہی کہلا سکے لیکن یہ بات کہ "ناقہ" کا وجود کس طرح ہوا اور کن وجوہ سے "نشان الٰہی" یا "معجزہ نبی" قرآن عزیز اس سے ساکت ہے۔ البتہ مختلف صحیح اخبار آحاد سے اس واقعہ پر ضرور روشنی پڑتی ہے جس کی تفصیل ابن کثیر سے ابھی نقل ہو چکی مگر واقعہ کی تفصیلی صراحت و وضاحت وہاں بھی موجود نہیں ہے بلکہ کتب تفسیر میں اسرائیلیات سے منقول ہے یا ضعیف روایات سے اخذ کی گئی ہے، لہٰذا مناسب یہی ہے کہ واقعہ کے اجمال و تفصیل میں فرق مراتب کا ضرور خیال رکھا جائے، جس قدر قرآن عزیز نے تصریح کی ہے وہ بغیر کسی تاویل کے واجب الاعتقاد ہے اور جس قدر صحیح روایات (اگرچہ وہ آحاد ہی کے درجہ کی ہیں) اس اجمال کی تفصیل کا پتہ ملتا ہے وہ اجمال کی تفصیل باقی تفصیلات کی حیثیت وہی ہے جو عام تاریخی وقائع اور اسرائیلیات کی حیثیت ہے۔

"اے فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں کیا تم کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پسند آئی؟ بلاشبہ ہم نے وہ سب کچھ پالیا جو ہمارے رب نے ہم سے وعدہ کیا تھا، پس کیا تم نے بھی وہ پایا جو تمہارے رب نے تم سے وعدہ کیا تھا؟"

اس قسم کے خطاب کے بارہ میں علماء کی چند رائیں ہیں:

① اس قسم کا خطاب انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات میں سے ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس کلام کو بلاشبہ مردوں کو سنوا دیتا ہے اگرچہ وہ جواب دینے سے قاصر ہیں، اس لیے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی لاشوں کو اس طرح مخاطب کیا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے تعجب سے پوچھا، کیا یہ سن رہے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں تم سے زیادہ مگر جواب سے عاجز ہیں۔"

② یہ طریق خطاب حزن و ملال کے اظہار کے لیے ہوتا ہے، مثلاً تم نے کسی شخص کو متنبہ کیا کہ اس باغ میں نہ جانا، سانپ بڑی کثرت سے ہیں، ڈسے جانے کا خطرہ ہے، مگر وہ شخص باغ میں گیا اور ڈسا گیا تو جب یہ تنبیہ کرنے والا اس کی نعش پر پہنچتا ہے تو بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے افسوس کیا میں نے تجھ سے نہ کہا تھا کہ باغ میں نہ جانا ورنہ ڈسا جائے گا آخر وہی ہوا۔

③ اس قسم کے خطاب کے اصل مخاطب وہ زندہ انسان ہوتے ہیں جو ان مُردہ نعشوں کو دیکھ رہے ہیں تاکہ ان کی عبرت حاصل ہو اور وہ اس قسم کی سرکشی کی جرأت نہ کر سکیں۔

قوم کی ہلاکت اور صالح علیہ السلام کا قیام:

یہ ایک تاریخی سوال ہے کہ جب ثمود ہلاک و برباد ہو گئے تو صالح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے مسلمانوں نے کہاں سکونت اختیار کی؟

اس سوال کا جواب یقینی اور حتمی طور پر دینا تو قریب قریب ناممکن ہے البتہ غالب گمان یہ ہے کہ وہ قوم کی ہلاکت کے بعد علاقہ فلسطین میں آ کر آباد ہوئے اس لیے کہ حجر کے قریب یہی مقام ایسا تھا جو سرسبز و شاداب اور مویشیوں کے پانی اور چارہ کے لیے بہترین تھا اور فلسطین کے علاقہ میں یہ جگہ نواحی رملہ ہوگی یا کوئی دوسرا مقام۔ علماء تفسیر اس کے جواب میں متعدد اقوال پیش فرماتے ہیں:

① وہ فلسطین کے علاقہ میں رملہ کے قریب آباد ہوئے، خازن نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

② وہ حضرموت میں آ کر آباد ہوئے اس لیے کہ ان کا اصل وطن یہی تھا یا اس لیے کہ یہ احقاف ہی کا ایک حصہ ہے، یہاں ایک قبر ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ یہ صالح علیہ السلام کی قبر ہے۔

③ وہ ثمود کی ہلاکت کے بعد ان ہی بستیوں میں آباد رہے، یہ عام مؤرخین کی رائے ہے۔

④ وہ قوم کی ہلاکت کے بعد مکہ معظمہ تشریف لے آئے اور وہیں مقیم ہو گئے اور وہیں انتقال فرمایا، اور ان کی قبر مبارک کعبہ سے غربی جانب حرم ہی میں ہے، سید آلوسی اسی کو راجح سمجھتے ہیں۔

سید آلوسی نے اپنی تفسیر میں ایک قول نقل کیا ہے جس میں بتایا ہے کہ صالح علیہ السلام پر ایمان لانے والے جو مسلمان ان کے ساتھ عذاب سے محفوظ اور نجات یافتہ رہے ان کی تعداد تقریباً ایک سو بیس (۱۲۰) تھی اور ہلاک شدہ قریباً ڈیڑھ ہزار گھرانے تھے۔

اب اس تمام ایں و آں کے بعد اس کلام بلاغت نظام "قرآن عزیز" کی آیات کا مطالعہ فرمائیے جو ان واقعات کا حقیقی

سرچشمہ ہیں اور عبرت و موعظت کا بے نظیر سامان مہیا کرتی ہیں۔

﴿وَ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِيْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَ عَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَ قَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۷۳-۷۹)

"اور (اسی طرح) ہم نے قوم ثمود کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے صالح علیہ السلام کو بھیجا، اس نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں دیکھو تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل تمہارے سامنے آ چکی ہے، یہ خدا کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی تمہارے لیے ایک (فیصلہ کن) نشانی ہے، پس اسے کھلا چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں جہاں چاہے چرے، اسے کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاؤ کہ (اس کی پاداش میں) عذاب جانکاہ تمہیں آ پکڑے اور وہ وقت یاد کرو کہ خدا نے تمہیں قوم عاد کے بعد اس کا جانشین بنایا اور اس سرزمین میں اس طرح بسا دیا کہ میدانوں سے محل بنانے کا کام لیتے ہو اور پہاڑوں کو بھی تراش کر اپنا گھر بنا لیتے ہو (یہ اس کا تم پر احسان ہے) پس اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد کرو، اور ملک میں سرکشی کرتے ہوئے خرابی نہ پھیلاؤ" قوم کے جن سر برآوردہ لوگوں کو (اپنی دولت و طاقت کا) گھمنڈ تھا انہوں نے مومنوں سے کہا، اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں (افلاس و بیچارگی کی وجہ سے) کمزور و حقیر سمجھتے تھے" کیا تم نے سچ مچ کو معلوم کر لیا ہے کہ صالح خدا کا بھیجا ہوا ہے؟ (یعنی ہمیں تو ایسی کوئی بات اس میں دکھائی دیتی نہیں) انہوں نے کہا، ہاں! بیشک جس پیام حق کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے، ہم اس پر پورا یقین رکھتے ہیں" اس پر گھمنڈ کرنے والوں نے کہا: "تمہیں جس بات کا یقین ہے ہمیں اس سے انکار ہے" غرض کہ انہوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی۔ انہوں نے کہا: "اے صالح (علیہ السلام)!! اگر تم واقعی پیغمبروں میں سے ہو، تو اب وہ بات ہم پر لا دکھاؤ جس کا تم نے ہمیں خوف دلایا تھا" پس ایسا ہوا کہ لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آ لیا۔ اور جب ان پر صبح ہوئی تو گھروں میں اوندھے منہ پڑے تھے۔ پھر صالح علیہ السلام ان سے کنارہ کش ہو گئے، اس نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! میں نے اپنے پروردگار کا پیام تمہیں پہنچایا اور نصیحت کی، مگر افسوس تم پر! تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔"

﴿وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ۝ قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَ اِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۫ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۝ وَ يٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ۝ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ۝ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ مِنْ خِزْيِ يَوْمِىٕذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ وَ اَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ۝﴾ (ھود: ۶۱۔۶۸)

"اور ہم نے قوم ثمود کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے صالح علیہ السلام کو بھیجا اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سواء تمہارا کوئی معبود نہیں، وہی ہے جس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور پھر اسی میں تمہیں بسا دیا، پس چاہیے کہ اس سے بخشش مانگو اور اس کی طرف رجوع ہو کر رہو۔ یقین کرو میرا پروردگار (ہر ایک کے) پاس ہے۔ اور (ہر ایک کی) دعاؤں کا جواب دینے والا ہے۔ لوگوں نے کہا: "اے صالح! پہلے تُو تو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی اُمیدیں تجھ سے وابستہ تھیں، پھر کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ اِن معبودوں کی پوجا نہ کریں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں؟ (یہ کیسی بات ہے؟) ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو کہ ہمارے دل میں اترتی نہیں" صالح نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن پر ہوں اور اس نے اپنی رحمت مجھے عطا فرمائی ہو تو پھر کون ہے جو اللہ کے مقابلہ میں میری مدد کرے گا اگر میں اس کے حکم سے سرتابی کروں؟ تم (اپنی توقع کے مطابق دعوت کا رد کر کے) مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے تباہی کی طرف لے جانا چاہتے ہو اور اے میری قوم کے لوگو! دیکھو یہ اللہ کی اونٹنی (یعنی اس کا نشان) تمہارے لیے ایک (فیصلہ کن) نشانی ہے پس اسے چھوڑ دو، اللہ کی زمین میں چرتی رہے، اسے کسی طرح کی اذیت نہ پہنچانا، ورنہ فوراً عذاب تمہیں آ پکڑے گا۔" لیکن لوگوں نے (اور زیادہ ضد میں آ کر) اسے ہلاک کر ڈالا۔ تب صالح علیہ السلام نے کہا: (اب تمہیں صرف) تین دن کی مہلت ہے، اپنے گھروں میں کھا پی لو یہ وعدہ ہے جھوٹا نہ نکلے گا" پھر جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آ پہنچا تو ہم نے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت سے بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے نجات دے دی (اے پیغمبر!) بلاشبہ تیرا پروردگار ہی ہے جو قوت والا اور سب پر غالب ہے! اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کا یہ حال ہوا کہ ایک زور کی کڑک نے آ لیا۔ جب صبح ہوئی تو سب اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے (وہ اس طرح اچانک مر گئے)

گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے! تو سن رکھو کہ ثمود نے اپنے پروردگار کی ناشکری کی، اور ہاں سن رکھو کہ ثمود کے لیے محرومی ہوئی۔"

﴿وَ لَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۸۰﴾ وَ اٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَ كَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾﴾ (الحجر: ۸۰-۸۴)

"اور دیکھو حجر کے لوگوں نے بھی رسولوں کی بات جھٹلائی، ہم نے اپنی نشانیاں انہیں دکھائیں، مگر وہ روگردانی ہی کرتے رہے، وہ پہاڑ تراش کر گھر بناتے تھے کہ محفوظ رہیں لیکن (یہ حفاظتیں کچھ بھی کام نہ آئیں) ایک دن صبح کو اٹھے تو ایک ہولناک آواز نے آ پکڑا تھا، اور جو کچھ انہوں نے اپنی سعی و عمل سے کمایا تھا وہ کچھ بھی ان کے کام نہ آیا۔"

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۴۳﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۴۴﴾ وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَاۤ اٰمِنِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾ وَّ زُرُوْعٍ وَّ نَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ﴿۱۴۸﴾ وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۵۰﴾ وَ لَا تُطِيْعُوْۤا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَاۤ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۴﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّ لَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۵﴾ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵۶﴾ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۷﴾ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۵۹﴾﴾ (الشعراء: ۱۴۱-۱۵۹)

"جھٹلایا ثمود نے پیغام لانے والوں کو جب کہا ان کو ان کے بھائی صالح علیہ السلام نے کیا تم ڈرتے نہیں میں تمہارے پاس پیغام لانے والا ہوں معتبر، سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور نہیں مانگتا میں تم سے اس پر کچھ بدلہ، میرا بدلہ ہے اسی جہان کے پالنے والے پر، کیا چھوڑے رکھیں گے تم کو یہاں کی چیزوں میں بے خوف، باغوں اور چشموں میں اور کھیتوں میں اور کھجوروں میں جن کا خوشہ نرم ہے اور تراشتے ہو پہاڑوں میں گھر تکلف کے، سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو، اور نہ مانو حکم بیباک لوگوں کا جو خرابی کرتے ہیں ملک میں اور اصلاح نہیں کرتے، بولے تجھ پر تو کسی نے جادو کیا ہے۔ تو بھی ایک آدمی ہے جیسے ہم، سو لے آ کچھ نشانی اگر تو سچا ہے، کہا یہ اونٹنی ہے اس کے لیے پانی پینے کی ایک باری اور تمہارے لیے باری ایک دن مقرر، اور مت چھیڑیو اس کو بری طرح سے پھر پکڑ لے تم کو آفت ایک بڑے دن کی، پھر کو نچیں کاٹیں اس اونٹنی کی پھر کل کو رہ گئے پچھتاتے پھر آ پکڑا ان کو عذاب نے البتہ اس بات میں نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے

اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم کرنے والا۔"

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِیْقٰنِ یَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ یٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْ لَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوا اطَّیَّرْنَا بِكَ وَ بِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَ كَانَ فِی الْمَدِیْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ یُّفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَ لَا یُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَیِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِیِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَ مَكَرُوْا مَكْرًا وَّ مَكَرْنَا مَكْرًا وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَ قَوْمَهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۵۱﴾ فَتِلْكَ بُیُوْتُهُمْ خَاوِیَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَ اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا یَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾﴾

(النمل: ۴۵-۵۳)

"اور ہم نے بھیجا تھا ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو کہ بندگی کرو اللہ کی پھر وہ تو دو فرقے ہو کر لگے جھگڑنے کہا اے میری قوم کیوں جلدی مانگتے ہو برائی کو پہلے بھلائی سے۔ کیوں نہیں گناہ بخشواتے اللہ سے شاید تم پر رحم ہو جائے، بولے ہم نے منحوس قدم دیکھا تجھ کو اور تیرے ساتھ والوں کو، کہا تمہاری بری قسمت اللہ کے پاس ہے تمہارا کہنا صحیح نہیں بلکہ تم جانچے جاتے ہو اور تھے اس شہر میں نو (۹) شخص کہ خرابی کرتے ملک میں اور اصلاح نہ کرتے بولے کہ آپس میں قسم کھاؤ اللہ کی کہ البتہ رات کو جا پڑیں ہم اس پر اور اس کے گھر پر پھر کہہ دیں گے اس کے دعویٰ کرنے والے کو ہم نے نہیں دیکھا جب تباہ ہوا اس کا گھر اور ہم بیشک سچ کہتے ہیں، اور انہوں نے بنائی ایک خفیہ تدبیر اور ہم نے بنائی ایک پوشیدہ تدبیر اور ان کو خبر نہ ہوئی پھر دیکھ لے کیسا ہوا انجام ان کے فریب کا کہ ہلاک کر ڈالا ہم نے ان کو اور ان کی قوم کو سب کو، سو یہ پڑے ہیں ان کے گھر ڈھے ہوئے بسبب ان کے انکار کے، البتہ اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں، اور بچا دیا ہم نے ان کو جو یقین لائے تھے اور بچتے رہے تھے۔"

﴿وَ اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَیْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰی عَلَی الْهُدٰی فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَ نَجَّیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا یَتَّقُوْنَ ﴿۱۸﴾﴾ (حٰمٓ السجدہ: ۱۷-۱۸)

"اور جو ثمود تھے سو ہم نے ان کو راہ بتائی پھر ان کو پسند آیا اندھا رہنا راہ سوجھنے سے، پھر پکڑا ان کو کڑک نے ذلت کے عذاب کی، بدلہ اس کا جو کماتے تھے اور بچا دیا ہم نے ان لوگوں کو جو یقین لائے تھے اور بچ کر چلتے تھے (برائی سے)۔"

﴿وَ فِیْ ثَمُوْدَ اِذْ قِیْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰی حِیْنٍ ﴿۴۳﴾ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَ هُمْ یَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِیَامٍ وَّ مَا كَانُوْا مُنْتَصِرِیْنَ ﴿۴۵﴾﴾ (الذاریات: ۴۳-۴۵)

"اور نشانی ہے ثمود میں جب کہا ان کو فائدہ اٹھا لو ایک وقت تک۔ پھر شرارت کرنے لگے اپنے رب کے حکم سے، پھر پکڑا ان کو کڑک نے اور وہ دیکھتے تھے پھر نہ ہو سکا ان سے کہ اٹھیں اور نہ ہوئے کہ بدلہ لیں۔"

﴿وَ اَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ا۟لْاُوْلٰى ۟ۙ وَ ثَمُوْدَاۡ فَمَاۤ اَبْقٰى ۟ۙ﴾ (النجم ۵۰۔۵۱)

"اور یہ کہ اس نے غارت کیا عاد اوّل کو، اور ثمود کو پھر کسی کو باقی نہ چھوڑا۔"

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ۟ فَقَالُوْۤا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ۟ ءَاُلْقِیَ الذِّكْرُ عَلَیْهِ مِنْۢ بَیْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ۟ سَیَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ۟ اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَ اصْطَبِرْ ۟ؗ وَ نَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَیْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ۟ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ۟ فَكَیْفَ كَانَ عَذَابِیْ وَ نُذُرِ ۟ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ صَیْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ ۟ وَ لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۟﴾ (القمر: ۲۳۔۳۲)

"جھٹلایا ثمود نے ڈر سنانے والوں کو، پھر کہنے لگے کیا ایک آدمی ہم میں سے اکیلا ہم اس کے کہے پر چلیں گے تو، تو ہم غلطی میں پڑے اور آگ میں جھکے کیا اُتری اسی پر نصیحت ہم سب میں سے کوئی نہیں یہ جھوٹا ہے بڑائی مارتا ہے، اب جان لیں گے کہ کل کو کون ہے جھوٹا بڑائی مارنے والا، ہم بھیجتے ہیں اونٹنی ان کے جانچنے کے واسطے سو انتظار کر ان کا اور سہتا رہ، اور سنا دے ان کو کہ پانی کی تقسیم ہے ان میں ہر ایک (فریق) اپنی باری پر پہنچے پھر پکارا انہوں نے اپنے رفیق کو پھر ہاتھ چلایا اور کاٹ ڈالا، پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔ ہم نے بھیجی ان پر ایک (خوفناک) چیخ، پھر رہ گئے جیسے روندی ہوئی باڑ کانٹوں کی، اور ہم نے آسان کر دیا قرآن کو سمجھنے کے لیے، پھر ہے کوئی سوچنے والا۔"

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَ عَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ۟ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِیَةِ ۟﴾ (الحاقۃ: ۴۔۵)

"جھٹلایا ثمود اور عاد نے اس کھڑکھڑانے والی (بات) کو سو جو ثمود تھے سو غارت کر دیئے گئے اچھال کر (سخت بھونچال سے)۔"

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَاۤ ۟ۙ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۟ۙ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْیٰهَا ۟ؕ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۪۬ فَدَمْدَمَ عَلَیْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۟ۙ وَ لَا یَخَافُ عُقْبٰهَا ۟۠﴾

(الشمس: ۱۱۔۱۵)

"جھٹلایا ثمود نے اپنی شرارت سے جب اُٹھ کھڑا ہوا ان میں کا بدبخت، پھر کہا ان کو اللہ کے رسول نے خبردار رہو اللہ کی اونٹنی سے اور اس کے پانی پینے کی باری سے پھر انہوں نے اس کو جھٹلایا پھر پاؤں کاٹ ڈالے اس کے پھر اُلٹ مارا ان کے رب نے بسبب ان کے گناہوں کے پھر برابر کر دیا سب کو اور اللہ نہیں ڈرتا پیچھا کرنے سے۔"

چند عبرتیں

① "ناقۃ اللہ" اگرچہ صالح علیہ السلام کی صداقت و رسالت کا ایک نشان تھی، تاہم قرآن عزیز کی تصریح ہے کہ وہ ثمود کے لیے آزمائش اور ابتلاء اور نتیجہ و ثمرہ میں ان کی ہلاکت کا نشان ثابت ہوئی۔

﴿اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴾ (القمر: ۲۷)

"بیشک ہم بھیجنے والے ہیں ناقہ کو ان کی آزمائش اور امتحان کے لیے پس تو ان کے انتظار میں رہ اور صبر اختیار کر۔"

② سنت اللہ یہ رہی ہے کہ اگر وہ اپنے پیغمبر کو کسی قوم کی ہدایت کے لیے بھیجے اور قوم اس کی ہدایت پر کان نہ دھرے تو ضروری نہیں کہ وہ قوم ہلاک ہی کر دی جائے لیکن جو قوم اپنے نبی سے اس وعدہ پر نشان طلب کرے کہ اگر ان کا مطلوبہ نشان ظاہر ہو گیا تو وہ ضرور ایمان لے آئیں گے اور پھر وہ ایمان نہ لائے تو اس قوم کی ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے اور خدائے تعالیٰ اس کو معاف نہیں کرتا تا آنکہ وہ تائب ہو جائے اور خدا کے دین کو قبول کر لے اور یا عذاب الٰہی سے صفحۂ ہستی سے مٹ کر دوسروں کے لیے عبرت کا سبب بن جائے۔

③ مگر اس سنت اللہ سے نبی اکرم ﷺ کا پیغام رسالت مستثنیٰ ہے اس لیے کہ آپ نے تصریح فرمائی ہے کہ میں نے خدائے تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ میری امت (امت دعوت ہو یا امت اجابت) میں عذاب عام مسلط نہ فرمائے اور اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمالی۔ اور قرآن عزیز میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس تصریح کی یہ کہہ کر تصدیق بھی فرما دی۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ﴾ (الانفال: ۳۳)

"اے رسول اس حال میں کہ تو ان میں موجود ہے خدائے تعالیٰ (ان کافروں) پر عام عذاب مسلط نہ کرے گا۔"

④ یہ مہلک غلطی اور نفس کا دھوکا ہے کہ انسان، خوش عیشی، رفاہیت اور دنیوی جاہ و جلال کو دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ جس قوم یا جس فرد کے پاس یہ سب کچھ موجود ہے وہ ضرور خدائے تعالیٰ کے سایہ میں ہے اور یہ کہ ان کی یہ خوش عیشی اس کی علامت ہے کہ خدائے تعالیٰ کی خوشنودی ان کے ساتھ ہے۔

یہ دھوکا اور غلطی اس لیے ہے کہ اس واقعہ میں جگہ جگہ یہ تصریح موجود ہے کہ بعض مرتبہ زیادہ سے زیادہ رفاہیت اور خوش عیشی زیادہ سے زیادہ عذاب و ہلاکت کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے، اگرچہ قوموں کے لیے اس کی مدت چند ماہ یا چند سال نہیں بلکہ گھبرا دینے والی مدت ہی کیوں نہ ہو مگر ہمہ قسم کی دنیوی کامرانیوں اور خوش عیشیوں کے ساتھ ساتھ جب ظلم، سرکشی، اور غرور کسی قوم کا مستقل شعار بن جائے تو سمجھو کہ اس کی تباہی و ہلاکت کا وقت قریب آ پہنچا۔

﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ﴾ (البروج: ۱۲)

"تیرے رب کی پکڑ بہت شدید ہے۔"

البتہ ان تمام رفاہیتوں کے ساتھ اگر قوم کے اکثر افراد خدا کے شکر گزار ہوں، اس کے بندوں کے ساتھ انصاف کرنے

والے اور باہم حسن نیت اور خیر خواہی پر عامل ہوں تو بلاشبہ وہ مقبول بارگاہِ الٰہی ہیں اور ان ہی کو دنیا و آخرت کی کامرانیوں کی بشارت ہے، اور ان ہی کے لیے یہ دنیوی عیش خدا کی بے غایت نعمتوں کی علامت ہے۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ﴾ (النور: ۵۵)

"اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کرلیا جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں یہ کہ ان کو زمین کی خلافت دے گا جیسا کہ ان سے اگلوں کو خلیفہ بنایا تھا اور ان کے لیے ان کا دین مضبوط کر دے گا جو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ان کے لیے خوف کو امن سے بدل دے گا (جن کی شان یہ ہوگی کہ) وہ میری بندگی کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو (کسی حیثیت سے بھی) شریک نہ کریں گے۔"

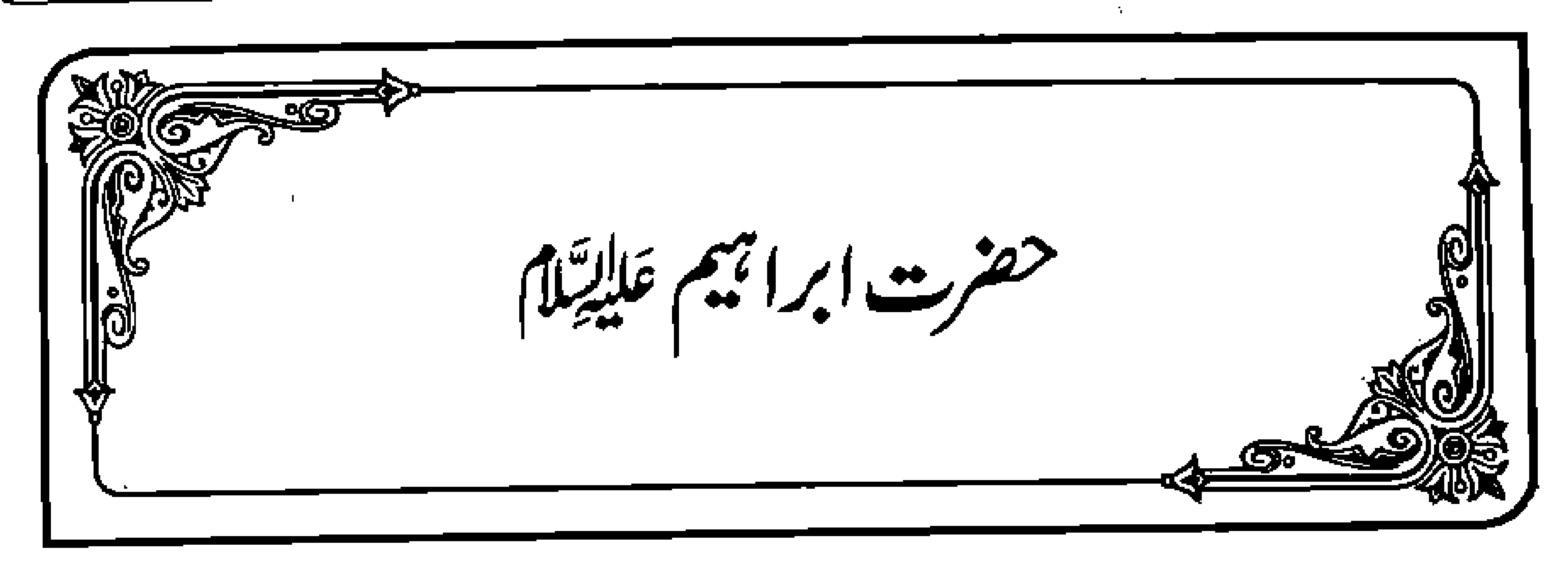
﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۱۰۵)

"اور بلاشبہ ہم نے نصیحت کے بعد زبور میں لکھ دیا کہ زمین کی وراثت میرے نیک بندوں کو حاصل ہوگی۔"

یہ آیات صراحت کر رہی ہیں کہ حکومت و دولت کا وعدہ "وراثت" کی حیثیت سے صرف انہی کا حصہ ہے جو مومن بھی ہیں اور خدا کے احکام پر عامل بن کر صالحین (نیکوکاروں) کی صف میں بھی شامل ہیں یعنی جن کی اجتماعی زندگی کا قالب ایک ساتھ ان دونوں صفات سے متصف ہے ان کے لیے بلاشبہ یہ حکومت و دولت خدا کا انعام و اکرام ہے۔

اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر "حکومت و دولت" کے لیے مومن و کافر کی کوئی تخصیص نہیں، خدا کی حکمتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر یہ دنیوی اسباب کی شکل میں چلتی پھرتی چھاؤں ہے اور ایسی "حکومت و دولت" کے لیے ہرگز یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے ساتھ خدا کی خوشنودی اور اس کا فضل و کرم بھی شامل حال ہو۔





حضرت ابراہیم علیہ السلام

○ نسب ابراہیم علیہ السلام ○ آزر کی تحقیق ○ مستشرقین کی ہرزہ سرائی کا جواب ○ قرآن عزیز میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ ○ ابراہیم علیہ السلام کا بتوں کے ساتھ معاملہ ○ اسلام کے متعلق باپ سے مناظرہ ○ قوم سے مناظرہ اور محاکمہ ○ بادشاہ وقت سے مناظرہ ○ سکونت و قیام ○ قوم کی ہدایت کے لیے اضطراب ○ مصر کی جانب سفر ○ ابراہیم و ہاجرہ علیہما السلام ○ ولادت اسماعیل علیہ السلام ○ سارہ و ہاجرہ علیہما السلام ○ سنت ختنہ ○ ارض حجاز و ہاجرہ علیہا السلام ○ اسحاق علیہ السلام ○ بناء کعبہ ○ چند اہم نتائج

نسب نامہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نسب نامہ توراۃ میں اس طرح مذکور ہے: "ابراہیم (خلیل اللہ علیہ السلام) بن تارخ بن ناحور بن سروج بن رعو بن فالج بن عابر بن شالح بن ارفکشاذ بن سام بن نوح علیہ السلام۔

یہ تصریح تورات اور تاریخ کے مطابق ہے مگر قرآن عزیز نے ان کے والد کا نام آزر بتایا ہے۔

﴿وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ﴾ (الانعام: ۷۴)

"اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ آزر سے کہا "کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے"۔

آزر کی تحقیق:

چونکہ تاریخ اور تورات دونوں ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ بتاتے ہیں اور قرآنِ عزیز آزر کہتا ہے، اس لیے علماء اور مفسرین نے اس مسئلہ کی تحقیق میں دو راہیں اختیار کی ہیں۔

① ایسی صورت کی جائے کہ دونوں ناموں کے درمیان مطابقت ہو جائے اور یہ اختلاف جاتا رہے۔

② تحقیق کے بعد فیصلہ کن بات کہی جائے کہ ان دونوں میں کون صحیح ہے اور کون غلط یا دونوں صحیح ہیں مگر دو جدا جدا ہستیوں کے نام ہیں۔

پہلے خیال کے علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخصیت سے وابستہ ہیں اور تارخ علم (اسمی نام) ہے اور آزر۔ علم وصفی (وصفی نام)۔

ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ آزر عبری زبان میں "محب صنم" کو کہتے ہیں اور چونکہ تارخ میں بت تراشی و بت پرستی دونوں

وصف موجود تھے اس لیے آزر کے لقب سے مشہور ہوا، اور بعض کا گمان ہے کہ آزر کے معنی اعوج (کم فہم) یا بے وقوف اور پیر فرتوت [1] کے ہیں، اور چونکہ تارخ میں یہ باتیں موجود تھیں اس لیے اس وصف سے موصوف کیا گیا۔ قرآن عزیز نے اسی مشہور وصفی علم کو بیان کیا ہے۔
سہیلی نے روض الانف [2] میں اسی کو اختیار کیا۔

اور دوسرے خیال کے علماء کی تحقیق یہ ہے کہ آزر اس بت کا نام ہے، تارخ جس کا پجاری اور مہنت تھا، چنانچہ مجاہد (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ قرآن عزیز کی مسطورہ بالا آیت کا مطلب یہ ہے:

اَتَتَّخِذُ اٰزَرَ اٰلِھَۃً ای تتخذ اصناما الھۃ.

"کیا تو آزر کو خدا مانتا ہے یعنی بتوں کو خدا مانتا ہے"۔

اور صنعانی کی رائے بھی اس کے قریب قریب ہے، صرف نحوی اعتبار سے تقدیر کلام میں وہ ایک دوسری راہ اختیار کرتے ہیں، غرض ان دونوں کے نزدیک آزر "ابیہ" کا بدل نہیں ہے بلکہ بت کا نام ہے اور اس طرح قرآن عزیز میں ان کے والد کا نام مذکور نہیں۔

ایک مشہور قول یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ تھا اور چچا کا آزر، اور چونکہ آزر ہی نے ان کی تربیت کی تھی اور بمنزلہ اولاد کے پالا تھا اس لیے قرآنِ عزیز میں آزر کو باپ کہہ کر پکارا گیا جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے "العم صنو ابیہ" چچا باپ ہی کی طرح ہے۔

علامہ عبدالوہاب نجار کی رائے یہ ہے کہ ان اقوال میں سے مجاہد کا قول قرینِ قیاس اور قابل قبول ہے اس لیے کہ مصریوں کے قدیم دیوتاؤں میں ایک نام ازوریس بھی آتا ہے جس کے معنی "خدائے قوی و معین" ہیں، اور اصنام پرست اقوام کا شروع سے یہ دستور رہا ہے کہ قدیم دیوتاؤں کے نام ہی پر جدید دیوتاؤں کے نام رکھ لیا کرتے تھے، اس لیے اس بت کا نام بھی قدیم مصری دیوتا کے نام پر آزر رکھا گیا ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ تھا۔

ہمارے نزدیک یہ تمام تکلفات باردہ ہیں، اس لیے کہ قرآن عزیز نے جب صراحت کے ساتھ آزر کو اب ابراہیم (ابراہیم کا باپ) کہا ہے تو پھر محض علماء انساب اور بائیبل کے تخمینی قیاسات سے متاثر ہو کر قرآن عزیز کی یقینی تعبیر کو مجاز کہنے یا اس سے بھی آگے بڑھ کر خواہ مخواہ قرآن عزیز میں نحوی مقدرات ماننے پر کون سی شرعی اور حقیقی ضرورت مجبور کرتی ہے۔

بر سبیل تسلیم اگر آزر عاشق صنم کو کہتے ہیں، یا بت کا نام ہے تب بھی بغیر تقدیر کلام اور بغیر کسی تاویل کے یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ ان ہر دو وجہ سے آزر کا نام آزر رکھا گیا جیسا کہ اصنام پرست اقوام کا قدیم سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ کبھی اپنی اولاد کا نام بتوں کا غلام ظاہر کر کے رکھتے تھے اور کبھی خود بت ہی کے نام پر نام رکھ دیا کرتے تھے۔

اصل یہ بات ہے کہ "آدار" کالدی زبان میں بڑے پجاری کو کہتے ہیں اور عربی میں یہی "آزر" کہلایا۔ تارخ چونکہ تراش اور سب سے بڑا پجاری تھا اس لیے "آزر" ہی کے نام سے مشہور ہو گیا، حالانکہ یہ نام نہ تھا بلکہ لقب تھا اور جبکہ لقب نے نام کی جگہ لے لی تو قرآن عزیز نے بھی اسی نام سے پکارا۔

---

[1] تاج العروس ج ۳ ص ۱۲۔ [2] جلد ۱

[1] تاج العروس ج ۳ ص ۱۲ [2] قصص الانبیاء ص ۹۶

نیز جس مقدس انسان (ابراہیم علیہ السلام) کی اخلاقی بلندی کا یہ عالم ہو کہ جب بت پرستی کی مذمت کے سلسلہ میں آزر سے مناظرہ ہو گیا اور آزر نے زچ ہو کر یہ کہا:

﴿ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝ ﴾ (مریم: ۴۶)

"اے ابراہیم (علیہ السلام) کیا تو میرے خداؤں سے بیزار ہے تو اگر اس حرکت سے باز نہ آیا میں ضرور تجھ کو سنگسار کر دوں گا اور جا میرے سامنے سے دور ہو جا۔"

تو اس سخت گیر اور دل آزار گفتگو کے موقع پر بھی اس نے پدری رشتہ کی بزرگی کا احترام کیا، اور جواب میں صرف یہ فرمایا:

﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ ﴾ (مریم: ۴۷)

"تجھ پر سلامی ہو، میں عنقریب تیرے لیے اپنے پروردگار سے بخشش چاہوں گا بلاشبہ وہ میرے ساتھ بہت مہربان ہے۔"

اس ہستی سے یہ کیسے توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے باپ آزر کو بے وقوف، پیر فرتوت اور اسی قسم کے تحقیر الفاظ کے ساتھ خطاب کرے؟

پس بلاشبہ تارخ کا تارخ، آزر ہی ہے اور وہ علم اسی ہے نہ کہ علم وصفی اور تارخ یا غلط نام ہے اور یا آزر کا ترجمہ ہے جو تورات کے دوسرے اعلام کی طرح ترجمہ نہ رہا بلکہ اصل بن گیا۔

مراتشی سترھویں صدی کا ایک عیسائی عالم ہے، اس نے قرآن عزیز کا ترجمہ کیا ہے اور قرآن عزیز پر نہایت رکیک اور متعصبانہ حملے کئے ہیں، اس نے اس موقعہ پر بھی عادت کے مطابق ایک مہمل اور لچر اعتراض کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یوزبیوس کی تاریخ کنیسہ کی ایک عبارت میں یہ لفظ آیا ہے جس کو غلط صیغہ کے ساتھ محمد ﷺ نے قرآن عزیز میں درج کر دیا۔

لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ مراتشی اپنے اس دعوے کے ثبوت میں نہ تاریخ کنیسہ کی وہ عبارت پیش کرتا ہے جس سے یہ لفظ ماخوذ بتایا گیا ہے اور نہ اس اصل لفظ ہی کا پتہ دیتا ہے کہ جس سے یہ غلط لفظ بنا لیا گیا اور نہ یہ بتلاتا ہے کہ آخر محمد ﷺ کو اس نقل کی کیا ضرورت پیش آئی؟ اس لیے یہ قطعاً بے دلیل اور بے سروپا بات ہے جو محض تعصب اور جہالت کی وجہ سے کہی گئی اور حق وہی ہے جو ہم نے ابھی واضح کیا۔

شجرۂ نسب حضرت ابراہیم تا حضرت نوح علیہما السلام:

تورات اور تاریخ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک نسب کی جو کڑیاں شمار کرائی ہیں وہ درج ذیل ہیں، ان شجرۂ نسب کی صحت و عدم صحت کا معاملہ قیاسی اور تخمینی رائے سے زیادہ نہیں ہے اس لیے کہ جب نبی اکرم ﷺ کے سلسلہ نسب کے متعلق، اس یقین کے باوجود کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں، عدنان سے اوپر کی کڑیوں کے متعلق خود ذات اقدس کا یہ مقولہ ہے کہ "کذب النسابون" علماء نسب نے ناموں کی تعیین میں غلط بیانی سے کام لیا ہے" تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک کا سلسلہ کس طرح کذب بیانی اور وضع سے پاک رہ سکتا ہے۔؟

نام	باپ کا نام	بیٹے کی پیدائش کے وقت باپ کی عمر
سام	نوح علیہ السلام	۵۰۰
ارفکشاذ	سام	۱۰۰
شالح	ارفکشاذ	۳۵
عابر	شالح	۳۰
فالج	عابر	۳۴
رعو	فالج	۳۰
سروج	رعو	۳۲
ناجور	سروج	۳۰
آذر (تارخ)	ناجور	۲۹
ابراہیم علیہ السلام	آذر (تارخ)	۷۰
		۸۹۰ مجموعی مدت

ان اعداد و شمار کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت سے حضرت نوح علیہ السلام تک آٹھ سو نوے سال ہوتے ہیں اور جبکہ حضرت نوح علیہ السلام کی کل عمر نو سو پچاس سال بتائی جاتی ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت نوح علیہ السلام کی عمر کے ساٹھ سال پائے اور وہ دونوں اس مدت کے اندر معاصر رہے ہیں اور یہ بلاشبہ بے سروپا بات اور قطعاً غلط اور مہمل ہے اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ تورات کے یہ اعداد و شمار محض خود تراشیدہ کہانیوں اور حکایتوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قدیم زمانہ میں یہود کے یہاں تاریخ کا باب اسی قسم کی حکایات و روایات پر قائم رہا ہے اور اس میں تاریخی حقائق اور زمانوں کے تضاد و اختلاف کا مطلق لحاظ و پاس نہیں رکھا گیا۔

مستشرقین یورپ کی ہرزہ سرائی:

مستشرقین یورپ کی ایک جماعت اسلام دشمنی میں ید طولیٰ رکھتی ہے اور بغض و عناد کی مشتعل آگ میں حقائق و واقعات تک کے انکار پر آمادہ ہو جاتی ہے، چنانچہ اس قسم کے مواقع میں سے کہ جہاں قرآن عزیز کے خلاف بے دلیل ان کی تنقید کی تلوار چلتی رہتی ہے ایک موقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کا بھی ہے۔

دائرۃ المعارف الاسلامیہ [1] نے ونسنک [2] کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے اسپرنگر [3] نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن میں ایک عرصہ تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کعبہ کے بانی اور دین حنیف کے ہادی کی حیثیت سے روشنی میں نہیں آئی البتہ عرصہ دراز کے بعد ان کی شخصیت کو ان صفات کے ساتھ متصف ظاہر کیا گیا ہے، اور ان کی ذات کی خاص اہمیت نظر آتی ہے، چونکہ یہ دعویٰ

[1] جلد ا ص ۲۷-۲۸ [2] Wensinck [3] Sprenger

اپنی اجمالی تعبیر کے لحاظ سے ابھی تشنہ تکمیل تھا اس لیے ایک طویل زمانہ کے بعد اسپرنگر کے اس دعوے کو سنوگ ہیکر ونیہ نے بڑے شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا اور اپنے مزعومہ دلائل کے ذریعہ اس کو خاص آب ورنگ سے رنگین بنایا۔ اس نے کہا:

"قرآن پاک میں جس قدر مکی آیات اور سورتیں ہیں ان میں کسی ایک مقام پر بھی اسماعیل (علیہ السلام) کا ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ رشتہ نظر نہیں آتا اور نہ ان کو اوّل مسلمین بتایا گیا ہے بلکہ وہ صرف ایک نبی اور پیغمبر کی حیثیت میں نظر آتے ہیں، ان کے تذکرہ کی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملتی جو اس کو مؤسس کعبہ، اسماعیل علیہ السلام کا باپ، عرب کا پیغمبر وہادی، اور ملت حنیفی کا داعی، ظاہر کرتی ہو، سورۃ الذاریات، الحجر، الصافات، الانعام، ہود، مریم، انبیاء اور عنکبوت جو سب مکی سورتیں ہیں ہمارے اس دعوے کی شاہد ہیں۔ اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے سرزمین عرب میں کوئی نبی نہیں آیا اور یہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔"

البتہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدنی زندگی شروع ہوتی ہے تو مدنی سورتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر کے وقت یہ تمام خصوصیات نمایاں کی جاتی اور اہمیت کے ساتھ روشنی میں لائی جاتی ہیں۔

ایسا کیوں ہوا؟ اور یہ اختلاف کیوں موجود ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکی زندگی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام امور میں یہود پر اعتماد رکھتے اور انہیں کے طریقوں کو پسند فرماتے تھے، لہٰذا اس وقت تک ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو بھی انہوں نے اسی نظر سے دیکھا جس نظر سے یہود دیکھتے تھے لیکن جب مدینہ پہنچ کر انہوں نے یہود کو اپنے مشن "اسلام" کی دعوت دی تو انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور وہ آپ کے دشمن ہو گئے۔ اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فکر وتامل کیا اور خوب سوچا، آخر ان کی ذکاوت اور جودت طبع نے رہنمائی کی اور انہوں نے عرب کے لیے یہود کی یہودیت سے جدا ایک ایسے دین کی بنیاد ڈالی جس کو یہودیت ابراہیمی کہنا چاہیے، لہٰذا اس سلسلہ کی تکمیل کے لیے قرآن کی مدنی سورتوں میں ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت کو اس طرح پیش کیا گیا کہ وہ ملت حنیفی کے داعی، عرب کے پیغمبر، اسماعیلؑ کے والد، کعبہ کے مؤسس نظر آتے ہیں۔ انتہیٰ

یہ ہے وہ دعویٰ اور اس کی دلیل جو اسپرنگر، سنوک اور وینسنک جیسے اسلام دشمن مستشرقین کی جانب محض اس لیے اختراع کیے گئے ہیں کہ اس قسم کی لچر بنیادوں پر مسیحیت کی برتری اور اسلام کی تحقیر کی عمارت تیار ہو سکے اور نیز یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ ثابت کیا جائے کہ ان کا عرب کے ساتھ نہ نسلی تعلق ہے اور نہ دینی، لیکن جب ایک مؤرخ اور ایک نقاد مستشرقین کے اس دعوے اور دعوے کے دلائل کو صرف تاریخی اور تنقیدی حیثیت سے دیکھتا ہے تب بھی اس کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے حقائق اور واقعات سے قصداً چشم پوشی کر کے محض عداوت اور بغض وعناد کی راہ سے بے دلیل کہا گیا ہے، اس لیے کہ اس سلسلہ میں سب سے بڑی دلیل پیش کی گئی ہے کہ مکی سورتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق وہ اوصاف نظر نہیں آتے جو مدنی آیات میں پائے جاتے ہیں، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سراسر غلط بلکہ قصد وارادہ کے ساتھ علمی بددیانتی ہے کہ مکی سورتوں میں سے صرف انہی کا حوالہ دیا گیا جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فقط ایک پیغمبر کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے، لیکن وہ مکی سورت جو ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو ہمہ حیثیت سے نمایاں کرنے کے لیے ان کے نام ہی سے معنون کر کے نازل کی گئی یعنی (سورۂ ابراہیم) اس کو نظر انداز کر دیا گیا تاکہ قرآن عزیز سے براہ راست فائدہ نہ اٹھا سکنے والے حضرات کے سامنے جہالت کا پردہ پڑا رہے اور ان کی کورانہ تقلید میں وہ ان کے دعوے کو صحیح سمجھتے رہیں۔

سورۂ ابراہیم مکی ہے، اس کی آیات کا نزول ہجرت سے قبل مکہ ہی میں ہوا ہے اور وہ حسب ذیل حقائق کا اعلان کرتی ہے۔

① حضرت ابراہیم علیہ السلام عرب (حجاز) کے اندر قیام پذیر ہیں اور خدا کے رسول کی حیثیت سے خود کو اور اپنی اولاد کو بت پرستی سے بچنے اور اس مقام کو امن عالم کا مرکز بنانے کی دعا کر رہے ہیں:

﴿ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴾ (ابراھیم: ۳۵)

"اے پروردگار اس شہر (مکہ) کو تو امن کا مرکز بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے دور رکھ۔"

﴿ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (ابراھیم: ۳۶)

"اے پروردگار بلاشبہ ان (بتوں) نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا پس جو شخص میری پیروی کرے وہ میری جماعت میں سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے پس بلاشبہ تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔"

② حضرت ابراہیم علیہ السلام اقرار کرتے ہیں کہ سرزمین حجاز (جو عرب کا قلب ہے) ان ہی کی اولاد سے آباد ہوئی اور انہوں نے ہی اس کو بسایا ہے اور وہی اس چٹیل میدان میں بیت الحرام (کعبہ) کے مؤسس ہیں۔

﴿ رَبَّنَاۤ اِنِّيْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْۤ اِلَيْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴾ (ابراھیم: ۳۷)

"اے ہمارے پروردگار بیشک میں نے اپنی بعض ذریت کو اس بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے گھر (کعبہ) کے نزدیک آباد کیا ہے، اے ہمارے پروردگار یہ اس لیے تا کہ وہ نماز قائم کریں پس تو لوگوں میں سے کچھ کے دل اس طرف پھیر دے کہ وہ (اس کعبہ کی بدولت) ان کی جانب مائل ہوں اور ان کو پھلوں سے رزق عطا کرتا کہ یہ شکر گزار بنیں۔"

③ حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت اسحاق علیہ السلام کے والد ہیں اور یہی اسماعیل علیہ السلام اہل عرب کے باپ ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اور اپنی اولاد کے لیے ملت حنیفی کے شعار "صلوٰۃ" کی اقامت کی دعا کر رہے ہیں:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۝ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴾ (ابراھیم: ۳۹-۴۱)

"سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق بخشے بلاشبہ میرا پروردگار ضرور دُعا کا سننے والا ہے، اے پروردگار مجھ کو اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا دے، اے ہمارے پروردگار ہماری دعا سن، اے ہمارے پروردگار تو مجھ کو اور میرے والدین کو اور کل مومنوں کو قیام حساب (قیامت) کے روز بخش دے۔"

ان آیات کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا ایک لمحہ کے لیے بھی کسی شخص کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ ان لغو اور بے سروپا دعووں کی تصدیق کرے جن کو مستشرقین یورپ نے اپنی جہالت یا ارادی جھوٹ کے ساتھ علمی تنقید کا عنوان دیا ہے، کیا یہ آیات مکی نہیں ہیں، اور کیا ان سے وہ سب کچھ ثابت نہیں ہوتا جو مدنی آیات میں مذکور ہے؟

۴ اسی طرح سورۂ ابراہیم کے علاوہ سورۂ انعام اور سورۂ النحل بھی مکی سورتیں ہیں ان میں بصراحت موجود ہے کہ حضرت ابراہیم شرک کے مقابلہ میں ملت حنیفی کے داعی ہیں اور ان کی شخصیت اس دعوت میں بہت نمایاں اور ممتاز ہے۔

﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴾(الانعام: ۷۹)

"بلاشبہ میں اپنے چہرہ کو اسی ذات کی طرف جھکاتا ہوں جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور شرک کرنے والوں میں سے ہرگز نہیں۔"

﴿قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ۬ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴾(الانعام: ۱۶۱)

"(اے محمد ﷺ) کہہ دو بلاشبہ مجھ کو میرے رب نے سیدھی راہ کی ہدایت کی ہے جو کج مج راہ سے الگ صاف اور سیدھا دین ہے ملت ہے ابراہیم کی جو تھے ایک خدا کی طرف جھکنے والے اور نہ تھے وہ مشرکوں میں سے۔"

﴿اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا ؕ وَ لَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴾(النحل: ۱۲۰)

"بیشک ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا حکم بردار صرف ایک خدا کی طرف جھکنے والا اور نہ تھا وہ شرک کرنے والوں میں سے۔"

﴿ثُمَّ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴾(النحل: ۱۲۳)

"پھر وحی کی ہم نے تیری جانب (اے محمد ﷺ) اس بات کی کہ تو پیروی کر اس ابراہیم کی ملت کی جو صرف خدائے واحد کی جانب جھکنے والا ہے اور نہیں ہے مشرکوں میں سے۔"

تو کیا ان واضح آیات کے بعد بھی ان دلائل کو دلائل کہنا کوئی حقیقت رکھتا ہے جو اس سلسلہ میں سنوک اور اس کے ہمنواؤں نے بیان کیے ہیں؟ مکی سورتیں ہوں یا مدنی دونوں جگہ ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت ایک ہی طرح نمایاں نظر آتی ہے، وہ دونوں حالتوں میں ملت حنیفی کے داعی حضرت اسماعیل علیہ السلام اور عرب کے باپ، کعبہ کے موسس و بانی اور عرب کے ہادی ہیں، اور اس لیے مستشرقین یورپ کا یہ کہنا کہ ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت قرآن عزیز کی مکی اور مدنی آیات میں دو جدا جدا صورتوں میں نظر آتی ہے کذب اور صریح بہتان ہے نیز یہ بھی خلاف واقعہ ہے کہ عرب میں رسول اکرم ﷺ کے دعوائے نبوت سے قبل کوئی بھی پیغمبر نہیں گزرا اس لیے کہ ابراہیم و اسماعیل اور ہود و صالح علیہم السلام اسی سرزمین کے ہادی و پیغمبر ہیں۔

ان مدعیان علم کو تعصب نے ایسا نادان بنا دیا کہ قرآن اور محمد رسول اللہ ﷺ پر اعتراض کرتے وقت یہ بھی خیال نہ رہا کہ ہم کے دعوے سے ہم صرف قرآن ہی کی نہیں بلکہ بائبل (تورات) کی بھی تکذیب کر رہے ہیں، اس لیے کہ تورات میں تصریح

ہے کہ اسماعیل، ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے ہیں اور اسماعیل علیہ السلام ہی عرب کے باپ ہیں اور ابراہیم علیہ السلام کی اسی اولاد سے حجاز کی سرزمین آباد ہوئی اور یہ دونوں باپ بیٹے عرب کی نمایاں شخصیتیں ہیں۔

نیز یہ الزام بھی قطعاً بے بنیاد اور لغو ہے کہ "مکہ کی زندگی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود اور ان کے مذہبی امور کی تقلید کی اور جب مدینہ میں پہنچ کر یہود کے انکار اور ان کے مخالفانہ جذبہ کو دیکھا تو یہود سے الگ ایک نئی یہودیت کی بنیاد ڈالی اور اس کو ملت ابراہیمی کا لقب دیا اس لیے کہ مکہ کی زندگی میں تو یہود سے آپ کا سابقہ ہی نہیں پڑا تو پھر مخالفت وموافقت یا اتباع کا سوال ہی کیا، البتہ مدینہ میں آ کر آپ نے مشرکین کے مقابلہ میں یہود کی جانب زیادہ توجہ فرمائی اور یہ اس لیے کہ وہ اسلام کے عقیدہ کے مطابق دین موسوی کے پیرو تھے اگرچہ اس میں تحریف ہو چکی تھی مگر وہ مشرکین کے خلاف توحید کے قائل تھے اور ان کی محرف کتابوں میں تحریف کے بعد بھی بہت سے جملے ایسے موجود تھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور رسالت کے شاہد اور گواہ ہیں اور ان سے آپ کے حق میں بشارات نکلتی ہیں، نیز بہت سے وہ احکام بھی موجود تھے جو صحیح معنی میں وحی الٰہی کی حیثیت رکھتے ہیں اور دین موسوی کی اساس و بنیاد رہے ہیں اس لیے آپ کو خیال تھا کہ یہ مشرکین کے مقابلہ میں جلد ہی ملت ابراہیمی یعنی اسلام قبول کر لیں گے لیکن جب آپ نے ان کے انکار، بغض وحسد کا تجربہ کر لیا تو پھر ان کے ساتھ بھی آپ کا معاملہ وہی ہو گیا جو مشرکین کے ساتھ تھا اور بمصداق ((الکفر ملة واحدة))۔ "کفر سب ایک ملت ہے" آپ نے ان سب کو ایک ہی حیثیت میں رکھا۔

اسپرنگر، سنوک اور ان کے ہمنوا اتنی صاف بات سمجھنے سے بھی قاصر ہیں یا عمداً سمجھنا نہیں چاہتے کہ جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) کے دادا تھے اور یہود اپنے دین کی نسبت حضرت اسرائیل علیہ السلام کی جانب کرتے اور بنی اسرائیل ہونے کی حیثیت سے اس پر فخر کرتے تھے تو ان کا یہ کہنا کہ ابراہیم علیہ السلام بھی یہودی تھے کس قدر مضحکہ خیز تھا، کیا پوتے کے دین کے متعلق کسی طرح یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ عرصہ دراز کے گزرے ہوئے دادا کا دین پوتے کے دین کے تابع تھا۔ پس اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے قرآن عزیز نے یہ اعلان کیا:

﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۗ ﴾(آل عمران:٦٧)

"ابراہیم نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی، البتہ وہ تھے ایک خدا کی جانب جھکنے والے مسلمان"۔

مگر ان کور چشموں نے اس کے معنی یہ لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تو یہود کے دین پر تھے لیکن مدینہ جا کر جب یہود نے ان کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا تو یہود کے دین کے مقابلہ میں ذکاوت طبع سے یہودیت ابراہیمی ایجاد کر لی۔ سبحانك هذا بهتان عظيم۔

سنوک اور اس کے ہمنواؤں نے اس دعوے کی دلیل میں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب میں کوئی پیغمبر نہیں گزرا، قرآن عزیز کی اس آیت کو بھی پیش کیا ہے:

﴿لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ﴾(السجدہ:٣)

"تاکہ تو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ڈرائے ایسی قوم کو کہ نہیں آیا ان کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا"۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر ابراہیم واسماعیل علیہما السلام عرب کے پیغمبر ہوتے تو قرآن عزیز امت عربیہ کے متعلق اس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم

خطاب نہ کرتا۔

مگر یہ بھی ایک سخت مغالطہ ہے جو قرآن عزیز کے طرز خطابت، اسلوب بیان، اور باطل پرستوں کی باطل پرستی، کے خلاف دلائل کی ترتیب سے ناواقفیت کی بناء پر پیدا ہوا ہے یا گذشتہ اعتراضات کی طرح محض بغض وعناد کی خاطر اختیار کیا گیا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ عرب کا بہت بڑا حصہ بت پرستی میں مبتلاء تھا، اس سلسلہ میں انہوں نے عقائد اور دین کے نام سے کچھ احکام مرتب کر رکھے تھے، مثلاً دیوتاؤں کی نذر اور قربانی کے لیے سائبہ، بحیرہ اور وصیلہ کی ایجاد، اور مختلف بتوں کی پرستش کے مختلف قواعد وضوابط وغیرہ، اس لیے جب نبی اکرم ﷺ نے ان کو توحید اور اسلام کی دعوت دی اور شرک اور بت پرستی سے روکا تو وہ کہنے لگے کہ تمہارا یہ کہنا کہ ہم بد دین ہیں اور ہمارا کوئی الہامی دین نہیں ہے، غلط ہے ہم تو خود مستقل دین رکھتے ہیں اور وہ ہمارے باپ دادا کا قدیمی دین ہے۔

﴿ قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ﴾ (الاعراف: ۲۸)

"مشرکین نے کہا۔ ہم نے اسی (بت پرستی) پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے۔"

تب قرآن عزیز نے ان کے باطل عقائد کی حقیقت کو ان پر واضح کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کو بتایا جائے کہ کسی دین کے خدائی دین ہونے کے لیے دو ہی قسم کے دلائل ہو سکتے ہیں، یا حسی اور عقلی راہ سے یہ واضح ہو جائے کہ یہ خدا کا دین اور اس کا مرغوب مذہب ہے، اور یا نقلی روایات اس کا قطعی، یقینی اور نا قابل انکار ثبوت پیش کرتی ہوں کہ یہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعت ہے اور اگر یہ دونوں راہیں کسی دعوے کے لیے بند ہیں تو وہ دعویٰ باطل اور اس کا مدعی کاذب ہے۔

لہٰذا قرآن عزیز نے مشرکین کے اس دعوے کی تردید کے لیے آیات قرآنی کے تین حصے کر دیئے، ایک حصہ میں ان کے اس دعوے کا انکار اور دعوے کی غیر معقولیت کا اظہار کیا اور بتایا کہ مشرکین کا یہ کہنا کہ ﴿ وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ﴾ "(ہم کو خدا نے ایسا (شرک) کرنے ہی کا حکم دیا ہے) بالکل غلط اور سراسر باطل ہے اس لیے کہ:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (الاعراف: ۲۸)

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ بے ہودہ خرافات کا حکم نہیں دیا کرتا (اے مشرکین) کیا تم اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے۔"

اور دوسرا حصہ ان کے باطل دعوے پر حسی اور عقلی سند کے مطالبہ سے متعلق کیا اور بتایا کہ وہ عقل سے یہ فتویٰ صادر کریں کہ جو کچھ خدا کے ساتھ انہوں نے غلط نسبتیں قائم کر رکھی ہیں اور جن پر ان کے مزعومہ دین کی بنیاد قائم ہے، وہ کس طرح صحیح اور اہل عقل کے نزدیک قابل تسلیم ہیں؟ وہ کہتا ہے:

﴿ فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَ لَهُمُ الْبَنُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّ هُمْ شٰهِدُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ۝ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ ۟ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ ﴾ (الصافات: ۱۴۹-۱۵۵)

"پس (اے محمد ﷺ) تم ان سے دریافت کرو کیا تمہارے پروردگار کے لیے لڑکیاں ہیں اور ان کے لیے لڑکے، کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں بنایا اور وہ اس وقت موجود تھے، خبردار بلاشبہ یہ سب ان کی بہتان طرازی ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے اولاد ہے، بلاشبہ یہ قطعاً جھوٹے ہیں (یہ کہتے ہیں کہ خدا نے) اپنے لیے بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیوں کو پسند کرلیا ہے (اے مشرکین) تم کو کیا ہوا یہ تم کیسا (جھوٹا) حکم کرتے ہو، پس کیا تم نصیحت نہ حاصل کرو گے؟"

اور تیسرا حصہ ان کے باطل عقیدوں کے متعلق نقلی سند کے مطالبہ سے وابستہ کیا، قرآن عزیز ان سے سوال کرتا ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اور اس کو خدا کا دین بتا رہے ہو تو کیا تمہارے پاس اس کے لیے خدا کی جانب سے کوئی حجت، اور دلیل نازل ہوئی ہے یا اس کے پاس سے ان عقائد کی صداقت کے لیے کوئی کتاب بھیجی گئی ہے اگر ایسا ہے تو پیش کرو؟

﴿اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ (الصافات: ۱۵۶۔۱۵۷)

"کیا تمہارے پاس کوئی ظاہر حجت اور صاف دلیل ہے پس تم اپنی (خدا کی جانب سے نازل شدہ) وہ کتاب لاؤ اگر تم سچے ہو؟"

اب اگر ان کے اپنے دعوے کی صداقت کے لیے ان کے پاس نہ کوئی حسی و عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی سند کے طور پر کوئی حجت و کتاب، تو پھر ان کا یہ دعویٰ کہ ان کے پاس محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے سے خدا کا دین موجود ہے اور اس کی منضبط شریعت بھی! بالکل غلط اور باطل دعویٰ ہے۔

اسی طرح مشرکین پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ تمہارے پاس اپنے دعوائے باطل کے سلسلہ میں نہ عقلی سند ہے اور نہ نقلی اور ان کو لاجواب بنانے کے لیے سورۂ احقاف میں بھی یہی طریق استدلال اختیار کیا گیا ہے۔

﴿اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ؕ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ﴾ (الاحقاف: ۴)

"تم مجھے بتاؤ کہ اللہ کے ماسواء جن کو تم پوجتے ہو مجھے دکھلاؤ کہ انہوں نے زمین سے کیا بنایا، یا کیا ان کی آسمانوں میں (اللہ کے ساتھ) کوئی شرکت ہے، اس سے پہلی کوئی کتاب اگر تمہارے پاس ہے (جو اس دعوے کی تصدیق کرتی ہو) تو وہ لے آؤ، یا علم (اولین میں سے کوئی بقیہ علم) تمہارے پاس ہو تو وہ پیش کر۔"

یہی وہ حقیقت ہے جس کو ایک دوسرے پیرایہ میں قرآن عزیز کی ان آیات میں بیان کیا گیا ہے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشرکین عرب کے پاس محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں آیا، ان آیات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سرزمین عرب (حجاز) ہمیشہ سے خدا کے نبی اور پیغمبر کے وجود سے محروم ہے اور اس ملک میں نبی اکرم ﷺ کی آواز سب سے پہلی آواز ہے، قرآن عزیز ایسی خلاف حقیقت بات کس طرح کہہ سکتا تھا جبکہ سورۂ ابراہیم، الانعام اور النمل کی آیات میں حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے عربی نبی ہونے کی صاف اور صریح شہادتیں موجود ہیں جو ابھی نقل کی جا چکی ہیں بلاشبہ قرآن عزیز اس قسم کے تضاد اور اختلاف سے قطعاً بری ہے، کہ ایک جگہ وہ ایک بات کا انکار کرے اور دوسری جگہ اسی بات کا اقرار، اس لیے کہ وہ خدائے عالم الغیب والشہادۃ کا

کلام ہے نہ کہ بھول چوک کرنے والے انسان کا کلام۔

﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ ﴾ (النساء: ۸۲)

"کیا انہوں نے قرآن پر غور نہیں کیا اور اگر وہ ہوتا اللہ کے سواء کسی اور کا کلام تو ضرور پاتے اس میں بہت سا اختلاف۔"

لہٰذا قرآن عزیز کے خلاف سنوک، اسپرنگر اور وینسنگ کے یہ تمام دعاوی اور ان کے دلائل تاریخی حقائق اور واقعات کی روشنی میں قطعاً باطل اور افتراء ہیں اور ان کے طرزِ عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کے دوسرے ناقدین قرآن عزیز پر علمی دیانت کے ساتھ تنقید نہیں کرتے اور نہ ان کی فہم اور سمجھ کا قصور ہے بلکہ اس کے برعکس وہ علمی بددیانتی سے کام لے کر قرآن کے خلاف زہر اگلتے، غلط الزام قائم کرتے، اور صریح اور واضح مسائل میں اپنے پیش نظر مقاصد کے مطابق گنجلک پیدا کر کے ناواقف دنیا کو گمراہ کرتے ہیں، بلکہ اس قسم کے الزامات سے ان کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے جس کو قرآن عزیز نے اس قسم کے معاندین کے لیے ایک مستقل قانون کی طرح واضح کر دیا ہے:

﴿ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً ﴾ (النساء: ۸۹)

"یہ (منکرین قرآن و اسلام) یہ خواہش رکھتے ہیں کہ کاش تم بھی ان کی طرح منکر بن جاؤ تاکہ وہ اور تم سب یکساں ہو جائیں۔"

اس لیے ان منکرین (کافروں) کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ہمیشہ ایک ہی جواب رہا ہے۔

﴿ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا ﴾ (آل عمران: ۸)

"اے پروردگار ہمارے دلوں کو ہدایت یافتہ اور راہ یاب کرنے کے بعد کجی کی جانب مت مائل کرنا۔"

بہرحال قرآن حکیم کی مسطورہ بالا زیرِ بحث آیت کا مطلب صاف اور واضح ہے اور اس کے درمیان اور الانعام، النحل اور ابراہیم جیسی سورتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے پیغمبر عرب ہونے کے درمیان قطعاً کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔

اس پیش کردہ تفصیل و تشریح کے علاوہ عام مفسرین نے اس قسم کی آیات کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یہ خطاب صرف ان ہی لوگوں سے متعلق ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک میں موجود تھے۔ ان کے گزشتہ آباؤ اجداد اور گزشتہ تاریخ عرب سے اس خطاب کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر قرآن میں:

قرآن عزیز کے رشد و ہدایت کا پیغام چونکہ ملت ابراہیمی کا پیغام ہے اس لیے اس نے جگہ جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا ہے اور جیسا کہ گزشتہ سطور میں کہا جا چکا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر مکی اور مدنی دونوں قسم کی سورتوں میں موجود ہے، مندرجہ ذیل جدول ان تمام سورتوں اور آیتوں کو ظاہر کرتی ہے۔

نام سورہ	نمبر سورہ	تعداد آیات
البقرہ	۲	۱۲۴،۱۲۵،۱۲۶،۱۲۷،۱۳۰،۱۳۲،۱۳۳،۱۳۵،۱۳۶،۱۴۰،۲۵۸،۲۶۰
آل عمران	۳	۳۳،۶۵،۶۷،۶۸،۸۴،۹۵،۹۷
النساء	۴	۵۴،۱۲۵،۱۶۳
الانعام	۶	۷۴،۷۵،۸۳،۱۶۱
التوبہ	۹	۷۰،۱۱۴
ہود	۱۱	۶۹،۷۴،۷۵،۷۶
ابراہیم	۱۴	۳۵
النحل	۱۶	۱۲۰،۱۲۳
الانبیاء	۲۱	۵۱،۶۰،۶۲،۶۹
الشعراء	۲۶	۶۹
الاحزاب	۳۳	۷
صٓ	۳۸	۴۵
الزخرف	۴۳	۲۶
النجم	۵۳	۳۷
الممتحنہ	۶۰	۴
یوسف	۱۲	۶،۳۸
الحجر	۱۵	۵۱
مریم	۱۹	۴۱،۴۶،۵۸
الحج	۲۲	۲۶،۴۳،۷۸
العنکبوت	۲۹	۱۶،۳۱
الصافات	۳۷	۸۳،۱۰۴،۱۰۹
الشوریٰ	۴۲	۱۳
الذاریات	۵۱	۲۴
الحدید	۵۷	۲۶
الاعلیٰ	۸۷	۱۹
مجموعہ	۲۵ سورتیں	۶۳ آیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے ساتھ دوسرے چند انبیاء علیہم السلام کے واقعات بھی وابستہ ہیں مثلاً حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ اس لیے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے بھی ہیں، اور ان کے پیرو بھی۔ اسی طرح ان کے صاحبزادوں حضرت اسماعیل وحضرت اسحاق علیہما السلام کے واقعات، اس لیے کہ اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ستاسی سال تھی اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کے وقت ان کی عمر پورے سو سال تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کل عمر ایک سو پچھتر (۱۷۵) سال ہوئی۔ لیکن ان تینوں پیغمبروں کے تفصیلی واقعات مستقل عنوان میں درج کئے جائیں گے اور یہاں صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے ضمن میں کہیں کہیں ذکر آئے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس عظمت شان کے پیش نظر جو انبیاء و رسل کے درمیان ان کو حاصل ہے قرآن عزیز نے ان کے واقعات کو مختلف اسلوب کے ساتھ جگہ جگہ بیان کیا ہے، ایک مقام پر اگر اختصار کے ساتھ ذکر ہے تو دوسری جگہ تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے اور بعض جگہ مختلف شؤن واوصاف کے پیش نظر ان کی شخصیت کو نمایاں کیا ہے اس لیے مناسب ترتیب کے ساتھ ان کو پیش کیا جاتا ہے۔

تورات یہ بتاتی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام عراق کے قصبہ اور اس کے باشندے اور اہل فدان میں سے تھے اور ان کی قوم بت پرست تھی اور انجیل برنابا میں تصریح ہے کہ ان کے والد نجاری (ترکھان) کا پیشہ کرتے اور اپنی قوم کے مختلف قبائل کے لیے لکڑی کے بت بناتے اور فروخت کیا کرتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شروع ہی سے حق کی بصیرت اور رشد و ہدایت عطا فرمائی تھی اور وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ بت نہ سن سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کسی کی پکار کا جواب دے سکتے ہیں، اور نہ نفع ونقصان کا ان سے کوئی واسطہ، اور نہ لکڑی کے کھلونوں اور دوسری بنی ہوئی چیزوں کے اور ان کے درمیان کوئی فرق و امتیاز ہے، وہ صبح و شام آنکھ سے دیکھتے تھے کہ ان بے جان مورتیوں کو میرا باپ اپنے ہاتھوں سے بناتا اور گھڑتا رہتا ہے اور جس طرح اس کا جی چاہتا ہے، ناک، کان، آنکھیں اور جسم تراش لیتا اور پھر خریدنے والوں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے تو کیا یہ خدا ہو سکتے ہیں یا خدا کے مثل وہمسر کہے جا سکتے ہیں؟ حاشا وکلا پس بعثت سے سرفراز ہو کر سب سے پہلے انہوں نے اسی طرف توجہ فرمائی۔

بعثت:

قرآن عزیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس حقیقت بیں اور بصیرت افروز رشد و ہدایت کا اس طرح ذکر کرتا ہے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۚ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۞ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۞ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۞ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ۞ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَ اَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۞﴾ (الانبیاء: ۵۱۔۵۶)

"اور بلاشبہ ہم نے ابراہیم کو اول ہی سے رشد و ہدایت عطاء کی تھی، اور ہم اس کے (معاملہ کے) جاننے والے تھے جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: "یہ مجسمے کیا ہیں جن کو تم لیے بیٹھے ہو" کہنے لگے "ہم نے اپنے باپ دادا کو ان ہی کی پوجا کرتے پایا ہے" ابراہیم نے کہا "بلاشبہ تم اور تمہارے باپ دادا کھلی گمراہی میں ہیں" انہوں نے جواب دیا کیا تو ہمارے لیے کوئی حق لایا ہے یا یوں ہی مذاق کرنے والوں کی طرح کہتا ہے، ابراہیم علیہ السلام نے کہا (یہ بت تمہارے رب نہیں ہیں) بلکہ تمہارا پروردگار زمینوں اور آسمانوں کا پروردگار ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے اور میں اسی بات کا قائل ہوں۔"

اور جب کہ اس جلیل القدر ہستی پر اللہ تعالیٰ کے جود و کرم اور عطاء و نوال کا فیضان بے غایت و بے نہایت سرعت رفتار کے ساتھ ہو رہا تھا تو اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس نے انبیاء علیہم السلام کی صف میں نمایاں جگہ پائی اور اس کی دعوت و تبلیغ کا محور و مرکز "دین حنیف" قرار پایا۔

اس نے جب یہ دیکھا کہ قوم بت پرستی، ستارہ پرستی اور مظاہر پرستی میں اس قدر منہمک ہے کہ خدائے برتر کی قدرت مطلقہ اور اس کی احدیت و صمدیت کا تصور بھی ان کے قلوب میں باقی نہیں رہا اور ان کے لیے خدا کی وحدانیت کے عقیدہ سے زیادہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں رہی، تب اس نے کمر ہمت چست کی اور ذات واحد کے بھروسہ پر ان کے سامنے دین حق کا پیغام رکھا اور اعلان کیا۔

اے قوم! یہ کیا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بتوں کی پرستش میں مشغول ہو، کیا تم اس قدر خواب غفلت میں ہو کہ جس بے جان لکڑی کو اپنے آلات سے گھڑ کر مجسمے تیار کرتے ہو اور اگر وہ مرضی کے مطابق نہ بنے تو ان کو توڑ کر دوسرے بنا لیتے ہو، بنا لینے کے بعد پھر ان ہی کو پوجنے اور نفع و ضرر کا مالک سمجھنے لگتے ہو، تم اس خرافات سے باز آؤ، خدا کی توحید کے نغمے گاؤ، اور اسی ایک مالک حقیقی کے سامنے سر نیاز جھکاؤ جو میرا، تمہارا اور کل کائنات کا خالق و مالک ہے۔

مگر قوم نے اس کی آواز پر مطلق کان نہ دھرا اور چونکہ گوش حق نیوش اور نگاہ حق بین سے محروم تھی اس لیے اس نے جلیل القدر پیغمبر کی دعوت حق کا مذاق اڑایا۔ اور زیادہ سے زیادہ تمرد و سرکشی کا مظاہرہ کیا۔

باپ کو دعوت اسلام اور باپ بیٹے کا مناظرہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام دیکھ رہے تھے کہ شرک کا سب سے بڑا مرکز خود ان کے اپنے گھر میں قائم ہے اور آزر کی بت سازی و بت پرستی پوری قوم کے لیے مرجع و محور بنی ہوئی ہے اس لیے فطرت کا تقاضا ہے کہ دعوت حق اور پیغام صداقت کے اداء فرض کی ابتداء گھر ہی سے ہونی چاہیے۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے والد "آزر" ہی کو مخاطب کیا اور فرمایا: اے باپ! خدا پرستی اور معرفت الٰہی کے لیے جو راستہ تو نے اختیار کیا ہے اور جس کو آباؤ اجداد کا قدیم راستہ بتلایا ہے یہ گمراہی اور باطل پرستی کی راہ ہے۔ اور صراط مستقیم اور راہ حق صرف وہی ہے جس کی دعوت میں دے رہا ہوں، اے باپ! توحید ہی سرچشمۂ نجات ہے نہ کہ تیرے ہاتھ کے بنائے ہوئے ان بتوں کی پرستش و عبادت، اس راہ کو چھوڑ اور توحید حق کی راہ کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کرتا کہ تجھ کو خدا کی رضا اور دنیا و آخرت کی سعادت حاصل ہو۔

مگر افسوس کہ آزر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس پند و نصیحت کا مطلق کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ قبول حق کے بجائے آزر نے بیٹے

کو دھمکانا شروع کیا، کہنے لگا کہ ابراہیم! اگر تو بتوں کی برائی سے باز نہ آئے گا تو میں تجھ کو سنگسار کر دوں گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ معاملہ اب حد سے آگے بڑھ گیا اور ایک جانب اگر باپ کے احترام کا مسئلہ ہے تو دوسری جانب ادائے فرض، حمایت حق اور اطاعت امر الٰہی کا سوال، تو انہوں نے سوچا اور آخر وہی کیا جو ایسے برگزیدہ انسان اور اللہ کے جلیل المرتبت پیغمبر کے شایان شان تھا، انہوں نے باپ کی سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا، تحقیر و تذلیل کا رویہ نہیں برتا بلکہ نرمی، ملاطفت، اور اخلاق کریمانہ کے ساتھ یہ جواب دیا، اے باپ! اگر میری بات کا یہی جواب ہے تو آج سے میرا تیرا اسلام ہے میں خدا کے سچے دین اور اس کے پیغام حق کو نہیں چھوڑ سکتا، اور کسی حال بتوں کی پرستش نہیں کر سکتا، میں آج سے تجھ سے جدا ہوتا ہوں، مگر غائبانہ تیرے لیے درگاہِ الٰہی میں بخشش طلب کرتا رہوں گا تا کہ تجھ کو ہدایت نصیب ہو اور تو خدا کے عذاب سے نجات پائے۔

سورۃ مریم میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۝ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَ اهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ وَ اَعْتَزِلُكُمْ وَ مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ اَدْعُوْا رَبِّيْ ۫ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۝﴾ (مریم: ۴۱۔۴۸)

"اور (اے پیغمبر!) الکتاب میں ابراہیم کا ذکر کر، یقیناً وہ مجسم سچائی تھا اور اللہ کا نبی تھا۔ اس وقت کا ذکر جب اس نے اپنے باپ سے کہا، اے میرے باپ! تو کیوں ایک ایسی چیز کی پوجا کرتا ہے جو نہ تو سنتی ہے نہ دیکھتی ہے، نہ تیرے کسی کام آ سکتی ہے؟ اے میرے باپ! میں سچ کہتا ہوں علم کی ایک روشنی مجھے مل گئی ہے جو تجھے نہیں ملی، پس میرے پیچھے چل، میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں گا، اے میرے باپ! شیطان کی بندگی نہ کر، شیطان تو خدائے رحمٰن سے نافرمان ہو چکا، اے میرے باپ! میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو، خدائے رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب تجھے گھیرے، اور شیطان کا ساتھی ہو جائے۔ باپ نے (یہ باتیں سن کر) کہا: "ابراہیم (علیہ السلام) کیا تو میرے معبود سے پھر گیا ہے؟ یاد رکھ اگر تو ایسی باتوں سے باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر کے چھوڑوں گا، اپنی خیر چاہتا ہے تو جان سلامت لے کر مجھ سے الگ ہو جا" ابراہیم علیہ السلام نے کہا: "اچھا میرا سلام قبول ہو (میں الگ ہو جاتا ہوں) اب میں اپنے پروردگار سے تیری بخشش کی دعا کروں گا۔ وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں نے تم سب کو چھوڑا اور انہیں بھی جنہیں تم اللہ کے سوا پکارا کرتے ہو، میں اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں، اُمید ہے اپنے پروردگار کو پکار کے میں محروم ثابت نہیں ہوں گا۔"

سورہ انعام میں آزر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نصیحت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ (الانعام:۷۴)

"اور (وہ وقت یاد کر) جب ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ آزر سے کہا: "کیا ٹھہراتا ہے تو بتوں کو خدا، میں تجھ کو اور تیری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتا ہوں"۔

قوم کو دعوت اسلام اور اس سے مناظرہ:

باپ اور بیٹے کے درمیان جب اتفاق کی کوئی صورت نہ بنی اور آزر نے کسی طرح ابراہیم علیہ السلام کی رشد و ہدایت کو قبول نہ کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آزر سے جدائی اختیار کر لی اور اپنی دعوت حق اور پیغام رسالت کو وسیع کر دیا اور اب صرف آزر ہی مخاطب نہ رہا بلکہ پوری قوم کو مخاطب بنا لیا۔ مگر قوم اپنے باپ دادا کے دین کو کب چھوڑنے والی تھی۔ اس نے ابراہیم علیہ السلام کی ایک نہ سنی اور دعوت حق کے سامنے اپنے باطل معبودوں کی طرح گونگے، اندھے اور بہرے بن گئے۔

ان کے کان موجود تھے مگر حق کی آواز کے لیے بہرے تھے، پتلیاں آنکھوں کے حلقوں میں زندہ انسان کی آنکھوں کی طرح حرکت ضرور کرتی تھیں مگر حق کی بصارت سے محروم تھیں، زبان گویا ضرور تھی لیکن کلمہ حق کے اعتبار سے گنگ تھی۔

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝﴾ (الاعراف:۱۷۹)

"ان کے دل ہیں پر سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں پر دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں، یہ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں، یہی ہیں جو غفلت میں سرشار ہیں۔"

اور جب ابراہیم علیہ السلام نے زیادہ زور دے کر پوچھا کہ یہ تو بتاؤ کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو یہ تم کو کسی قسم کا بھی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ تو کہنے لگے کہ ان باتوں کے جھگڑے میں ہم پڑنا نہیں چاہتے، ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا ہی کرتے چلے آئے ہیں لہٰذا ہم بھی وہی کر رہے ہیں۔ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک خاص انداز سے خدائے واحد کی ہستی کی جانب توجہ دلائی، فرمانے لگے، میں تو تمہارے ان سب بتوں کو اپنا دشمن جانتا ہوں یعنی میں ان سے بے خوف و خطر ہو کر ان سے اعلان جنگ کرتا ہوں، کہ اگر یہ میرا کچھ بگاڑ سکتے ہیں تو اپنی حسرت نکال لیں۔

البتہ میں صرف اس ہستی کو اپنا مالک سمجھتا ہوں جو تمام جہانوں کی پروردگار ہے، جس نے مجھ کو پیدا کیا اور راہ راست دکھائی، جو مجھ کو کھلاتا پلاتا یعنی رزق دیتا ہے، اور جب میں مریض ہو جاتا ہوں تو جو مجھ کو شفاء بخشتا ہے، اور جو میری زیست و موت دونوں کا مالک ہے، اور اپنی خطاء کاری کے وقت جس سے یہ طمع کرتا ہوں کہ وہ قیامت کے روز مجھ کو بخش دے اور میں اس کے حضور میں یہ دعا کرتا رہتا ہوں، اے میرے پروردگار! تو مجھ کو صحیح فیصلہ کی قوت عطاء کر اور مجھ کو نیکوکاروں کی فہرست میں داخل کر اور مجھ کو

زبان کی سچائی عطا کر اور جنت نعیم کے وارثوں میں شامل کر۔

نصیحت و موعظت کے اس مؤثر انداز خطابت کو جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد اور قوم کے سامنے پیش کیا، سورۃ الشعراء میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ۞ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۞ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ۞ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۞ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ۞ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۞ قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۞ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۞ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۞ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ۞ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۞ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۞ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۞ رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۞ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۞ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ۞ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۞ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ۞ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۞ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۞ ﴾

(الشعراء:۶۹۔۸۹)

"اور سنا دے ان کو خبر ابراہیم (علیہ السلام) کی جب کہا اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو تم کس کو پوجتے ہو، وہ بولے ہم پوجتے ہیں مورتیوں کو پھر سارے دن انہی کے پاس لگے بیٹھے رہتے ہیں، کہا، کچھ سنتے ہیں تمہارا کہا جب تم پکارتے ہو یا کچھ بھلا کرتے ہیں تمہارا یا برا، بولے نہیں، پر ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو یہی کام کرتے، کہا: بھلا دیکھتے ہو جن کو پوجتے رہے ہو، تم اور تمہارے باپ دادے اگلے، سو وہ میرے دشمن ہیں مگر جہان کا رب جس نے مجھ کو بنایا سو وہی مجھ کو راہ دکھلاتا ہے اور وہ جو مجھ کو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی شفاء دیتا ہے، اور وہ جو مجھ کو مارے گا اور پھر جلائے گا، اور جس سے مجھ کو توقع ہے کہ بخشے میری تقصیر انصاف کے دن، اے میرے رب! دے مجھ کو حکم اور ملا مجھ کو نیکوں میں، اور رکھ میرا بول سچا پچھلوں میں، اور کر مجھ کو وارثوں میں نعمت کے باغ کے اور معاف کر میرے باپ کو وہ ہے راہ بھولے ہوؤں میں، اور رسوا نہ کر مجھ کو جس دن سب جی کر اٹھیں۔ جس دن نہ کام آوے کوئی مال اور نہ بیٹے، مگر جو کوئی آیا اللہ کے پاس لے کر بے روگ دل۔"

مگر آزر اور قوم آزر کے دل کسی طرح قبول حق کے لیے نرم نہ ہوئے اور ان کا انکار اور جحود حد سے گزرتا ہی رہا۔

گزشتہ سطور میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم، بت پرستی کے ساتھ ساتھ کواکب پرستی بھی کرتی تھی، اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ انسانوں کی موت و حیات، ان کا رزق ان کا نفع و ضرر، خشک سالی اور قحط سالی، فتح و ظفر اور شکست و ہزیمت، غرض تمام کارخانہ عالم کا نظم و نسق کواکب اور ان کی حرکات کی تاثیر پر چل رہا ہے، اور یہ تاثیر ان کے ذاتی اوصاف میں سے ہے اس لیے

ان کی خوشنودی ضروری ہے اور یہ ان کی پرستش کے بغیر ممکن نہیں۔

اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس طرح ان کو ان کے سفلی معبودان باطل کی حقیقت واشگاف کر کے راہ حق کی طرف دعوت دی اسی طرح ضروری سمجھا کہ ان کے علوی معبودان باطل کی بے ثباتی اور فنا کے منظر کو پیش کر کے اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیں کہ تمہارا یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ ان چمکتے ہوئے ستاروں، چاند اور سورج کو خدائی طاقت حاصل ہے، ہرگز نہیں، یہ خیال خام اور باطل عقیدہ ہے، مگر یہ باطل پرست جبکہ اپنے خود ساختہ اصنام سے اس قدر خائف تھے کہ ان کو برا کہنے والے کے لیے ہر آن یہ تصور کرتے تھے کہ وہ ان کے غضب میں آ کر برباد و تباہ ہو جائے گا تو ایسے اوہام پرستوں کے دلوں میں بلند ستاروں کی پرستش کے خلاف جذبہ پیدا کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اس لیے (مجدد انبیاء ابراہیم علیہ السلام) نے ان کے دماغوں کے مناسب ایک عجیب اور دلچسپ پیرایہ بیان اختیار فرمایا۔

تاروں بھری رات تھی، ایک ستارہ خوب روشن تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو دیکھ کر فرمایا "میرا رب یہ ہے؟" اس لیے کہ اگر ستارے ربوبیت کر سکتے ہیں تو یہ ان سب میں ممتاز اور روشن ہے لیکن جب وہ اپنے وقت مقررہ پر نظر سے اوجھل ہو گیا، اور اس کو یہ مجال نہ ہوئی کہ اپنے پرستاروں کے لیے ایک گھڑی اور رونمائی کرا سکتا اور نظام کائنات سے منحرف ہو کر اپنے پوجنے والوں کے لیے زیارت گاہ بنا رہتا۔ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: "میں چھپ جانے والے کو پسند نہیں کرتا" یعنی جس شئے پر مجھ سے بھی زیادہ تغیرات کا اثر پڑتا ہو، اور جو جلد جلد ان اثرات کو قبول کر لیتا ہو وہ میرا معبود کیونکر ہو سکتا ہے، پھر نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ چاند آب و تاب کے ساتھ سامنے موجود ہے، اس کو دیکھ کر فرمایا: "یہ میرا رب ہے؟" اس لیے کہ یہ خوب روشن ہے اور اپنی خنک روشنی سے سارے عالم کو بقعۂ نور بنائے ہوئے ہے پس اگر کواکب کو رب بنانا ہی ہے تو اسی کو کیوں نہ بنایا جائے کیونکہ یہی اس کا زیادہ مستحق نظر آتا ہے۔

اب سحر کا وقت ہونے لگا تو قمر کے بھی ماند پڑ جانے اور روپوش ہو جانے کا وقت آ پہنچا اور جس قدر طلوع آفتاب کا وقت قریب ہوتا گیا چاند کا جسم دیکھنے والوں کی آنکھوں سے اوجھل ہونے لگا، تو یہ دیکھ کر ابراہیم علیہ السلام نے ایک ایسا جملہ فرمایا۔ جس سے چاند کے رب ہونے کی نفی کے ساتھ ساتھ خدائے واحد کی ہستی کی جانب قوم کی توجہ اس خاموشی کے ساتھ پھیر دی جائے کہ قوم اس کا احساس بھی نہ کر سکے اور اس گفتگو کا جو مقصد وحید ہے "یعنی صرف خدائے واحد پر ایمان" وہ ان کے دلوں میں بغیر قصد و ارادے کے پیوست ہو جائے فرمایا: "اگر میرا حقیقی پروردگار میری رہنمائی نہ کرتا تو میں بھی ضرور گمراہ قوم ہی میں سے ایک ہوتا"۔

پس اس قدر فرمایا اور خاموش ہو گئے اس لیے کہ ابھی اس سلسلہ کی ایک کڑی اور باقی ہے اور قوم کے پاس ابھی مقابلہ کے لیے ایک ہتھیار موجود ہے اس لیے اس سے زیادہ کہنا مناسب نہیں تھا۔

تاروں بھری رات ختم ہوئی چمکتے ہوئے ستارے اور چاند سب نظر سے اوجھل ہو گئے، کیوں؟ اس لیے کہ اب آفتاب عالمتاب کا رخ روشن سامنے آ رہا ہے، دن نکل آیا اور وہ پوری آب و تاب سے چمکنے دمکنے لگا۔

ابراہیم علیہ السلام نے اس کو دیکھ کر فرمایا: "یہ ہے میرا رب کیونکہ یہ کواکب میں سب سے بڑا ہے اور نظام فلکی میں اس سے بڑا ستارہ ہمارے سامنے دوسرا نہیں ہے؟" لیکن دن بھر چمکنے اور روشن رہنے اور تمام عالم کو روشن کرنے کے بعد وقت مقررہ پر اس نے بھی عراق کی سرزمین سے پہلو بچانا شروع کر دیا اور شب دیجور آہستہ آہستہ سامنے آنے لگی اور آخر کار وہ نظروں سے غائب ہو گیا، تو اب

وقت آ پہنچا کہ ابراہیم علیہ السلام اصل حقیقت کا اعلان کر دیں اور قوم کو لاجواب بنا دیں کہ ان کے عقیدہ کے مطابق اگر ان کواکب کو ربوبیت اور معبودیت حاصل ہے تو اس کی کیا وجہ کہ ہم سے بھی زیادہ ان میں تغیرات نمایاں ہیں اور یہ جلد جلد ان کے اثرات سے متاثر ہوتے ہیں اور اگر معبود ہیں تو ان میں "افول" کیوں ہے جس طرح چمکتے نظر آتے تھے اسی طرح کیوں چمکتے نہ رہے، چھوٹے ستاروں کی روشنی کو ماہتاب نے کیوں ماند کر دیا اور ماہتاب کے رخ روشن کو آفتاب کے نور نے کس لیے بےنور بنا دیا۔

پس اے قوم! میں ان مشرکانہ عقائد سے "بری ہوں اور شرک کی زندگی سے بیزار، بلاشبہ میں نے اپنا رخ صرف اسی ایک خدا کی جانب کر لیا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے میں "حنیف" ہوں اور "مشرک" نہیں ہوں۔

اب قوم سمجھی کہ یہ کیا ہوا، ابراہیم علیہ السلام نے ہمارے تمام ہتھیار بیکار اور ہمارے تمام دلائل پامال کر دیئے، اب ہم ابراہیم علیہ السلام کے اس مضبوط و محکم برہان کا کس طرح رَد کریں اور اس کی روشن دلیل کا کیا جواب دیں؟ وہ اس کے لیے بالکل عاجز و درماندہ تھے اور جب کوئی بس نہ چلا تو قائل ہونے اور صدائے حق کو قبول کر لینے کے بجائے ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑنے اور اپنے معبودانِ باطلہ سے ڈرانے لگے کہ وہ تیری توہین کا تجھ سے ضرور انتقام لیں گے اور تجھ کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کیا تم مجھ سے جھگڑتے اور اپنے بتوں سے مجھ کو ڈراتے ہو حالانکہ خدائے تعالیٰ نے مجھ کو صحیح راہ دکھا دی ہے اور تمہارے پاس گمراہی کے سواء کچھ نہیں، مجھے تمہارے بتوں کی مطلق کوئی پرواہ نہیں، جو کچھ میرا رب چاہے گا وہی ہوگا۔ تمہارے بت کچھ بھی نہیں کر سکتے، کیا تم کو ان باتوں سے کوئی نصیحت حاصل نہیں ہوتی؟ تم کو تو خدا کی نافرمانی کرنے اور اس کے ساتھ بتوں کو شریک ٹھہرانے میں بھی کوئی خوف نہیں آتا جس کے لیے تمہارے پاس ایک دلیل بھی نہیں ہے اور مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ خدائے واحد کا ماننے والا اور امن عالم کا ذمہ دار ہو کر میں تمہارے بتوں سے ڈر جاؤں گا، کاش کہ تم سمجھتے کہ کون مفسد ہے اور کون مصلح و امن پسند؟

صحیح امن کی زندگی اسی شخص کو حاصل ہے جو خدائے واحد پر ایمان رکھتا اور شرک سے بیزار رہتا ہے، اور وہی راہ یاب ہے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ کی یہ وہ عظیم الشان حجت تھی جو اس نے ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے بت پرستی کے خلاف ہدایت و تبلیغ کے بعد کواکب پرستی کے رَد میں ظاہر فرمائی اور ان کی قوم کے مقابلہ میں ان کو روشن دلائل و براہین کے ساتھ سربلندی عطاء فرمائی۔

اس سلسلہ میں سورۂ انعام کی یہ آیات شاہد عدل ہیں:

﴿وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ وَ حَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ۚ قَالَ

اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰہِ وَقَدْ ھَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّیْ شَيْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰہِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰی قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾ (الانعام: ۷۵-۸۳)

"اور اسی طرح ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہت کے جلوے دکھائے، تاکہ وہ یقین رکھنے والوں میں سے ہو جائے پھر (دیکھو) جب ایسا ہوا کہ اس پر رات کی تاریکی چھا گئی تو اس نے (آسمان پر) ایک ستارہ (چمکتا ہوا) دیکھا۔ اس نے کہا "یہ میرا پروردگار ہے" (کہ سب لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں) لیکن جب وہ ڈوب گیا تو کہا "نہیں میں انہیں پسند نہیں کرتا جو ڈوب جانے والے ہیں (یعنی طلوع و غروب ہوتے رہتے ہیں) پھر جب ایسا ہوا کہ چاند چمکتا ہوا نکل آیا، تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا "یہ میرا پروردگار ہے" لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا "اگر میرے پروردگار نے مجھے راہ نہ دکھائی ہوتی تو میں ضرور اسی گروہ میں سے ہو جاتا جو راہ راست سے بھٹک گیا ہے"! پھر جب صبح ہوئی اور سورج چمکتا ہوا طلوع ہوا تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا، یہ میرا پروردگار ہے کہ یہ سب سے بڑا ہے" لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا، تو اس نے کہا اے میری قوم! تم جو کچھ خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو، میں اس سے بیزار ہوں، میں نے تو ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف اسی ہستی کی طرف اپنا رخ کر لیا ہے جو (کسی کی بنائی ہوئی نہیں، بلکہ) آسمان و زمین کی بنانے والی ہے (اور جس کے حکم و قانون پر تمام آسمانی اور ارضی مخلوقات چل رہی ہیں) اور میں ان میں سے نہیں جو اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے ہیں!" اور (پھر) ابراہیم سے اس کی قوم نے رد و کد کی، ابراہیم نے کہا: "کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں رد و کد کرتے ہو، حالانکہ اس نے مجھے راہ حق دکھا دی ہے جنہیں تم نے خدا کا شریک ٹھہرا لیا ہے، میں ان سے نہیں ڈرتا۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، مگر یہ کہ میرا پروردگار ہی مجھے نقصان پہنچانا چاہے، میرا پروردگار اپنے علم سے تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ پھر کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے" اور (دیکھو) میں ان ہستیوں سے کیونکر ڈر سکتا ہوں جنہیں تم نے خدا کا شریک ٹھہرا لیا ہے جبکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراؤ جن کے لیے اس نے کوئی سند و دلیل تم پر نہیں اتاری؟ بتلاؤ ہم دونوں فریقوں میں سے کس کی راہ امن کی راہ ہوئی، اگر علم و بصیرت رکھتے ہو جن لوگوں نے خدا کو مانا اور اپنے ماننے کو ظلم سے (یعنی شرک سے) آلودہ نہیں کیا تو انہی کے لیے امن ہے اور وہی ٹھیک راستہ پر ہیں اور (دیکھو) یہ ہماری حجت ہے ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر دی تھی، ہم جس کے مرتبے بلند کرنا چاہتے ہیں اسے علم و دلیل کا عرفان دے کر بلند کر دیتے ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار حکمت والا علم رکھنے والا ہے۔"

آیات کی تفسیر میں قول فیصل:

اس بارہ میں کلی اتفاق کے باوجود کہ ابراہیم علیہ السلام نے کبھی کواکب پرستی نہیں کی اور ان کی تمام زندگی شرک کی تلویثات سے

پاک ہے سورۂ انعام کی مسطورہ بالا آیات کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، ان آیات کی تمہید میں جو کچھ لکھا گیا وہ ان اقوال میں سے ایک قول کے مطابق ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ گفتگو قوم کی کواکب پرستی کے رَد میں اس کو لاجواب کرنے کے لیے تھی، اس لیے کہ جب دو فریق کسی مسئلہ میں اختلاف کر بیٹھتے ہیں تو اِحقاقِ حق کے لیے مناظرانہ دلائل میں سے دلیل کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں صرف نظریوں، تھیوریوں (Thorees) سے کام نہ لیا جائے بلکہ مشاہدہ اور معائنہ کی ایسی راہ اختیار کی جائے کہ مخالف اس کے دعوے کے مقابلہ میں لاجواب ہو جائے اور اس کی دلیل کے رَدّ کرنے کی تمام راہیں اس کے سامنے بند ہو جائیں، اب اگر اس میں سلامت روی باقی ہے اور اس کے قلب میں قبولِ حق کی گنجائش ہے تو وہ اس کو قبول کر لیتا ہے ورنہ بے دلیل لڑنے اور جھگڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے تب اس طرح حق و باطل میں امتیاز ہو جاتا ہے اور اصلی اور حقیقی بات نکھر کر صاف ہو جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر ہیں اس لیے ان کی تبلیغ کا مشن منطق صغریٰ کبریٰ پر قائم نہ تھا بلکہ حقیقت کو فطری دلائل کی سادگی کے ساتھ واضح کرنا ہی ان کا طغرائے امتیاز تھا، اس لیے انہوں نے یہی راستہ اختیار کیا اور قوم پر واضح کر دیا کہ ستارے خواہ شمس و قمر ہی کیوں نہ ہوں رب کہلانے کے قابل نہیں ہیں بلکہ ربوبیت صرف اسی کو زیبا ہے جو رب العالمین ہے اور ارضی و سماوی، سفلی و علوی کل کائنات کا خالق و مالک ہے اور چونکہ قوم کے پاس اس بہترین دلیل کا کوئی جواب نہ تھا اس لیے وہ زچ ہوئی اور امرِ حق کو قبول کرنے کی بجائے لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہو گئی، مگر اس کے ضمیر کو ماننا پڑا کہ یہ جو کچھ کہا گیا حق ہے اور ہمارے پاس اس کا کوئی صحیح جواب نہیں ہے یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد تھا اور ان کے ادائے فرض کی حد یہیں تک تھی، کیونکہ دل چیر کر حق کو اس میں اتار دینا ان کی طاقت سے باہر تھا۔

اس تفسیر کے مطابق قرآن عزیز کی ان آیات میں نہ تاویل کی ضرورت باقی رہتی ہے اور نہ مقدرات ماننے کی، نیز مشاہدہ کواکب سے متعلق آیات کا سیاق و سباق بھی بے تکلف اسی کی تائید کرتا ہے، مثلاً اس سلسلہ کی پہلی دو آیات ہیں:

﴿وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝﴾ (الانعام: ۷۴-۷۵)

"جب کہا ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ آزر سے، کیا تو بناتا ہے بتوں کو خدا، میں تجھ کو اور تیری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتا ہوں، اور اسی طرح ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو آسمانوں اور زمینوں کی سلطنت کا مشاہدہ کرا دیا اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔"

ان ہر دو آیات سے حسب ذیل نتائج ظاہر ہوتے ہیں:

① رؤیت کواکب کا یہ معاملہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ایسے زمانہ میں پیش آیا ہے جبکہ وہ اپنے والد اور قوم کے ساتھ تبلیغ حق کے مناظرہ میں مصروف تھے، اس لیے کہ پہلی آیت کے بعد دوسری آیت ﴿وَ كَذٰلِكَ﴾ کہہ کر شروع کرنا یہی معنی رکھتا ہے، پھر تیسری آیت کے شروع میں ﴿فَلَمَّا﴾ کی ﴿فَ﴾ یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ دوسری آیت سے وابستہ ہے، اور اس طرح ان تینوں

آیات کا سلسلہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جس طرح اصنام پرستی کے مقابلہ میں روشن دلائل عطاء فرمائے تھے تا کہ وہ آزر اور قوم کو لاجواب کر سکیں اور راہ ہدایت دکھائیں۔ اسی طرح کواکب پرستی کے مقابلہ میں بھی اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمینوں کی سلطنت کا مشاہدہ کرا دیا تا کہ وہ ان سب مخلوق کی حقیقت سے آگاہ ہو جائیں اور ان کو حق الیقین کا درجہ حاصل ہو جائے، اور پھر وہ کواکب پرستی کے رَد میں بھی بہترین دلائل دے سکیں اور اس سلسلہ میں بھی قوم کو حق کی راہ دکھلا کر ان کی غلط روش کے متعلق لاجواب بنا سکیں۔ یہ تو آیات رؤیت کا سباق تھا اور اب سیاق قابل توجہ ہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آخر میں آفتاب پر نظر فرمائی اور پھر وہ بھی نظروں سے غائب ہونے لگا تو اسی آیت میں یہ جملہ موجود نظر آتا ہے:

﴿قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ﴾(الانعام: ۷۸)۔

"ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا: "اے قوم میں شرک کرنے والوں سے بری ہوں"۔

اور ساتھ ہی یہ آیت مذکور ہے:

﴿اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾(الانعام: ۷۹)

"بلاشبہ میں نے اپنا رخ صرف اس خدا کی جانب پھیر دیا ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، اس حالت میں کہ میں حنیف ہوں اور مشرک نہیں ہوں"۔

اور پھر اسی کے متصل آیت میں ہے:

﴿وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّىْ فِى اللّٰهِ﴾(الانعام: ۸۰)

"اور ابراہیم (علیہ السلام) کی قوم نے اس سے جھگڑنا شروع کیا ابراہیم علیہ السلام نے کہا، کیا تو مجھ سے اللہ کے بارہ میں جھگڑتی ہے"۔

اور سب سے آخر آیت میں کہا گیا ہے:

﴿وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ﴾(الانعام: ۸۳)

"اور یہ ہماری دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطاء کی، ہم جس کا درجہ بلند کرنا چاہتے ہیں کر دیا کرتے ہیں، بیشک تیرا رب دانا ہے جاننے والا"۔

ان آیات سے یہ نتائج اخذ ہوتے ہیں:

(۱) رؤیت کواکب کا یہ معاملہ قوم سے ضرور وابستہ تھا تب ہی تیسری مرتبہ میں ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذات سے خطاب کرنے کے بجائے فوراً قوم سے خطاب شروع کر دیا۔

(۲) اور قوم نے بھی یہ سب کچھ سن کر دلیل کا جواب دلیل سے دینے کی جگہ ابراہیم علیہ السلام سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔

④ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اس گفتگو کو قوم کے مقابلہ میں اپنی جانب سے حجت قرار دیا اور بتایا کہ ابراہیم علیہ السلام کا رتبہ رسالت بہت بلند اور ارفع ہے، اور اس لیے قوم ان کی رہنمائی کی سخت محتاج ہے، اور ان امور کے سوا یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ بھی ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۚ﴾ (الانبیاء: ۵۱)

"اور بلاشبہ ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو پہلے ہی سے ہدایت عطا کر دی تھی اور ہم ہی اس کے واقف کار ہیں۔"

لہٰذا یہ معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نہ لڑکپن کا ہو سکتا ہے اور نہ ان کے اپنے عقیدہ اور ایمان کا اس تفصیل سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری بیان کردہ تفسیر ہی آیات کی صحیح تفسیر ہے اور بلاشبہ ابراہیم علیہ السلام کی جانب سے قوم پر یہ زبردست حجت تھی کہ افراد قوم کا کواکب کی پرستش کرنا، ان کے لیے ہیکل بنانا، اپنے سفلی معبودوں کے نام ان کے نام پر رکھنا، غرض ان کو معبود، رب اور خدا سمجھنا قطعاً باطل اور گمراہی ہے، اس لیے کہ یہ سب ایک خاص نظام میں جکڑے ہوئے اور دن اور رات کے تغیر کے ساتھ تغیرات کو قبول کرنے والے ہیں، اور اس پورے نظام کی مالک و خالق صرف وہی ہستی ہے جس کے ید قدرت میں ان سب کی تسخیر ہے، اور وہ "اللہ" ہے۔

﴿لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ﴾ (یٰسٓ: ۴۰)

"نہ سورج کی یہ مجال ہے کہ وہ قمر کو پا سکے اور نہ رات میں یہ قدرت کہ وہ دن کو پیچھے ہٹا کر اس کی جگہ خود لے لے۔"

غرض ان تمام روشن دلائل و براہین کے بعد بھی جب قوم نے دعوت اسلام کو قبول نہ کیا اور اصنام پرستی و کواکب پرستی میں اسی طرح مبتلا رہی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک دن جمہور کے سامنے اعلانِ جنگ کر دیا کہ میں تمہارے ان بتوں کے متعلق ایک ایسی چال چلوں گا جو تم کو زچ کر کے ہی چھوڑے گی۔

﴿وَ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۵۷)

"اور اللہ کی قسم میں تمہاری عدم موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کے ساتھ خفیہ چال چلوں گا۔"

اس معاملہ سے متعلق اصل صورت حال یہ ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے آزر اور قوم کے جمہور کو ہر طرح بت پرستی کے معائب ظاہر کر کے اس سے باز رکھنے کی سعی کر لی، اور ہر قسم کے پند و نصائح کے ذریعہ ان کو یہ باور کرانے میں قوت صرف کر دی کہ یہ بت نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان اور یہ کہ تمہارے کاہنوں اور پیشواؤں نے ان کے متعلق تمہارے دلوں میں غلط خوف بٹھا دیا ہے کہ اگر ان سے منکر ہو جاؤ گے تو یہ غضبناک ہو کر تم کو تباہ کر ڈالیں گے، یہ تو اپنی آئی ہوئی مصیبت کو بھی نہیں ٹال سکتے مگر آزر اور قوم کے دلوں پر مطلق اثر نہ ہوا اور وہ اپنے دیوتاؤں کی خدائی قوت کے عقیدہ سے کسی طرح باز نہ آئے بلکہ کاہنوں اور سرداروں نے ان کو زیادہ پختہ کر دیا اور ابراہیم علیہ السلام کی نصیحت پر کان دھرنے سے سختی کے ساتھ روک دیا تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ اب رشد و ہدایت کا ایسا پہلو اختیار کرنا چاہیے جس سے جمہور کو یہ مشاہدہ ہو جائے کہ واقعی ہمارے دیوتا صرف لکڑیوں اور پتھروں کی

مورتیاں ہیں جو گونگی بھی ہیں، بہری بھی ہیں اور اندھی بھی، اور دلوں میں یہ یقین راسخ ہو جائے کہ اب تک ان کے متعلق ہمارے کاہنوں اور سرداروں نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل غلط اور بے سروپا بات تھی اور ابراہیم ہی کی بات سچی ہے، اگر ایسی کوئی صورت بن آئی تو پھر میرے لیے تبلیغ حق کے لیے آسان راہ نکل آئے گی، یہ سوچ کر انہوں نے ایک نظام عمل تیار کیا۔ جس کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا، اور اس کی ابتداء اس طرح کی کہ باتوں باتوں میں اپنی قوم کے افراد سے یہ کہہ گزرے کہ "میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک خفیہ چال چلوں گا" گویا اس طرح ان کو متنبہ کرنا تھا کہ اگر تمہارے دیوتاؤں میں کچھ قدرت ہے جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو تو وہ میری چال کو باطل اور مجھ کو مجبور کر دیں کہ میں ایسا نہ کر سکوں مگر چونکہ بات صاف نہ تھی اس لیے قوم نے اس جانب کچھ توجہ نہ کی، حسن اتفاق کہ قریب ہی زمانہ میں قوم کا ایک مذہبی میلہ پیش آ گیا، جب سب اس کے لیے چلنے لگے تو کچھ لوگوں نے ابراہیم علیہ السلام سے بھی اصرار کیا کہ وہ بھی ساتھ چلیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اول انکار فرمایا اور جب اس جانب سے اصرار بڑھنے لگا تو ستاروں کی جانب نگاہ اٹھائی اور فرمانے لگے ﴿ اِنِّیْ سَقِیْمٌ ﴾ "میں آج کچھ علیل سا ہوں" چونکہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم کو کواکب پرستی کی وجہ سے نجوم میں کمال بھی اور اعتقاد بھی تھا اس لیے اپنے عقیدہ کے لحاظ سے وہ یہ سمجھے کہ ابراہیم علیہ السلام کسی نحس ستارہ کے اثر بد میں مبتلاء ہیں اور یہ سوچ کر بغیر کسی تشریح حال کے ابراہیم علیہ السلام کو چھوڑ کر میلہ میں چلے گئے:

﴿ فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴿۹۰﴾ ﴾ (الصافات: ۸۸-۹۰)

"پس (ابراہیم علیہ السلام) نے ایک نگاہ اٹھا کر ستاروں کی جانب دیکھا اور کہنے لگا میں کچھ علیل ہوں، پس وہ اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔"

اب جبکہ ساری قوم، بادشاہ، کاہن اور مذہبی پیشواء میلہ میں مصروف اور شراب و کباب میں مشغول تھے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ وقت آ گیا ہے کہ اپنے نظام عمل کی تکمیل کروں اور مشاہدہ کی صورت میں جمہور پر واضح کر دوں کہ ان کے دیوتاؤں کی حقیقت کیا ہے؟ وہ اٹھے اور سب سے بڑے دیوتا کے ہیکل (مندر) میں پہنچے، دیکھا تو وہاں دیوتاؤں کے سامنے قسم قسم کے حلووں، پھلوں، میووں اور مٹھائیوں کے چڑھاوے رکھے تھے، ابراہیم علیہ السلام نے طنزیہ لہجہ میں چپکے چپکے ان مورتیوں سے خطاب کر کے کہا کہ یہ سب کچھ موجود ہے ان کو کھاتے کیوں نہیں؟ اور پھر کہنے لگے، میں بات کر رہا ہوں کیا بات ہے کہ تم جواب نہیں دیتے؟ اور پھر ان سب کو توڑ پھوڑ ڈالا اور سب سے بڑے بت کے کاندھے پر تبر رکھ کر واپس چلے گئے۔

﴿ فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ ﴾ (الصافات: ۹۱-۹۲)

"پس چپکے سے جا گھسا ان کے بتوں میں کہنے لگا (ابراہیم علیہ السلام) ان کے دیوتاؤں سے کیوں نہیں کھاتے، تم کو کیا ہو گیا کیوں نہیں بولتے؟ پھر اپنے داہنے ہاتھ سے ان سب کو توڑ ڈالا۔"

﴿ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾ ﴾ (الانبیاء: ۵۸)

"پس کر دیا ان کو ٹکڑے ٹکڑے مگر ان میں سے بڑے دیوتا کو چھوڑ دیا تا کہ (اپنے عقیدہ کے مطابق) وہ اس کی طرف

رجوع کریں (کہ یہ کیا ہو گیا)۔"

جب لوگ میلے سے واپس آئے تو ہیکل (مندر) میں بتوں کا یہ حال پایا، سخت برہم ہوئے اور ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگے کہ یہ کیا ہوا اور کس نے کیا؟ ان میں وہ بھی تھے جن کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام ﴿وَ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ﴾ (تفسیر ابن کثیر جلد ۳ سورہ انبیاء) کہہ چکے تھے انہوں نے فوراً کہا کہ یہ اس شخص کا کام ہے جس کا نام ابراہیم (علیہ السلام) ہے، وہی ہمارے دیوتاؤں کا دشمن ہے۔

﴿ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ۝﴾ (الانبیاء: ۵۹-۶۰)

"وہ کہنے لگے یہ معاملہ ہمارے خداؤں کے ساتھ کس نے کیا ہے بلاشبہ وہ ضرور ظالم ہے (ان میں سے بعض) کہنے لگے ہم نے ایک جوان کی زبان سے ان بتوں کا (برائی کے ساتھ) ذکر سنا ہے اس کو ابراہیم کہا جاتا ہے (یعنی یہ اس کا کام ہے)۔"

کاہنوں اور سرداروں نے جب یہ سنا تو غم و غصہ سے سرخ ہو گئے اور کہنے لگے اس کو مجمع کے سامنے پکڑ کر لاؤ تاکہ سب دیکھیں کہ مجرم کون شخص ہے۔

ابراہیم علیہ السلام سامنے لائے گئے تو بڑے رعب داب سے انہوں نے پوچھا، کیوں ابراہیم (علیہ السلام) تو نے ہمارے دیوتاؤں کے ساتھ یہ سب کچھ کیا ہے؟

﴿قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ۝ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝﴾ (الانبیاء: ۶۱-۶۲)

"انہوں نے کہا ابراہیم علیہ السلام کو لوگوں کے سامنے لاؤ تاکہ وہ دیکھیں، وہ کہنے لگے، کیا ابراہیم تو نے ہمارے دیوتاؤں کے ساتھ یہ کیا ہے؟"

ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ اب وہ بہترین موقعہ آ گیا ہے جس کے لیے میں نے یہ تدبیر اختیار کی، مجمع موجود ہے جمہور دیکھ رہے ہیں کہ ان کے دیوتاؤں کا کیا حشر ہو گیا، اس لیے اب کاہنوں اور مذہبی پیشواؤں کو جمہور کی موجودگی میں ان کے باطل عقیدہ پر نادم کر دینے کا وقت ہے تاکہ عوام کو آنکھوں دیکھتے معلوم ہو جائے کہ آج تک ان دیوتاؤں کے متعلق جو کچھ ہم سے کاہنوں اور پجاریوں نے کہا تھا یہ سب ان کا مکر و فریب تھا، مجھے ان سے کہنا چاہیے کہ یہ سب اس بڑے بت کی کارروائی ہے، اس سے دریافت کرو؟ لامحالہ وہ یہی جواب دیں گے کہ کہیں بت بھی بولتے اور بات کرتے ہیں، تب میرا مطلب حاصل ہے اور پھر میں ان کے عقیدے کا پول جمہور کے سامنے کھول کر صحیح عقیدہ کی تلقین کر سکوں گا اور بتاؤں گا کہ کس طرح وہ باطل اور گمراہی میں مبتلاء ہیں، اس وقت ان کاہنوں اور پجاریوں کے پاس ندامت کے سوائے کیا ہوگا، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۶۳)

"ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا بلکہ ان میں سے اس بڑے بت نے یہ کیا ہے، پس اگر یہ (تمہارے دیوتا) بولتے ہوں تو ان سے دریافت کرلو۔"

ابراہیم (علیہ السلام) کی اس یقینی حجت اور دلیل کا کاہنوں اور پجاریوں کے پاس کیا جواب ہو سکتا تھا، وہ ندامت میں غرق تھے۔ دلوں میں ذلیل ورسوا تھے، اور سوچتے تھے کہ کیا جواب دیں، جمہور بھی آج سب کچھ سمجھ گئے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھ لیا جس کے لیے وہ تیار نہ تھے اور بالآخر چھوٹے اور بڑے سب ہی کو دل میں اقرار کرنا پڑا کہ ابراہیم علیہ السلام ظالم نہیں ہے بلکہ ظالم ہم خود ہیں کہ ایسے بے دلیل اور باطل عقیدہ پر یقین رکھتے ہیں، تب نہایت شرمساری کے ساتھ سرنگوں ہو کر کہنے لگے ابراہیم علیہ السلام تو خوب جانتا ہے کہ ان دیوتاؤں میں بولنے کی سکت نہیں ہے، یہ تو بے جان مورتیاں ہیں۔

﴿فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ٦٤-٦٥)

"پس انہوں نے اپنے جی میں سوچا پھر کہنے لگے بیشک تم ہی ظالم ہو بعد ازاں اپنے سروں کو نیچے جھکا کر کہنے لگے (اے ابراہیم علیہ السلام) تو خوب جانتا ہے کہ یہ بولنے والے نہیں ہیں۔"

اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حجت و دلیل کامیاب ہوئی اور دشمنوں نے اعتراف کر لیا کہ ظالم ہم ہی ہیں اور ان کو جمہور کے سامنے زبان سے اقرار کرنا پڑا کہ ہمارے یہ دیوتا جواب دینے اور بولنے کی طاقت نہیں رکھتے، چہ جائیکہ نفع ونقصان کے مالک ہوں۔

تو اب ابراہیم علیہ السلام نے مختصر مگر جامع الفاظ میں ان کو نصیحت کی اور ملامت بھی، اور بتایا کہ جب یہ دیوتا نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان تو پھر یہ خدا اور معبود کیسے ہو سکتے ہیں، افسوس تم اتنا بھی نہیں سمجھتے یا عقل سے کام نہیں لیتے؟ فرمانے لگے:

﴿اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ۝ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ٦٦-٦٧)

"کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی پوجا کرتے ہو جو تم کو نہ کچھ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان دے سکتے ہیں، تم پر افسوس ہے اور تمہارے ان معبودان باطل پر بھی جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔"

﴿فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ۝ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

(الصافات: ٩٤-٩٦)

"پس وہ سب ہلہ کر کے ابراہیم (علیہ السلام) کے گرد جمع ہو گئے، ابراہیم نے کہا کیا جن بتوں کو ہاتھ سے گھڑتے ہو انہی کو پھر پوجتے ہو، اور اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے تم کو پیدا کیا ہے اور ان کو بھی جن کاموں کو تم کرتے ہو۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس نصیحت وموعظت کا اثر یہ ہونا چاہیے تھا کہ تمام قوم اپنے باطل عقیدہ سے تائب ہو کر ملت حنیفی

کو اختیار کر لیتی اور کج روی چھوڑ کر راہ مستقیم پر گامزن ہو جاتی لیکن دلوں کی کجی، نفوس کی سرکشی، متمردانہ ذہنیت اور باطنی خباثت و نائت نے اس جانب نہ آنے دیا، اور اس کے برعکس ان سب نے ابراہیم (علیہ السلام) کی عداوت و دشمنی کا نعرہ بلند کر دیا اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ اگر دیوتاؤں کی خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو اس گستاخی اور مجرمانہ حرکت پر سخت سزا دو اور دہکتی ہوئی آگ میں جلا ڈالو تاکہ اس کی تبلیغ و دعوت کا قصہ ہی پاک ہو جائے۔

بادشاہ کو دعوت اسلام اور اس سے مناظرہ:

ابھی یہ مشورے ہو ہی رہے تھے کہ شدہ شدہ بادشاہ وقت تک یہ باتیں پہنچ گئیں، اس زمانہ میں عراق کے بادشاہ کا لقب نمرود ہوتا تھا اور یہ رعایا کے صرف بادشاہ ہی نہیں تھے بلکہ خود کو ان کا رب اور مالک مانتے تھے اور رعایا بھی دوسرے دیوتاؤں کی طرح اس کو اپنا خدا اور معبود مانتی اور اس کی بھی اسی طرح پرستش کرتی تھی، جس طرح دیوتاؤں کی، بلکہ ان سے بھی زیادہ پاس و ادب کے ساتھ پیش آتی تھی، اس لیے کہ وہ صاحب عقل و شعور بھی ہوتا تھا اور مالک تخت و تاج بھی۔

نمرود کو جب یہ معلوم ہوا تو آپے سے باہر ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اس شخص کی پیغمبرانہ تبلیغ و دعوت کی سرگرمیاں اگر اسی طرح جاری رہیں تو یہ میری ربوبیت، ملوکیت اور الوہیت سے بھی سب رعایا کو برگشتہ کر دے گا اور اس طرح باپ دادا کے مذہب کے ساتھ ساتھ میری یہ سلطنت بھی زوال میں آ جائے گی، اس لیے اس قصہ کا ابتداء ہی میں خاتمہ کر دینا بہتر ہے، یہ سوچ کر اس نے حکم دیا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کو ہمارے دربار میں حاضر کرو، ابراہیم (علیہ السلام) جب نمرود کے دربار میں پہنچے تو نمرود نے گفتگو شروع کی اور ابراہیم علیہ السلام سے دریافت کیا کہ تو باپ دادا کے دین کی مخالفت کس لیے کرتا ہے اور مجھ کو رب ماننے سے تجھے کیوں انکار ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میں خدائے واحد کا پرستار ہوں، اس کے علاوہ کسی کو اس کا شریک نہیں مانتا ساری کائنات اور تمام عالم اسی کی مخلوق ہے اور وہی ان سب کا خالق و مالک ہے، تو بھی اسی طرح ایک انسان ہے جس طرح ہم سب انسان میں پھر تو کس طرح رب یا خدا ہو سکتا ہے، اور کس طرح یہ گونگے بہرے لکڑی کے بت خدا ہو سکتے ہیں؟ میں صحیح راہ پر ہوں اور تم سب غلط راہ پر ہو، اس لیے میں تبلیغ حق کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں اور تمہارے باپ دادا کے خود ساختہ دین کو کیسے اختیار کر سکتا ہوں؟

نمرود نے ابراہیم علیہ السلام سے دریافت کیا کہ اگر میرے علاوہ تیرا کوئی رب ہے تو اس کا ایسا وصف بیان کر کہ جس کی قدرت مجھ میں نہ ہو، تب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میرا رب وہ ہے جس کے قبضہ میں موت و حیات ہے، وہی موت دیتا ہے اور وہی زندگی بخشتا ہے، کج فہم نمرود، موت و حیات کی حقیقت سے ناآشنا نمرود کہنے لگا۔ اس طرح موت و حیات تو میرے قبضہ میں بھی ہے اور یہ کہہ کر اسی وقت ایک بے قصور شخص کے متعلق جلاد کو حکم دیا کہ اس کی گردن مار دو اور موت کے گھاٹ اتار دو، جلاد نے فوراً حکم کی تعمیل کر دی اور ایک قتل کے سزا یافتہ مجرم کو جیل سے بلا کر حکم دیا کہ جاؤ ہم نے تمہاری جان بخشی کی اور پھر ابراہیم علیہ السلام کی جانب متوجہ ہو کر کہنے لگا۔ دیکھا میں بھی کس طرح زندگی بخشتا اور موت دیتا ہوں، پھر تیرے خدا کی خصوصیت کیا رہی؟

ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ نمرود یا تو موت و حیات کی اصل حقیقت سے ناآشنا ہے اور یا جمہور اور رعایا کو مغالطہ دینا چاہتا ہے کہ وہ اس فرق کو نہ سمجھ سکیں کہ زندگی بخشنا اس کا نام نہیں ہے بلکہ نیست سے ہست کرنے کا نام زندگی بخشنا ہے اور اسی طرح کسی کو قتل یا پھانسی سے بچا لینا موت کا مالک ہونا نہیں ہے۔ موت کا مالک وہی ہے جو روح انسانی کو اس کے جسم سے نکال کر اپنے قبضہ میں کر لیتا

ہے، اس لیے بہت سے دار رسیدہ اور شمشیر چشیدہ انسان زندگی پا جاتے ہیں اور بہت سے قتل و دار سے بچائے ہوئے انسان لقمہ اجل بن جاتے ہیں اور کوئی طاقت ان کو نہیں روک سکتی اور اگر ایسا ہو سکتا تو ابراہیم علیہ السلام سے گفتگو کرنے والا نمرود سریر آرائے سلطنت نہ ہوتا بلکہ اس کے خاندان کا پہلا شخص ہی آج بھی اس تاج و تخت کا مالک نظر آتا، مگر نہ معلوم کہ عراق کی اس سلطنت کے کتنے مدعی زیر زمین دفن ہو چکے اور ابھی کتنوں کی باری ہے۔

تاہم ابراہیم (علیہ السلام) نے سوچا کہ اگر میں نے اس موقع پر موت و حیات کے دقیق فلسفہ پر بحث شروع کر دی تو نمرود کا مقصد پورا ہو جائے گا اور وہ جمہور کو مغالطہ میں ڈال کر اصل معاملہ کو اُلجھا دے گا اور اس طرح میرا نیک مقصد پورا نہ ہو سکے گا اور تبلیغ حق کے سلسلہ میں سر محفل نمرود کو لاجواب کرنے کا موقع ہاتھ سے جاتا رہے گا، کیونکہ بحث و مباحثہ اور جدل و مناظرہ میرا اصل مقصد نہیں ہے بلکہ لوگوں کے دماغ و قلب میں خدائے واحد کا یقین پیدا کرنا میرا مقصد واحد ہے اس لیے انہوں نے اس دلیل کو نظر انداز کر کے سمجھانے کا ایک دوسرا پیرایہ اختیار کیا اور ایسی دلیل پیش کی جس کا صبح و شام ہر شخص آنکھوں سے مشاہدہ کرتا اور بغیر کسی منطقی دلیل کے روز و شب کی زندگی میں اس سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔

ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا میں اس ہستی کو "اللہ" کہتا ہوں جو روزانہ سورج کو مشرق سے لاتا اور مغرب کی جانب لے جاتا ہے، پس اگر تو بھی اسی طرح خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کے خلاف سورج کو مغرب سے نکال اور مشرق میں چھپا۔ یہ سن کر نمرود مبہوت اور لاجواب ہو کر رہ گیا اور اس طرح ابراہیم (علیہ السلام) کی زبان سے نمرود پر خدا کی حجت پوری ہوئی۔

نمرود اس دلیل سے مبہوت کیوں ہوا اور اس کے پاس اس کے مقابلہ میں مغالطہ کی گنجائش کیوں نہ رہی؟ یہ اس لیے کہ ابراہیم (علیہ السلام) کی دلیل کا حاصل یہ تھا کہ میں ایک ایسی ہستی کو اللہ مانتا ہوں جس کے متعلق میرا یہ عقیدہ ہے کہ یہ ساری کائنات اور اس کا سارا نظام اس ہی نے بنایا ہے اور اس نے اس پورے نظام کو اپنی حکمت کے قانون سے ایسا مسخر کر دیا ہے کہ اس کی کوئی شئے نہ وقت مقررہ سے پہلے اپنی جگہ سے ہٹ سکتی اور نہ اِدھر اُدھر ہو سکتی ہے، تم اس پورے نظام میں سے آفتاب ہی کو دیکھو کہ عالم ارضی اس سے کس قدر فائدے حاصل کرتا ہے۔ بایں ہمہ اللہ تعالیٰ نے اس کے طلوع و غروب کا بھی ایک نظام مقرر کر دیا ہے۔ بس اگر آفتاب لاکھ بار بھی چاہے کہ وہ اس نظام سے باہر ہو جائے تو وہ اس پر قادر نہیں ہے، کیونکہ اس کی باگ خدائے واحد کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اس کو بیشک یہ قدرت ہے کہ جو چاہے کر گزرے لیکن وہ کرتا وہی ہے جو اس کی حکمت کا تقاضا ہے۔

لہٰذا اب نمرود کے لیے تین ہی صورتیں جواب دینے کی ہو سکتی تھیں یا وہ یہ کہے کہ مجھے آفتاب پر پوری قدرت حاصل ہے اور میں نے ہی یہ سارا نظام بنایا ہے، مگر اس نے یہ جواب اس لیے نہیں دیا کہ وہ خود اس کا قائل نہیں تھا کہ یہ ساری کائنات اس نے بنائی ہے اور آفتاب کی حرکت اس کے قبضہ قدرت میں ہے بلکہ وہ تو خود اپنی رعایا کا رب اور دیوتا کہلاتا تھا اور بس۔

دوسری صورت یہ تھی کہ وہ کہتا "میں اس عالم کو کسی کی مخلوق نہیں مانتا اور آفتاب تو خود مستقل دیوتا ہے اس کے اختیارات میں خود بہت کچھ ہے" مگر اس نے یہ بھی اس لیے نہ کہا کہ اگر وہ ایسا کہتا تو ابراہیم علیہ السلام کا وہی اعتراض سامنے آجاتا، جو انہوں نے جمہور کے سامنے آفتاب کی ربوبیت کے خلاف اٹھایا تھا کہ اگر یہ "رب" ہے تو عابدوں اور پجاریوں سے زیادہ اس معبود اور دیوتا میں تغیرات اور فنا کے اثرات کیوں موجود ہیں "رب" کو فنا اور تغیر سے کیا علاقہ، اور کیا اس کی قدرت میں یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو وقت مقررہ سے

پہلے یا بعد طلوع یا غروب ہو جائے۔

تیسری صورت یہ تھی کہ ابراہیم علیہ السلام کی تحدی (چیلنج) کو قبول کر لیتا اور مغرب سے نکال کر دکھا دیتا، مگر نمرود چونکہ ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت میں بھی جواب پر قادر نہ تھا اس لیے مبہوت اور لاجواب ہو جانے کے علاوہ اس کے پاس دوسرا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا۔ [1]

قرآن عزیز نے (سورۂ البقرہ) میں اس واقعہ کو مختصر مگر لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۚ﴾ (البقرہ: ۲۵۸)

"کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کا واقعہ، جس کو اللہ نے بادشاہت بخشی تھی اس نے کس طرح ابراہیم سے اس کے پروردگار کے بارے میں مناظرہ کیا؟ جب کہا ابراہیم نے میرا پروردگار تو زندگی بخشا ہے اور موت دیتا ہے، بادشاہ نے کہا میں بھی زندگی بخشتا ہوں اور موت دیتا ہوں، ابراہیم نے کہا بلاشبہ اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے پس تو اس کو مغرب سے نکال کر دکھلا، پس وہ کافر (بادشاہ) مبہوت اور لاجواب ہو کر رہ گیا اور اللہ ظلم کرنے والوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔"

غرض حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے والد آزر کو اسلام کی تلقین کی، پیغام حق سنایا اور راہ مستقیم دکھائی، اس کے بعد عوام اور جمہور کے سامنے اس دعوت کو عام کیا اور سب کو امر حق تسلیم کرانے کے لیے فطرت کے بہترین اصول دلائل کو پیش فرمایا، اور نرمی، شیریں کلامی مگر مضبوط و محکم اور روشن حجت و دلیل کے ساتھ ان پر حق کو واضح کیا اور سب سے آخر میں بادشاہ نمرود سے مناظرہ کیا اور اس پر روشن کر دیا کہ ربوبیت و الوہیت کا حق صرف خدائے واحد ہی کے لیے سزاوار ہے اور بڑے سے بڑے شہنشاہ

---

[1] عیسائی پادریوں اور ان کی اندھی تقلید میں آریہ سماجیوں نے ابراہیم علیہ السلام کے اس ذکر کردہ مناظرہ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر نمرود یہ کہہ بیٹھتا کہ ابراہیم تو ہی اپنے خدا سے آفتاب کو مغرب سے طلوع کرا دے تو ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس کیا جواب تھا؟ یہ اعتراض بہت ہی لچر اور سطحی ہے اس لئے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے مناظرہ کی جو تشریح بیان کی ہے اور جو حقیقت واقعہ ہے اس کے بعد یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ نمرود جانتا تھا کہ وہ ایسا اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ پہلے وہ خود اپنی عاجزی و درماندگی کا اقرار کرے اور ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرے کہ آفتاب ہمارا دیوتا بھی نہیں ہے اور نہ اس میں یہ قدرت کہ وہ ہماری اس استدعاء کو ابراہیم علیہ السلام کے مقابلہ میں منظور کر لے، بدیں وجہ اس نے خاموشی کو ترجیح دی، اور اگر وہ ایسا سوال کر ہی بیٹھتا تو ابراہیم علیہ السلام کو یہ یقین تھا کہ ایسے تحدی (چیلنج) کے وقت اللہ تعالیٰ اپنے سچے پیغمبر کو ذلیل نہیں کرے گا اور ابراہیم علیہ السلام کی دُعا پر وہ بلاشبہ آفتاب کو مغرب سے طلوع کر کے ابراہیم کی صداقت کو واضح کر دے گا۔ البتہ یہ مسئلہ مادیین اور خدا کی قدرت پر کنٹرول کرنے والوں کے لئے ضرور تعجب خیز ہو سکتا ہے لیکن جن کا عقیدہ یہ ہے کہ "کائنات کا یہ سارا نظام اگرچہ خاص قوانین کے شکنجہ میں جکڑا ہوا ہے لیکن اس کا یہ شکنجہ ان اشیاء کے ذاتی خواص کی بناء پر نہیں ہے بلکہ اس شکنجہ میں کسنے والی ہستی اور ہے جو سب سے بالاتر ہے اور تمام اشیاء کی تاثیر اور اس کے خواص اسی کے ید قدرت میں ہیں لہٰذا وہ چاہے تو ان کے خواص و تاثیرات کو بدل بھی سکتا ہے اور فنا بھی کر سکتا ہے اور اسی قادر مطلق اور بے قید مالک و متصرف کا نام "اللہ" ہے، تو ان کی نگاہ میں یہ تعجب انگیز بات نہیں ہے۔

کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس کی ہمسری کا دعویٰ کرے، کیونکہ وہ اور کل دنیا اسی کی مخلوق ہے اور وجود و عدم کی قید و بند میں گرفتار، مگر اس کے باوجود کہ بادشاہ، آزر اور جمہور، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے دلائل سے لاجواب تھے اور دلوں میں قائل، بلکہ بتوں کے واقعہ میں تو زبان سے بھی اقرار کرنا پڑا کہ ابراہیم جو کچھ کہتا ہے وہی حق ہے اور صحیح و درست، تاہم ان میں سے کسی نے راہ مستقیم کو اختیار نہ کیا اور قبول حق سے منحرف ہی رہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے برعکس اپنی ندامت و ذلت سے متاثر ہو کر بہت زیادہ غیظ و غضب میں آ گئے اور بادشاہ سے رعایا تک سب نے متفقہ فیصلہ کر لیا کہ دیوتاؤں کی توہین اور باپ دادا کے دین کی مخالفت میں ابراہیم علیہ السلام کو دہکتی آگ میں جلا دینا چاہیے کیونکہ ایسے سخت مجرم کی سزا یہی ہو سکتی ہے اور دیوتاؤں کی تحقیر کا انتقام اسی طرح لیا جا سکتا ہے۔

آگ کا سرد ہو جانا:

اس مرحلہ پر پہنچ کر ابراہیم علیہ السلام کی جدوجہد کا معاملہ ختم ہو گیا اور اب دلائل و براہین کی قوت کے مقابلہ میں مادی طاقت و سطوت نے مظاہرہ شروع کر دیا، باپ اس کا دشمن، جمہور اس کے مخالف، اور بادشاہ وقت اس کے درپے آزار، ایک ہستی اور چہار جانب سے مخالفت کی آواز دشمنی کے نعرے، اور نفرت و حقارت کے ساتھ سخت انتقام اور خوفناک سزا کے ارادے، ایسے وقت میں اس کی مدد کون کرے، اور اس کی حمایت کا سامان کس طرح مہیا ہو؟

مگر ابراہیم علیہ السلام کو نہ اس کی پرواہ تھی اور نہ اس کا خوف، وہ اسی طرح بے خوف و خطر اور ملامت کرنے والوں کی ملامت سے بے نیاز اعلان حق میں سرشار، اور دعوت رشد و ہدایت میں مشغول تھے، البتہ ایسے نازک وقت میں جب تمام مادی سہارے ختم، دنیوی اسباب ناپید، اور حمایت و نصرت کے ظاہری اسباب مفقود ہو چکے تھے، ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت بھی ایک ایسا بڑا زبردست سہارا حاصل تھا جو تمام سہاروں کا سہارا اور تمام نصرتوں کا ناصر کہا جاتا ہے اور وہ خدائے واحد کا سہارا تھا۔ اس نے اپنے جلیل القدر پیغمبر، قوم کے عظیم المرتبت ہادی اور رہنما کو بے یار و مددگار نہ رہنے دیا اور دشمنوں کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ ہوا یہ کہ نمرود اور قوم نے ابراہیم علیہ السلام کی سزا کے لیے ایک مخصوص جگہ بنوائی اور اس میں کئی روز مسلسل آگ دہکائی گئی، حتیٰ کہ اس کے شعلوں سے قرب و جوار کی اشیاء تک جھلسنے لگیں، جب اس طرح بادشاہ اور قوم کو کامل اطمینان ہو گیا کہ اب ابراہیم علیہ السلام کے اس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تب ایک گوپھن میں ابراہیم علیہ السلام کو بٹھا کر دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا گیا۔

اس وقت آگ میں جلانے کی تاثیر بخشنے والے نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ابراہیم علیہ السلام پر اپنی سوزش کا اثر نہ کرے اور ناری عناصر کا مجموعہ ہوتے ہوئے بھی اس کے حق میں سلامتی کے ساتھ سرد پڑ جائے۔

آگ اسی وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں "برد و سلام" بن گئی اور دشمن ان کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا سکے اور ابراہیم علیہ السلام دہکتی ہوئی آگ سے سالم و محفوظ دشمنوں کے نرغہ سے نکل گئے۔

"دشمن اگر قویست نگہبان قوی تر ست"

اس مقام پر ایک مذہبی انسان کی طمانیت قلب اور سکون خاطر کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ آگ کے برد و سلام ہو جانے کو اس لیے صحیح اور مبنی بر حقیقت سمجھے کہ اس نے اپنی عقل اور اپنے شعور سے اول اس امر کا امتحان کر لیا ہے کہ قرآن عزیز کی تعلیم وحی الٰہی کی تعلیم ہے اور اس کی لانے والی ہستی کی زندگی کا ہر پہلو پیغمبرانہ معصومیت کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ کہ وہ جن معجزانہ حقائق کی اطلاعات

ہم پہنچاتا اور وحی الٰہی کے ذریعہ ہم کو سناتا ہے وہ عقل کے لیے اگر چہ حیران کن ہیں لیکن عقل کی نگاہ میں محال اور ناممکن نہیں، اس لیے ایک مخبر صادق (کہ جس کی زندگی کی صداقت کا ہر پہلو سے امتحان کر کے اطمینان کر لیا گیا ہے) کی اس قسم کی خبریں بلاشبہ صحیح اور حق ہیں اور بقول قیصر روم ہرقل اعظم (ہرکلیوس) کہ جو شخص انسانوں کے ساتھ جھوٹ نہیں بولتا اور ان سے دغا و فریب نہیں کرتا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی خدا کی جانب کسی غلط بات کو منسوب نہیں کر سکتا اور کبھی اس پر جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا" اور مذہبی زندگی میں صاف اور سیدھی راہ بھی یہی ہے کہ جس مذہب کی مکمل تعلیم کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر ہر طرح قابل اطمینان پا لیا جائے اس کے بتائے ہوئے چند ایسے امور پر جو عقل کے لیے صرف حیران کن ہوں مگر اس کے نزدیک محال ذاتی اور ناممکن کے مرادف نہ ہوں فلسفیانہ موشگافیوں کے بغیر ایمان لے آیا جائے اور صاحب وحی (ﷺ) کی اس یقینی اور غیر مشکوک اطلاع کو آفتاب کی روشنی سے زیادہ روشن سمجھا جائے اور یقین رکھا جائے کہ تمام اشیاء میں خواص و تاثیرات پیدا کرنے والے خدا میں یہ بھی قدرت ہے کہ جب چاہے ان کو دی ہوئی تاثیر اور خاصہ کو سلب کر لے اور جب چاہے دوسری کیفیت کے ساتھ بدل ڈالے لیکن مادیین کے لیے اگر یہ راہ باعث اطمینان نہ ہو اور فلسفہ کے شیدائی مذہب کے اس مسئلہ کو بھی فلسفیانہ موشگافیوں سے پاک نہ رہنے دینا چاہتے ہوں تو ان کے لیے بھی اس معجزہ سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لیے کہ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ آگ کا طبعی خاصہ جلا دینا ہے اور جو شئے بھی اس میں پڑے گی جل جائے گی لیکن اس کی کیا وجہ کہ بعض وہ کپڑے اور وہ اشیاء جن کو "فائر پروف" کہا جاتا ہے، آگ کے شعلوں کے اندر کیوں محفوظ رہتی ہیں اور ان کو آگ جلا کر کیوں خاکستر نہیں کر دیتی۔

تم کہو گے کہ آگ بدستور جلانے کا خاصہ رکھتی ہے مگر کپڑے یا چیز پر ایک ایسا مسالہ لگا دیا گیا ہے جس پر آگ اپنا اثر نہیں کر سکتی، یہ نہیں ہے کہ آگ نے جلانے کا خاصہ ترک کر دیا ہے۔

تو ایک مذہبی انسان کے لیے اسی طرح آپ کے فلسفیانہ رنگ میں یہ جواب دینے کا کیوں حق نہیں ہے کہ نمرود اور اس کی قوم کی دہکتی آگ میں جلانے کا خاصہ بدستور اسی طرح باقی تھا جس طرح آگ کے عناصر میں موجود ہے، مگر وہ ابراہیم کے جسم کے لیے بے اثر ثابت ہوا، فرق صرف اس قدر ہے کہ تمہارے "فائر پروف" میں انسانوں کی سوچی ہوئی تدابیر کا دخل ہے اور اس لیے ہر سیکھنے والے کو ایک فن کی طرح سیکھ لینے کا موقع حاصل ہے اور ابراہیم علیہ السلام کے جسم کا آگ سے محفوظ ہو جانا بلا واسطہ خدائے برتر کی تدبیر کے زیر اثر تھا اور اس قسم کا عمل پیغمبر کی صداقت اور دشمنوں کے مقابلہ میں اس کی برتری کے لیے کبھی کبھی بہ تقاضائے حکمت اس کی جانب سے سامنے آ جاتا اور شریعت کی اصطلاح میں "معجزہ" شمار ہوتا ہے بیشک وہ نہ فن ہوتا ہے اور نہ وسائل و اسباب سے پیدا کردہ تدابیر کا محتاج، پس خدا کی مخلوق "انسان" کو اگر یہ قدرت حاصل ہے کہ کسی شئے کے طبعی خاصہ کو بعض اشیاء پر مؤثر نہ ہونے دے تو اشیاء کے خواص کے خالق کو کیوں یہ قدرت حاصل نہیں کہ وہ کسی خاص موقع پر شئے کی تاثیر کو عمل سے روک دے۔

اور اگر آج سائنس کی دریافت پر فضا میں ایسی گیسیں موجود ہیں جن کے بدن پر اثر کرنے سے آگ کی سوزش سے محفوظ رہا جا سکتا ہے تو گیسوں کے پیدا کرنے والے خالق کے لیے کون مانع ہے کہ نمرود کی دہکتی آگ میں ان کو ابراہیم علیہ السلام تک نہ پہنچا دے، اور اس طرح آگ کو بحق ابراہیم علیہ السلام بردو سلام نہ بنا دے۔

قرآن عزیز میں ابراہیم علیہ السلام کے اس پر اعجاز واقعہ کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

﴿ قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ ۞ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ۞ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ ۞ ﴾(الانبیاء: ۶۸۔۷۰)

"وہ سب کہنے لگے اس (ابراہیم علیہ السلام) کو جلا ڈالو اور اپنے دیوتاؤں کی مدد کرو اگر تم کرنا چاہتے ہو، ہم نے حکم دیا، اے آگ! تو ابراہیم کے حق میں سرد اور سلامتی بن جا، اور انہوں نے ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا پس ہم نے ان کو ان کے ارادہ میں ناکام بنا دیا۔"

﴿ قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ۞ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ۞ وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ۞ ﴾(الصافات: ۹۷۔۹۹)

"انہوں نے کہا اس کے لیے ایک جگہ بناؤ اور اس کو دہکتی آگ میں ڈالو، پس انہوں نے اس کے ساتھ ارادہ بد کیا تو کر دیا ہم نے ان کو (اس کے مقابلہ میں) پست و ذلیل اور کہا ابراہیم (علیہ السلام) نے میں جانے والا ہوں اپنے پروردگار کے پاس قریب ہے وہ مجھے راہ یاب کرے گا۔"

حدیث بخاری:

ابراہیم علیہ السلام کے واقعات میں قرآن عزیز نے اس موقعہ پر جبکہ ابراہیم علیہ السلام اور قوم کے بعض افراد کے درمیان میلے کی شرکت کے لیے گفتگو ہو رہی تھی ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا ہے ﴿إِنِّي سَقِيمٌ﴾ (ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میں بیمار ہوں) اور جب بتوں کی شکست و ریخت کے سلسلہ میں ان سے دریافت کیا گیا تو ان کا جواب اس طرح منقول ہے۔

﴿قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَٰذَا فَاسْأَلُوهُمْ إِن كَانُوا يَنطِقُونَ ۞ ﴾(الانبیاء: ۶۳)

"ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا بلکہ ان میں سے سب سے بڑے بت نے یہ کیا ہے پس ان سے پوچھو اگر یہ بول سکتے ہیں؟"

ان دونوں جملوں کے متعلق ایک خالی الذہن انسان ایک لحہ کے لیے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ان میں جھوٹ کا بھی کوئی شائبہ ہو سکتا ہے؟ "إِنِّي سَقِيمٌ" میں علالت طبع کا ذکر ہے۔ جس کو ابراہیم علیہ السلام ہی خوب جان سکتے ہیں کہ وہ کیا بیمار ہیں اس میں دوسرے کو خواہ مخواہ شک اور تردد کا کونسا موقع ہے، حتیٰ کہ اگر ایک شخص ظاہر میں نگاہوں میں تندرست نظر آتا ہو تب بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ واقعی تندرست ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کا مزاج کسی وجہ سے حد اعتدال پر نہ ہو اور ایسی تکلیف میں مبتلاء ہو جس کا اظہار کئے بغیر دوسرا اس کو نہ سمجھ سکے۔ اسی طرح دوسری آیت کا معاملہ ہے اس لیے کہ دو مختلف الخیال انسانوں کے درمیان اگر مناظرہ اور تبادلہ خیالات کی نوبت آ جاتی ہے تو معمولی حرف شناس بھی اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اپنے حریف کو اس کی غلطی پر متنبہ کرنے اور لاجواب کر دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے مسلمات میں سے کسی مسلمہ عقیدہ کو صحیح فرض کر کے اس طرح اس کا استعمال کرے کہ اس کا ثمرہ اور نتیجہ حریف کے خلاف اور اپنے موافق ظاہر ہو۔

ابراہیم علیہ السلام نے یہی کیا، ان کی قوم کا یہ عقیدہ تھا کہ ان کے دیوتا سب کچھ سنتے اور ہماری مرادوں کو پورا کرتے ہیں، وہ

اپنے پجاریوں اور معتقدوں سے خوش اور اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے سخت انتقام لیتے ہیں، ابراہیم علیہ السلام نے جب ان دیوتاؤں کو توڑ پھوڑ ڈالا تو بڑے بت کو چھوڑ دیا، آخر جب پوچھ گچھ کی نوبت آئی تو انہوں نے مناظرہ کا وہی بہترین اسلوب اختیار کیا جس کا تفصیلی ذکر گزشتہ صفحات میں آ چکا ہے اور نتیجہ یہ نکلا کہ کاہنوں، پجاریوں اور ساری قوم کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ہم ہی غلطی پر ہیں اور تو خود حقیقت شناس ہے کہ ان میں گویائی کی طاقت نہیں ہے۔

لہٰذا ان دونوں جملوں میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جس کو حقیقتاً "یا صورۃً" جھوٹ کہا جا سکے، یہ دو باتیں تو قرآن عزیز میں مذکور ہیں لیکن صحیح بخاری، صحیح مسلم اور بعض دوسری حدیث کی کتابوں میں مسطورہ بالا دونوں باتوں کے علاوہ ایک تیسری بات کا بھی ذکر ہے۔

یہ حدیث ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے:

لم یکذب ابراھیم النبی علیہ السلام قط الاثلث کذبات... الخ. (بخاری ج ٦ ص ٣٠١)

"نہیں جھوٹ بولا کبھی ہرگز ابراہیم نبی علیہ السلام نے مگر تین جھوٹ۔"

اور پھر تفصیل کے ساتھ ان تینوں کو شمار کیا ہے، ان میں سے دو کا ذکر ابھی ہو چکا اور تیسری بات یہ مذکور ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا جب مصر سے گزر ہوا تو انہوں نے مصر پہنچنے سے پہلے اپنی زوجہ مطہرہ حضرت سارہ علیہا السلام سے یہ فرمایا کہ یہاں کا بادشاہ جابر و ظالم ہے اگر کسی حسین عورت کو دیکھتا ہے تو اس کو زبردستی چھین لیتا ہے اور اس کے ساتھی مرد کو اگر وہ اس عورت کا شوہر ہے تو قتل کر ڈالتا ہے اور اگر کوئی دوسرا عزیز ہے تو اس سے کوئی تعرض نہیں کرتا، تم چونکہ میری دینی بہن ہو اور اس سرزمین میں میرے اور تمہارے علاوہ دوسرا کوئی مسلمان نہیں ہے اس لیے تم اس سے کہہ دینا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور جب شب میں اس نے ارادۂ بد کیا تو اس کا ہاتھ شل ہو کر رہ گیا اور وہ کسی طرح حضرت سارہ علیہا السلام کو ہاتھ نہ لگا سکا، یہ دیکھ کر اس نے سارہ علیہا السلام سے کہا اپنے خدا سے دعا کر کہ میرا ہاتھ درست ہو جائے تو میں تجھ کو رہا کر دوں گا، سارہ علیہا السلام نے دعا کی مگر اس نے پھر ارادۂ بد کیا، دوبارہ اس کا ہاتھ شل ہو گیا، تیسری مرتبہ پھر یہی تمام قصہ پیش آیا تب اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے یہ "جن" ہے انسان نہیں ہے، اس کو میرے پاس سے جلد لے جاؤ اور ساتھ ہی ہاجرہ علیہا السلام کو حوالہ کر کے کہا کہ اس کو بھی اپنے ساتھ لے جا میں نے تیرے حوالہ کیا۔ جب سارہ علیہا السلام ہاجرہ علیہا السلام کو ساتھ لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچیں تو انہوں نے حال دریافت کیا اور سارہ علیہا السلام نے مبارک باد دی اور کہا، شکر ہے خدائے عزوجل کا کہ اس نے ہم کو اس فاسق و فاجر سے نجات دی اور آپ کے لیے ایک خادمہ اور ساتھ کر دی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث نقل کر کے فرمایا: "اے شریف النسب اہل عرب یہ ہیں وہ ہاجرہ علیہا السلام جو تم سب کی ماں ہیں۔"

یہ حدیث مختلف طریقوں سے کتب احادیث میں منقول ہے، اس کے علاوہ بخاری میں ایک اور طویل حدیث ہے جو حدیث شفاعت کے نام سے موسوم ہے اور متعدد ابواب بخاری مثلاً سورۂ بقرہ کی تفسیر کے باب میں کتاب الاسترقاق میں، اور کتاب التوحید میں مذکور ہے، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو تذکرہ ہے اس کا حاصل یہ ہے:

میدان حشر میں جب سب مخلوق آدم، نوح علیہ السلام اور دوسرے انبیاء علیہم السلام سے شفاعت کے لیے کہہ چکی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچی اور ان سے کہا کہ آپ خلیل الرحمٰن ہیں، آپ ہماری سفارش بارگاہ الٰہی میں کیجیے کہ جلد فیصلہ ہو، تو انہوں

نے فرمایا کہ مجھ کو شرم آتی ہے اس لیے کہ میں نے دنیا میں تین جھوٹ باتیں کہی تھیں ﴿اِنِّیْ سَقِیْمٌ . بَلْ فَعَلَهٗ كَبِیْرُهُمْ﴾ اور اپنی بیوی سے کہا تھا کہ ﴿اِنِّیْ اَخُوْكَ﴾۔

بخاری کے علاوہ یہ روایت مسلم، مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ، مستدرک حاکم، معجم طبرانی، مصنف ابن ابی شیبہ، ترمذی، اور مسند ابی عوانہ میں مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔

یہ روایت کتب حدیث میں اجمال وتفصیل کے ساتھ مختلف طریقوں سے روایت کی گئی ہے۔ بعض میں صرف اجمالی طور پر اسی قدر تذکرہ ہے کہ ہر نبی اس وقت اپنی لغزش کو بیان کر کے معذرت کریں گے کہ وہ شفاعت نہیں کر سکتے اور بعض میں ابراہیم علیہ السلام کے جواب میں فقط "ثلث کذبات" ہی کا ذکر ہے اور بعض روایات میں ان تینوں کی تفصیل ہے اور ان ہی میں سے بعض روایات میں یہ تصریح بھی موجود ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابراہیم علیہ السلام کے ان تینوں جھوٹ میں سے ہر ایک صرف اللہ تعالیٰ کے دین کی مدافعت و حمایت ہی کے لیے بولا گیا ہے۔

بہر حال یہ دونوں روایات صحیحین (بخاری ومسلم) کی روایات ہیں جو ہر قسم کے سقم روایت سے پاک اور صاف ہیں، یہ روایات ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر اور مجدد انبیاء کی جانب "کذب" کی نسبت کر رہی ہیں اگرچہ انہی روایات کے بعض طریق روایت نے یہ صاف کر دیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر "کذب" سے مراد وہ عام معنی نہیں لیے جو اخلاقی بول چال میں نہایت شنیع اور گناہ کبیرہ میں شمار ہیں، بلکہ اس کے برعکس یہ واضح کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ تینوں باتیں نہ ذاتی غرض کے لیے کہی ہیں اور نہ دنیوی مصلحت کے پیش نظر بلکہ معاندین حق کے مقابلہ میں خالص اللہ تعالیٰ کے دین کی حمایت میں کہی ہیں، اس کے باوجود جو بات دل میں کھٹکتی اور قلب پر ایک بھاری بوجھ محسوس ہوتی ہے وہ حدیث کی یہ تعبیر ہے۔

یہ تسلیم کہ روایت کی بعض تصریحات نے اس کو "کذب" کے عام معنی سے جدا کر دیا تاہم اول تو یہ "زیادت" صحیحین میں مذکور نہیں اگرچہ صحیح روایت میں موجود ہے، دوسرے جبکہ "صدق لسانی" انبیاء علیہم السلام کی غیر منفک اور عصمت نبی کے لیے ایک ضروری صفت ہے نیز جبکہ خصوصیت کے ساتھ قرآن عزیز نے ابراہیم علیہ السلام کے متعلق حسب ذیل امتیازات کا صراحت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے تو پھر ان کے ساتھ صورۃً بھی کذب کی نسبت کیسی؟

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝﴾ (مریم: ۴۱)

"اور یاد کر کتاب میں ابراہیم کا ذکر بے شک تھا وہ صدیق (صادق النفس) نبی۔"

"صدیق" مبالغہ کا صیغہ ہے اور اسی ہستی پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے "صدق" جس کی ذاتی اور نفسیاتی صفت ہو۔

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝﴾ (النحل: ۱۲۰-۱۲۱)

"بیشک ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا حکم بردار، خالص اللہ کی طرف جھکنے والا اور نہ تھا وہ مشرکوں میں سے، خدا کی نعمتوں کا شکر

گزار تھا، خدا نے اس کو چن لیا تھا، اور سیدھی راہ کی اس کو ہدایت دی۔"

مجتبیٰ اور مہدی ایسی صفات ہیں کہ جن کے ساتھ کذب نہ حقیقتاً جمع ہوسکتا ہے اور نہ صورۃً۔

﴿ثُمَّ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا﴾(النحل: ۱۲۳)

"(اے محمد ﷺ) پھر ہم نے تیری طرف وحی بھیجی کہ تو ملت ابراہیم کی پیروی کر جو ابراہیم کہ خالص خدا کی جانب جھکنے والا ہے۔"

یہ وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں جن کی ملت کی اقتداء اور پیروی کا حکم محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کی امت مرحومہ کو دیا جا رہا ہے۔

﴿وَ لَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ رُشۡدَهٗ مِنۡ قَبۡلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيۡنَ ۚ﴾(الانبیاء: ۵۱)

"اور بلاشبہ ہم نے ابراہیم کو رشد و ہدایت شروع ہی سے بخش دی تھی اور ہم ہی اس کو جاننے والے ہیں۔"

یہ اور اسی قسم کی بہت سی آیات حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ان خصوصی صفات کا ذکر کرتی اور نصوص قطعیہ پیش کرتی ہیں کہ جن کے بعد ایک لمحہ کے لیے بھی اس جیسی مقدس اور جلیل القدر ہستی کے متعلق "کذب" کا تصور نہیں ہوسکتا، چہ جائیکہ وقوع اور عمل" خواہ وہ کذب حقیقی معنی میں ہو یا محض کذب کی صورت میں۔"

زیر بحث مسئلہ:

اس مقام پر پہنچ کر ایک مرتبہ پھر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مسئلہ زیر بحث یہ نہیں ہے کہ "العیاذ باللہ" ابراہیم علیہ السلام نے واقعی جھوٹ بولا۔ کیونکہ قرآن عزیز کی قطعی نصوص اور زیر بحث روایات کے علاوہ احادیث نصوص ابراہیم علیہ السلام کو نبی، پیغمبر اور رسول بتاتی اور ان کی امتیازی صفات صدیق، مجتبیٰ، مہدی، نبی، حنیف اور رسول ثابت کرتی ہیں، نیز زیر بحث روایت میں بھی یہ واضح ہے کہ ان کے یہ کلمات خدا کے دین کی حمایت و مدافعت کے لیے تھے نہ کہ کسی دنیوی غرض و مصلحت سے۔ لہٰذا ایک لمحہ کے لیے بھی اس میں تردد کی گنجائش نہیں ہے کہ "کذب" ان سے اسی طرح دور ہے جس طرح دن سے رات اور روشنی سے تاریکی، اور بلاشبہ وہ ایک نبی معصوم ہیں اور ہر قسم کی معصیت گناہ سے پاک۔

البتہ زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ ان دو صحیح روایات میں ان تینوں باتوں کے متعلق رسول اکرم ﷺ نے ایسے جلیل القدر پیغمبر کے بارہ میں "کذب" کی تعبیر کیوں فرمائی جبکہ آپ کی ذات اقدس ضروریات دین اور عقائد اسلامی کے بارہ میں ابہام اور گنجلک کو دور کرنے کا باعث ہے نہ کہ ابہام و التباس پیدا کرنے کا؟ خصوصاً جبکہ یہ تینوں باتیں خود اپنی جگہ کسی حال میں نہ صورت میں کذب ہیں اور نہ حقیقی معنی ہیں۔

- بلاشبہ حضرت سارہ علیہا السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دینی بہن تھیں اور بیوی کے رشتہ سے اسلامی اخوت کا رشتہ منقطع نہیں ہو جاتا، نیز ابن کثیر اور دوسرے مؤرخین کی تحقیق میں وہ ان کے چچا حاران کی بیٹی تھیں، اس لیے چچا زاد بہن بھی تھیں، اور بلاشبہ ان کا مزاج ناساز تھا گو سخت بیماری نہ سہی اس لیے "اِنِّيۡ سَقِيۡمٌ" ہر حیثیت سے صحیح ہے اور بلاشبہ انہوں نے مناظرانہ طرز خطابت میں دشمن کو

لاجواب کرنے کے لیے فرمایا ﴿بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ﴾ اور یہ عملی دنیا میں کسی حیثیت سے بھی جھوٹ نہیں تھا، تو پھر ان ہر دو احادیث میں اس طرح کی تعبیر کیوں اختیار کی گئی؟

اس اشکال کے جواب میں علماء اسلام نے دو راہیں اختیار فرمائی ہیں:

① یہ اخبار آحاد ہیں اس لیے جرأت کے ساتھ یہ کہہ دینا چاہیے کہ اگرچہ یہ روایتیں صحیحین کی ہیں اور اس لیے مشہور کی حد تک پہنچ گئی ہیں مگر راوی کو ان روایات میں سخت مغالطہ ہوا ہے لہٰذا ہرگز قابل قبول نہیں ہیں اس لیے کہ ایک نبی کی جانب کذب کی نسبت کے مقابلہ میں راویوں کی غلطی کا اعتراف بدرجہا بہتر اور صحیح طریق کار ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ کا رجحان اسی جانب ہے اور انہوں نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

② یہ قطعی اور یقینی عقیدہ ہے کہ نبی اور رسول کی جانب "کذب" کی نسبت کسی حال میں درست نہیں ہے ایسی صورت میں اگر مستند اور صحیح روایات میں جو کہ حد شہرت و تواتر کو پہنچ چکی ہوں اس قسم کی کوئی نسبت موجود ہو جو نبی کی نبوت کے شان کے منافی ہو تو ان روایات کو صحیح مانتے ہوئے ان خصوصی جملوں کی ایسی توجیہ کرنی چاہیے جس سے اصل مسئلہ پر بھی زد نہ پڑے اور صحیح روایات کا انکار بھی لازم نہ آئے پس چونکہ صحیحین کی یہ روایات "تلقی بالقبول" کی وجہ سے صحت اور شہرت کے اس درجہ اور مرتبہ کو پہنچ چکی ہیں جو اخبار آحاد میں شمار نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے ان روایات کو مردود قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ "ثلث کذبات" کے جملہ کی یہ توجیہ کرنی چاہیے کہ اس مقام پر "کذب" سے مراد یہ ہے کہ "ایسا کلام جو صحیح اور پاک مقصد کے لیے بولا گیا ہو لیکن مخاطب اس کا وہ مطلب نہ سمجھے جو متکلم کی مراد ہے بلکہ ان الفاظ کو اپنی ذہنی مراد کے مطابق سمجھے" اور یہ معنی صرف ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے لیے ہی نہیں تراشے گئے بلکہ علم بدیع کی اصطلاح میں اس کو "معاریض" کی اقسام میں شمار کیا گیا ہے اور فصحاء و بلغاء کے کلام میں اکثر رائج ہے۔

اس طرح روایات کا انکار بھی لازم نہیں آئے گا اور صداقت نبی کا مسئلہ بھی اپنی جگہ بغیر کسی غل و غش کے صحیح رہے گا، چنانچہ حدیث شفاعت کے وہ الفاظ "مامنها كذبة الا ماحل به عن دين الله" ہماری اس توجیہ کی تائید کرتے ہیں، جمہور علماء اسلام کی یہی رائے ہے اور وہ امام رازی اور ان کے ہمنوا علماء کی پہلی رائے کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔

مشہور مصری عالم عبدالوہاب نجار نے قصص الانبیاء میں امام رازی کی رائے کے ساتھ موافقت کی ہے اور مصری علماء عصر کی رائے کے خلاف (جو دراصل جمہور کی تائید میں نجار کی رائے پر تنقید کی شکل میں ظاہر کی گئی ہے) کافی شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام و سارہ علیہا السلام کے اس واقعہ سے انکار کیا ہے۔

مؤلف کی رائے:

مگر ان ہر دو آراء سے الگ سادہ اور صاف راہ یہ ہے کہ صحیح حدیث کے انکار اور اس کے الفاظ کی رکیک تاویل کیے بغیر ہی مسئلہ کو اس طرح حل کر دیا جائے کہ اصل مسئلہ "عصمت پیغمبر" پر بھی حرف نہ آنے پائے اور اس قسم کے مواقع سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں، اور احادیث نبوی کے ساتھ تمسخر اور مذاق کرنے والوں کو بھی الحاد کی جرأت نہ ہوسکے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ "عصمت پیغمبر" کا مسئلہ بلاشبہ اصول دین اور مہمات عقائد میں سے ہے بلکہ دین و مذہب کی صداقت کی اساس و بنیاد صرف اسی ایک مسئلہ پر قائم ہے کیونکہ یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ بعض حالات میں نبی اور پیغمبر بھی "کذب" کی کوئی نہ کوئی شکل و صورت اختیار کر سکتا ہے خواہ وہ حمایت حق ہی کے لیے کیوں نہ ہو اس کی لائی ہوئی تمام تعلیم سے یہ امتیاز اٹھ جائے گا کہ اس میں سے کون سا جز اپنی حقیقی مراد کے ساتھ وابستہ ہے اور کون سا "کذب" کے رنگ میں رنگا ہوا، اور اگر یہ مان لیا جائے تو پھر دین، دین نہیں رہ سکتا اور نہ مذہب، مذہب۔

اس لیے قرآن عزیز کا یہ منصوص عقیدہ "عصمت پیغمبر" اپنی جگہ غیر متزلزل اور غیر متبدل عقیدہ ہے اور اس لیے بلاشبہ جو اس عقیدہ کی صداقت پر حرف گیری کا باعث بنے وہ خود اپنی جگہ یا قابل رد و انکار ہے اور یا اپنی صحت تعبیر کے لیے جوابدہ، پس اس محکم عقیدہ کو اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی بلکہ اس سے معارض شئے کو یا اس کے مطابق ہونا پڑے گا ورنہ تو مٹ جانا ہوگا۔

اسی طرح یہ امر بھی مسلم ہے کہ قرآن عزیز کی تفسیر و تشریح صرف لغت عرب سے ہی نہیں کی جا سکتی بلکہ جس طرح اس کے مفہوم سمجھنے کے لیے "لغت کی معرفت" ضروری ہے اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ پیغمبر خدا ﷺ کے اقوال، اعمال اور احوال کی معرفت کی ضرورت ہے جو کلام اللہ کی صحیح توجیہ، تفسیر اور تشریح کے حامل ہیں۔

بلاشبہ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ قرآنی احکام مثلاً: ﴿ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ ۔ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ۔ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَۃَ ۔ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ میں نماز، زکوٰۃ حج اور روزہ کے مفہوم اور معنی کو ہم کسی طرح بھی "لغت عربی" کے ذریعہ متعین نہیں کر سکتے اور تنہا یہ لغوی معنی و مفہوم قرآنی احکام کا مصداق نہیں بن سکتے بلکہ ان کی معرفت کے لیے ہم مجبور ہیں کہ پیغمبر خدا ﷺ کے ان اقوال و اعمال کی طرف رجوع کریں جو ان فرائض کی تفسیر و تشریح میں کہے گئے یا کیے گئے ہیں، اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ صرف تعامل کے ذریعہ ہم ان فرائض کی حقیقت سے آگاہ ہو سکیں اس لیے کہ اگر دقت نظر سے کام لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تعامل کا مبدأ بھی آخر کار قول و عمل رسول پر ہی جا کر منتہی ہوتا ہے، لہٰذا پیغمبر خدا ﷺ کے اس قول و عمل کو بھی جزو دین سمجھنا ضروری ہو جاتا ہے اور بغیر اس تسلیم و رضا کے آیت۔

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ﴾ (الاحزاب: ۲۱)

"بلاشبہ خدا کے پیغمبر (ﷺ) میں اس شخص کے لیے عمدہ نمونہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر اُمید لگاتا ہو۔"

کے کوئی معنی نہیں بنتے، کیونکہ یہ "اسوۂ حسنہ" خود قرآن عزیز اور اس کی آیات نہیں ہیں بلکہ اس پیغمبر کا قول، عمل اور حال ہی اسوۂ حسنہ ہے اور جبکہ پیغمبر خدا ﷺ کے یہ اقوال، اعمال اور احوال جزو دین ہیں تو ضروری تھا کہ ان کی حفاظت کا ایسا سامان مہیا ہو جو "خاتم النبیین" کی امت کے لیے رہتی دنیا تک محفوظ طریقے سے پہنچ سکے اور اس جوہر خالص میں جب بھی کھوٹ کی ملاوٹ کی جائے تو اس کے حافظین اور فن کے ماہرین فوراً دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے کھرے کھوٹے کو الگ کر سکیں، پس اسی طریقہ حفاظت کا نام "روایت حدیث اور نقد حدیث ہے" اور اسی فن کو "فن حدیث" کہتے ہیں، اور یہی وہ شریف اور مقدس خدمت ہے جس نے اپنوں سے

نہیں بلکہ غیروں سے بھی خراج تحسین حاصل کیا ہے اور اس خدمت کو اسلام کا امتیازی نشان تسلیم کرایا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ان اقوال و اعمال کی روایت کی حفاظت کے سلسلہ میں کھرے اور کھوٹے کے امتیاز کے لیے زمانہ نبوت سے اب تک جو خدمت ہوتی آ رہی ہے اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہو سکتی ہے کہ "روایت حدیث" کا فن تقریباً چودہ فنون اور شاخوں میں منقسم ہے۔

لہٰذا از بس ضروری ہے کہ ہم کسی ایک ایسی روایت یا روایت کے جملہ کو "جو اپنی لفظی اور ظاہری تعبیر میں مسلمہ عقیدہ کے بارہ میں ابہام پیدا کرتا ہو" صحیح اور مقبول، مشہور اور متواتر روایات حدیثی کے انکار پر حجت و دلیل قائم نہ کر لیں اور اس کو انکار حدیث کا ذریعہ بنا کر قرآن عزیز کو ایک ایسی اجنبی کتاب نہ بنا دیں جس کی تعبیر کے لیے نہ کسی پیغمبر کے تفسیری اقوال ہیں اور نہ تشریحی اعمال بلکہ وہ کسی ویرانہ یا پہاڑ پر نازل ہوئی ہے اور صرف اپنی زبان کی لغت اور ڈکشنری سے حل کی جا سکتی ہے۔ البتہ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ تمام احادیث رسول روایت باللفظ نہیں ہیں بلکہ بعض روایات بالمعنی ہیں یعنی یہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جو بھی الفاظ زبان مبارک سے فرمائے ہوں راوی نے ایک ایک لفظ اسی طرح نقل کر دیا ہو، بلکہ معنی اور مفہوم کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اس روایت کے الفاظ راوی کی اپنی تفسیر ہوتے ہیں۔

پس ان اہم اور بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھنے کے بعد اب مسئلہ زیر بحث کو اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ بخاری کی احادیث کو بلاشبہ "تلقی بالقبول" حاصل ہے اور یہ بھی تسلیم کہ یہ کتاب جرح و نقد پر کسے جانے اور پرکھے جانے کے بعد امت میں شہرت و قبولیت کا وہ درجہ رکھتی ہے کہ کتاب اللہ کے بعد اس کو اصح الکتب کہا جاتا ہے۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ روایت بالمعنی ہونے کی وجہ سے اس کی کسی روایت میں راوی سے لفظی تعبیر میں سقم پیدا ہو گیا ہو اور روایت اگرچہ اپنے سلسلہ سند اور مجموعہ متن کے اعتبار سے اصولاً قابل تسلیم ہو مگر اس جملہ کی تعبیر کو سقیم سمجھا جائے اور اصل روایت کو رَد کرنے کی بجائے صرف اس کے سقم کو ظاہر کر دیا جائے چنانچہ اس کی بہترین مثال بخاری کی حدیث معراج ہے۔

محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ مسلم کی حدیث اسریٰ عن انس رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں بخاری کی حدیث عن عبداللہ بن ابی نمرہ میں سقم ہے اور اس کی ترتیب میں غلطیاں ہیں اور مسلم کی روایت ان اسقام و اغلاط سے پاک صاف ہے، حالانکہ یہ دونوں روایتیں روایت و درایت کے اعتبار سے صحیح اور قابل تسلیم ہیں۔

تب بغیر کسی شک اور تردد کے یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق یہ دونوں طویل روایات "روایت بالمعنیٰ" کی قسم میں داخل ہیں، اور یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا کہ الفاظ اور جملوں کی یہ پوری نشست نبی اکرم ﷺ کی زبان حق ترجمان کے نکلے ہوئے الفاظ اور جملوں کی نشست ہے بلکہ آپ کے مفہوم اور معنی کو ادا کرتی ہیں لہٰذا ہو سکتا ہے کہ ہر دو روایات میں بیان کردہ واقعات کی صحت کے باوجود زیر بحث الفاظ سلسلہ سند کے کسی راوی کے اختلال لفظی کا نتیجہ ہوں اور اس سے یہ تعبیری سقم پیدا ہو گیا ہو۔

خصوصاً جبکہ اس کے لیے یہ قرینہ بھی موجود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام و سارہ علیہا السلام اور شاہ مصر کا یہ واقعہ توراۃ میں بھی مذکور ہے اور وہاں اس قسم کے غیر محتاط جملے بکثرت موجود ہیں لہٰذا یہ ممکن ہے کہ راوی سے اس اسرائیلی روایت اور صحیح روایت کے درمیان تعبیر میں خلط ہو گیا ہو اور اس لیے اس نے معاملہ کی تعبیر زیر بحث الفاظ سے کر دی ہو۔

ہدایت قوم کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اضطراب:

گذشتہ سطور سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کی ہدایت کے لیے کس درجہ مضطرب اور بے چین تھے اور دلائل و براہین کی وہ کون سی صورت ہو سکتی ہے جو انہوں نے حق کے آشکارا کرنے میں صرف نہ کر دی ہو؟ سب سے پہلے اپنے باپ آزر کو سمجھایا پھر "جمہور" کے سامنے حق کی روشنی کو پیش کیا، اور آخر میں نمرود سے مناظرہ کر کے اس کے سامنے بھی احقاق حق کو بہتر سے بہتر اسلوب کے ساتھ ادا کیا اور ہر لمحہ یہی سب کو تلقین کی کہ خدائے واحد کے علاوہ کسی کی پرستش جائز نہیں اور اصنام پرستی اور کواکب پرستی کا نتیجہ خسران اور ذلت کے سوائے دوسرا نہیں ہے اس لیے شرک سے باز آنا چاہیے اور "ملت حنیفیہ" ہی کو صراط مستقیم سمجھنا چاہیے جس کی اساس و بنیاد صرف "توحید الٰہی" پر قائم ہے۔

مگر بد بخت قوم نے کچھ نہ سنا، اور کسی طرح رشد و ہدایت کو قبول نہ کیا اور ابراہیم علیہ السلام کی بیوی حضرت سارہ علیہا السلام اور ان کے برادر زادہ حضرت لوط علیہ السلام کے علاوہ کوئی ایک بھی ایمان نہیں لایا۔ اور تمام قوم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلا دینے کا فیصلہ کر لیا اور دہکتی آگ میں ڈال دیا۔

اور جب خدائے تعالیٰ نے دشمنوں کے ارادوں کو ذلیل و رسوا کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں آگ کو "برد و سلام" بنا دیا تو اب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ کسی دوسری جگہ جا کر پیغام الٰہی سنائیں اور دعوت حق پہنچائیں اور یہ سوچ کر "فدان آرام"[1] سے ہجرت کا ارادہ کر لیا۔

﴿وَ قَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ۝﴾ (الصافات: ۹۹)

اور ابراہیم نے کہا "میں جانے والا ہوں اپنے پروردگار کی طرف قریب ہی وہ میری رہنمائی کرے گا۔"

یعنی اب مجھے کسی ایسی آبادی میں ہجرت کر کے چلا جانا چاہیے جہاں خدا کی آواز گوش حق نیوش سے سنی جائے، خدا کی زمین تنگ نہیں ہے، یہ نہیں اور سہی، میرا کام پہنچانا ہے، خدا اپنے دین کی اشاعت کا سامان خود پیدا کر دے گا۔

اور کلدانیین کی جانب ہجرت:

بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد آزر اور قوم سے جدا ہو کر فرات کے غربی کنارہ کے قریب ایک بستی میں چلے گئے جو اور کلدانیین کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کیا، اور حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت سارہ علیہا السلام ہم سفر رہیں اور کچھ دنوں کے بعد یہاں سے "حران یا حاران" کی جانب روانہ ہو گئے اور وہاں "دین حنیف" کی تبلیغ شروع کر دی مگر اس عرصہ میں برابر اپنے والد آزر کے لیے بارگاہ الٰہی میں استغفار کرتے، اور اس کی ہدایت کے لیے دعا مانگتے رہے اور یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ وہ نہایت رقیق القلب رحیم اور بہت ہی نرم دل و بردبار تھے اس لیے آزر کی جانب سے ہر قسم کی عداوت کے مظاہروں کے باوجود انہوں نے آزر سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگرچہ میں تجھ سے جدا ہو رہا ہوں اور افسوس کہ تو نے خدا کی رشد و ہدایت پر توجہ نہ کی تاہم میں برابر تیرے حق

---

[1] بابل کی حکومت مذکورہ میں ایک مشہور شہر تھا، یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مولد ہے۔

میں خدا سے مغفرت کی دعا کرتا رہوں گا آخر کار حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وحی الٰہی نے مطلع کیا کہ آزر ایمان لانے والا نہیں ہے اور یہ انہی اشخاص میں سے ہے جنہوں نے اپنی نیک استعداد کو فنا کر کے خود کو اس کا مصداق بنا لیا۔

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ (البقرہ: ۷)

”اللہ نے مہر لگا دی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہو گیا تو آپ نے آزر سے اپنی برات کا صاف صاف اعلان کر دیا کہ جو اُمید موہوم میں نے لگا رکھی تھی وہ اب ختم ہو گئی اس لیے اب استغفار کا سلسلہ بے محل ہے، قرآن عزیز کی سورۂ توبہ میں اس واقعہ کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

﴿وَ مَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝﴾ (التوبہ: ۱۱۴)

”اور نہ تھا ابراہیم (علیہ السلام) کا استغفار اپنے باپ کے لیے مگر اس وعدہ کے مطابق جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا، پھر جب اس پر یہ ظاہر ہو گیا کہ یہ خدا کا دشمن ہے (یعنی اس کا آخری انجام یہی ہوگا) تو اس سے بیزاری کا اظہار کر دیا، بے شک ابراہیم (علیہ السلام) بے ضرور رقیق القلب بردبار۔“

ہجرت فلسطین:

ابراہیم علیہ السلام اس طرح تبلیغ کرتے کرتے فلسطین پہنچے، اس سفر میں بھی ان کے ہمراہ حضرت سارہ علیہا السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی بیوی تھیں۔ سورۂ عنکبوت میں ہے:

﴿فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَ قَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ (العنکبوت: ۲۶)

”پس لوط علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور کہنے لگے میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں بیشک وہ غالب ہے، حکمت والا ہے۔“

روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ اپنی زوجہ مطہرہ حضرت رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کر گئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ان عثمان اوّل مهاجر باهله بعد لوط)).

”بلاشبہ لوط علیہ السلام کے بعد عثمان پہلے مہاجر ہیں جنہوں نے اپنی بیوی سمیت ہجرت کی۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فلسطین کے غربی اطراف میں سکونت اختیار کی، اس زمانہ میں یہ علاقہ کنعانیوں کے زیر اقتدار تھا، پھر قریب ہی شکم (نابلس) میں چلے گئے اور وہاں کچھ عرصہ قیام کیا، اس کے بعد یہاں بھی زیادہ مدت قیام نہیں فرمایا اور غرب ہی کی جانب بڑھتے چلے گئے حتیٰ کہ مصر تک جا پہنچے۔

ہجرت مصر اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام:

جب نابلس سے چل کر مصر پہنچے تو بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق ملک جبار کا وہ واقعہ پیش آیا جو گذشتہ سطور میں سپرد قلم ہو چکا ہے اور تورات میں اس قصہ کو اس طرح نقل کیا گیا ہے:

"سو جب ابرام مصر پہنچا۔ مصریوں نے اس عورت کو دیکھا کہ وہ نہایت خوبصورت ہے اور فرعون کے امیروں نے بھی اسے دیکھا اور فرعون کے حضور میں اس کی تعریف کی اور اس عورت کو فرعون کے گھر میں لے گئے اور اس نے اس کے سبب ابرام پر احسان کیا کہ اس کو بھیڑ بکری اور گائے بیل اور گدھے اور غلام اور لونڈیاں اور گدھیاں اور اونٹ ملے، پھر خداوند نے فرعون، اور اس کے خاندان کو ابرام کی جورو سری کے سبب بڑی مار ماری، تب فرعون نے ابرام کو بلا کر اس سے کہا کہ تو نے مجھ سے یہ کیا کیا؟ کیوں نہ جتایا کہ وہ میری جورو ہے، تو نے کیوں کہا کہ وہ میری بہن ہے؟ یہاں تک کہ میں نے اسے اپنی جورو بنانے کو لیا، دیکھ یہ تیری جورو حاضر ہے اس کو لے اور چلا جا، اور فرعون نے اس کے حق میں لوگوں کو حکم کیا تب انہوں نے اسے اور اس کی جورو کو اور جو کچھ اس کا تھا روانہ کیا۔" [1]

صحیحین (بخاری و مسلم) کی روایت اور تورات کی اس روایت کے درمیان یہ اختلاف ہے کہ صحیحین کی روایت میں حضرت سارہ علیہا السلام کے بددعا والے واقعہ میں ملک جبار "فرعون" نے شیطانی (جنی) اثر سمجھ کر سارہ علیہا السلام سے جان چھڑائی اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو ان کے حوالہ کر کے ابراہیم علیہ السلام کو مع ان کے رفقاء اور ساز و سامان کے مصر سے چلے جانے کی اجازت دی، فتح الباری میں ہے کہ مصری "جن" کی عظمت کے قائل تھے، اس لیے شیطان سے مراد یہاں جن ہے۔

اور تورات کی روایت یہ کہتی ہے کہ فرعون مصر نے سارہ علیہا السلام کے واقعہ کو کرامت سمجھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ عتاب کیا کہ انہوں نے شروع ہی سے یہ کیوں نہ بتا دیا کہ سارہ علیہا السلام ان کی بہن نہیں ہے۔ بلکہ بیوی ہے اور پھر بڑے انعام و اکرام اور عزت کے ساتھ ان کو مصر سے رخصت کیا۔ تورات کی روایت کے مطابق اس وقت حضرت سارہ علیہا السلام کی عمر ستر سال کی تھی۔

بہرحال صحیحین کی روایت ہو یا تورات کی، معنی اور مفہوم کے اعتبار سے دونوں روایات قریب قریب ہیں اور دونوں کے درمیان کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔

البتہ ان تمام روایات سے اس قدر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی سارہ علیہا السلام اور اپنے برادر زادہ حضرت لوط علیہ السلام کے ساتھ مصر تشریف لے گئے اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مصر کی حکومت ایسے خاندان کے ہاتھ میں ہے جو سامی قوم سے تعلق رکھتا تھا اور اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسبی سلسلہ میں وابستہ تھا، یہاں پہنچ کر ابراہیم علیہ السلام اور فرعون مصر کے درمیان ضرور کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جس سے اس کو یقین ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام اور اس کا خاندان خدا کا مقبول اور برگزیدہ خاندان ہے، یہ دیکھ کر اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی حضرت سارہ علیہا السلام کا بہت اعزاز کیا اور ان کو ہر قسم کے مال و منال سے نوازا، اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے قدیم خاندانی رشتہ کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیے اپنی بیٹی ہاجرہ علیہا السلام کو بھی ان کی زوجیت میں دے دیا،

---

[1] پیدائش باب ۱۲ آیت ۱۴۔۲۰ تورات

جو اس زمانہ کے رسم و رواج کے اعتبار سے پہلی اور بڑی بی بی کی خدمت گذار قرار پائیں، چنانچہ اس تاریخی قیاس کی سب سے بڑی شہادت خود یہود کے یہاں بھی موجود ہے۔

سفر الیشیاء میں (جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے) مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ حضرت کا ہم وطن تھا۔ [1]

اور اسی طرح یہود کی معتبر روایات سے یہ مسئلہ بھی صاف اور روشن ہو جاتا ہے کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام "شاہ مصر فرعون" کی بیٹی تھیں، لونڈی اور باندی نہیں تھیں، توراۃ کا ایک معتبر مفسر ربی شلوملو اسحٰق کتاب پیدائش باب ۱۶ آیت ۱ کی تفسیر میں لکھتا ہے ابث بر عہ ھاینا کشر انسیم شنعسو اسارہ امر تاب شتھابتی شفحہ بیت زہ ولو کبیرہ بیت اخیر۔ جب اس نے (رقیوں شاہ مصر نے) سارہ کی وجہ سے کرامات کو دیکھا تو کہا: میری بیٹی کا اس کے گھر میں لونڈی ہو کر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ ہو کر رہنے سے بہتر ہے۔ [2]

اس تفسیر اور تورات کی آیت کو جمع کرنے سے یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو جاتی ہے کہ تورات میں ہاجرہ علیہا السلام کو صرف اسی لیے لونڈی کہا گیا کہ شاہ مصر نے ان کو سارہ اور ابراہیم علیہما السلام کے سپرد کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ وہ سارہ کی خدمت گزار رہے گی، یہ مطلب [3] نہ تھا کہ وہ لونڈی بمعنی "جاریہ" ہیں اس لیے کہ ربی شلوملو تصریح کرتا ہے کہ ہاجرہ فرعون مصر کی بیٹی تھیں۔

بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملک جبار کی جو روایت مذکور ہے اس میں بھی یہ جملہ موجود ہے اور ربی شلوملو کی تفسیر کی تائید کرتا ہے۔

واخدمھا ھاجرہ [4] اور ہاجرہ علیہا السلام کو سارہ علیہا السلام کے حوالہ کر دیا کہ ان کی خدمت گذار رہے اور اس لیے بنی اسرائیل کا یہ طعن کہ بنی اسماعیل ہم سے اس لیے کمتر ہیں کہ وہ لونڈی سے ہیں اور ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہ علیہا السلام سے، صحیح نہیں ہے اور واقعہ اور تاریخ دونوں کے خلاف ہے اور جس طرح تورات کے دوسرے مضامین میں تحریف کی گئی ہے اسی طرح اس واقعہ میں بھی تحریف کی گئی ہے، اور واقعہ کی تمام تفصیلات کو حذف کر کے صرف "لونڈی" کا لفظ باقی رہنے دیا گیا ہے۔

ہاجرہ دراصل عبرانی لفظ "ہاغار" ہے جس کے معنی بیگانہ اور اجنبی [5] کے ہیں، ان کا وطن چونکہ مصر تھا اس لیے یہ نام پڑ گیا، لیکن اسی اصول کے پیش نظر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ "ہاغار" کے معنی "جدا ہونے والے" کے ہیں اور عربی میں "ہاجر" کے معنی بھی یہی ہیں، چونکہ اپنے وطن مصر سے جدا ہو کر یا ہجرت کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریک حیات اور حضرت سارہ علیہا السلام کی خدمت گذار بنیں اس لیے ہاجرہ کہلائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دو اہم مقام:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زیر عنوان بحث ختم کرنے سے قبل دو ایسے اہم مقامات کا ذکر کر دینا از بس ضروری ہے جن کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بہت گہرا تعلق ہے اور جو پیروان ملت ابراہیمی کے لیے "مقام بصیرت" کی حیثیت رکھتے اور مجد د انبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیغمبرانہ عظمت و جلال کو تابندہ تر بناتے ہیں۔

---

[1] ارض القران جلد ۲ ص ۴۱ [2] ایضاً [3] براھین باھرہ فی حریۃ ھاجرہ از مولانا غلام رسول چڑیا کوٹی

[4] بخاری، باب الانبیاء جلد ۶ ص ۳۰۱ [5] ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۰

مقام اوّل:

سورۂ ممتحنہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک خاص دُعا کا تذکرہ ہو رہا ہے، وہ بارگاہ الٰہی میں دست طلب دراز کیے عجز و نیاز کے ساتھ یہ عرض کر رہے ہیں۔

﴿ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ (الممتحنہ: ۵)

"اے ہمارے پروردگار! ہم کو ان لوگوں کے لیے "فتنہ" نہ بنا جو کافر ہیں۔"

فتنہ "فتن" سے ماخوذ ہے، جب سونے کو اس لیے آگ میں تپاتے ہیں کہ کھوٹ اور میل جل کر خالص سونا باقی رہ جائے تو اس کے لیے "فتن الذہب" بولتے ہیں، اب اصطلاح میں امتحان اور آزمائش اور پرکھ کو کہتے ہیں اور اس لیے حضرت انسان پر جو شدائد و مصائب آتے ہیں وہ اس مناسبت سے "فتنہ" کہلاتے ہیں، قرآن حکیم نے بھی مال، اولاد اور منصب و جاہ کو اسی معنی کے پیش نظر "فتنہ" کہا ہے اور صاف صاف اعلان کیا ہے کہ صادق کاذب کی جانچ کے لیے "مومن" کو اس کسوٹی پر ضرور پرکھا جاتا ہے۔

﴿ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ ﴾ (العنکبوت: ۲)

"کیا لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ جو لوگ دعویٰ ایمان کرتے ہیں وہ یوں ہی چھوڑ دیئے جائیں گے اور آزمائے نہ جائیں گے۔"

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ ﴾ (الانفال: ۳۹)

"اور ان مشرکوں سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ مٹ جائے اور دین سب کا سب خالص اللہ کے لیے رہ جائے۔"

تو اب قابل توجہ ہے یہ بات کہ اس دُعا ابراہیمی کی مراد کیا ہے؟ اور وہ کافروں کے لیے فتنہ نہ بننے سے متعلق کیا خواہش رکھتے ہیں؟

اختلاف ذوق کے پیش نظر علماء حق نے اس سوال کو تین طرح سے حل کیا ہے لیکن ان تینوں حقیقتوں پر غائر نظر ڈالنے کے بعد بآسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ دُعا اپنی وسعت اور دقیق تعبیر کے لحاظ سے بیک وقت تینوں باتوں پر حاوی ہے۔

① حضرت ابراہیم علیہ السلام درگاہ رب العزت میں یہ دعا کر رہے ہیں "پروردگار عالم! مجھ کو وہ زندگی بخش کہ میرا قول و عمل اور میری رفتار و گفتار "اسوۂ حسنہ" کی تعبیر ہو، میں اگر ہادی بنوں تو اسوۂ حسنہ کا اور مجھ کو قیادت نصیب ہو تو رشد و ہدایت کی اور پھر اس پر استقامت عطا فرما، ایسا نہ ہو کہ میں اسوۂ سیئہ کا رہنما اور قائد بن جاؤں اور فردائے قیامت میں امت کے گمراہ کافر تیرے حضور مجھ کو یہ کہہ کر شرمندہ کریں۔

﴿ رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ ﴾ (الاحزاب: ۶۷)

"اے ہمارے پروردگار! اس میں ذرا شک نہیں ہے کہ ہم نے اپنے قائدین اور اپنے بڑوں کی پیروی اختیار کر لی تھی پس انہوں نے ہی ہم کو راہ سے بے راہ کیا۔"

یعنی وہ خواہش رکھتے ہیں کہ اگر راہنمائی اور قیادت ان کا نصیب ہے تو پھر وہ اسوہ اور قدوہ چھوڑ کر جائیں کہ کل کے دن "اولیاء الرحمٰن" کے زمرہ میں جگہ ملے اور ان کی زندگی کا راز "اولیاء الشیطان" کے ساتھ عداوت بن جائے، آیت کا سیاق و سباق اس معنی کی پوری تائید کرتا ہے اس لیے کہ آیت سے قبل مشرکین کے مقابلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی پاکباز امت کے اس اعلان کا تذکرہ ہے۔

﴿ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ ﴾ (الممتحنة : ٤)

"اور ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت و بغض کا آغاز ہو گیا ہے تا آنکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔"

اور زیر بحث آیت کے بعد پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے پیرو "مومنین قانتین" کے اسوۂ حسنہ کا ذکر خیر ہے اور شروع سورۃ میں بھی ابراہیم علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کا ذکر موجود ہے۔

(۲) ابراہیم علیہ السلام اپنے ان جامع کلمات میں بارگاہ حق سے اس کے طالب ہیں کہ خدایا! تو ہم کو کافروں کے ہاتھوں آزمائش کے لیے نہ چھوڑ دینا کہ وہ ہم کو ایمان سے برگشتہ اور کفر کے قبول کرنے کے لیے طرح طرح کے مصائب و آلام کا شکار بنائیں اور جبر و ظلم کے ذریعہ راہ سے بے راہ بنانے پر آمادہ و دلیر ہو جائیں۔

اس معنی کا قرینہ یہ ہے کہ آیت زیر عنوان سے قبل یہ ذکر آ چکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی امت اجابت نے ذی اقتدار اور بااختیار کافر و مشرک جماعت کے سامنے جرأت حق کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ ہم تمہارے معتقدات کے قطعاً منکر ہیں "کفرنا بکم" اور ہمارے اور تمہارے درمیان اسلام کے انکار و اقرار اور قبول و عدم قبول کے لیے کھلا چیلنج ہے، تو اس صورت حال میں ازبس ضروری تھا کہ ایک باخدا انسان، جلیل القدر پیغمبر، عظیم المرتبہ ہادی، اپنی انسانی کمزوریوں پر نظر رکھتے ہوئے درگاہ الٰہی میں دست بدعا ہو کر اے لازوال قدرت کے مالک! تو کسی طرح اور کسی حالت میں بھی کافروں کو ہم پر غلبہ عطا نہ فرما اور کافر کسی شکل میں بھی ہم پر ایسے قابو یافتہ نہ ہو سکیں کہ ایمان و کفر سے متعلق ہمارا یہ اعلان جنگ ہمارے لیے باعث امتحان و فتنہ بن جائے اور مشرک کو کفر کی جانب واپس لانے کی جرأت بے جا کر سکیں۔

(۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام اس مقام پر فتنہ کہہ کر "عذاب" مراد لیتے ہیں اس لیے کہ فتنہ کی مختلف شکلوں میں سے ایک بھیانک شکل یہ بھی ہے، اور عرض کرتے ہیں، پروردگار ہم کو ایسی حالت پر کبھی نہ پہنچانا کہ ہم کافروں اور مشرکوں کے ہاتھوں طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہو جائیں اور نتیجہ یہ نکلے کہ اپنی پستی، نکبت، ذلت و غلامی اور دشمنوں کی دنیوی عزت و جاہ عروج و ترقی، اور حاکمانہ اقتدار کو دیکھ دیکھ کر یہ کہہ اٹھیں کہ اگر ہم حق پر ہوتے تو اس ذلت و خسران میں نہ ہوتے اور اگر شرک و کفر خدا کی نگاہ میں مبغوض ہوتا تو ان کافر اور مشرک جماعتوں کو یہ عزت و جاہ اور یہ فروغ حاصل نہ ہوتا یعنی ہم سے حق و باطل کا امتیاز ہی اٹھ جائے پس ایسے فتنہ سے ہمیشہ ہمیشہ محفوظ رکھ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا یہ پہلو ہمارے لیے صد ہزار سامان عبرت و بصیرت رکھتا ہے اس لیے کہ گذشتہ ڈیڑھ صدی سے خصوصیت کے ساتھ اسلامی دنیا اپنی خود ساختہ غیر اسلامی روش کی بدولت جس طرح غیر اسلامی اقتدار، حاکمانہ جبر اور پنجہ استبداد

کے نیچے دبی ہوئی ہے اور ہر طرح بیچارہ و مجبور نظر آتی ہے اس نے ہم کو اس درجہ حقیر و ذلیل بنا دیا ہے کہ ہم سے ہمارے قوائے فکر و عمل بھی مفقود ہو چکے ہیں اور احساس کمتری میں مبتلا ہو کر ہم بے خوف و خطر یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اسلام نہ خدا پرستی کا نام ہے اور نہ عقائد و اعمال صالحہ کی زندگی کا بلکہ صرف مادی قوت و شوکت (حکومت) اور اس کے ذریعہ حصول عیش و عشرت کا دوسرا نام "مذہب" یا "اسلام" ہے اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اس مادی قوت کے حصول کے لیے ڈسپلن اور ضبط و نظم کے لیے صرف ایک طریق کار ہیں نہ کہ مقصد حیات ملی، اور صرف یہی حقیقت ہے اس "جنت" کی جس کا وعدہ ارباب حق کے لیے قرآن میں کیا گیا ہے۔ پس اگر یہ حاصل نہیں تو پھر اس کا دوسرا نام "جہنم" ہے اور وعدہ آخرت، بعثت و حشر اور جنت و جہنم سب محض فرضی تخیلات ہیں جو کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوں گے۔ (العیاذ باللہ)

اور یہ کہ جن قوموں کو دنیا میں اقتدار اور طاقت اور اس کے ذریعہ عیش و عشرت حاصل ہے قرآن میں مذکور حقیقی مومن وہی ہیں اور وہی اس طغرائے امتیاز کے مستحق، نہ کہ وہ خدا پرست مسلمان جو اس دولت سے محروم اور مجبور ہیں، چنانچہ کتاب "تذکرہ"[1] اسی خیال کی صدائے بازگشت ہے اور دین حق (اسلام) کی تعلیم سے ناآشنا اور مادیت سے مرعوب اکثر نوجوانان قوم کے بیباک خیالات اور ملحدانہ جذبات اسی پست اور شکست خوردہ ذہنیت کے آئینہ دار ہیں، یہی وہ خوفناک حقیقت ہے جس کے تصور نے مرکز وحدت، کعبہ کے مؤسس، ملت ابراہیمی کے داعی، دین حق کے مبلغ اور خدا کے مقدس رسول، ابراہیم علیہ السلام کو لرزہ براندام کر دیا اور انہوں نے عجز و زاری کے ساتھ اس ناپاک زندگی سے محفوظ رہنے کے لیے حضرت حق کے سامنے دست طلب دراز کیا کہ ہم پر وہ وقت کبھی نہ آئے کہ کفر کی شوکت و طاقت اس طرح کچل ڈالے کہ پرستاران توحید اس سخت اور کڑی آزمائش میں مبتلاء ہو کر حق و باطل کے درمیان امتیاز بھی کھو بیٹھیں۔

﴿ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَ اِلَيْكَ اَنَبْنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ اغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ﴾ (الممتحنة: ٤-٥)

"اے ہمارے رب تجھ ہی پر ہمارا بھروسہ ہے، اور تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں، اور تیرے ہی حضور میں (ہمیں) لوٹ جانا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم کو کافروں کے ہاتھ سے عذاب نہ دلانا، اور اے پروردگار ہمارے ہمیں معاف فرما بیشک تو غالب حکمت والا ہے۔"

مقام ثانی:

سورہ شعراء میں بہ سلسلہ عبرت و بصیرت، انبیاء علیہم السلام کی دعوت رشد و ہدایت کا جو ذکر ہو رہا ہے، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی تذکرہ ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کو توحید الٰہی کی تلقین اور شرک و کفر سے بیزاری و نفرت کی ترغیب دلا رہے ہیں، اسی حالت میں وہ توحید ذات و صفات کا ذکر خیر کرتے ہوئے یک بیک خدائے واحد کی جانب دست بدعا ہو جاتے ہیں، گویا ایک دوسرے رنگ میں قوم کو اللہ رب العالمین کا پرستار بنانے کی سعی فرما رہے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام دعا کرتے کرتے درگاہ

[1] مصنفہ علامہ مشرقی

ایزدی میں عرض کرتے ہیں ﴿وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ﴾ "پروردگار! اور جس روز لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے تو اس دن مجھ کو رسوا نہ کرنا۔

اس آیت کے تحت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی الجامع الصحیح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث نقل فرمائی ہے کتاب التفسیر میں مختصر اور کتاب الانبیاء میں تفصیل کے ساتھ منقول ہے۔ کتاب التفسیر میں منقول حدیث کا ترجمہ یہ ہے:

"حضرت ابراہیم علیہ السلام قیامت کے دن اپنے والد کو پراگندہ حال اور روسیاہ دیکھیں گے تو فرمائیں گے: "پروردگار! دنیا میں تو نے میری اس دعا کو قبول فرمالیا تھا ﴿وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ﴾ (یعنی پھر یہ رسوائی کیسی کہ میدان حشر میں اپنے باپ کو اس حال میں دیکھ رہا ہوں) اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا ابراہیم! میں نے کافروں پر جنت کو حرام کر دیا ہے"۔

اور کتاب الانبیاء میں یہ روایت ان اضافات کے ساتھ مذکور ہے۔

"جب قیامت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کو پراگندہ حال اور روسیاہ دیکھیں گے تو باپ سے مخاطب ہو کر فرمائیں گے: "کیا میں نے بارہا تجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ میری راہ ہدایت کی مخالفت نہ کر" آزر کہے گا! "جو ہوا سو ہوا آج کے دن سے میں تیری مخالفت نہیں کروں گا" تب حضرت ابراہیم علیہ السلام درگاہِ الٰہی میں عرض رسا ہوں گے: "پروردگار! تو نے میری اس دعا کو قبول فرمالیا تھا ﴿وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ﴾ مگر اس سے زیادہ رسوائی اور کیا ہوگی کہ میرا باپ (آزر) تیری رحمت سے انتہائی دور ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا "میں نے بلاشبہ کافروں پر جنت کو حرام کر دیا ہے" پھر ہاتف غیبی آواز دے گا (اور بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی پکارے گا) ابراہیم! قدموں کے نیچے دیکھ کیا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام دیکھیں گے کہ گندگی میں لتھڑا ہوا ایک بجو پیروں میں پڑا لوٹ رہا ہے، تب فرشتے ٹانگوں سے پکڑ کر جہنم میں اس کو پھینک دیں گے"۔

مختصر حدیث میں قیامت کے دن آزر کی ہیئت کذائی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ تو ٹھیک ٹھیک قرآن عزیز سورۂ عبس کی اس آیت کی تفسیر ہے جس میں قیامت کے دن کافروں کی یہ حالت بیان کی گئی ہے:

﴿وَوُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ عَلَیْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝﴾ (عبس: ۴۰-۴۲)

"اور کتنے (لوگوں کے) منہ اس دن (ایسے) ہوں گے کہ ان پر گرد پڑی ہوگی اور ان پر کلونس چھا رہی ہوگی، یہی وہ (لوگ) ہیں جو (دنیا میں) کافر اور بدکار ہیں۔

اور سورۂ یونس میں مومنوں اور اصحاب جنت کے لیے اسی حالت کی نفی کی گئی ہے۔

﴿لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِیَادَةٌ ؕ وَلَا یَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ (یونس: ۲۶)

"جن لوگوں نے دنیا میں بھلائی کی ان کے لیے (آخرت میں بھی) بھلائی ہے اور کچھ بڑھ کر بھی اور گنہگاروں کی طرح ان کے منہ پر نہ کلونس چھائی ہوئی ہوگی اور نہ ذلت، یہی ہیں جنتی کہ وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے"۔

طویل حدیث میں دونئی باتیں کہی گئی ہیں ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آزر کی یہ حالت دیکھ کر درگاہِ الٰہی میں مسطورہ بالا دعا کا ذکر کریں گے جو انبیاء علیہم السلام کی دعاؤں کی طرح شرف قبول حاصل کر چکی ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ باپ کی یہ رسوائی دراصل میری رسوائی ہے، دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آزر کو بجو کی شکل میں مسخ کر دیا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے اجزاء پر بحث کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آزر کو اس لیے مسخ کر دے گا تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ حزن و ملال جاتا رہے جو آزر کے بشکل انسان رہنے کی صورت میں ناری اور جہنمی ہونے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا اور وہ اس کی اس ہیئت کذائی کو دیکھ کر متنفر ہو جائیں اور فطرت ابراہیمی اس سے بیزار ہو جائے۔

اور بجو کی شکل میں مسخ ہو جانے کی حکمت یہ بیان کرتے ہیں کہ ماہرین علم الحیوانات کے نزدیک بجو گندہ بھی ہے اور درندوں میں احمق بھی تو چونکہ آزر بھی بت پرست ہونے کی وجہ سے نجاست میں ملوث تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیش کردہ آیات بینات اور توحید الٰہی کے روشن دلائل و براہین کے نہ قبول کرنے کی بناء پر احمق بھی تھا اس لیے قانون الٰہی "پاداش عمل از جنس عمل" کے پیش نظر اسی کا مستحق تھا کہ ایک احمق اور نجس درندہ کی شکل میں مسخ کر دیا جائے۔

مگر مشہور محدث اسمٰعیلی اس روایت ہی کو مجروح اور لائق طعن سمجھتے اور صحت سند کے اعتراف کے باوجود "سقم درایت" کی بناء پر اس کو قبول نہیں کرتے، وہ فرماتے ہیں:

> "اس حدیث میں یہ "سقم" ہے کہ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ وہ العیاذ باللہ خدائے برتر کے متعلق "خلف وعدہ" کا شک کرتے تھے، تب ہی تو یہ سوال کیا؟ حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اولوالعزم انبیاء میں سے ہیں اور وہ بلاشبہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی ہرگز نہیں کرتا ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴾ لہٰذا ابراہیم علیہ السلام کی جانب ایسی بات کی نسبت کرنا قطعاً درست نہیں، وہ کسی طرح بھی آزر کی مشرکانہ زندگی و موت کے علم ہوتے ہوئے ایسا سوال نہیں کر سکتے۔"

اسماعیلی کے علاوہ بعض دوسرے محدثین نے بھی اس تفصیلی روایت پر جرح کی ہے، وہ کہتے ہیں:

یہ روایت بظاہر قرآن کے خلاف ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝﴾ (التوبہ: ۱۱۴)

> "اور (وہ جو) ابراہیم نے اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا مانگی تھی سو (وہ) ایک وعدہ (کی وجہ) سے مانگی تھی جو ابراہیم نے اپنے باپ سے کر لیا تھا، پھر ان کو جب معلوم ہو گیا کہ یہ دشمن خدا ہے تو باپ سے (مطلقاً) دست بردار ہو گئے، بیشک ابراہیم علیہ السلام البتہ بڑے نرم دل اور بردبار تھے۔"

یہ آیت ناطق ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو دنیا ہی میں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا باپ آزر حیات کے آخری لمحہ تک خدا کا دشمن ہی اور اسی پر اس کی موت ہوئی اس لیے انہوں نے دنیا ہی میں اس سے اپنی بیزاری اور بے تعلقی کا اعلان کر دیا تھا اور بتلا دیا تھا کہ

خلیل الرحمٰن کو عدو الرحمٰن کے ساتھ کسی قسم کا واسطہ نہیں ہو سکتا۔
پس اس صورت حال کے بعد روایت کا یہ مضمون کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟
حافظ ابن حجر رحمہ اللہ مسطورہ بالا دونوں جرح کو نقل کرنے کے بعد ان کا جواب اس طرح دیتے ہیں:

"حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ آزر سے اظہار بیزاری کس وقت پیش آیا؟ اس سلسلہ میں دو روایات منقول ہیں، ایک حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ابن جریر نے بسند صحیح اس طرح روایت کی ہے کہ جب آزر کا بحالت شرک و کفر انتقال ہو گیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یقین ہو گیا کہ وہ دشمن خدا ہو کر مرا لہٰذا انہوں نے آزر سے جو وعدۂ استغفار کیا تھا اب اس کو ترک کر دیا اور اس سے اظہار بیزاری کر دیا۔"

اور دوسری روایت کہ وہ بھی ابن جریر ہی نے روایت کی ہے، یہ ہے:

"ابراہیم علیہ السلام کی "تبری" (آزر سے اظہار بیزاری) کا یہ معاملہ دنیا میں نہیں قیامت کے دن پیش آئے گا اور اسی طرح پیش آئے گا جیسا کہ مسطورۂ بالا تفصیلی روایت میں مذکور ہے یعنی جب آزر مسخ کر دیا گیا تو ابراہیم علیہ السلام نے یقین کر لیا کہ اب استغفار کی قطعاً گنجائش باقی نہیں رہی۔

نقد و جرح کے اصول کو پیش نظر رکھ کر دونوں روایات کے درمیان تطبیق کی شکل یہ ہے کہ اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دنیا ہی میں آزر کی مشرکانہ موت کے پیش نظر اس سے اظہار بیزاری کر دیا تھا لیکن جب میدان حشر میں باپ کی زبوں حالت کو دیکھا تو صفت رافت و رحمت جوش میں آ گئی اور بہ تقاضائے فطرت انہوں نے پھر طلب مغفرت پر اقدام کیا مگر جب اللہ تعالیٰ نے آزر کو مسخ کر دیا تب ابراہیم اس کے انجام سے مایوس ہو گئے اور سمجھ گئے کہ اس کی مغفرت کی قطعاً کوئی صورت نہیں ہے لہٰذا دوسری مرتبہ اس دار و گیر کے دن بھی "تبری" کا اعلان فرمایا"۔ ✿ (انتہی)

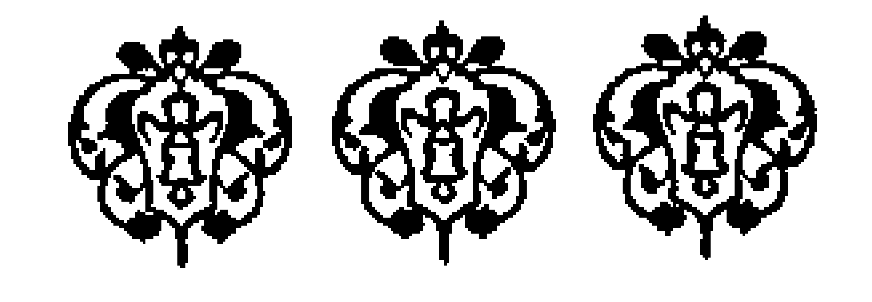
حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ قرآن عزیز نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نمایاں خصوصیات میں سے اس صفت کا بھی اعلان کیا ہے ﴿اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ ۝﴾ چنانچہ اس کے مختلف مظاہر میں سے ایک مظہر یہ بھی ہے کہ آزر کی شرک پر موت اور ابراہیم علیہ السلام کے دنیا ہی میں اس سے اظہار تبری کے باوجود کہ جس کا ذکر قرآن عزیز کی سورۂ توبہ میں موجود ہے جب وہ فردائے قیامت میں آزر کو اس زبوں حال میں دیکھیں گے۔ ﴿غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝﴾ تو ان کی رافت و رحمت جوش میں آ جائے گی اور اولوالعزم پیغمبر کی طرح حقیقت حال سے باخبر رہتے ہوئے بھی ان کی صفات کریمانہ کا اس درجہ فطری غلبہ برسر کار آ جائے گا کہ وہ آزر کے لیے طلب مغفرت پر آمادہ ہو جائیں گے اور یہ دیکھ کر کہ آزر کی مشرکانہ زندگی کا کوئی پہلو بھی ایسا نہیں ہے کہ اس کو حیلہ شفاعت بنایا جا سکے ابراہیم علیہ السلام اپنی اس دعا کی پناہ لیں گے جو دنیا ہی میں قبولیت کا شرف دوام حاصل کر چکی تھی اور باپ کی رسوائی کو اپنی رسوائی ظاہر کر کے درگاہ حق میں اس وعدہ کا ذکر کریں گے، لیکن اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں یہ فرما کر کہ "کافر پر میں نے جنت کو حرام کر دیا ہے" ابراہیم علیہ السلام کو اس جانب توجہ دلائے گا کہ اپنی اس فطری رافت و رحمت کے باوجود تم کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہ دنیائے عمل نہیں بلکہ روز جزاء ہے اور آج "میزان عدل قائم ہے جس کے لیے ہمارا یہ غیر متبدل قانون ابدیت کا

✿ جلد ۸ کتاب التفسیر

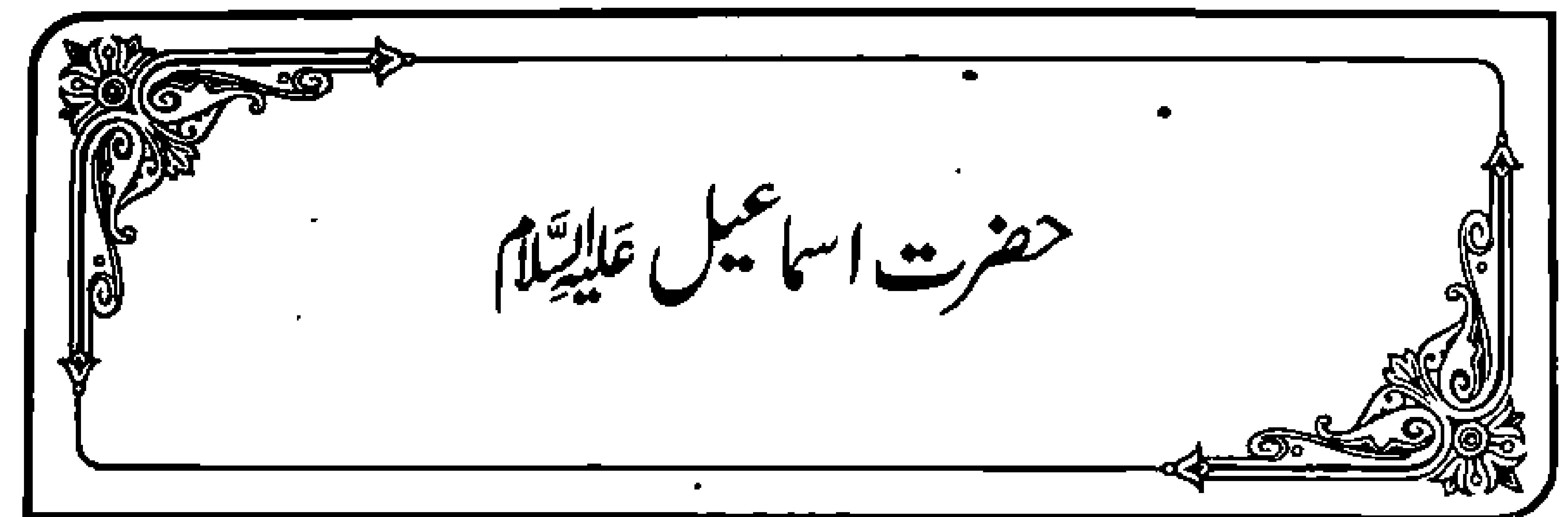
شرف حاصل کر چکا ہے کہ کافر و مشرک کے لیے جنت میں کوئی جگہ نہیں اور یہ کہ "مشرک کی رسوائی" ہرگز "مومن کی رسوائی" کا باعث نہیں ہوسکتی خواہ ان دونوں کے درمیان علاقہ دنیوی کے مضبوط رشتے ہی کیوں نہ قائم رہے ہوں، اور ساتھ ہی حکمت الٰہی ایسی صورت حال پیدا کر دے گی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حزن و ملال کا وہ اثر ہی باقی نہ رہے گا جس کی وجہ سے ان کے فطری ملکات نے طلب مغفرت پر آمادہ کیا تھا چنانچہ آزر کو درندہ کی شکل میں مسخ کر دیا جائے گا جس کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پاک اور سلیم فطرت اس کو دیکھ کر نفرت و کراہت کرنے لگے گی۔

غرض حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ سوال اس لیے نہ تھا کہ وہ العیاذ باللہ اس صورت حال کو "خلف وعد" سمجھ رہے تھے بلکہ ایک فطری تقاضے کے پیش نظر تھا جو اگرچہ نتائج و ثمرات کو تو نہیں بدل سکتا مگر اس شخصیت کے ملکات حسنہ اور اوصاف کریمانہ کے نمایاں کرنے کا باعث ضرور بن جاتا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ جواب اگرچہ اسمٰعیلی اور بعض دوسرے محدثین کے طعن و جرح کو بلاشبہ بڑی حد تک ہلکا کر دیتا ہے تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول بخاری کی مختصر حدیث کے علاوہ طویل حدیث کے بعض اجزاء ضرور محل نظر ہیں تب ہی تو غالباً حافظ حدیث عمادالدین ابن کثیر نے ان روایات کو اپنی تفسیر میں نقل کرنے کے بعد مختصر حدیث کو قبول کرتے ہوئے بخاری کی کتاب الانبیاء والی طویل حدیث پر "تفرد" کا اور نسائی کی حدیث پر "غرابت" و "نکارت" کا حکم لگایا ہے، مشہور محدث کرمانی نے بھی اس مسئلہ کو سوال و جواب کی شکل میں پیش کر کے اس کے حل کرنے کی سعی فرمائی ہے جو اپنی جگہ قابل مراجعت ہے۔[1]



[1] فتح الباری جلد ۸ کتاب الانبیاء۔



حضرت اسماعیل علیہ السلام

اسماعیل علیہ السلام کی ولادت:

حضرت ابراہیم علیہ السلام ابھی تک اولاد سے محروم تھے اور ان کے گھر کا مالک ایک خانہ زاد الیعزر دمشقی تھا، ایک روز حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں فرزند کے لیے دُعا کی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمالیا اور ان کو تسلی دی۔

"ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے خداوند خدا تو مجھ کو کیا دے گا میں تو بے اولاد ہوا جاتا ہوں اور میرے گھر کا مختار الیعزر ہے پھر ابرام نے کہا کہ تو نے مجھے فرزند نہ دیا، اور دیکھ میرا خانہ زاد میرا وارث ہوگا، ❶ تب خداوند کا کلام اس پر اترا اور اس نے کہا کہ یہ تیرا وارث نہیں ہونے کا بلکہ جو تیری صلب سے پیدا ہو وہی تیرا وارث ہوگا"۔

اور یہ دعا اس طرح قبول ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چھوٹی بی بی حضرت ہاجرہ علیہا السلام حاملہ ہوئیں۔

"اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی"۔ ❷

جب حضرت سارہ علیہا السلام کو یہ پتہ چلا تو انہیں بہ تقاضائے بشریت ہاجرہ علیہا السلام سے رشک پیدا ہو گیا اور انہوں نے حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو تنگ کرنا شروع کر دیا، حضرت ہاجرہ علیہا السلام مجبور ہو کر ان کے پاس سے چلی گئیں۔

اور خداوند کے فرشتے نے اسے میدان میں پانی کے ایک چشمہ کے پاس پایا یعنی اس چشمہ کے پاس جو صور کی راہ پر ہے اور اس نے کہا کہ اے سری کی لونڈی ہاجرہ تو کہاں سے آئی؟ اور کدھر جاتی ہے؟ وہ بولی کہ میں اپنی بی بی سری کے سامنے سے بھاگی ہوں، اور خداوند کے فرشتے نے اسے کہا کہ تو اپنی بی بی کے پاس پھر جا اور اس کے تابع رہ، پھر خداوند کے فرشتے نے اسے کہا کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے اور خداوند کے فرشتے نے اسے کہا کہ تو حاملہ ہے، اور ایک بیٹا جنے گی، اس کا نام اسماعیل رکھنا کہ خداوند نے تیرا دکھ سن لیا اور وہ وحشی (بدوی) آدمی ہوگا اور اس کا ہاتھ سب کے ہاتھ اور سب کا ہاتھ اس کے برخلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بودوباش کرے گا۔ ❸

حضرت ہاجرہ علیہا السلام جس مقام پر فرشتہ سے ہمکلام ہوئیں اس جگہ ایک کنواں تھا، ہاجرہ علیہا السلام نے یادگار کے طور پر اس کا نام "زندہ نظر آنے والے کا کنواں" رکھا، تھوڑے عرصہ کے بعد ہاجرہ علیہا السلام کا بیٹا پیدا ہوا اور فرشتہ کی بشارت کے مطابق اس کا نام اسمٰعیل رکھا گیا۔

"اور ہاجرہ (علیہا السلام) ابرام کے لیے بیٹا جنی اور ابرام نے اپنے اس بیٹے کا نام جو ہاجرہ جنی اسمٰعیل رکھا اور جب ابرام کے لیے

---

❶ تورات پیدائش باب ۱۵ آیت ۲۔۴ ❷ ایضاً باب ۱۶ آیت ۴ ❸ تورات پیدائش باب ۱۶ آیت ۷۔۱۲

ہاجرہ سے اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا۔"❶

اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کے بعد ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق علیہ السلام کی بشارت دی جیسا کہ ابھی مفصل ذکر آئے گا، مگر ابراہیم علیہ السلام نے اس بشارت پر چنداں مسرت کا اظہار نہیں کیا اور اس کی جگہ یہ دعا مانگی۔

"اور ابرام نے خدا سے کہا کہ کاش اسماعیل تیرے حضور جیتا رہے"❷ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کا یہ جواب دیا۔

"اسماعیل علیہ السلام کے حق میں میں نے تیری سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا، اور اسے برومند کروں گا، اور اس کو بہت بڑھاؤں گا، اور اس کے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا۔❸ اسماعیل "اسمع" اور "ایل" دو لفظوں سے مرکب ہے، عبرانی میں "ایل" اللہ کے مرادف ہے اور عربی کے اسمع اور عبرانی کے شماع کے معنی ہیں "سن" چونکہ اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سن لی اور ہاجرہ کو فرشتہ سے بشارت ملی اس لیے ان کا یہ نام رکھا گیا، عبرانی میں اس کا تلفظ "شماع ایل" ہے۔

وادی غیر ذی زرع اور ہاجرہ و اسماعیل علیہما السلام:

حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے بطن سے اسماعیل کا پیدا ہو جانا حضرت سارہ علیہا السلام پر بے حد شاق گذرا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی اور بڑی بیوی، قدیم سے گھر کی مالکہ ہاجرہ چھوٹی بیوی اور ان کی خدمت گذار، یہ سب باتیں تھیں جنہوں نے بشری تقاضے کے پیش نظر اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کو حضرت سارہ علیہا السلام کے لیے سوہان روح بنا دیا تھا، اس لیے سارہ علیہا السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اصرار کیا کہ ہاجرہ علیہا السلام اور اس کا بچہ اسماعیل علیہ السلام میری نگاہ کے سامنے نہ رہیں، ان کو علیحدہ کسی جگہ لے جاؤ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ اصرار بے حد ناگوار گزرا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو مطلع کیا کہ ہاجرہ، اسماعیل تیرے لیے مصلحت اسی میں ہے کہ سارہ جو کچھ کہتی ہے اس کو مان لے۔

اور سرہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو وہ ابراہیم علیہ السلام سے جنی تھی ٹھٹھے مارتا ہے تب اس نے ابراہام سے کہا کہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اسحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا، پھر اپنے بیٹے کی خاطر یہ بات ابراہیم علیہ السلام کی نظر میں نہایت بری معلوم ہوئی خدا نے ابراہام سے کہا کہ وہ بات اس لڑکے اور تیری لونڈی کی بابت تیری نظر میں بری نہ معلوم ہو، ہر ایک بات کے حق میں جو سرہ نے تجھے کہی اس کی آواز پر کان رکھ، کیونکہ تیری نسل اضحاق سے کہلائے گی، اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی ایک قوم پیدا کروں گا، اس لیے کہ وہ تیری نسل ہے۔❹

تورات کی اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہو چکے تھے، اس لحاظ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام سن رشد کو پہنچ چکے ہوں گے کیونکہ تورات کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام سے تیرہ سال بڑے ہیں۔

---

❶ ایضاً باب ۱۶ آیت ۱۵، ۱۶ ❷ ایضاً باب ۱۷ آیت ۱۸ ❸ ایضاً باب ۱۷ آیت ۲۰
❹ تورات پیدائش ۲۱ آیت ۹، ۱۳

لیکن اسی واقعہ میں تورات کی دوسری آیات مسطورۂ بالا آیات کے خلاف یہ کہتی ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ابھی شیر خواہ بچہ تھے۔

"تب ابراہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہ کو اس کے کاندھے پر دھر کر دی اور اس کے لڑکے کو بھی اور اسے رخصت کیا، وہ روانہ ہوئی اور بیرسبع کے بیابان میں بھٹکتی پھرتی تھی، اور جب مشک کا پانی چک گیا تب اس نے اس لڑکے کو ایک پہاڑی کے نیچے ڈال دیا اور آپ اس کے سامنے ایک پتھر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی کیونکہ اس نے کہا کہ میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں۔" [1]

اس لیے تورات کے ان مخالف و متضاد بیانات کے مقابلہ میں صحیح قول یہ ہے کہ ہاجرہ و اسماعیل علیہما السلام کے خروج کے وقت اسماعیل علیہ السلام شیر خوار بچہ تھے اور اسحاق علیہ السلام ابھی تک پیدا نہیں ہوئے تھے۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت منقول ہے وہ بھی اسی قول کی تائید کرتی ہے، اس روایت کا مضمون یہ ہے:

"ابراہیم، ہاجرہ اور اس کے شیر خوار بچہ اسماعیل علیہ السلام کو لے کر چلے اور جہاں آج کعبہ ہے اس جگہ ایک بڑے درخت کے نیچے زمزم کے موجودہ مقام سے بالائی حصہ پر ان کو چھوڑ گئے، وہ جگہ ویران اور غیر آباد تھی اور پانی کا بھی نام و نشان نہ تھا، اس لیے ابراہیم علیہ السلام نے ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلی کھجور بھی ان کے پاس چھوڑ دیں اور پھر منہ پھیر کر روانہ ہو گئے، ہاجرہ علیہا السلام ان کے پیچھے پیچھے یہ کہتی ہوئی چلیں اے ابراہیم! تم ہم کو ایسی وادی میں کہاں چھوڑ کر چل دیئے جہاں نہ آدمی ہے نہ آدم زاد اور نہ کوئی مونس و غمخوار، ہاجرہ برابر یہ کہتی جاتی تھیں مگر ابراہیم علیہ السلام خاموش چلے جارہے تھے آخر ہاجرہ علیہا السلام نے دریافت کیا، کیا تیرے خدا نے تجھ کو یہ حکم دیا ہے؟ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا "ہاں، یہ خدا کے حکم سے ہے" ہاجرہ علیہا السلام نے جب یہ سنا تو کہنے لگیں، اگر یہ خدا کا حکم ہے تو بلاشبہ وہ ہم کو ضائع اور برباد نہیں کرے گا، اور پھر واپس لوٹ آئیں، ابراہیم علیہ السلام چلتے چلتے جب ایک ٹیلہ پر ایسی جگہ پہنچے کہ ان کے اہل و عیال نگاہ سے اوجھل ہو گئے تو اس جانب جہاں کعبہ ہے رخ کیا اور ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی:

﴿رَبَّنَآ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـِٕدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ وَ ارۡزُقۡہُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۳۷﴾﴾ (ابراھیم:۳۷)

"اے ہم سب کے پروردگار! (تو دیکھ رہا ہے کہ) ایک ایسے میدان میں جہاں کھیتی کا نام و نشان نہیں، میں نے اپنی بعض اولاد تیرے محترم گھر کے پاس لا کر بسائی ہے کہ نماز قائم رکھیں (تاکہ یہ محترم گھر عبادت گزارانِ توحید سے خالی نہ رہے) پس تو (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں اور ان کے لیے زمین کی پیداوار سے سامان رزق مہیا کر دے تاکہ تیرے شکر گزار رہوں۔"

ہاجرہ چند روز تک مشکیزہ سے پانی اور خورجی سے کھجوریں کھاتی اور اسماعیل علیہ السلام کو دودھ پلاتی رہیں، لیکن وہ وقت بھی آ گیا کہ پانی رہا نہ کھجوریں تب وہ سخت پریشان ہوئیں، چونکہ وہ بھوکی پیاسی تھیں اس لیے دودھ بھی نہ اترتا تھا اور بچہ بھی بھوکا پیاسا رہا،

[1] ایضاً پیدائش ۲۱ آیت ۱۴، ۱۶

جب حالت دگرگوں ہونے لگی اور بچہ بیتاب ہونے لگا تو ہاجرہ، اسماعیل علیہ السلام کو چھوڑ کر دور جا بیٹھیں تا کہ اس حالت زار میں اس کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں، کچھ سوچ کر قریب کی پہاڑی صفا پر چڑھیں کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ نظر آ جائے یا پانی نظر آ جائے مگر کچھ نظر نہ آیا، پھر بچہ کی محبت میں دوڑ کر وادی میں آ گئیں، اس کے بعد دوسری جانب کی پہاڑی مروہ پر چڑھ گئیں، اور وہاں بھی جب کچھ نظر نہ آیا تو پھر تیزی سے لوٹ کر وادی میں بچہ کے پاس آ گئیں، اور اس طرح سات مرتبہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر پہنچ کر فرمایا کہ یہی وہ "سعی بین الصفا والمروہ" ہے جو حج میں لوگ کرتے ہیں، آخر میں جب وہ مروہ پر تھیں تو کانوں میں ایک آواز آئی، چونکیں اور دل میں کہنے لگیں کہ کوئی پکارتا ہے کان لگایا تو پھر آواز آئی، ہاجرہ کہنے لگیں اگر تم مدد کر سکتے ہو تو سامنے آؤ تمہاری آواز سن گئی، دیکھا تو خدا کا فرشتہ (جبریل علیہ السلام) ہے، فرشتہ نے اپنا پیر (یا ایڑی) اس جگہ مارا جہاں زمزم ہے، اس جگہ سے پانی اُبلنے لگا، ہاجرہ علیہا السلام نے یہ دیکھا تو پانی کے چاروں طرف باڑ بنانے لگیں مگر پانی برابر اُبلتا رہا، اس جگہ پہنچ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ اُم اسماعیل پر رحم کرے، اگر وہ زمزم کو اس طرح نہ روکتیں اور اس کے چار جانب باڑھ نہ لگاتیں تو آج وہ زبردست چشمہ ہوتا۔

ہاجرہ علیہا السلام نے پانی پیا اور پھر اسماعیل علیہ السلام کو دودھ پلایا، فرشتہ نے ہاجرہ سے کہا خوف اور غم نہ کر، اللہ تعالیٰ تجھ کو اور اس بچہ کو ضائع نہ کرے گا۔ یہ مقام "بیت اللہ" ہے جس کی تعمیر اس بچہ (اسماعیل علیہ السلام) اور اس کے باپ ابراہیم علیہ السلام کی قسمت میں مقدر ہو چکی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اس خاندان کو ہلاک نہیں کرے گا، بیت اللہ کی یہ جگہ قریب کی زمین سے نمایاں تھی مگر پانی کا سیلاب داہنے بائیں اس حصہ کو برابر کرتا جا رہا تھا، اسی دوران میں ہی بنی جرہم کا ایک قبیلہ اس وادی کے قریب آ کر ٹھہرا، دیکھا تو تھوڑے سے فاصلہ پر پرند اُڑ رہے ہیں، جرہم نے کہا یہ پانی کی علامت ہے، وہاں ضرور پانی موجود ہے، جرہم نے بھی قیام کی اجازت مانگی، ہاجرہ علیہا السلام نے فرمایا قیام کر سکتے ہو، لیکن پانی میں ملکیت کے حصہ دار نہیں ہو سکتے، جرہم نے یہ بات بخوشی منظور کر لی اور وہیں مقیم ہو گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاجرہ علیہا السلام خود بھی باہمی انس و رفاقت کے لیے یہ چاہتی تھیں کہ کوئی یہاں آ کر مقیم ہو، اس لیے انہوں نے مسرت کے ساتھ بنی جرہم کو قیام کی اجازت دے دی۔ جرہم نے آدمی بھیج کر اپنے باقی ماندہ اہل خاندان کو بھی بلا لیا اور یہاں مکانات بنا کر رہنے سہنے لگے، ان ہی میں اسماعیل علیہ السلام بھی رہتے اور کھیلتے اور ان سے ان کی زبان سیکھتے، جب اسماعیل علیہ السلام بڑے ہو گئے تو ان کا طرز و انداز اور ان کی خوبصورتی بنی جرہم کو بہت بھائی اور انہوں نے اپنے خاندان کی لڑکی سے ان کی شادی کر دی، اس کے کچھ عرصہ کے بعد ہاجرہ علیہا السلام کا انتقال ہو گیا، ابراہیم علیہ السلام برابر اپنے اہل و عیال کو دیکھنے آتے رہتے تھے، ایک مرتبہ تشریف لائے تو اسماعیل علیہ السلام گھر پر نہ تھے ان کی اہلیہ سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ روزی کی تلاش میں باہر گئے ہیں ابراہیم علیہ السلام نے دریافت کیا، گذران کی کیا حالت ہے؟ وہ کہنے لگی، سخت مصیبت و پریشانی میں ہیں اور سخت دکھ و تکلیف میں، ابراہیم علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا اسماعیل سے میرا سلام کہہ دینا اور کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ تبدیل کر دو، اسماعیل علیہ السلام واپس آئے تو ابراہیم علیہ السلام کے نور نبوت کے اثرات پائے، پوچھا کہ کوئی شخص یہاں آیا تھا، بی بی نے سارا قصہ سنایا اور پیغام بھی، اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کا یہ مشورہ ہے کہ میں تجھ کو طلاق دے دوں، لہٰذا میں تجھ کو جدا کرتا ہوں۔

اسماعیل علیہ السلام نے پھر دوسری شادی کر لی، ایک مرتبہ ابراہیم علیہ السلام پھر اسماعیل علیہ السلام کی غیبت میں آئے اور اسی طرح ان کی بیوی سے سوالات کیے، بی بی نے کہا خدا کا شکر و احسان ہے، اچھی طرح گذر رہی ہے، دریافت کیا کھانے کو کیا ملتا ہے؟ اسماعیل علیہ السلام

کی بی بی نے جواب دیا، گوشت، ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا اور پینے کو؟ اس نے جواب دیا، پانی، تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی:
"اللہ تعالیٰ ان کے گوشت اور پانی میں برکت عطا فرما"۔

اور چلتے ہوئے پیغام دے گئے کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ کو محفوظ رکھنا، حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو ان کی بی بی نے تمام واقعہ دہرایا اور پیغام بھی سنایا، اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کا پیغام یہ ہے کہ تو میری زندگی بھر رفیقۂ حیات رہے۔ (الخ)

یہ طویل روایت بخاری کتاب الرویاء اور کتاب الانبیاء میں دو جگہ منقول ہے اور دونوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کی سرزمین) یعنی مکہ میں بحالت شیر خوارگی پہنچے تھے۔

مگر سید سلیمان ندوی، ارض القرآن میں تورات کی روایت کی تردید یا تصحیح کرتے ہوئے یہ تحریر فرماتے ہیں کہ اسماعیل علیہ السلام اس وقت سن رشد کو پہنچ چکے تھے، اور قرآن کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں:

﴿رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ ھٰذَا لَهُوَ الْبَلٰۗؤُا الْمُبِيْنُ ۝ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓي اِسْحٰقَ ۭ﴾ (الصافات: ۱۰۰-۱۱۳)

"اے پروردگار! عطا کر مجھ کو نیک لڑکا پس بشارت دی ہم نے اس کو بردبار لڑکے کی پھر جب پہنچا وہ اس سن کو کہ باپ کے ساتھ دوڑے، تو باپ نے کہا، میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ دیکھو تم کیا سمجھتے ہو بیٹے نے کہا، میرے باپ جو حکم کیا گیا ہے کر گزرو، مجھے صابر پاؤ گے۔ اور ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اسحاق (علیہ السلام) کی بشارت دی جو نبی ہوگا، اور نیکوکاروں میں سے ہوگا اور اس پر اور اسحاق (علیہ السلام) پر برکت نازل کی۔"

﴿رَبَّنَآ اِنِّىْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ﴾ (ابراھیم: ۳۷)

"اے ہمارے پروردگار! میں نے بسا دیا ہے اپنی اولاد میں سے بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے محترم گھر کے پاس۔"

(اور آخر میں ہے)

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَي الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ﴾ (ابراھیم: ۳۹)

"سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے بخشا مجھ کو بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق (علیہما السلام) کو۔"

وجہ استدلال یہ ہے کہ صافات کی پہلی آیت میں ﴿بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ﴾ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام سن رشد تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ رہے اور آخر کی آیت بتاتی ہے کہ اسحاق علیہ السلام اس وقت پیدا ہو چکے تھے اور اسماعیل علیہ السلام اسحاق علیہ السلام سے تیرہ سال بڑے تھے۔

اور سورۂ ابراہیم کی آیتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام جب مکہ میں لائے گئے ہیں تو وہ سن رشد کو پہنچ چکے تھے تب ہی تو ابراہیم علیہ السلام نے دعا میں دونوں کا ذکر فرمایا ہے۔

اس استدلال کے بعد سید صاحب بخاری کی روایت کو ابن عباس رضی اللہ عنہما پر موقوف اور اسرائیلیات سے قرار دیتے ہیں، مگر سید صاحب کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے، اور نہ ان کی پیش کردہ آیات سے اس کی تائید نکلتی ہے۔

اول: اس لیے کہ صافات میں ﴿بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ﴾ کا یہ مطلب لینا کہ اسماعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زیر سایہ فلسطین ہی میں پرورش پاتے رہے، تب صحیح ہو سکتا تھا کہ اس جملہ کے بعد آیت میں کوئی دوسرا جملہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مکے پہنچنے کے متعلق مذکور ہوتا تا کہ ذبح اسماعیل علیہ السلام کے واقعہ کے ساتھ صحیح جوڑ لگ سکتا، کیونکہ اس پر تمام علماء اسلام کا اتفاق ہے اور سید صاحب بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ذبح اسماعیل علیہ السلام کا واقعہ مکہ کی زندگی سے وابستہ ہے، اور آیت یہ کہتی ہے کہ ”جب اسماعیل علیہ السلام سن رشد کو پہنچے تو ان کے باپ نے ان سے اپنا خواب بیان کیا“ پس سید صاحب کی توجیہ کے مطابق اس آیت میں سخت ابہام ہے، حالانکہ قرآن عزیز کے طرز خطابت اور اصول بیان کے یہ قطعاً خلاف ہے کہ ایک آیت کے اندر اس طرح کا ابہام پیدا کر دے جس سے دو اہم زندگیوں کے درمیان کوئی ربط قائم نہ رہ سکے۔

دوم: اس لیے کہ صافات میں اسماعیل علیہ السلام سے متعلق جس واقعہ کا ذکر ہے، وہ ”ذبح عظیم“ کا تذکرہ ہے نہ کہ مکہ پہنچنے کا اور وہ بلا شبہ اسماعیل علیہ السلام کے سن رشد کا زمانہ ہے اور اسحاق علیہ السلام اس وقت پیدا ہو چکے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اگرچہ ہاجرہ اور اسماعیل علیہما السلام کو مکہ کے بیابان وصحراء میں چھوڑ آئے تھے لیکن باپ تھے، نبی و پیغمبر تھے، اہلیہ اور بیٹے کو کیسے بھول سکتے، اور ان کی نگہداشت سے کیسے بے پرواہ ہو سکتے تھے، وہ برابر اس بے آب و گیاہ صحراء میں آتے رہتے اور اپنے خاندان کی نگرانی کرتے رہتے تھے اور آیت ﴿بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ﴾ سے یہی مراد ہے۔ لہٰذا اسحاق علیہ السلام کی بشارت کا ذکر بالکل برمحل ہے، خود سید صاحب تورات کے ایک فقرہ کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”تورات میں یہ مذکور نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ساتھ آئے تھے لیکن کون شقی ہوگا جو اپنے نرینہ بچہ کو جس کی پیدائش کی اس نے خود دعا کی ہو، جس کے لیے زندگی اس نے خدا سے مانگی ہو، اس کو تنہا بے آب و گیاہ مقام میں ہمیشہ کے لیے جانے دے۔“[1]

اسی طرح سورہ ابراہیم کی آیت میں ﴿عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ﴾ کے بعد یہ جملہ ہے۔

﴿رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ﴾ (ابراھیم: ۳۷)

[1] ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۷

"اے ہمارے پروردگار! (میں نے کعبہ کے پاس ان کو اس لیے بسایا) تا کہ یہ نماز کو قائم کریں پس تو لوگوں کو ان کی طرف پھیر دے۔"

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا بیت اللہ کی تعمیر کے بعد سے متعلق ہے اور آیت کا سیاق وسباق صاف صاف اسی پر دلالت کرتا ہے، اس میں قیام صلوٰۃ کا ذکر ہے، اس میں حج کی طرف اشارہ ہے اور اس میں یہاں کے بسنے والوں کے لیے رزق کی وسعت کی تمنا جھلکتی ہے اور یہ سب باتیں جب ہی موزوں ہوسکتی ہیں کہ بیت اللہ اپنی تعمیر کے ساتھ موجود ہو، البتہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں بھی اس دُعا کا ذکر آتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خاندان کو یہاں چھوڑتے وقت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا مانگی تھی وہ اسی کے قریب قریب تھی، اس لیے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں اس آیت کو بطور استشہاد نقل کر دیا گیا ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ بعینہٖ یہی وہ دعا ہے جو اس وقت انہوں نے مانگی تھی اور اس میں اسحاق علیہ السلام کا بھی ذکر تھا، جب ابن عباس رضی اللہ عنہما خود روایت کر رہے ہیں کہ یہ واقعہ اسماعیل علیہ السلام کی شیر خوارگی کا ہے تو وہ کس طرح کہہ سکتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت ایسی دعا مانگی کہ جس کے آخر میں اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ اسحاق علیہ السلام کی ولادت کا بھی ذکر تھا۔

سوم: اس بن کھیتی کی سرزمین (مکہ) کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ میں شور پانی کے سوائے شیریں پانی کا نام ونشان نہیں ہے اور آج بھی آلات جدیدہ کی اعانت کے باوجود اس زمین سے شیریں پانی کا اخراج ناممکن بنا ہوا ہے تو "زمزم" کا وجود یہاں کیسے ہوا؟ یہ مذہبی اور تاریخی دونوں حیثیت سے اہم سوال ہے، سو اس کے متعلق اگرچہ آیات قرآنی کوئی تصریح نہیں کرتیں، مگر بخاری کی یہی ابن عباس رضی اللہ عنہما والی ہر دو روایات اس کے وجود کی تاریخ بیان کرتی ہیں۔ جس میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو شیر خوار ظاہر کیا گیا ہے، اور تورات میں بھی جس طرح اس کا ذکر ہے وہ ان ہی آیات میں ہے جو اسماعیل علیہ السلام کو شیر خوار ظاہر کرتی ہیں۔

بہرحال اگرچہ قرآن عزیز کی کسی آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسماعیل علیہ السلام اس سرزمین (مکہ) میں کس سن میں پہنچائے گئے اگر بخاری کی روایات کہتی ہیں کہ یہ زمانہ اسماعیل علیہ السلام کی شیر خوارگی کا تھا۔ اور یہی صحیح ہے، پس ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت اسرائیلیات میں سے نہیں ہے بلکہ زبان وحی ترجمان کے بیان کردہ تفصیلات کی صحیح ترجمانی ہے۔

قرآن عزیز نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے متعلق ان کا نام لے کر صاف صاف کوئی ذکر نہیں کیا، البتہ بغیر نام لیے ہوئے ان کی ولادت کی بشارت کا تذکرہ موجود ہے۔

ابراہیم علیہ السلام ابھی تک اولاد سے محروم ہیں اس لیے درگاہِ الٰہی میں ایک نیک اور صالح فرزند کے لیے دعا مانگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشتا، اور ولادت فرزند کی بشارت دیتا ہے۔

﴿رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝﴾ (الصافات: ۱۰۰۔۱۰۱)

"اے پروردگار مجھ کو ایک نیکوکار لڑکا عطا کر، پس ہم نے اس کو ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی۔"

یہ "غلام حلیم" کون ہے؟ وہی اسماعیل علیہ السلام جو ہاجرہ علیہا السلام کے بطن سے پیدا ہوا، اس لیے کہ قرآن عزیز کی اس آیت سے دوسری آیت کے بعد حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت کا ذکر ہے۔

﴿وَ بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَ بٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَ عَلٰٓى اِسْحٰقَ﴾ (الصافات: ۱۱۲۔۱۱۳)

"اور بشارت دی ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اسحاق (علیہ السلام) کی جو نیکوکاروں میں سے ہوگا نبی ہوگا، اور برکت دی ہم نے اس پر اور اسحاق (علیہ السلام) پر۔"

پس جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ابھی دو بیٹے تھے اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام اور تورات و تاریخ کی متفقہ نقول کے پیش نظر اسماعیل علیہ السلام بڑے ہیں اور اسحاق علیہ السلام چھوٹے تو صاف ظاہر ہے کہ صافات کی پہلی آیت میں جس لڑکے کی بشارت مذکور ہے اس سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے علاوہ دوسرا کون مراد ہوسکتا ہے؟

اور جب ابراہیم علیہ السلام نے ہاجرہ و اسماعیل علیہما السلام کو مکہ میں آباد کیا تھا تو ان کے لیے دعا کرتے ہوئے اس طرح اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ﴾ (ابراہیم: ۳۹)

"تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق (علیہما السلام) عطاء کیے۔"

یہ آیت بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ الصافات کی آیت میں جس بشارت کا ذکر ہے اس سے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی مراد ہیں۔

ختنہ:

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ننانوے سال ہوئی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تیرہ سال تو اللہ تعالیٰ کا حکم آیا کہ ختنہ کرو، ابراہیم علیہ السلام نے تعمیل حکم میں پہلے اپنی ختنہ کیں۔ اور اس کے بعد اسماعیل علیہ السلام اور تمام خانہ زادوں اور غلاموں کی ختنہ کرائیں۔

"تب ابراہام نے اپنے بیٹے اسماعیل اور سب خانہ زادوں اور اپنے سب زرخریدوں کو یعنی ابراہام کے گھر کے لوگوں میں جتنے مرد تھے سب کو لیا، اور اسی روز ان کا ختنہ کیا جس طرح خدا نے اس کو فرمایا تھا جس وقت ابراہام کا ختنہ ہوا وہ ننانوے برس کا تھا اور جس اس کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کا ختنہ ہوا وہ تیرہ برس کا تھا۔" [1]

یہی رسم ختنہ آج بھی "ملت ابراہیمی" کا شعار ہے اور سنت ابراہیمی کے نام سے مشہور ہے۔

تاریخ عظیم:

مقربین بارگاہ الٰہی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ وہ نہیں ہوتا جو عام انسانوں کے ساتھ ہے، ان کو امتحان و آزمائش کی سخت سے سخت منزلوں سے گزرنا پڑتا، اور قدم قدم پر جاں سپاری اور تسلیم و رضا کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہم گروہ انبیاء اپنے مراتب کے اعتبار سے امتحان کی صعوبتوں میں ڈالے جاتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام بھی چونکہ جلیل القدر نبی اور پیغمبر تھے اس لیے ان کو بھی مختلف آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا، اور اپنی جلالت

[1] پیدائش باب ۱۷ آیات ۲۳۔۲۵

قدر کے لحاظ سے ہر دفعہ امتحان میں کامل و مکمل ثابت ہوئے۔

جب ان کو آگ میں ڈالا گیا تو اس وقت جس صبر اور رضاء بہ قضاء الٰہی کا انہوں نے ثبوت دیا۔ اور جس عزم و استقامت کو، پیش کیا وہ انہی کا حصہ تھا، اس کے بعد جب اسماعیل اور ہاجرہ علیہما السلام کو فاران کے بیابان میں چھوڑ آنے کا حکم ملا تو وہ بھی معمولی امتحان نہ تھا، آزمائش اور سخت آزمائش کا وقت تھا۔ بڑھاپے اور پیری کی تمناؤں کے مرکز، راتوں اور دنوں کی دعاؤں کے ثمر اور گھر کے چشم و چراغ اسماعیل علیہ السلام کو صرف حکم الٰہی کی تعمیل و امتثال میں ایک بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑتے ہیں اور پیچھے پھر کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شفقت پدری جوش میں آ جائے اور امتثال امر الٰہی میں کوئی لغزش ہو جائے۔

ان دونوں کٹھن منزلوں کو عبور کرنے کے بعد اب ایک تیسرے امتحان کی تیاری ہے، جو پہلے دونوں سے بھی زیادہ زہرہ گداز اور جاں گسل امتحان ہے، یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام تین شب مسلسل خواب دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے ابراہیم! تو ہماری راہ میں اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دے۔

انبیاء (علیہم السلام) کا خواب "رویاء صادقہ" اور وحی الٰہی ہوتا ہے اس لیے ابراہیم علیہ السلام رضاء و تسلیم کا پیکر بن کر تیار ہو گئے کہ خدا کے حکم کی جلد سے جلد تعمیل کریں، مگر چونکہ یہ معاملہ تنہا اپنی ذات سے وابستہ نہ تھا بلکہ اس آزمائش کا دوسرا جزو وہ "بیٹا" تھا جس کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا، اس لیے باپ نے بیٹے کو اپنا خواب اور خدا کا حکم سنایا، بیٹا ابراہیم علیہ السلام جیسے مجدد انبیاء و رسل کا بیٹا تھا فوراً سر تسلیم خم کر دیا اور کہنے لگا کہ اگر خدا کی یہی مرضی ہے تو انشاء اللہ آپ مجھ کو صابر پائیں گے، اس گفتگو کے بعد باپ بیٹے اپنی قربانی پیش کرنے کے لیے جنگل روانہ ہو گئے باپ نے بیٹے کی مرضی پا کر مذبوح جانور کی طرح ہاتھ پیر باندھے، چھری کو تیز کیا اور بیٹے کو پیشانی کے بل بچھاڑ کر ذبح کرنے لگے، فوراً خدا کی وحی ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوئی، اے ابراہیم (علیہ السلام)! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھلایا، بیشک یہ بہت سخت اور کٹھن آزمائش تھی، اب لڑکے کو چھوڑ اور تیرے پاس جو یہ مینڈھا کھڑا ہے اس کو بیٹے کے بدلے میں ذبح کر، ہم نیکوکاروں کو اسی طرح نوازا کرتے ہیں، ابراہیم علیہ السلام نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جھاڑی کے قریب ایک مینڈھا کھڑا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اس مینڈھے کو ذبح کیا۔

یہی وہ "قربانی" ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسی مقبول ہوئی کہ بطور یادگار کے ہمیشہ کے لیے ملت ابراہیمی کا شعار قرار پائی اور آج بھی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو تمام دنیائے اسلام میں یہ "شعار" اسی طرح منایا جاتا ہے۔

مگر اس پورے واقعہ سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے "ذبیح" کون ہے۔ اسماعیل علیہ السلام یا اسحاق علیہ السلام؟ قرآن عزیز نے اگرچہ "ذبیح" کا نام نہیں لیا مگر جس طرح اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے اس سے بغیر کسی کنج وکاؤ کے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نص قرآنی اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح بتاتی ہے اور یہی واقعہ اور حقیقت ہے۔ سورہ الصافات میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ

مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ۞ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ ۞ وَ نَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۞ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۞ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ۞ وَ فَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ۞ وَ تَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ۞ سَلٰمٌ عَلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ ۞ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۞ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ۞ وَ بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۞ وَ بٰرَكْنَا عَلَیْهِ وَ عَلٰۤی اِسْحٰقَ ﴾ (الصافات: ۱۰۰-۱۱۳)

"اے پروردگار! مجھ کو ایک نیکوکار لڑکا عطا کر، پس بشارت دی ہم نے ان کو بردبار لڑکے کی، پھر جب وہ اس سن کو پہنچا کہ باپ کے ساتھ دوڑنے لگے، ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا اے میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں پس تو دیکھ کیا سمجھتا ہے؟ کہا "اے میرے باپ! جس بات کا تجھے حکم کیا گیا ہے وہ کر، اگر اللہ نے چاہا تو مجھ کو صبر کرنے والوں میں سے پائے گا۔ پس جب ان دونوں نے رضاء و تسلیم کو اختیار کر لیا اور پیشانی کے بل اس (بیٹے) کو پچھاڑ دیا، ہم نے اس کو پکارا، اے ابراہیم! تو نے خواب سچ کر دکھایا، بیشک ہم اسی طرح نیکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں، بلاشبہ یہ کھلی ہوئی آزمائش ہے، اور بدلہ دیا ہم نے اس کو بڑے ذبح (مینڈھے) کے ساتھ، اور ہم نے آنے والی نسلوں میں اس کے متعلق یہ باقی چھوڑا کہ ابراہیم پر سلام ہو، اس طرح ہم نیکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں، بیشک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے ہے۔ اور بشارت دی ہم نے اس کو اسحاق (علیہ السلام) کی جو نبی ہوگا اور نیکوکاروں میں سے ہوگا، اور برکت دی ہم نے اس پر اور اسحاق پر۔"

ان آیات میں ابراہیم علیہ السلام کے دو صاحبزادوں کی بشارت کا ذکر ہے پہلے لڑکے کا نام نہیں لیا اور "غلام حلیم" کہہ کر اس کے ذبح عظیم کے واقعہ کا تذکرہ کیا اور اس کے بعد دوسرے لڑکے کی بشارت کا ذکر نام لے کر کیا ﴿ بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ ﴾ اور یہ طے شدہ امر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے دونوں صاحبزادوں اسماعیل و اسحاق علیہما السلام میں سے اسماعیل علیہ السلام کے علاوہ کس کا ذکر ہو سکتا ہے؟ بلاشبہ وہ اسماعیل علیہ السلام ہی ہیں جنہوں نے ﴿ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ﴾ کہہ کر اور ﴿ وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ ﴾ کا مظاہرہ کر کے ﴿ وَ فَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ﴾ کا اعزاز حاصل کیا، علاوہ ازیں صرف قرآن عزیز ہی اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح نہیں کہتا بلکہ تورات کی عبارت کو اگر غور سے مطالعہ کیجئے تو وہ بھی یہی بتاتی ہے کہ اسماعیل علیہ السلام اور صرف اسماعیل علیہ السلام ہی ذبیح ہیں۔

"ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابراہام کو آزمایا اور اسے کہا کہ تو اپنے بیٹے ہاں اپنے اکلوتے بیٹے جس کو تو پیار کرتا ہے "اضحٰق کو لے" اور زمین موریا میں جا اور اسے وہاں پہاڑوں میں سے ایک جو میں تجھے بتاؤں گا، سوختنی قربانی کے لیے چڑھا۔" [1]

"تب خداوند کے فرشتے نے دوبارہ آسمان پر سے ابراہام کو پکارا اور کہا کہ...... خداوند فرماتا ہے اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا "اپنا اکلوتا ہی بیٹا" دریغ نہ رکھا، میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا۔" [2]

---

[1] تورات پیدائش باب ۲۲ آیت ۱-۲

[2] باب ۲۲ آیت ۱۵-۱۶

تورات کی ان ہر دو عبارات کے نشان زدہ فقروں "اپنے اکلوتے بیٹے" اور "اپنا اکلوتا ہی بیٹا" کو دیکھئے اور پھر تورات کی ان گذشتہ آیات کو پڑھئے کہ جس میں اسماعیل علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اکلوتا بیٹا بتایا گیا ہے کیونکہ اسماعیل علیہ السلام جب چودہ برس کے ہو چکے ہیں تب اسحاق علیہ السلام کی ولادت ہوئی ہے، کیا ان سے یہ صاف طور پر واضح نہیں ہوتا کہ "ذبیح" جیسے اعزاز کو بنی اسرائیل کے ساتھ وابستہ کرنے کی یہ غلط حرص تھی جس نے یہود کو اس تحریف پر آمادہ کیا کہ انہوں نے اس عبارت میں "اکلوتے بیٹے" کے فقرے کے ساتھ "اسحاق" علیہ السلام کا نام بے محل جوڑ دیا؟ پس یہ اضافہ تورات کی تصریحات کے بھی خلاف ہے اور نص قرآنی کے بھی اور واقعہ و حقیقت کے بھی قطعاً خلاف ہے۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ "ذبیح اللہ" کا عظیم الشان شرف اسماعیل علیہ السلام ہی کے لیے مقسوم تھا۔

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝﴾ (الجمعة : ٤)

"یہ اللہ کا فضل ہے جس کو وہ چاہے اس کو دے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔"

سخت تعجب ہے کہ چند علمائے اسلام بھی اس غلطی میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ "ذبیح" اسماعیل علیہ السلام نہ تھے، اسحاق علیہ السلام تھے اور جو دلائل انہوں نے اس سلسلہ میں بیان کیے ہیں افسوس کہ ہم ان سے متفق نہیں ہو سکتے، کیوں کہ ان کی بنیاد و اساس محض وہم وظن پر قائم ہے نہ کہ یقین کی روشنی پر۔ مثلاً ان کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ "والصافات" کی مسطورۂ بالا آیات میں سے پہلی آیت ﴿فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ﴾ میں کوئی نام مذکور نہیں ہے اور اس کے بعد کی آیات میں اس کے ذبح سے متعلق ذکر کرتے ہوئے فرمایا ﴿بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ﴾ تو کیا "غلام حلیم" بھی یہی اسحاق نہیں ہیں؟ مگر آپ خود اندازہ کیجئے کہ یہ کس قدر غلط استدلال ہے، اول ان آیات کے سیاق وسباق کا مطالعہ کیجئے اور پھر غور کیجئے کہ ﴿فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ﴾ کے بعد ﴿بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ﴾ کو عطف کے ذریعہ جس طرح جدا کیا گیا ہے عربی اصول نحو کے مطابق کون سی گنجائش ہے کہ ان دونوں کو ایک ہی شخصیت قرار دیا جائے خصوصاً جب کہ دونوں کی بشارت کے ذکر کے ساتھ ساتھ جدا جدا ان کے اوصاف بھی بیان کیے گئے ہیں۔

صاحب قصص الانبیاء عبدالوہاب نجار نے اس موقعہ پر آیت ﴿وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓي اِسْحٰقَ﴾ میں علیہ کی ضمیر "ذبیح" کی جانب راجع کی ہے اور یہ ترجمہ کیا ہے "ہم نے برکت نازل کی اس "ذبیح" پر اور اسحاق علیہ السلام پر اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ پورا قصہ بیان کرنے کے بعد اسحاق علیہ السلام کی بشارت کا ذکر اس بات کے لیے "نص" ہے کہ صاحب قصہ لڑکا اسحاق کے علاوہ ہے اور وہ صرف اسماعیل علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ واقعہ مکہ کے قریب منیٰ میں پیش آیا ہے اور تورات کا جملہ "اکلوتا بیٹا" اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ ابھی تک حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت بھی نہیں ہوئی لہٰذا تورات کا اس واقعہ کو موریا کے قریب بتانا اسی قسم کی تحریف ہے جس سے تورات کا کوئی باب خالی نہیں اور جس کا انکار بداہت کا انکار ہے۔[1]

یہ مسئلہ اگرچہ بہت زیادہ تفصیل طلب ہے لیکن ہم نے صرف ضروری امور کے بیان کر دینے پر اکتفاء کیا ہے۔[2]

---

[1] تحریف کے لئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ کی کتاب "اظہار الحق" قابل مطالعہ ہے۔

[2] اس مسئلہ پر مولانا عبدالحمید صاحب فراہی مرحوم کا رسالہ "الرائے الصحیح فی من ھو الذبیح" بہترین معلومات کا حامل ہے۔

بناء کعبہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام اگرچہ فلسطین میں مقیم تھے مگر برابر مکہ میں ہاجرہ و اسماعیل علیہما السلام کو دیکھنے آتے رہتے تھے، اسی اثناء میں ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ "کعبۃ اللہ" کی تعمیر کرو، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے تذکرہ کیا اور دونوں باپ بیٹوں نے "بیت اللہ" کی تعمیر شروع کر دی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری * میں ایک روایت نقل کی ہے، جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ بیت اللہ کی سب سے پہلی اساس حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں رکھی گئی اور ملائکۃ اللہ نے ان کو وہ مقام بتا دیا تھا جہاں کعبہ کی تعمیر ہوئی تھی، مگر ہزاروں سال کے حوادث نے عرصہ ہوا اس کو بے نشان کر دیا، البتہ اب بھی وہ ایک ٹیلہ یا ابھری ہوئی زمین کی شکل میں موجود تھا، یہی وہ مقام ہے جس کو وحی الٰہی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتایا اور انہوں نے اسماعیل علیہ السلام کی مدد سے اس کو کھودنا شروع کیا تو سابق تعمیر کی بنیادیں نظر آنے لگیں، انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی تعمیر کی گئی، مگر قرآن عزیز نے بیت اللہ کی تعمیر کا معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے شروع کیا ہے اور اس سے پہلی حالت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

حاصل یہ کہ اس واقعہ سے قبل تمام کائنات اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں بتوں اور ستاروں کی پرستش کے لیے ہیکل اور مندر موجود تھے اور ان ہی کے ناموں پر بڑی بڑی تعمیرات کی جاتی تھیں۔

مصریوں کے یہاں سورج دیوتا، ازوریس، ایزیس، حوریس اور بعل دیوتا سب ہی کے نام پر ہیکل اور مندر تھے، اشوریوں نے بعل دیوتا کا ہیکل بنایا اور ابوالہول کا مجسمہ بنا کر اس کی جسمانی عظمت کا مظاہرہ کرایا۔ کنعانیوں نے مشہور قلعہ بعلبک میں اسی بعل کا مشہور ہیکل بنایا تھا جو آج تک یادگار چلا آتا ہے غرہ کے باشندے "داجون" مچھلی دیبی کے مندر پر چڑھاوے چڑھاتے تھے، جس کی شکل انسان کی اور جسم مچھلی کا بنایا گیا تھا، عمونیوں نے سورج دیوتا کے ساتھ عشتارون (قمر) کو دیبی بنا کر پوجا اور اس کے عظیم الشان ہیکل تیار کیے، فارس نے آگ کی تقدیس کا اعلان کر کے آتشکدے تیار کیے، رومیوں نے مسیح اور کنواری مریم کے بت بنا کر کلیساؤں کو زینت دی اور ہندیوں نے مہاتما بدھ، شری رامچندر، شری مہادیر اور مہادیو کو دیوتا اور اوتار مان کر اور کالیدیوی، سیتلا دیوی، سیتا دیوی اور پاربتی دیوی ناموں سے ہزاروں بتوں کی پرستش کے لیے کیسے کیسے عظیم الشان منادر تیار کیے ہر دوار، پریاگ، کاشی پوری، ٹیکسلا، سانچی اور بودھ گیا جیسے مذہبی مقامات اس کی زندہ شہادتیں ہیں۔

مگر ان سب کے برعکس صرف خدائے واحد کی پرستش اور اس کی یکتائی کے اقرار میں سرنیاز جھکانے کے لیے یا یوں کہیے کہ توحید الٰہی کی سربلندی کے اظہار کے لیے دنیا کے بت کدوں میں پہلا گھر جو خدا کا گھر کہلایا وہ یہی "بیت اللہ" ہے۔

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا ۔ خلیل ایک معمار تھا جس بناء کا

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (ال عمران: ۹۶)

"بیشک سب سے پہلا وہ گھر جو لوگوں کے لیے (خدا کی یاد کے لیے) بنایا گیا البتہ وہ ہے جو مکہ میں ہے، وہ سرتا پا برکت

---

* جلد ۸ ص ۱۳۸

ہے اور جہاں والوں کے لیے ہدایات (کا سرچشمہ)۔"

اسی تعمیر کو یہ شرف حاصل ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جیسا جلیل القدر پیغمبر اس کا معمار ہے اور اسماعیل علیہ السلام جیسا نبی و ذبیح اس کا مزدور، باپ بیٹے برابر اس کی تعمیر میں مصروف ہیں اور جب اس کی دیواریں اوپر اٹھتی ہیں اور بزرگ باپ کا ہاتھ اوپر تعمیر سے معذور ہو جاتا ہے تو قدرت کی ہدایت کے مطابق ایک پتھر کو باڑ بنایا جاتا ہے جس کو اسماعیل علیہ السلام اپنے ہاتھ سے سہارا دیتے، اور ابراہیم علیہ السلام اس پر چڑھ کر تعمیر کرتے جاتے ہیں، یہی وہ یادگار ہے جو آج مقام ابراہیم کے نام سے موسوم ہے، جب تعمیر اس حد پر پہنچی جہاں آج حجر اسود نصب ہے تو جبریل امین علیہ السلام نے ان کی راہنمائی کی اور حجر اسود کو ان کے سامنے ایک پہاڑی سے محفوظ نکال کر دیا جس کو جنت کا لایا ہوا پتھر کہا جاتا ہے تاکہ وہ نصب کر دیا جائے۔

بیت اللہ تعمیر ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو بتایا کہ یہ ملت ابراہیمی کے لیے (قبلہ) اور ہمارے سامنے جھکنے کا نشان ہے، اس لیے یہ توحید کا مرکز قرار دیا جاتا ہے تب ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے دعا مانگی کہ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کی ذریت کو اقامت صلوٰۃ و زکوٰۃ کی ہدایت دے اور استقامت بخشے اور ان کے لیے پھلوں، میووں اور رزق میں برکت عطا فرمائے اور تمام اقطاع عالم کے بسنے والوں میں سے ہدایت یافتہ گروہ کو اس طرف متوجہ کرے کہ وہ دور دور سے آئیں اور مناسک حج ادا کریں اور ہدایت و رشد کے اس مرکز میں جمع ہو کر اپنی زندگی کی سعادتوں سے دامن بھریں۔

قرآن عزیز نے بیت اللہ کی تعمیر، تعمیر کے وقت ابراہیم علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام کی مناجات، اقامت صلوٰۃ اور مناسک حج کی ادا کے لیے شوق و تمنا کے اظہار اور بیت اللہ کے مرکز توحید ہونے کے اعلان کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے اور نئے نئے اسلوب و طرز ادا سے اس کی عظمت اور جلالت و جبروت کو ان آیات میں واضح فرمایا ہے:

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مُبٰرَکًا وَّ هُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ وَ مَنْ دَخَلَهٗ کَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ وَ مَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ (آل عمران: ۹۶-۹۷)

"بلاشبہ پہلا گھر جو انسانوں کے لیے (خدا پرستی کا معبد و مرکز) بنایا گیا ہے وہ یہی (عبادت گاہ) ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا، اور تمام انسانوں کے لیے سرچشمہ ہدایت، اس میں (دین حق کی) روشن نشانیاں ہیں، از انجملہ مقام ابراہیم ہے (یعنی ابراہیم (علیہ السلام) کے کھڑے ہونے اور عبادت کرنے کی جگہ) جو اس وقت سے لے کر آج تک بغیر کسی شک و شبہ کے مشہور و معین رہی ہے اور (از انجملہ یہ بات ہے کہ) جو کوئی اس کی حدود میں داخل ہوا، وہ امن و حفاظت میں آ گیا اور (از انجملہ یہ کہ) اللہ کی طرف سے لوگوں کے لیے یہ بات ضروری ہو گئی کہ اگر اس تک پہنچنے کی استطاعت پائیں تو اس گھر کا حج کریں، بایں ہمہ جو کوئی (اس حقیقت سے) انکار کرے (اور اس مقام کی پاکی و فضیلت کا اعتراف نہ کرے) تو یاد رکھو اللہ کی ذات تمام دنیا سے بے نیاز ہے (وہ اپنے کاموں کے لیے کسی فرد اور قوم کا محتاج نہیں!)۔"

﴿وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤی اِبْرٰهٖمَ

وَ اِسۡمٰعِیۡلَ اَنۡ طَہِّرَا بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَ الۡعٰکِفِیۡنَ وَ الرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ ﴿۱۲۵﴾ وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰہٖمُ رَبِّ اجۡعَلۡ ہٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارۡزُقۡ اَہۡلَہٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنۡ اٰمَنَ مِنۡہُمۡ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنۡ کَفَرَ فَاُمَتِّعُہٗ قَلِیۡلًا ثُمَّ اَضۡطَرُّہٗۤ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۲۶﴾ وَ اِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰہٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَ اِسۡمٰعِیۡلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَ اجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَ تُبۡ عَلَیۡنَا ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَ ابۡعَثۡ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِکَ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۲۹﴾ (البقرہ: ۱۲۵۔۱۲۹)

"اور (پھر دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے (مکہ کے) اس گھر کو (یعنی خانہ کعبہ) کو انسانوں کی گرو آوری کا مرکز اور امن وحرکت کا مقام ٹھہرا دیا اور حکم دیا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے کھڑے ہونے کی جگہ (ہمیشہ کے لیے) نماز کی جگہ بنائی جائے، اور ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) اور اسماعیل (علیہ السلام) کو حکم دیا تھا کہ ہمارے نام پر جو گھر بنایا گیا ہے اسے طواف کرنے والوں، عبادت کے لیے ٹھہرنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے (ہمیشہ) پاک رکھنا (اور ظلم ومعصیت کی گندگیوں سے آلودہ نہ کرنا!) اور پھر جب ایسا ہوا تھا کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے خدا کے حضور دعا مانگی تھی (اے پروردگار! اس جگہ کو (جو دنیا کی آباد سرزمینوں سے دور اور سرسبزی اور شادابی سے یک قلم محروم ہے) امن وامان کا ایک آباد شہر بنا دے، اور اپنے فضل وکرم سے ایسا کر کہ یہاں کے بسنے والوں میں جو لوگ تجھ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہوں ان کے رزق کے لیے ہر طرح کی پیداوار مہیا ہو جائے! اس پر ارشاد الٰہی ہوا تھا کہ (تمہاری دعا قبول کی گئی اور یہاں کے باشندوں میں سے) جو کوئی کفر کا شیوہ اختیار کرے گا، سو اسے بھی ہم (سروسامان رزق سے) فائدہ اٹھانے دیں گے البتہ یہ فائدہ اٹھانا بہت تھوڑا ہوگا، کیونکہ بالآخر اسے (پاداش عمل میں) چاروناچار دوزخ میں جانا ہے، اور (جو بد بخت نعمت کی راہ چھوڑ کر عذاب کی راہ اختیار کر لے تو کیا ہی بری اس کی راہ ہے اور) کیا ہی برا اس کا ٹھکانا ہے! اور (پھر دیکھو، وہ کیسا عظیم الشان اور انقلاب انگیز وقت تھا) جب ابراہیم خانہ کعبہ کی بنیاد چن رہا تھا، اور اسماعیل بھی اس کے ساتھ شریک تھا (ان کے ہاتھ تو پتھر چن رہے تھے، اور دل وزبان پر یہ دعا طاری تھی!) اے "پروردگار! (ہم تیرے دو عاجز بندے تیرے مقدس نام پر اس گھر کی بنیاد رکھ رہے ہیں) ہمارا یہ عمل تیرے حضور قبول ہو! بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کا سننے والا اور (مصالح عالم کا) جاننے والا ہے۔ اے پروردگار! (اپنے فضل وکرم سے) ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم سچے مسلم (یعنی تیرے حکموں کے فرمانبردار) ہو جائیں اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی امت پیدا کر دے جو تیرے حکموں کی فرمانبردار ہو! خدایا ہماری عبادت کے (سچے) طور طریقے بتا دے، اور ہمارے قصوروں سے درگزر کر، بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو رحمت سے درگزر کرنے والی ہے اور جس کی رحیمانہ درگزر کی کوئی انتہا نہیں! اور خدایا (اپنے فضل وکرم

سے) ایسا کیجئے کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول مبعوث ہو جو انہی میں سے ہو، وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے، کتاب اور حکمت کی انہیں تعلیم دے، اور (اپنی پیغمبرانہ تربیت سے) ان کے دلوں کو مانجھ دے، اے پروردگار! بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو حکمت والی اور سب پر غالب ہے۔"

﴿وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْــٴًـا وَّ طَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآىٕفِیْنَ وَ الْقَآىٕمِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾ وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ﴿۲۷﴾ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ یَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْۤ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآىٕسَ الْفَقِیْرَ ﴿۲۸﴾ ثُمَّ لْیَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَ لْیُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَ لْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ ۗ وَ مَنْ یُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ وَ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴿۳۰﴾ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَیْرَ مُشْرِكِیْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّیْرُ اَوْ تَهْوِیْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ مَكَانٍ سَحِیْقٍ ﴿۳۱﴾ ذٰلِكَ ۗ وَ مَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآىٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾ لَكُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَی الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ﴿۳۳﴾﴾ (الحج: ٢٦۔٣٣)

"اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے خانہ کعبہ کی جگہ مقرر کر دی، (اور حکم دیا) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کر، اور میرا یہ گھر ان لوگوں کے لیے پاک رکھ جو طواف کرنے والے ہوں، عبادت میں سرگرم رہنے والے ہوں، رکوع و سجود میں جھکنے والے ہوں! اور (حکم دیا کہ) "لوگوں میں حج کا اعلان پکار دے، لوگ تیرے پاس دنیا کی تمام دور دراز راہوں سے آیا کریں گے پا پیادہ، اور ہر طرح کی سواریوں پر جو (مشقت سفر سے) جھکی ہوئی ہوں گی، وہ اس لیے آئیں گے کہ اپنے فائدہ پانے کی جگہ میں حاضر ہو جائیں اور ہم نے جو پالتو جانور پائے ان کے لیے مہیا کر دیئے ہیں ان کی قربانی کرتے ہوئے مقررہ دنوں میں اللہ کا نام لیں، پس قربانی کا گوشت خود بھی کھاؤ اور بھوکے فقیروں کو بھی کھلاؤ، پھر قربانی کے بعد وہ اپنے جسم و لباس کا میل کچیل دور کر دیں (یعنی احرام اتار دیں) نیز اپنی نذریں پوری کریں اور اس خانہ قدیم (یعنی خانہ کعبہ) کے گرد پھیرے پھر لیں"۔ تو دیکھو (حج کی) بات یوں ہوئی اور جو کوئی اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حرمتوں کی عظمت مانے، تو اس کے لیے اس کے پروردگار کے حضور بڑی ہی بہتری ہے، اور (یہ بات بھی یاد رکھو کہ) ان جانوروں کو چھوڑ کر جن کا حکم قرآن میں سنا دیا گیا ہے تمام چار پائے تمہارے لیے حلال کیے گئے ہیں، پس چاہیے کہ بتوں کی ناپاکی سے بچتے رہو، نیز جھوٹ بولنے سے، صرف اللہ ہی کے ہو کر رہو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، جس کسی نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا، تو اس کا حال ایسا سمجھو، جیسے بلندی سے اچانک نیچے گر پڑا، جو چیز اس طرح گرے گی، اسے یا تو کوئی پرندا اچک لے گا یا ہوا کا جھونکا کسی دور دراز گوشہ میں لے جا کر پھینک دے گا! (حقیقت حال) یہ ہے، پس (یاد

رکھو) جس کسی نے اللہ کی نشانیوں کی عظمت مانی، تو اس نے ایسی بات مانی جو فی الحقیقت دلوں کی پرہیزگاری کی باتوں میں سے ہے، ان (چارپایوں) میں ایک مقررہ وقت تک تمہارے لیے (طرح طرح کے) فائدے ہیں۔ پھر اس خانہ قدیم تک پہنچا کر ان کی قربانی کرنی ہے۔"

﴿وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ (الحج: ۳۶-۳۷)

"اور (دیکھو) قربانی کے یہ اونٹ (جنہیں دور دور سے حج کے موقع پر لایا جاتا ہے، تو ہم نے اسے ان چیزوں میں سے ٹھہرا دیا ہے، جو تمہارے لیے اللہ کی (عبادت) کی نشانیوں میں سے ہیں، اس میں تمہارے لیے بہتری کی بات ہے، پس چاہیے کہ انہیں قطار در قطار ذبح کرتے ہوئے اللہ کا نام یاد کرو، پھر جب وہ کسی پہلو پر گر پڑیں (یعنی ذبح ہو جائیں) تو ان کے گوشت میں سے خود بھی کھاؤ اور فقیروں اور زائروں کو بھی کھلاؤ، اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا تاکہ (احسان الٰہی کے) شکر گزار ہو! یاد رکھو اللہ تک ان قربانیوں کا نہ گوشت پہنچتا ہے نہ خون، اس کے حضور جو کچھ پہنچ سکتا ہے وہ تو صرف تمہارا تقویٰ ہے (یعنی تمہارے دل کی نیکی ہے) ان جانوروں کو اس طرح تمہارے لیے مسخر کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی پر اس کے شکر گزار ہو۔ اور اس کے نام کی بڑائی کا آوازہ بلند کرو، اور نیک کرداروں کے لیے (قبولیت حق کی) خوش خبری ہے۔"

اسماعیل علیہ السلام کی اولاد:

اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کا ذکر قرآن عزیز یا احادیث نبوی ﷺ میں تفصیل کے ساتھ نہیں آتا، البتہ تورات نے ان کے ناموں کا علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے تورات کے قول کے مطابق اسماعیل علیہ السلام کے بارہ لڑکے تھے جو بارہ سردار کہلائے اور عرب کے مستقل قبائل کے جد قبیلہ بنے اور ایک لڑکی تھی جس کا نام بشامہ یا محلاۃ تھا۔

اور ابراہام کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کا جسے سری کی لونڈی مصری ہاجرہ ابراہیم کے لیے جنی تھی یہ نسب نامہ ہے اور یہ اسماعیل کے بیٹوں کے نام ہیں مطابق ان کے ناموں اور نسبوں کی فہرست کے اسماعیل علیہ السلام کا پہلوٹھا نبایوت، قیدار، ادبئیل، مبسام، مشماع، دومہ، مسّا، حدار، تیما، یطور، نافیش، قیدما یہ اسماعیل علیہ السلام کے بیٹے ہیں، اور ان کے نام ان کی بستیوں اور قلعوں میں یہ ہیں اور یہ اپنی امتوں کے بارہ رئیس تھے۔ [1]

ان میں دو بڑے بیٹے نابت یا نبایوت اور قیدار بہت مشہور ہیں اور ان کا ذکر تورات میں بھی کثرت سے پایا جاتا ہے اور

---

[1] ۲۵ آیت ۱۲-۱۶ پیدائش

عرب مؤرخین بھی ان کی تفصیلات پر روشنی ڈالتے ہیں یہی وہ ثابت ہیں جن کی نسل اصحاب الحجر کہلائی اور قیدار کی نسل اصحاب الرس کے نام سے مشہور ہوئی ان کے علاوہ دوسرے بھائیوں اوران کے خاندانوں کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔

قرآن عزیز میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا تذکرہ:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر قرآن عزیز میں متعدد بار ہوا ہے، ان میں سے ایک جگہ صرف اوصاف مذکور نہیں ہیں، یہ "ذبح عظیم" والی آیت ہے اور دو مقام پر اس بشارت کے موقع پر ذکر آیا ہے جس میں ابراہیم علیہ السلام کی پسری اولاد کی بشارت دی گئی ہے اور سورۂ مریم میں ان کا نام لے کر ان کے اوصاف جمیلہ کا ذکر کیا گیا ہے:

﴿وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۚ وَ كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ ۪ وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴾(مریم:۵۴۔۵۵)

"اور یاد کر کتاب میں اسماعیل (علیہ السلام) کا ذکر تھا وہ وعدہ کا سچا اور تھا رسول نبی اور حکم کرتا تھا اپنے اہل کو نماز کا اور زکوٰۃ کا اور تھا وہ اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ۔"

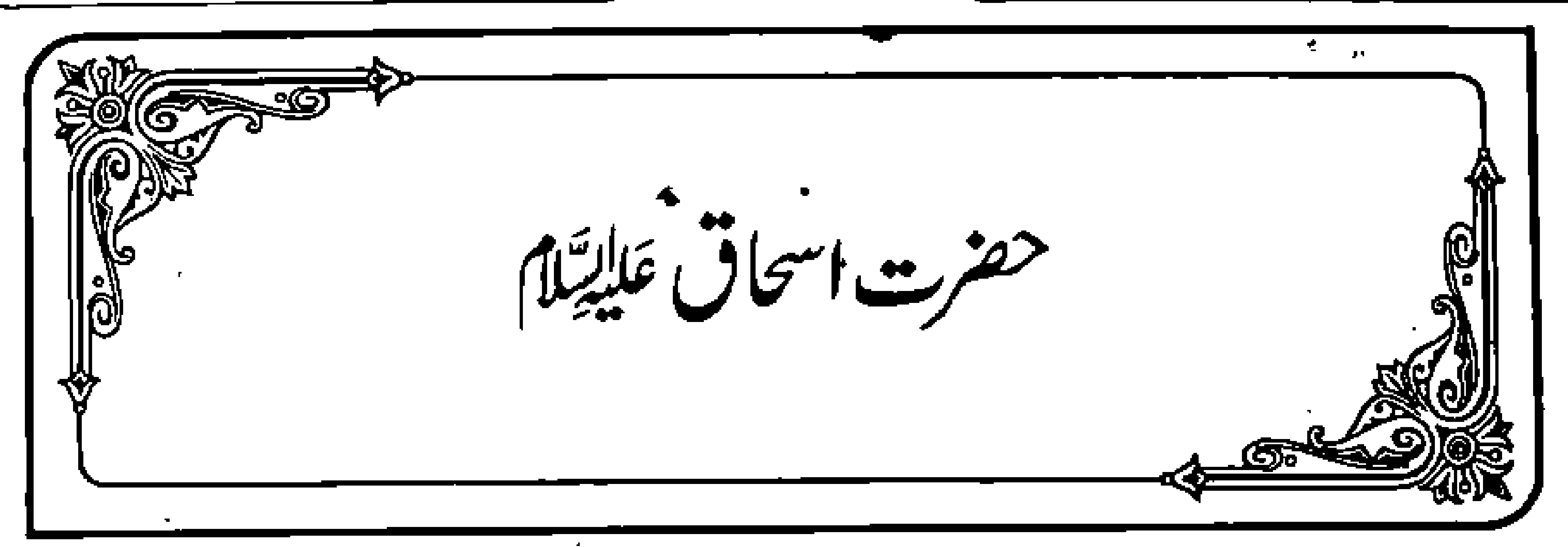
حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وفات:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر جب ایک سو چھتیس (۱۳۶) سال کی ہوئی تو ان کا انتقال ہو گیا، اس وقت ان کے سامنے ان کی اولاد اور نسل کا سلسلہ بہت پھیل گیا تھا جو حجاز، شام، عراق، فلسطین، اور مصر تک پھیلی۔

تورات ایک موقع پر اشارہ کرتی ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر فلسطین ہی میں [1] ہے اور یہیں ان کی وفات ہوئی اور عرب مؤرخین کہتے ہیں کہ وہ اور ان کی والدہ ہاجرہ بیت اللہ کے قریب حرم کے اندر مدفون ہیں۔ [2]



[1] پیدائش باب ۲۵ [2] تاریخ طبری جلد ا



حضرت اسحاق علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر سو سال کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بشارت سنائی کہ سارہ کے بطن سے بھی تیرے ایک بیٹا ہوگا اس کا نام اسحاق رکھنا۔

"اور خدا نے ابراہام سے کہا کہ تیری جورو سری جو ہے اس کو سری مت کہا کر بلکہ اس کا نام سرہ ہے اور میں اسے برکت دوں گا، اور اس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا یقیناً میں اسے برکت دوں گا کہ وہ قوموں کی ماں ہوگی، اور ملکوں کے بادشاہ اس سے پیدا ہوں گے، تب ابراہام منہ کے بل گرا اور ہنس کے دل میں کہا کہ کیا سو برس کے مرد کو بیٹا پیدا ہوگا اور کیا سارہ جو نوے برس کی ہے بیٹا جنے گی؟ اور ابراہیم نے خدا سے کہا کہ کاش کہ اسماعیل تیرے حضور جیتا رہے تب خدا نے کہا کہ بیشک تیری جورو سرہ تیرے لیے بیٹا جنے گی تو اس کا نام اضحاق رکھنا"۔ [1]

اور قرآن عزیز میں ہے:

﴿وَ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰی قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ ۝ فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ ۝ وَ امْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ ۝ قَالَتْ یٰوَیْلَتٰۤی ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ ۝ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝﴾ (ھود: ۶۹-۷۳)

"اور بلاشبہ ہمارے ایلچی (فرشتے) ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے، انہوں نے ابراہیم (علیہ السلام) کو سلام کیا اور ابراہیم (علیہ السلام) نے سلام کہا، تھوڑی دیر کے بعد ابراہیم بچھڑے کا بھنا گوشت لایا اور جب اس نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھتے تو ان کو اجنبی محسوس کیا اور ان سے خوف کھایا، وہ کہنے لگے خوف نہ کرو، ہم لوط کی قوم پر (عذاب کے لیے) بھیجے گئے ہیں، اور ابراہیم (علیہ السلام) کی بیوی (سارہ) کھڑی ہوئی ہنس رہی تھی، پس ہم نے اس کو اسحاق کی اور اس کے بعد (اس کے بیٹے) یعقوب کی بشارت دی، سارہ کہنے لگی، کیا میں نگوڑی بڑھیا جنوں گی اور جب کہ یہ ابراہیم میرا شوہر بھی بوڑھا ہے، واقعی یہ تو بہت عجیب بات ہے، فرشتوں نے کہا، کیا تو خدا کے حکم پر تعجب کرتی ہے، اے اہل بیت تم پر خدا کی رحمت و برکت ہو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر طرح قابل حمد ہے اور بہت بزرگ"۔

[1] باب ۱۷ آیت ۱۵ تا ۱۹

﴿فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَ بَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَ قَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ۝ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝﴾

(الذاریات: ۲۸۔۳۰)

"پس محسوس کیا (ابراہیم علیہ السلام نے) ان سے خوف، وہ (فرشتے) کہنے لگے خوف نہ کھا اور بشارت دی اس کو ایک سمجھ دار لڑکے کی، پس آئی بی بی (سارہ) ابراہیم کی سخت بے چینی کا اظہار کرتی ہوئی پھر پیٹ لیا اس نے اپنا منہ اور کہنے لگی بانجھ بڑھیا (اور بچہ) فرشتوں نے کہا تیرے پروردگار نے یہی کہا ہے، ایسا ہی ہوگا وہ دانا ہے، حکمت والا۔"

﴿قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ۝ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰۤى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ۝ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ۝ قَالَ وَ مَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ۝﴾ (الحجر: ۵۲۔۵۶)

"ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا بیشک مجھ کو تم سے خوف معلوم ہوتا ہے، فرشتوں نے کہا ہم سے نہ ڈر بلا شبہ ہم تجھ کو ایک سمجھ دار لڑکے کی بشارت دینے آئے ہیں، ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کیا تم مجھ کو اس بڑھاپا آ جانے پر بھی بشارت دیتے ہو، یہ کیسی بشارت دے رہے ہو؟ فرشتوں نے کہا ہم تجھ کو حق بات کی بشارت دے رہے ہیں پس تو ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہو ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا اور نہیں ناامید ہوتے اپنے پروردگار کی رحمت سے مگر گمراہ۔"

ختنہ:

جب حضرت اسحاق علیہ السلام آٹھ دن کے ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی ختنہ کرا دیں۔ اور ابراہام نے جیسا کہ خدا نے اسے حکم دیا تھا، اپنے بیٹے اضحاق کا جب وہ آٹھ دن کا ہوا ختنہ کیا۔[1] اسحٰق اصل لفظ کے اعتبار سے "یصحق" ہے، یہ عبرانی لفظ ہے جس کا عربی ترجمہ "یضحك" (ہنستا ہے) ہوتا ہے۔

خدا کے فرشتوں نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سو برس اور حضرت سارہ علیہا السلام کو نوے سال کے سن میں بیٹا ہونے کی بشارت دی تھی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اچنبھا سمجھا تھا اور حضرت سارہ کو بھی یہ سن کر ہنسی آ گئی تھی اس لیے ان کا یہ نام تجویز ہوا، یا اس لیے یہ نام رکھا گیا کہ ان کی پیدائش حضرت سارہ علیہا السلام کی مسرت و شادمانی کا باعث ہوئی۔

عربی قاعدہ سے "یضحق" مضارع کا صیغہ ہے، اہل عرب کا ہمیشہ سے ہی یہ دستور رہا ہے کہ وہ مضارع کے صیغوں کو بھی بطور نام کے استعمال کرتے ہیں، چنانچہ یعرب، یملک جیسے نام عرب میں معروف و مشہور ہیں۔

اسحاق علیہ السلام کی شادی:

قرآن عزیز میں اس کے متعلق کوئی ذکر نہیں ہے، البتہ تورات میں اس سلسلہ میں ایک طویل قصہ مذکور ہے جس کا خلاصہ یہ

[1] تورات باب ۲۱ آیت ۴

ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے خانہ زاد الیعزر دمشقی سے فرمایا کہ میں یہ طے کر چکا ہوں کہ اسحاق کی شادی فلسطین کے ان کنعانی خاندانوں میں ہرگز نہ کروں گا بلکہ میری یہ خواہش ہے کہ اپنے خاندان اور باپ دادا کی نسل میں اس کا رشتہ کروں اس لیے تو سازوسامان لے کر جا اور فدان آرام میں میرے بھتیجے بتوئیل بن ناحور کو یہ پیغام دے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح اسحاق سے کر دے، اگر وہ راضی ہو جائے تو اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ میں اسحاق کو اپنے پاس سے جدا کرنا نہیں چاہتا لہٰذا لڑکی کو تیرے ساتھ رخصت کر دے، الیعزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حکم کے مطابق فوراً آرام کو روانہ ہو گیا جب آبادی کے قریب پہنچا تو اپنے اونٹ کو بٹھایا تاکہ حالات معلوم کرے، الیعزر نے جس جگہ اونٹ بٹھایا تھا، اسی کے قریب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی بتوئیل کا خاندان آباد تھا، ابھی یہ اس میں مشغول تھا کہ سامنے ایک حسین لڑکی نظر آئی جو پانی کا گھڑا بھر کر مکان کو لیے جا رہی تھی۔ الیعزر نے اس سے پانی مانگا، لڑکی نے اس کو بھی پانی پلایا اور اس کے اونٹ کو بھی اور پھر حال دریافت کیا، الیعزر نے بتوئیل کا پتہ دریافت کیا، لڑکی نے کہا کہ وہ میرے باپ ہیں اور الیعزر کو مہمان بنا کر لے گئی، مکان پر پہنچ کر اپنے بھائی لابان کو اطلاع دی، لابان نے الیعزر کی بیحد مدارات کی اور آمد کی وجہ دریافت کی، الیعزر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیغام سنایا۔ لابان کو اس پیغام سے بے حد مسرت ہوئی اور اس نے بہت سا سازوسامان دے کر اپنی بہن رفقہ کو الیعزر کے ہمراہ رخصت کر دیا۔

حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد:

رفقہ سے حضرت اسحاق علیہ السلام کے توام دو لڑکے علی الترتیب عیسو اور یعقوب پیدا ہوئے، اس وقت حضرت اسحاق علیہ السلام کی عمر ساٹھ سال کی تھی، اسحاق علیہ السلام عیسو کو زیادہ چاہتے تھے اور رفقہ یعقوب سے زیادہ پیار رکھتی تھیں، عیسو شکاری تھا اور بوڑھے ماں باپ کو شکار کا گوشت لا کر دیتا تھا اور یعقوب خیمہ ہی میں رہتا تھا۔

ایک روز عیسو تھکا ماندہ آیا اور یعقوب سے کہنے لگا میں ماندہ ہوں اور آج شکار بھی ہاتھ نہ آیا تو اپنے کھانے مسور اور لپسی میں سے مجھے بھی کچھ دے، یعقوب نے کہا کہ فلسطینیوں کا یہ دستور ہے کہ میراث بڑے لڑکے کو ملتی ہے اس لیے باپ کا وارث تو ہوگا اگر تو اس حق سے دست بردار ہو جائے تو میں تجھ کو کھانا کھلاؤں گا، عیسو نے کہا مجھے اس میراث کی کوئی پرواہ نہیں تو ہی وارث ہو جانا، تب یعقوب نے عیسو کو کھانا کھلایا۔

ایک مرتبہ حضرت اسحاق علیہ السلام نے (جبکہ بہت بوڑھے اور ضعیف البصر ہو گئے تھے) یہ چاہا کہ عیسو کو برکت دیں، اور اس سے کہا کہ جا شکار کر کے لا اور عمدہ کھانا پکا کر میرے سامنے پیش کر، رفقہ نے یہ سنا تو دل سے چاہا کہ یہ برکت یعقوب کو ملے۔ فوراً یعقوب کو بلا کر کہا کہ جلدی عمدہ کھانا تیار کر کے باپ کے سامنے لے جا اور دُعا برکت کا طالب ہو، یعقوب نے نام بتائے بغیر ایسا ہی کیا اور اسحاق علیہ السلام سے دُعا برکت حاصل کر لی، جب عیسو آیا اور اس نے سب قصہ سنا تو انتہائی ناگواری محسوس کی اور یعقوب سے کینہ رکھنے لگا۔ تب رفقہ نے یعقوب کو رائے دی کہ وہ یہاں سے اپنے ماموں لابان کے پاس کچھ دنوں کے لیے چلا جائے۔ یعقوب ماموں کے یہاں پہنچا اور وہیں کچھ مدت گذاری اور یکے بعد دیگرے لابان کی دونوں لڑکیوں لئیہ اور راحیل سے شادی کر لی۔ [1]

---

[1] پیدائش باب ۲۴ آیت ۱۔۶۵

یہ روایت اگرچہ اپنے مضامین کے اعتبار سے بہت زیادہ ناقابل اعتماد ہے اور اس میں جو اخلاقی زندگی پیش کی گئی ہے وہ تورات کی دوسری محرف روایات کی طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے خاندان کے شایان شان بھی نہیں ہے، مگر اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی شادی ان کے ماموں کے یہاں ہوئی اور وہ ایک عرصہ تک ان کے پاس رہے۔

اور عیسو بھاگ کر اپنے چچا اسماعیل علیہ السلام کے پاس چلے گئے اور وہاں ان کی صاحبزادی بشامہ یا باسمہ یا محلاۃ (جو بھی نام صحیح ہو) سے شادی کر لی، اور ان کے علاوہ بھی شادیاں کیں، اور اپنے خاندان کو لے کر سعیر (یا ساعیر) کو اپنا وطن بنالیا، اور یہاں ادوم کے نام سے مشہور ہوئے اور اس لیے ان کی نسل بنی ادوم کے نام سے مشہور ہوئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حق الیقین کی طلب:

گزشتہ سطور میں چونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کا ذکر آ گیا تھا اس لیے ان سے متعلق واقعات کو تفصیل سے بیان کر دینا مناسب سمجھا گیا تا کہ واقعات کے تسلسل میں انتشار پیدا نہ ہو، نیز یہ واقعات بھی درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی زندگی سے متعلق ہیں اس لیے ان کا تذکرہ بے محل نہیں ہے، اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باقی حالات قابل توجہ ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حقائق اشیاء کی جستجو اور طلب کا طبعی ذوق تھا، اور وہ ہر شئے کی حقیقت تک پہنچنے کی سعی کو اپنی زندگی کا خاص مقصد سمجھتے تھے تا کہ ان کے ذریعہ ذات واحد (اللہ جل جلالہ) کی ہستی، اس کی وحدانیت، اور اس کی قدرت کاملہ کے متعلق علم الیقین کے بعد حق الیقین حاصل کر سکیں۔

آزر، جمہور اور نمرود کے ساتھ مناظروں میں ان کے اس طبعی ذوق کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے "حیات بعد الممات" یعنی مرجانے کے بعد جی اٹھنے کے متعلق خدائے تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ وہ کس طرح ایسا کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا، اے ابراہیم! کیا تم اس مسئلہ پر یقین و ایمان نہیں رکھتے؟ ابراہیم علیہ السلام نے فوراً جواب دیا، کیوں نہیں! میں بلا توقف اس پر ایمان رکھتا ہوں، لیکن میرا یہ سوال ایمان و یقین کے خلاف اس لیے نہیں ہے کہ میں علم الیقین کے ساتھ ساتھ عین الیقین اور حق الیقین [1] کا خواستگار ہوں، میری تمنا یہ ہے کہ تو مجھ کو آنکھوں سے مشاہدہ کرا دے

---

[1] یقین: مضبوط اعتقاد اور اذعان محکم کو کہتے ہیں جو کسی بھی حالت میں شک و شبہ کی راہ سے متزلزل نہ ہو سکے، اس لئے یہ (یقین) ایمان بالحق کے لئے اساس و بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، البتہ اعتقاد جازم کے باوجود مراتب و درجات کے لحاظ سے اس میں تفاوت بھی پایا جاتا ہے جس کو علمی اصطلاح میں علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کہا جاتا ہے، اگر کسی مسئلہ میں جہل و نادانی کے خلاف دلیل و برہان کے ذریعہ علم و دانش اس حد تک حاصل ہو جائے کہ تردد اور تذبذب کی راہیں مسدود ہو کر رہ جائیں تو اس کا نام علم الیقین ہے، اور اگر یہ علم، علیل و برہان سے آگے مشاہدہ محسوس کی حد میں داخل ہو جائے اور دلیل کے ساتھ پوری پوری مطابقت نظر آ جائے تو پھر اس حاصل شدہ یقین کو عین الیقین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علم الیقین اور عین الیقین تک رسائی کے باوجود فطرت انسانی ابھی مزید یقین کی طالب ہوتی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ جس شئے کو محکم دلیل کی روشنی میں سمجھا اور جانا نیز مشاہدہ وحس کے ذریعہ اس کی مزید تقویت بھی مل گیا اچھا ہو کہ اس کا کیف و کم سب ہی سامنے آ جائے اور حقیقت حال تک پہنچنے کی راہ نکل آئے پس جب فطرت انسانی یقین کے اس درجہ پر قابو پا لیتی ہے تو اس کو حق الیقین کہا جاتا ہے۔ مثلاً سیب ایک بہترین پھل ہے اس کے جاننے اور معلوم کرنے کا پہلا درجہ یہ ہے کہ عوام و خواص اور ثقہ اور غیر ثقہ سے تواتر اور شہرت کی اس حد تک اس کے وجود اور اس کی تعریف کو سنا کہ جس کے انکار کے لئے کوئی تردد، تذبذب اور شک و شبہ باقی نہیں رہا تو سیب کے متعلق اس یقین کا نام علم الیقین ہے، اور حسن اتفاق سے کشمیر جا کر آنکھوں سے اس کو

کہ "حیات بعد الممات" کی شکل کیا ہوگی، تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا اگر تم کو اس کے مشاہدہ کی طلب ہے تو چند پرند لو، اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے سامنے والے پہاڑ پر ڈال دو، اور پھر فاصلہ پر کھڑے ہو کر ان کو پکارو، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے ان کو آواز دی تو ان سب کے اجزاء علیحدہ علیحدہ ہو کر فوراً اپنی اپنی شکل پر آ گئے اور زندہ ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس اڑتے ہوئے چلے آئے۔

سورۂ بقرہ میں اس واقعہ کو اس معجزانہ بلاغت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴾ (البقرہ: ۲۶۰)

"(یاد کر) جب ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا، اے میرے پروردگار! مجھے دکھلا تو کس طرح مردوں کو زندہ کر دے گا، کہا، کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟ کیوں نہیں لیکن دلی اطمینان چاہتا ہوں، کہا پس چار پرندے لے پھر ان کو اپنے ساتھ مانوس کر پھر رکھ دے ہر ہر پہاڑ پر ان کے جزء جزء ڈال کر، پھر ان کو بلا وہ آئیں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور تو جان بیشک اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا۔"

سلف صالحین سے ان آیات کی تفسیر یہی ثابت ہے اور بعض روایات حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہیں، اس لیے حضرات ...نے اس مسئلہ کی غرابت کے پیش نظر ان آیات میں طرح طرح کی تاویلات کر کے دور از کار باتیں بیان کی ہیں وہ نا قابل التفات ...، ہم اس سے قبل واضح کر چکے ہیں کہ جس طرح یہ راہ غلط ہے کہ ہر موقعہ پر اچنبھوں اور عجوبہ کاریوں کی داستان سرائی ہو اور رطب و ...بس روایات کے اعتماد پر بے اصل باتوں پر یقین کیا جائے اسی طرح یہ بھی گمراہی کی راہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے متعلق جن خوارق ...ادات (معجزات) کا ذکر نصوص قرآنی اور صحیح روایات سے معلوم ہو جائے ان کا بھی اس لیے انکار کیا جائے یا باطل تاویلات گھڑی ...یں کہ مدعیان عقل و فلسفہ (مادیین) ہمارے اس یقین و علم پر ٹھٹھا کریں گے اور اس کا مذاق اڑائیں گے۔

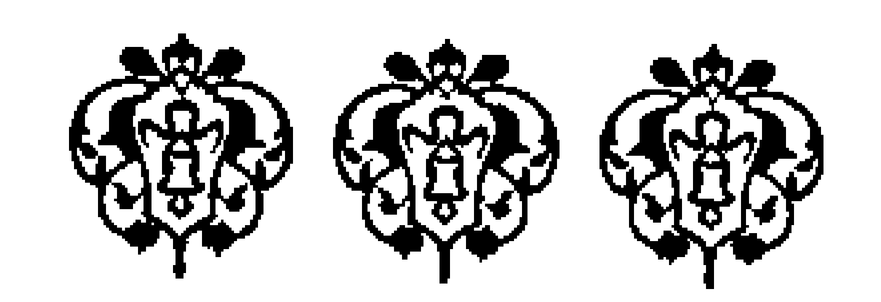
قطورہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ علیہا السلام اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے علاوہ ایک اور شادی کی تھی اس بی بی کا نام قطورہ تھا، ان ...بطن سے ابراہیم علیہ السلام کے چھ بیٹے پیدا ہوئے۔

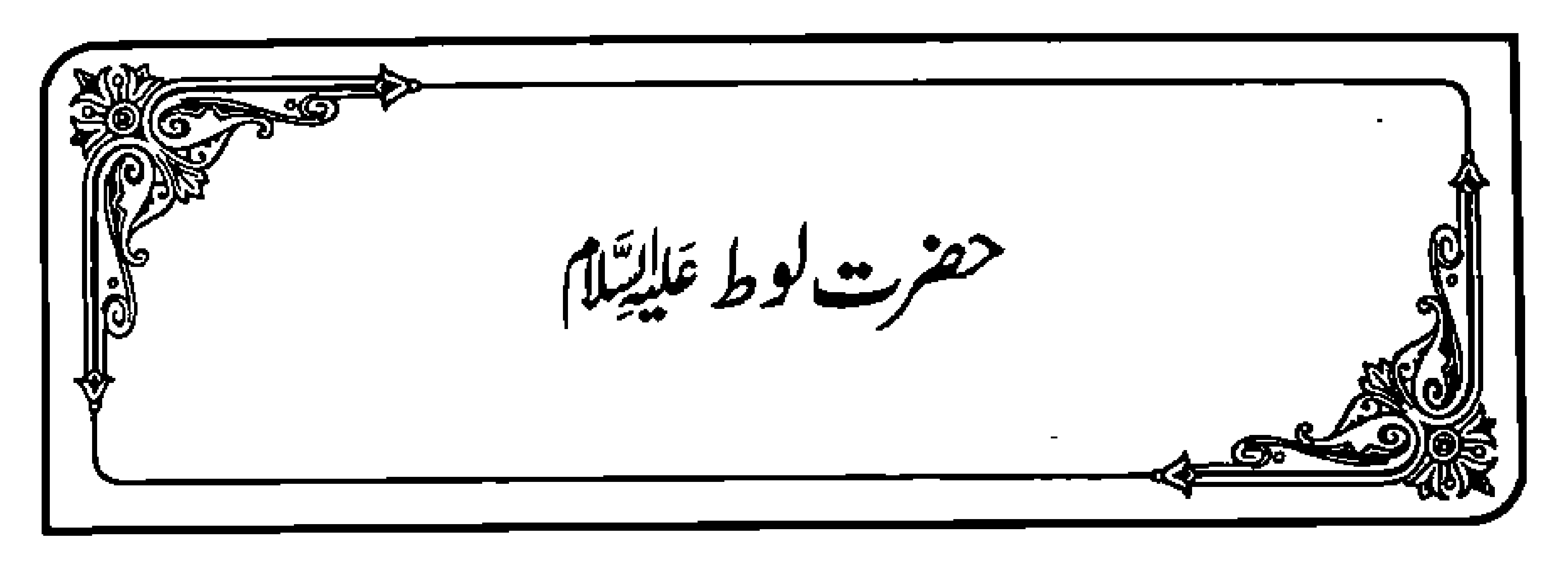
...دیکھ لیا تو یقین کا یہ درجہ عین الیقین کے نام سے موسوم ہے، اور اگر آنکھ سے رنگ و روپ کا مشاہدہ کیا، ناک سے اس کی خوشبو کو پہچانا اور زبان پر رکھ ...کی مدد سے اس کی لطافت، خنکی، شیرینی غرض اس کی حقیقت کے تمام اوصاف کو حاصل کر لیا تو یہ حق الیقین ہے، اور یقین کا یہ وہ آخری درجہ ہے جو ...انسانی کے تقاضائے تشنگی کی سیرابی کے لئے کافی ووافی ہوتا اور حضرت انسان کی دسترس کی معراج سمجھا جاتا ہے۔
البتہ یہ الگ بات ہے کہ مختلف انسانوں کی صلاحیت و استعداد اور خود شئے مطلوب کی حقیقت و کنہ کے پیش نظر حق الیقین کے بھی مختلف مراتب و ...ہیں جن کی تشریح و توضیح کا یہ مقام نہیں ہے۔

"اور ابراہیم علیہ السلام نے ایک اور جورو کی جس کا نام قطورہ تھا، اور اس سے زمران، یقسان مدان، مدیان، یشباق، شوحا پیدا ہوئے اور یقسان سے صبا اور ددان پیدا ہوئے، اور ان کے فرزند اسوری اور لطوسی اور لومی تھے اور مدیان کے فرزند عیفہ، غفر، خیوک، ابیداع، اور ددعا تھے یہ سب بنی قطورہ تھے۔" ❶

"مدین یا مدیان" کی نسل نے اپنی آبادی اپنے باپ کے نام پر مدین کے نام سے بسائی اور یہ اصحاب مدین کہلائے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے ددان کی نسل اصحاب الایکہ کے نام سے مشہور ہوئی یہی اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ دو قومیں ہیں جن میں ہدایت و سعادت کی پیغامبری کے لیے حضرت شعیب علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ یہ قتادہ کی روایت اور بعض مؤرخین حاضر کی تحقیق ہے، اس کے خلاف حافظ ابن کثیر اصحاب مدین و ایکہ کو ایک ہی تسلیم کرتے ہیں اور یہی تحقیق راجح ہے، تفصیل حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعہ میں آئے گی۔



❶ پیدائش ۲۵۔ آیت ۱۔ ۴



لوط اور ابراہیم علیہما السلام:

صفحات گذشتہ میں ذکر آ چکا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے برادر زادہ ہیں، ان کے والد کا نام ہاران تھا، حضرت لوط علیہ السلام کا بچپن حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے زیر سایہ گذرا اور ان کی نشوونما حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہی آغوش تربیت کی رہین منت تھی۔ اسی لیے وہ اور حضرت سارہ "ملت ابراہیمی" کے پہلے مسلم اور ﴿السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ﴾ میں داخل ہیں:

﴿فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ؕ﴾ (العنکبوت: ۲۶)

"پس ایمان لایا لوط ابراہیم (کے دین) پر اور کہا میں ہجرت کرنے والا ہوں اپنے رب کی جانب۔" [1]

یہ اور ان کی بی بی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرتوں میں ہمیشہ ساتھ رہے ہیں اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام مصر میں تھے تو اس وقت بھی یہ ہم سفر تھے۔

تورات میں ہے کہ مصر کے قیام میں چونکہ دونوں کے پاس کافی ساز و سامان تھا اور مویشیوں کے بڑے بڑے ریوڑ تھے اس لیے ان کے چرواہوں اور محافظوں کے درمیان بہت زیادہ کشمکش رہتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چرواہے چاہتے تھے کہ اس چراگاہ اور سبزہ زار سے پہلے ہمارے ریوڑ فائدہ اٹھائیں اور حضرت لوط علیہ السلام کے چرواہوں کی خواہش ہوتی کہ اول ہمارا حق سمجھا جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس صورت حال کا اندازہ کر کے حضرت لوط علیہ السلام سے مشورہ کیا، اور دونوں کی صلاح سے یہ طے پایا کہ باہمی تعلقات کی خوشگواری اور دائمی محبت و الفت کی بقاء کے لیے ضروری ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام مصر سے ہجرت کر کے شرق اردن کے علاقہ سدوم اور عامورہ چلے جائیں اور وہاں رہ کر دین حنیف کی تبلیغ کرتے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی رسالت کا پیغام حق سناتے رہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پھر واپس فلسطین چلے جائیں اور وہاں رہ کر اسلام کی تعلیم و تبلیغ کو سر بلند کریں۔

سدوم:

اردن کی وہ جانب جہاں آج بحر میت یا بحر لوط واقع ہے یہی وہ جگہ ہے جس میں سدوم اور عامورہ کی بستیاں آباد تھیں، اس کے قریب بسنے والوں کا یہ اعتقاد ہے کہ پہلے یہ تمام حصہ جو اب سمندر نظر آتا ہے کسی زمانہ میں خشک زمین تھی اور اس پر شہر آباد تھے، سدوم و عامورہ کی آبادیاں اسی مقام پر تھیں۔ یہ مقام شروع سے سمندر نہیں تھا بلکہ جب قوم لوط پر عذاب آیا اور اس سرزمین کا تختہ

---

[1] آیت ﴿مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ﴾ میں وطنی اور روحانی دونوں قسم کی ہجرتیں مراد ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ خدا کے دین کی خاطر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا وطنی ہجرت ہے اور باپ دادا کے قدیم مذہب (مظاہر پرستی) کو چھوڑ کر ملت حنیفی کو اختیار کر لینا روحانی ہجرت ہے۔

اُلٹ دیا گیا اور سخت زلزلے اور بھونچال آئے تب یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی بھر آیا، اسی لیے اس کا نام بحر میت اور بحر لوط ہے۔ ❶

یہ صحیح ہو یا غلط بہرحال یہ مسئلہ حقیقت رکھتا ہے کہ اسی بحر میت کے ساحل پر وہ حادثہ رونما ہوا جو قوم لوط کے عذاب سے موسوم ہے اور جو گذشتہ دو سو سال کی اثری تحقیق نے بحر میت کے ساحل پر لوط کی بستیوں کے بعض تباہ شدہ آثار ہویدا کر کے اس علم و یقین کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے جس کا اعلان ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن عزیز نے کر دیا تھا۔

قوم لوط:

لوط علیہ السلام نے جب سدوم میں آ کر قیام کیا تو دیکھا کہ یہاں کے باشندے فواحش اور معصیتوں میں اس قدر مبتلاء ہیں کہ الامان، الحفیظ، دنیا کی کوئی برائی ایسی نہیں تھی جو ان میں موجود نہ ہو اور کوئی خوبی ایسی نہ تھی جو ان میں پائی جاتی ہو، دنیا کی سرکش، متمرد، اور بداخلاق و بداطوار اقوام کے دوسرے عیوب و فواحش کے علاوہ یہ قوم ایک خبیث عمل کی موجد تھی یعنی اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے وہ عورتوں کی بجائے امرد لڑکوں سے اختلاط رکھتے تھے، دنیا کی قوموں میں اس عمل کا اس وقت تک قطعاً کوئی رواج نہ تھا، یہی بدبخت قوم ہے جس نے اس ناپاک عمل کی ایجاد کی، اس عمل کا نام "لواطت" مشہور ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ شرارت، خباثت اور بے حیائی یہ تھی کہ وہ اپنی اس بدکرداری کو عیب نہیں سمجھتے تھے، اور علی الاعلان فخر و مباہات کے ساتھ اس کو کرتے رہتے تھے۔

﴿وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۸۰۔۸۱)

"اور (یاد کرو) لوط کا واقعہ، جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ایسے فحش کام میں مشغول ہو، جس کو دنیا میں تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا، یہ کہ بلاشبہ تم عورتوں کی بجائے اپنی شہوت کو مردوں سے پوری کرتے ہو، یقیناً تم حد سے گزرنے والے ہو۔"

عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ میں نے عبرانی ادب کی ایک کتاب میں ان کی بعض بداعمالیوں کا حال پڑھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل سدوم کی یہ بھی عادت تھی کہ وہ باہر سے آنے والے تاجروں اور سوداگروں کے مال کو ایک نئے اور اچھوتے انداز سے لوٹ لیا کرتے تھے، چنانچہ ان کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی سوداگر باہر سے آ کر سدوم میں مقیم ہوتا تو اس کے مال کو دیکھنے کے بہانے سے ہر شخص تھوڑی تھوڑی چیزیں اٹھاتا اور لے کر چل دیتا اور تاجر بیچارہ حیران و پریشان ہو کر رہ جاتا، اب اگر اس نے اپنے ضیاع مال کا شکوہ کیا اور رونے دھونے لگا تو ان لٹیروں میں سے ایک آتا اور لوٹی ہوئی دو ایک چیزیں دکھلا کر کہنے لگتا کہ بھائی میں تو یہ لے گیا تھا، لو تمہاری یہ چیز موجود ہے، وہ رنجیدہ آواز میں کہتا کہ میں اس کو لے کر کیا کروں گا، جہاں میرا سارا مال لٹ گیا وہاں یہ بھی سہی، جا تو ہی اپنے پاس رکھ، جب یہ معاملہ ختم ہو جاتا تو اب دوسرا آتا اور وہ بھی اسی طرح کوئی معمولی سی چیز دکھا کر وہی کہتا جو پہلے نے کہا تھا اور سوداگر رنج و غم اور غصہ میں اس سے بھی پہلی بات لوٹا کر کہہ دیتا۔ اسی طرح سب اس کا مال ہضم کر جاتے اور سوداگر کو لوٹ کھسوٹ

❶ بستانی جلد ۹ ص ۵۳۷

کر بھگا دیتے۔

اسی کتاب میں یہ عجیب قصہ بھی نقل کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور سارہ علیہا السلام نے ایک مرتبہ حضرت لوط علیہ السلام کی عافیت و خیر معلوم کرنے کے لیے اپنے خانہ زاد الیعزر دمشقی کو سدوم بھیجا، یہ جب بستی کے قریب پہنچا تو اجنبی سمجھ کر ایک سدومی نے اس کے سر پر پتھر کھینچ مارا، الیعزر کے سر سے خون جاری ہو گیا، تب آگے بڑھ کر سدومی کہنے لگا کہ میرے پتھر کی وجہ سے یہ تیرا سر سرخ ہوا ہے لہٰذا مجھے اس کا معاوضہ ادا کر، اور اس مطالبہ کے لیے کھینچتا ہوا سدوم کی عدالت میں لے گیا، حاکم سدوم نے مدعی کا بیان سن کر کہا کہ بیشک الیعزر کو سدومی کے پتھر مارنے کی اجرت دینی چاہیے، الیعزر یہ سن کر غصہ میں آ گیا اور ایک پتھر اٹھا کر حاکم کے سر پر دے مارا اور کہنے لگا کہ میرے پتھر مارنے کی جو اجرت ہے وہ تو اس سدومی کو دے دینا اور یہ کہہ کر وہاں سے بھاگ گیا۔

یہ واقعات صحیح ہوں یا غلط لیکن ان سے یہ روشنی ضرور پڑتی ہے کہ اہل سدوم اس قدر ظلم، فحش، بے حیائی، بداخلاقی اور فسق و فجور میں مبتلا تھے کہ اس زمانہ کی قوموں میں ان کی جانب اس قسم کے واقعات عام طور پر منسوب کیے جاتے تھے۔

حضرت لوط علیہ السلام اور تبلیغ حق:

ان حالات میں حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو ان کی بے حیائیوں اور خباثتوں پر ملامت کی اور شرافت و طہارت کی زندگی کی رغبت دلائی، اور حسن خطابت، لطافت اور نرمی کے ساتھ جو ممکن طریقے سمجھانے کے ہو سکتے تھے ان کو سمجھایا اور موعظت و نصیحت کی اور گذشتہ اقوام کی بداعمالیوں کے نتائج و ثمرات بتا کر عبرت دلائی، مگر ان بدبختوں پر مطلق اثر نہ پڑا، بلکہ اس کا یہ اُلٹا اثر ہوا کہ کہنے لگے:

﴿وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝﴾

(الاعراف: ۸۲)

"لوط (علیہ السلام) کی قوم کا جواب اس کے سوائے کچھ نہ تھا کہ کہنے لگے ان/لوط اور اس کے خاندان) کو اپنے شہر سے نکال دو، یہ بیشک بہت ہی پاک لوگ ہیں۔"

"بیشک یہ پاک لوگ ہیں" قوم لوط کا یہ مذاقیہ فقرہ تھا، گویا حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے خاندان پر طنز کرتے اور ان کا ٹھٹھا اڑاتے تھے کہ بڑے پاکباز ہیں ان کا ہماری بستی میں کیا کام، یا ناصح مشفق کی مربیانہ نصیحت سے غیظ و غضب میں آ کر کہتے تھے کہ اگر ہم ناپاک اور بے حیا ہیں اور وہ بڑے پاکباز ہیں تو ان کا ہماری بستی سے کیا واسطہ ان کو یہاں سے نکالو۔

حضرت لوط علیہ السلام نے پھر ایک مرتبہ بھری محفل میں ان کو نصیحت کی اور فرمایا: تم کو اتنا بھی احساس نہیں رہا ہے کہ یہ سمجھ سکو کہ مردوں کے ساتھ بے حیائی کا تعلق، لوٹ مار، اور اسی قسم کی بداخلاقیاں بہت برے اعمال ہیں، تم یہ سب کچھ کرتے ہو اور بھری محفلوں اور مجلسوں میں کرتے ہو اور شرمندہ ہونے کے بجائے بعد میں ان کا ذکر اس طرح سناتے ہو کہ گویا یہ کارنامے ہیں جو تم نے انجام دیئے ہیں۔

﴿اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ﴾ (العنکبوت: ۲۹)

"کیا تم ہی وہ نہیں ہو کہ تم مردوں سے بدعملی کرتے اور لوگوں کو راہ مارتے ہو اور اپنی مجلسوں میں اور اہل و عیال کے روبرو

فواحش کرتے ہو۔"

قوم نے اس نصیحت کو سنا تو غم و غصہ سے تلملا اٹھی اور کہنے لگی: لوط (علیہ السلام)! بس یہ نصیحتیں اور عبرتیں ختم کر، اور اگر ہمارے ان اعمال سے تیرا خدا ناراض ہے تو وہ عذاب لا کر دکھا جس کا ذکر کر کے بار بار ہم کو ڈراتا ہے اور اگر تو واقعی اپنے قول میں سچا ہے تو ہمارا تیرا فیصلہ ہو جانا ہی اب ضروری ہے۔

﴿فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝﴾ (العنکبوت: ۲۹)

"پس اس (لوط علیہ السلام) کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ کہنے لگے تو ہمارے پاس اللہ کا عذاب لے آ، اگر تو سچا ہے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ملائکۃ اللہ:

ادھر یہ ہو رہا تھا اور دوسری جانب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جنگل میں سیر کر رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ تین اشخاص سامنے کھڑے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نہایت متواضع اور مہمان نواز تھے اور ہمیشہ ان کا دستر خوان مہمانوں کے لیے وسیع تھا، اس لیے ان تینوں کو دیکھ کر وہ بے حد مسرور ہوئے اور ان کو اپنے گھر لے گئے اور بچھڑا ذبح کر کے تکے بنائے اور بھون کر مہمانوں کے سامنے پیش کیے، مگر انہوں نے کھانے سے انکار کیا، یہ دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سمجھا کہ یہ کوئی دشمن ہیں جو حسب دستور کھانے سے انکار کر رہے ہیں اور کچھ خائف ہوئے کہ آخر یہ کون ہیں؟

مہمانوں نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اضطراب دیکھا تو ان سے ہنس کر کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں! ہم خدا کے فرشتے ہیں اور قوم لوط کی تباہی کے لیے بھیجے گئے ہیں، اس لیے سدوم جا رہے ہیں۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان ہو گیا کہ یہ دشمن نہیں ہیں بلکہ ملائکۃ اللہ ہیں تو اب ان کی رقت قلب، جذبہ ہمدردی اور محبت و شفقت کی فراوانی غالب آئی اور انہوں نے قوم لوط کی جانب سے جھگڑنا شروع کر دیا اور فرمانے لگے کہ تم اس قوم کو کیسے برباد کرنے جا رہے ہو جس میں لوط جیسا خدا کا برگزیدہ نبی موجود ہے، اور وہ میرا برادر زادہ بھی ہے، اور ملت حنیف کا پیرو بھی، فرشتوں نے کہا: ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں مگر خدا کا یہ فیصلہ ہے کہ قوم لوط اپنی سرکشی، بدعملی، بے حیائی اور فواحش پر اصرار کی وجہ سے ضرور ہلاک کی جائے گی، اور لوط اور اس کا خاندان اس عذاب سے محفوظ رہے گا البتہ لوط کی بیوی قوم کی حمایت اور ان کی بداعمالیوں اور بدعقیدگیوں میں شرکت کی وجہ سے قوم لوط کے ساتھ عذاب پائے گی۔

﴿فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَ جَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ۝ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَ اِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ۝﴾ (ہود: ۷۴۔۷۶)

"پھر جب ابراہیم (علیہ السلام) سے خوف جاتا رہا اور اس کو ہماری بشارت (ولادت اسحاق) پہنچ گئی تو وہ ہم سے قوم لوط کے متعلق جھگڑنے لگا، بیشک ابراہیم بردبار، غمخوار، رحیم ہے، اے ابراہیم! اس معاملہ میں نہ پڑ، بلاشبہ تیرے رب کا حکم آ چکا

ہے اور بلاشبہ ان پر عذاب آنے والا ہے جو کسی طرح ٹل نہیں سکتا۔"

﴿قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝﴾ (الذاریات: ۳۱-۳۴)

"ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا: "اے خدا کے بھیجے ہوئے فرشتو! تم کس لیے آئے ہو" انہوں نے کہا: "ہم مجرم قوم کی جانب بھیجے گئے ہیں تا کہ ہم ان پر پتھروں کی بارش کریں، یہ نشان کر دیا گیا ہے تیرے رب کی جانب سے حد سے گذرنے والوں کے لیے۔"

﴿وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ڭ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۡ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝﴾ (العنکبوت: ۳۱-۳۲)

"اور جب ہمارے فرشتے، ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے کہنے لگے بیشک ہم ہلاک کرنے والے ہیں اس (سدوم) قریہ کے بسنے والوں کو بلاشبہ اس کے باشندے ظالم ہیں، ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کہ اس بستی میں تو لوط ہے فرشتوں نے کہا ہمیں خوب معلوم ہے جو اس بستی میں آباد ہیں، ہم البتہ لوط کو اور اس کے خاندان کو نجات دیں گے مگر اس کی بی بی کو نہیں کہ وہ بھی بستی میں رہ جانے والوں کے ساتھ ہے۔"

غرض حضرت لوط علیہ السلام کے ابلاغ حق، امر بالمعروف، اور نہی عن المنکر کا قوم پر مطلق کچھ اثر نہ ہوا اور وہ اپنی بداخلاقیوں پر اسی طرح قائم رہی، حضرت لوط علیہ السلام نے یہاں تک غیرت دلائی کہ تم اس بات کو نہیں سوچتے کہ میں رات دن جو اسلام اور صراط مستقیم کی دعوت و پیغام کے لیے تمہارے ساتھ حیران و سرگرداں ہوں کیا کبھی میں نے تم سے اس سعی و کوشش کا کوئی ثمرہ طلب کیا، کیا کوئی اجرت مانگی، کسی نذر و نیاز کا طالب ہوا؟ میرے پیش نظر تو تمہاری دینی و دنیوی سعادت و فلاح کے سوائے اور کچھ بھی نہیں ہے، مگر تم ہو کہ مطلق توجہ نہیں کرتے۔

﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ۨالْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ وَ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (الشعراء: ۱۶۰-۱۶۴)

"جھٹلایا قوم لوط (علیہ السلام) نے پیغمبروں کو جب کہ کہا ان کے بھائی لوط نے کیا تم نہیں ڈرتے، بیشک میں تمہارے لیے پیغمبر ہوں امانت والا، پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو، اور میں تم سے (اس نصیحت پر) اجرت نہیں مانگتا، میرا اجر اللہ رب العالمین کے سوائے کسی کے پاس نہیں۔"

مگر ان کے تاریک دلوں پر اس کہنے کا بھی مطلق کچھ اثر نہ ہوا۔ اور وہ حضرت لوط علیہ السلام کو "اخراج" اور سنگساری کی

دھمکیاں دیتے رہے، جب نوبت یہاں تک پہنچی اور ان کی سیہ بختی نے کسی طرح اخلاقی زندگی پر آمادہ نہ ہونے دیا، تب ان کو بھی وہی پیش آیا جو خدا کے بنائے ہوئے قانون جزا کا یقینی اور حتمی فیصلہ ہے یعنی بدکرداریوں پر اصرار کی سزا بربادی و ہلاکت، غرض ملائکۃ اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے روانہ ہو کر سدوم پہنچے اور لوط علیہ السلام کے یہاں مہمان ہوئے، یہ اپنی شکل وصورت میں حسین و خوبصورت اور عمر میں نوجوان لڑکوں کی شکل وصورت میں تھے، حضرت لوط علیہ السلام نے ان مہمانوں کو دیکھا تو گھبرا گئے اور ڈرے کہ بدبخت قوم میرے ان مہمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کرے گی، کیونکہ ابھی تک ان کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ خدا کے پاک فرشتے ہیں۔

ابھی حضرت لوط علیہ السلام اسی حیص وبیص میں تھے کہ قوم کو خبر لگ گئی اور لوط علیہ السلام کے مکان پر چڑھ آئے اور مطالبہ کرنے لگے کہ تم ان کو ہمارے حوالہ کرو، حضرت لوط علیہ السلام نے بہت سمجھایا، اور کہا کیا تم میں کوئی بھی سلیم فطرت انسان "رجل رشید" نہیں ہے کہ وہ انسانیت کو برتے اور حق کو سمجھے؟ تم کیوں اس لعنت میں گرفتار ہو، اور خواہشات نفس کے ایفاء کے لیے فطری طریق عمل کو چھوڑ کر اور حلال طریقہ سے عورتوں کو رفیقۂ حیات بنانے کی جگہ اس ملعون بے حیائی کے درپے ہو، اے کاش میں "رکن شدید" کی زبردست حمایت حاصل کر سکتا۔

حضرت لوط علیہ السلام کی اس پریشانی کو دیکھ کر فرشتوں نے کہا، آپ ہماری ظاہری صورتوں کو دیکھ کر گھبرائیے نہیں، ہم ملائکہ عذاب ہیں اور خدا کے قانون "جزائے اعمال" کا فیصلہ ان کے حق میں اٹل ہے، وہ اب ان کے سر سے ٹلنے والا نہیں، آپ اور آپ کا خاندان عذاب سے محفوظ رہے گا، مگر آپ کی بیوی ان ہی بے حیاؤں کی رفاقت میں رہے گی اور تمہارا ساتھ نہ دے گی۔

آخر عذاب الٰہی کا وقت آ پہنچا، ابتداء شب ہوئی تو ملائکہ کے اشارہ پر حضرت لوط علیہ السلام اپنے خاندان سمیت دوسری جانب سے نکل کر سدوم سے رخصت ہو گئے اور ان کی بیوی نے ان کی رفاقت سے انکار کر دیا اور راستہ ہی سے لوٹ کر سدوم واپس آ گئی، آخر شب ہوئی تو اوّل ایک ہیبت ناک چیخ نے اہل سدوم کو تہ و بالا کر دیا اور پھر آبادی کا تختہ اوپر اٹھا کر اُلٹ دیا گیا اور اُوپر سے پتھروں کی بارش نے ان کا نام ونشان تک مٹا دیا اور وہی ہوا جو گذشتہ قوم کی نافرمانی اور سرکشی کا انجام ہو چکا ہے۔

﴿ فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوۡطِ ۣالۡمُرۡسَلُوۡنَ ۙ﴿۶۱﴾ قَالَ اِنَّکُمۡ قَوۡمٌ مُّنۡکَرُوۡنَ ﴿۶۲﴾ قَالُوۡا بَلۡ جِئۡنٰکَ بِمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَمۡتَرُوۡنَ ﴿۶۳﴾ وَ اَتَیۡنٰکَ بِالۡحَقِّ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ ﴿۶۴﴾ فَاَسۡرِ بِاَہۡلِکَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّیۡلِ وَ اتَّبِعۡ اَدۡبَارَہُمۡ وَ لَا یَلۡتَفِتۡ مِنۡکُمۡ اَحَدٌ وَّ امۡضُوۡا حَیۡثُ تُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۶۵﴾ وَ قَضَیۡنَاۤ اِلَیۡہِ ذٰلِکَ الۡاَمۡرَ اَنَّ دَابِرَ ہٰۤؤُلَآءِ مَقۡطُوۡعٌ مُّصۡبِحِیۡنَ ﴿۶۶﴾ وَ جَآءَ اَہۡلُ الۡمَدِیۡنَۃِ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ ﴿۶۷﴾ قَالَ اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ ضَیۡفِیۡ فَلَا تَفۡضَحُوۡنِ ۙ﴿۶۸﴾ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ وَ لَا تُخۡزُوۡنِ ﴿۶۹﴾ قَالُوۡۤا اَوَ لَمۡ نَنۡہَکَ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ ہٰۤؤُلَآءِ بَنٰتِیۡۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ فٰعِلِیۡنَ ﴿ؕ۷۱﴾ لَعَمۡرُکَ اِنَّہُمۡ لَفِیۡ سَکۡرَتِہِمۡ یَعۡمَہُوۡنَ ﴿۷۲﴾ فَاَخَذَتۡہُمُ الصَّیۡحَۃُ مُشۡرِقِیۡنَ ﴿ۙ۷۳﴾ فَجَعَلۡنَا عَالِیَہَا سَافِلَہَا وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ حِجَارَۃً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ﴿ؕ۷۴﴾ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِیۡنَ ﴿۷۵﴾ ﴾

(الحجر: ۶۱-۷۵)

"اور پھر جب ایسا ہوا کہ بھیجے ہوئے (فرشتے) خاندان لوط کے پاس پہنچے، تو انہوں نے کہا "تم لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہو" انہوں نے کہا نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ ہم تمہارے پاس وہ بات لے کر آئے ہیں، جس میں لوگ شک کیا کرتے تھے (یعنی ہلاکت کے ظہور کی خبر جس کا لوگوں کو یقین نہ تھا) ہمارا آنا ایک امر حق کے لیے ہے، اور ہم اپنے بیان میں سچے ہیں، پس چاہیے کہ کچھ رات رہے اپنے گھروں کے لوگوں کو لے کر نکل جاؤ اور ان کے پیچھے قدم اٹھاؤ، اور اس بات کا خیال رکھو کہ کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے، جہاں جانے کا حکم دیا گیا ہے (اسی طرح رخ کیے چلے جائیں) غرضیکہ ہم نے لوط پر حقیقت حال واضح کر دی کہ ہلاکت کا ظہور ہونے والا ہے اور باشندگان شہر کی بیخ و بنیاد صبح ہوتے ہوتے اکھڑ جانے والی ہے اور اس (اثناء میں ایسا ہوا کہ) شہر کے لوگ خوشیاں مناتے ہوئے آ پہنچے، لوط علیہ السلام نے کہا دیکھو یہ (نئے آدمی) میرے مہمان ہیں تم میری فضیحت نہ کرو، اللہ سے ڈرو تم میری رسوائی کے کیوں درپے ہو گئے ہو؟" انہوں نے کہا: "کیا ہم نے تجھے اس بات سے نہیں روک دیا تھا کہ کسی قوم کا آدمی ہو، لیکن اپنے یہاں نہ ٹھہراؤ" لوط (علیہ السلام) نے کہا اگر ایسا ہی ہے تو "دیکھو یہ میری بیٹیاں (کھڑی) ہیں (یعنی باشندگان شہر کی بیویاں جن کی طرف وہ ملتفت نہیں ہوتے تھے) ان کی طرف ملتفت ہو" (تب فرشتوں نے لوط سے کہا) تمہاری زندگی کی قسم، یہ لوگ تو اپنی بدمستیوں میں کھوئے گئے ہیں (تمہاری باتیں ماننے والے نہیں) غرضیکہ سورج نکلتے نکلتے ایک ہولناک آواز نے انہیں آ لیا، پس ہم نے وہ بستی زیروزبر کر ڈالی اور پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی ان پر بارش کی بلاشبہ اس واقعہ میں ان لوگوں کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو (حقیقت کی) پہچان رکھنے والے ہیں۔"

﴿وَ لَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَا لُوۡطًا سِیۡٓءَ بِہِمۡ وَ ضَاقَ بِہِمۡ ذَرۡعًا وَّ قَالَ ہٰذَا یَوۡمٌ عَصِیۡبٌ ۝ وَ جَآءَہٗ قَوۡمُہٗ یُہۡرَعُوۡنَ اِلَیۡہِ ؕ وَ مِنۡ قَبۡلُ کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ ہٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیۡ ہُنَّ اَطۡہَرُ لَکُمۡ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ لَا تُخۡزُوۡنِ فِیۡ ضَیۡفِیۡ ؕ اَلَیۡسَ مِنۡکُمۡ رَجُلٌ رَّشِیۡدٌ ۝ قَالُوۡا لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَا لَنَا فِیۡ بَنٰتِکَ مِنۡ حَقٍّ ۚ وَ اِنَّکَ لَتَعۡلَمُ مَا نُرِیۡدُ ۝ قَالَ لَوۡ اَنَّ لِیۡ بِکُمۡ قُوَّۃً اَوۡ اٰوِیۡۤ اِلٰی رُکۡنٍ شَدِیۡدٍ ۝ قَالُوۡا یٰلُوۡطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنۡ یَّصِلُوۡۤا اِلَیۡکَ فَاَسۡرِ بِاَہۡلِکَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّیۡلِ وَ لَا یَلۡتَفِتۡ مِنۡکُمۡ اَحَدٌ اِلَّا امۡرَاَتَکَ ؕ اِنَّہٗ مُصِیۡبُہَا مَاۤ اَصَابَہُمۡ ؕ اِنَّ مَوۡعِدَہُمُ الصُّبۡحُ ؕ اَلَیۡسَ الصُّبۡحُ بِقَرِیۡبٍ ۝ فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِیَہَا سَافِلَہَا وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہَا حِجَارَۃً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۬ۙ مَّنۡضُوۡدٍ ۝ مُّسَوَّمَۃً عِنۡدَ رَبِّکَ ؕ وَ مَا ہِیَ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ بِبَعِیۡدٍ ۝﴾ (ھود: ۷۷۔۸۳)

"اور پھر جب ایسا ہوا کہ ہمارے فرستادے لوط کے پاس پہنچے، تو وہ ان کے آنے سے خوش نہ ہوا اور ان کی موجودگی نے اسے پریشان کر دیا، وہ بولا "آج کا دن تو بڑی مصیبت کا دن ہے!" اور اس کی قوم کے لوگ (اجنبیوں کے آنے کی خبر سن کر) دوڑتے ہوئے آئے وہ پہلے سے برے کاموں کے عادی ہو رہے تھے، لوط نے ان سے کہا "لوگو! یہ میری بیٹیاں ہیں

(یعنی بستی کی عورتیں جنہیں وہ اپنی بیٹیوں کی جگہ سمجھتا تھا، اور جنہیں لوگوں نے چھوڑ رکھا تھا) یہ تمہارے لیے جائز اور پاک ہیں، پس (ان کی طرف ملتفت ہو، دوسری بات کا قصد نہ کرو اور) اللہ سے ڈرو، میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسواء نہ کرو، کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں؟" ان لوگوں نے کہا تجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تیری ان بیٹیوں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں اور تو اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں لوط (علیہ السلام) نے کہا: "کاش تمہارے مقابلہ کی مجھے طاقت ہوتی یا کوئی اور سہارا ہوتا جس کا آسرا پکڑ سکتا" (تب) مہمانوں نے کہا: اے لوط! "ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں (گھبرانے کی کوئی بات نہیں) یہ لوگ کبھی تجھ پر قابو نہ پاسکیں گے تو یوں کر کہ جب رات کا ایک حصہ گزر جائے تو اپنے گھر کے آدمیوں کو ساتھ لے کر نکل چل، اور تم میں سے کوئی اِدھر اُدھر نہ دیکھے (یعنی کسی بات کی فکر نہ کرے) مگر ہاں تیری بیوی (ساتھ دینے والی نہیں، وہ پیچھے رہ جائے گی، اور) جو کچھ ان لوگوں پر گذرتا ہے وہ اس پر بھی گذرے گا، ان لوگوں کے لیے عذاب کا مقررہ وقت صبح کا ہے، اور صبح کے آنے میں کچھ دیر نہیں" پھر جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آ پہنچا تو (اے پیغمبر!) ہم نے اس (بستی) کی تمام بلندیاں پستی میں بدل دیں (یعنی بستی کو اُلٹ دیا) اور زمین کے برابر کر دیا) اور اس پر آگ میں پکے ہوئے پتھر لگا تار برسائے تیرے پروردگار کے حضور (اس غرض) سے نشانی کیے ہوئے تھے، یہ (بستی) ان ظالموں سے (یعنی اشرار مکہ سے) کچھ دور نہیں ہے (یہ اپنی سیر و سیاحت میں وہاں سے گذرتے رہتے ہیں، اور اگر چاہیں، تو اس سے عبرت پکڑ سکتے ہیں)۔"

﴿فَنَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ۙ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ۚ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۚ وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ (الشعراء: ۱۷۰-۱۷۵)

"پھر بچا دیا ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو سب کو مگر ایک بڑھیا رہ گئی رہنے والوں میں، پھر اٹھا مارا ہم نے ان دوسروں کو اور برسایا ان پر ایک برساؤ، سو کیا بُرا برساؤ تھا ان ڈرائے ہوؤں کا، البتہ اس بات میں نشانی ہے، اور ان میں بہت لوگ نہیں تھے ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا۔"

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّ قِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝﴾

(التحریم: ۱۰)

"اللہ نے بتلائی ایک مثال منکروں کے واسطے عورت نوح کی اور عورت لوط کی، گھر میں تھیں دونوں دو نیک بندوں کے ہمارے نیک بندوں میں سے، پھر انہوں نے ان سے خیانت کی پھر وہ کام نہ آئے ان کے اللہ کے ہاتھ سے کچھ بھی اور حکم ہوا کہ چلی جاؤ دوزخ میں جانے والوں کے ساتھ۔"

مسائل:

① مسطورۂ بالا آیات میں حضرت لوط علیہ السلام کے یہ مقولے مذکور ہیں: ﴿هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ﴾ یعنی حضرت لوط علیہ السلام نے قوم کی مزاحمت اور مہمانوں سے متعلق مطالبہ سے تنگ آ کر یہ فرمایا کہ "تم ان مہمانوں سے تعرض نہ کرو، اگر نفس کی فطری خواہش پوری کرنا چاہتے ہو تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں، یہ تمہارے لیے پاک ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟ ایک باعصمت و باعزت انسان اور پھر وہ بھی نبی معصوم، کس طرح یہ گوارا کر سکتا ہے کہ وہ اپنی باعصمت لڑکیوں کو ایسے بے حیا اور خبیث انسانوں کے سامنے پیش کرے؟ اس سوال کے حل میں علماء محققین نے مختلف جواب دیئے ہیں۔

(ا) حضرت لوط علیہ السلام نبی ہیں اور ہر ایک نبی اپنی قوم کا روحانی باپ ہوتا ہے، قوم مسلمان ہو کر اس کی اطاعت گذار ثابت ہو، یا انکار کر کے متمرد و منحرف، دونوں صورتوں میں وہ اس کی "امت" میں داخل ہے، اگرچہ پہلی امت "امت اجابت" ہے اور دوسری "امت دعوت" اور اس لیے تمام امت اس کی اولاد ہوتی ہے اور نبی اور رسول اس کا روحانی باپ۔

لہٰذا حضرت لوط علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ بدبختو! تمہارے گھروں میں یہ سب میری بیٹیاں تمہاری رفیقۂ حیات ہیں اور تمہارے لیے حلال، پھر تم ان کو چھوڑ کر اس ملعون اور خبیث کام پر اصرار کرتے ہو ایسا نہ کرو (العیاذ باللہ) یہ مقصد نہ تھا کہ وہ اپنی صلبی لڑکیاں ان کو پیش فرما رہے تھے۔

(ب) تورات اور دیگر روایات سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو "اسحاق علیہ السلام" کی بشارت دے کر قوم لوط کو ہلاک کرنے آئے تھے تین تھے، اس لیے یہ ناممکن تھا کہ تین افراد کے لیے پوری بستی خواہش مند ہو جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے، بلکہ اصل بات یہ تھی کہ اس قوم میں دو سردار تھے اور انہوں نے ہی لوط علیہ السلام کے مہمانوں کا مطالبہ کیا تھا، باقی قوم اپنی اس عام بدکرداری کی وجہ سے ان کی حمایت میں جمع ہو گئی تھی اور چونکہ حضرت لوط علیہ السلام کی دو بیٹیاں کنواری موجود تھیں اس لیے انہوں نے ان دونوں سرداروں کو سمجھایا کہ تم اپنے اس خبیث و شنیع مطالبہ سے باز آ جاؤ، اور میں اس کے لیے تیار ہوں کہ اپنی دونوں لڑکیوں کا نکاح تم سے کر دوں مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا، اور کہنے لگے، لوط! تجھے معلوم ہے کہ ہم عورتوں کی جانب رغبت نہیں رکھتے۔

(ج) حضرت لوط علیہ السلام نے بیشک اپنی بیٹیوں ہی کے متعلق یہ جملہ فرمایا تھا مگر اس کی حیثیت اس بزرگ کے مقولہ کی طرح ہے جو کسی کو ناحق پٹتا ہوا دیکھ کر ظالم مارنے والے سے یہ کہے کہ اس کو نہ مار اس کے عوض مجھ کو مار لے، حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ وہ کبھی ایسی جرأت نہیں کر سکے گا کیوں کہ وہ اس کا چھوٹا ہے یا ماتحت۔

پس جس طرح اس شخص کا مقصد مارنے والے کو عار اور شرم دلانا ہوتا ہے، اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو شرم اور عار دلانے اور اس قبیح فعل پر ذلیل اور نادم کرنے کے لیے یہ جملہ فرمایا اور ان کو یہ یقین تھا کہ نہ یہ بدبخت اس طرف راغب ہوں گے اور نہ وہ عملاً ایسا کریں گے۔

امام رازی، اصفہانی اور ابوالسعود اسی توجیہ کو پسند فرماتے ہیں اور عبدالوہاب نجار مصری کی بھی یہی رائے ہے، مگر میرے

نزدیک پہلی توجیہ زیادہ صحیح اور قابل قبول ہے اور علامہ عبدالوہاب کا اس کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ "یہ قول اس لیے کمزور ہے کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام ان کافر عورتوں کے باپ تسلیم کئے جائیں" اس لیے کہ ہم شروع جواب ہی میں تصریح کر چکے ہیں کہ "نبی معصوم" اپنی اس تمام امت کا روحانی باپ ہوتا ہے جس کی جانب اس کو مبعوث کیا گیا ہے، یہ جدا بات ہے کہ امت اجابت اس کی عطاء کردہ سعادت و فلاح سے مستفید ہوتی ہے اور امت دعوت اس سے محروم رہتی ہے، نیز آج بھی یہ دستور ہے کہ کافر و مسلم کے امتیاز کے بغیر بڑے بوڑھے بستی کی لڑکیوں کو اپنی بیٹیاں کہا کرتے ہیں۔

② حضرت لوط علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ قوم ان کے مہمانوں کے ساتھ بداخلاقی پر تلی ہوئی ہے اور کسی طرح ان پر عار دلانے کا اثر ہوتا ہے نہ حیاء و مروت اور اخلاق و انسانیت کے نام پر اپیل کا، تب پریشان خاطر ہوکر فرمایا:

﴿ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ ۝﴾ (ھود: ۸۰)

"کاش میرے لیے تم سے (مقابلہ کی) طاقت ہوتی یا پناہ ملتی کسی زبردست قوت پناہ کے ساتھ۔"

اس "رکن شدید" سے کیا مراد ہے، کیا حضرت لوط علیہ السلام "العیاذ باللہ" خدا کی قدرت پر بھروسہ نہیں رکھتے تھے جو کسی "رکن شدید" کی پناہ کے طالب تھے؟

اس مشکل کا حل بخاری کی روایت نے بخوبی کر دیا ہے، اس روایت میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

یغفر اللّٰہ للوط ان کان لیاوی الی رکن شدید، وھو ربه وخالقه۔ ❶

"اللہ تعالیٰ لوط علیہ السلام کی بخشش کرے (کہ وہ اس درجہ پریشان کیے گئے) کہ رکن شدید کی پناہ کے طالب ہوئے اور ان کے لیے رکن شدید ان کا پروردگار اور ان کا خالق ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام خدا کو بھول کر کسی اور قوت کی پناہ کے طالب نہ تھے بلکہ وہ اس درجہ قابل رحم حالت میں تھے کہ اس وقت ان کی یہ تمنا ہوئی، کاش کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی قوت عطا کرتا کہ میں اسی وقت ان سب بدبختوں کو ان کی خباثت کا مزہ چکھا سکتا، اور "رکن شدید" یعنی اس کے پروردگار نے آخر ان کی مدد کی اور ان پر فرشتوں نے اپنا راز ظاہر کر دیا اور ان کو تسلی اور اطمینان بخشا کہ آپ پریشان نہ ہوں تھوڑا ہی وقت گذرتا ہے کہ یہ اپنی بدکرداری کے عبرتناک انجام کو پہنچ جائیں گے۔

③ بعض مفسرین نے ﴿بِكُمْ قُوَّةً﴾ میں ﴿كُمْ﴾ کا مخاطب فرشتوں کو سمجھا ہے، اور مراد یہ لیتے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا کاش تم اس کثرت سے ہوتے کہ ان کے مقابلہ میں مجھ کو تم سے قوت پہنچتی یا خدا کوئی ایسی صورت پیدا کر دیتا کہ میں ان کو سزا دے سکتا، اسی لیے حضرت لوط علیہ السلام کے اس قول کو سن کر فرشتوں نے کہا:

---

❶ تفسیر کی بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ "رکن شدید" میں رکن سے مراد خاندان ہے، حضرت لوط علیہ السلام نے سدوم کے باشندوں کی بے مروتی اور وحشت کو محسوس کیا تو یہ تقاضائے بشریت فرمایا، کاش کہ میں خاندان والوں سے وابستہ ہوتا تو یہ پریشانی نہ ہوتی، چنانچہ اس کے بعد حق تعالیٰ نے انبیاء و رسل کو ان کے اپنے خاندان اور برادری ہی میں مبعوث کیا، مگر یہ توجیہ مضبوط نہیں ہے اور اپنے اندر کافی سقم رکھتی ہے اس لئے صحیح توجیہ وہی ہے جو صحیح بخاری میں خود ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔

﴿قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ﴾ (ہود: ۸۱)

"فرشتوں نے کہا، اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں (مجبور انسان نہیں ہیں) یہ تجھ کو ہرگز ہرگز نہیں پہنچا سکتے۔"

تورات میں ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام مع اپنے خاندان کے سدوم سے ہجرت کر کے ضوغر یا ضغر کی بستی میں چلے گئے جو سدوم سے قریب ہی آباد تھی۔[1] آفتاب نکلنے کے بعد جب انہوں نے سدوم کی جانب دیکھا تو وہاں ہلاکت و بربادی کے نشانات کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام نے پھر ضغر کو بھی چھوڑ دیا، اور اس کے قریب ایک پہاڑی پر جا کر آباد ہوئے، اور امن و امان سے رہنے سہنے لگے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام مجدد انبیاء علیہم السلام:

ان مسلسل واقعات سے بہت سے بصائر و عبر وغیرہ حاصل ہونے کے علاوہ ایک سب سے اہم بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت منصب نبوت و رسالت میں بھی خاص امتیازی شان رکھتی ہے، یوں تو خدا کا ہر ایک پیغمبر توحید کا داعی اور شرک کا دشمن ہے اور اس لیے تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں یہ دو باتیں قدرے مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں، بلکہ روحانی دعوت و ارشاد کی اساس و بنیاد صرف انہی دو مسئلوں پر قائم ہے مگر یہ خصوصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے حصہ میں آئی تھی کہ اس دنیا میں وہ پہلی ہستی ہیں جنہیں اس راہ عزیمت میں سخت سے سخت آزمائشوں اور کڑی سے کڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اور وہ ان مصائب کے مقابلے میں کامران و کامیاب ثابت ہوئے۔

غور کیجئے بڑھاپے اور یاس کی عمر میں ہزاروں تمناؤں اور لاکھوں آرزوؤں کے بعد ایک بچہ پیدا ہوا تھا اور ابھی بچہ شیر خوار ہے کہ خدائے تعالیٰ کا حکم آتا ہے "ابراہیم (علیہ السلام)! اس لو اور اس کی والدہ کو اپنے گھر سے جدا کرو، اور ایک لق و دق بیابان اور بن کھیتی کی زمین میں "جہاں نہ پانی ہے نہ سبزہ" ان دونوں کو چھوڑ آؤ پھر کیا ہوا؟ کیا ابراہیم علیہ السلام نے ایک لمحہ بھی تامل کیا؟ اور تعمیل ارشاد میں کسی قسم کا کوئی عذر سامنے آیا؟ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ بے چون و چرا ان دونوں کو مکہ کی سرزمین پر چھوڑ آئے۔

اور اس کے بعد جب وہ سن رشد کو پہنچتا اور ماں باپ کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنتا ہے تو اب پھر ابراہیم (علیہ السلام) کو خدا کا حکم ملتا ہے کہ اس کو ہمارے نام پر قربان کرو اور اپنی فدا کاری و اطاعت شعاری کا ثبوت دو۔

اس نازک وقت میں ایک مطیع سے مطیع اور فرمانبردار سے فرمانبردار ہستی کے ایمان و یقین کی کشتی کس طرح بھنور میں آ جاتی ہے اس کا اندازہ خود کرو، اور پھر ابراہیم علیہ السلام کی جانب دیکھو کہ نہ خدا کی وحی کی جو "خواب اور رؤیا کی شکل میں" دکھائی گئی تھی، انہوں نے کوئی تاویل کی، نہ اس کے لیے حیلہ بہانہ سوچا، اور نہ اس کو ٹالنے کے لیے کوئی فکر و تردد کیا، صبح اٹھے اور اپنے لخت جگر کو لیا اور تعمیل ارشاد الٰہی میں وہ سب کچھ کیا جو ان کے انسانی ہاتھ کر سکتے تھے اور اس طرح اپنی محیر العقول وفا کیشی کا ثبوت دیا۔

اور تیسری سخت آزمائش کا وہ وقت تھا کہ جب باپ، قوم اور بادشاہ وقت سب نے متفق ہو کر یہ فیصلہ کر لیا کہ ابراہیم علیہ السلام یا پیغام حق سے باز آ جائے ورنہ تو اس کو دہکتی آگ میں ڈال کر خاکستر کر دیا جائے، تب ظالموں کا یہ فیصلہ اور اتحاد کیا ابراہیم علیہ السلام

---

[1] پیدائش باب ۱۹ آیت ۲۲

کو ڈگمگا سکا؟ نہیں! بلکہ وہ ایک عزم کا پہاڑ بن کر اسی طرح اپنی جگہ کھڑا رہا، اور پیغام حق اور خدا کی رشد و ہدایت کو اسی عزم و ثبات کے ساتھ سناتا رہا جس طرح شروع سے کرتا رہا، پھر دشمنوں نے جو کچھ کہا تھا آخر کر دکھایا اور اس کو دہکتی آگ میں جھونک دیا، مگر ابراہیم علیہ السلام کے سکون و اطمینان میں مطلق کوئی فرق نہیں آیا، البتہ دشمنوں کی دشمنی اور ان کے تمام مکر و فریب کو ابراہیم علیہ السلام کے خدا نے پادر ہوا کر دیا اور خاک میں ملا دیا، اور آگ کے شعلے اس کے لیے "برد و سلام" بن گئے، اور اس طرح ابراہیم علیہ السلام اپنے قوی تر نگہبان کے زیر سایہ سعادت و ہدایت کے فیضان سے بندگان خدا کو برابر منور و روشن کرتا رہا اور اس کی جرأت حق اور دعوت الی اللہ تیز تر ہو گئی۔

ان تمام سخت امتحانوں اور آزمائشوں اور پھر ان میں ثبات قدمی اور استقامت کے علاوہ ابراہیم علیہ السلام کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے شرک اور توحید کی متضاد زندگی کے لیے ایک ایسا امتیاز قائم کر دیا جو انہی جیسے جلیل القدر پیغمبر کے شایان شان تھا۔

﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ (الانعام: ۷۹)

"بلاشبہ میں نے اپنا رخ اسی ذات کی طرف جھکا دیا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے، خالص اس کا ہو کر اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

ابراہیم علیہ السلام کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے تصور کی دو راہیں ہیں ایک صحیح اور دوسری غلط، غلط راہ یہ ہے کہ یہ عقیدہ قائم کر لیا جائے کہ خدا کو راضی کرنے، اس کو خوش رکھنے اور اس کی عبادت و پرستش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بتوں اور ستاروں کی پوجا کی جائے کیونکہ جب یہ ارواح ہم سے خوش ہو جائیں گی یہ تو خدا کو ہم سے راضی کر دیں گی، اس عقیدہ کا نام "شرک اور صابئیت ہے" کیونکہ اس عقیدہ کے مطابق عبودیت و پرستش کے تمام وہ خصوصی امتیازات جو صرف "ذات واحد" کے لیے مخصوص رہنے چاہیے تھے دوسروں کے لیے بھی مشترک ہو جاتے ہیں، اور یہی شرک کی حقیقت ہے۔

اس کے مقابلہ میں صحیح راہ یہ ہے کہ اس علم و یقین کو عقیدہ بنایا جائے کہ خدائے تعالیٰ کی رضا مندی اور خوشنودی کا طریقہ اس کے علاوہ دوسرا نہیں ہے کہ خود اسی کی پرستش کی جائے اسی کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے، نفع و ضرر، صحت و مرض، افلاس و تمول، رزق کا قبض و بسط اور موت و زیست غرض تمام امور میں اسی کو اور صرف اسی کو مالک و مختار مطلق تسلیم کیا جائے اور اس کی رضا و عدم رضاء کی معرفت کے لیے اس کے بھیجے ہوئے سچے پیغمبروں اور رسولوں کی ہی ہدایت و رشد پر عمل کیا جائے، گویا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیا جائے کہ خدا کو راضی رکھنے اور اس سے قربت حاصل کرنے کے لیے دیوی دیوتاؤں کو ذریعہ بنانے کی حاجت نہیں بلکہ صرف اس ذات احدیت کی عبودیت و بندگی کو سرمایہ حیات بنایا جائے، اسی عقیدہ کا نام "اسلام" اور "حنیفیت" ہے۔

اس لیے یہ پہلا دن تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلی راہ کو شرک و صابئیت اور دوسری راہ کو اسلام و حنیفیت کا نام دے کر دونوں راہوں کے درمیان مستقل امتیاز قائم کر دیا اور یہ امتیاز ایسا مقبول ہوا کہ آنے والی تمام پیغمبرانہ تعلیم و دعوت کی بنیاد و اساس اسی نام سے موسوم کی گئیں حتیٰ کہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری پیغام کا نام بھی "ملت حنیف" اور اس کے پیرو کا نام "مسلم" قرار پایا۔

﴿ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ﴾ (النحل: ۱۲۳)

"اور پیروی کر وملت ابراہیم کی جو حنیف تھا۔"

﴿ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِیْ هٰذَا ﴾ (الحج: ۷۸)

"اس ابراہیم (علیہ السلام) نے تمہارا نام پہلے ہی سے مسلمان رکھا ہے اور اس قرآن میں بھی (یہی نام پسند رہا)"۔

یہی وجہ ہے کہ "سورۂ ابراہیم" کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں انبیاء علیہم السلام کے ظہور اور ان کے حالات وتشخصات اور نتائج کو مجموعی طور پر پیش کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ پیغمبروں کی دعوت رشد و ہدایت کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان کیا فرق ہے؟ اور یہ کہ خیر وشر، طاعت و بغاوت اور تسلیم و انکار میں کیا غیر اللہ کی خوشنودی کو بھی کوئی مقام حاصل ہے یا صرف رضاء وعدم رضاء الٰہی ہی اصل ایمان ہے؟

پس ان مجموعی خصوصیات ابراہیمی کے پیش نظر بلاشبہ یہ کہنا صحیح ہے کہ نبیوں اور رسولوں کی مقدس زندگی میں ابراہیم (علیہ السلام) کا مقام "مجدد انبیاء ورسل" کا مقام ہے۔

واقعات زیر بحث سے متعلق چند عبرتیں:

① جب انسان کسی عقیدہ کو علم ویقین کی روشنی میں قائم کر لیتا ہے، اور وہ اس کے قلب میں جا گزیں، اس کی روح میں پیوست، اور اس کے سینہ میں نقش کالحجر ہو جاتا ہے تو اس کا فکر وخیال، اس کا سوچ بچار، اور اس کا استغراق اس بارہ میں اس درجہ زبردست ثابت وراسخ ہو جاتا ہے کہ کائنات کا کوئی حادثہ اور دنیا کی کوئی سخت سے سخت مصیبت بھی اس کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی، وہ اس کے لیے آگ میں بے خطر کود پڑتا، سمندر میں بے جھجک چھلانگ مار دیتا اور سولی کے تختہ پر بے خوف جان دے دیتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عزم وثبات کی مثال اس کے لیے ایک زندہ اور روشن مثال ہے۔

② حمایت حق کے لیے ایسے دلائل و براہین پیش کرنے چاہئیں جو دشمن اور باطل پرست کے تہ قلب میں اتر جائیں اور وہ زبان سے خواہ اقرار حق نہ کرے لیکن اس کا ضمیر اور اس کا قلب حق کے اقرار پر مجبور ہو جائے بلکہ بعض مرتبہ زبان بھی بے اختیار اعلان حق سے باز نہ رہ سکے، آیت قرآن ﴿وجادلهم بالتي هي احسن﴾ اسی حقیقت کا اعلان کرتی ہے۔

③ پیغمبروں اور رسولوں کی راہ یہی ہے، وہ جدل ومخاصمت کی منطقیانہ راہوں پر نہیں چلتے، ان کے دلائل و براہین کی بنیاد محسوسات ومشاہدات پر ہوتی ہے یا سادہ وجدانیات وعقلیات پر، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصنام پرستی وکواکب پرستی کے متعلق جمہور سے مناظرہ اور مناظرۂ نمرود، اس کی واضح اور روشن مثال ہے۔

④ کسی امر حق کو ثابت کرنے کے لیے دلیل میں مخالف کے باطل عقیدہ کو فرضی طور پر تسلیم کر لینا جھوٹ یا اس باطل عقیدہ کا اقرار نہیں ہے بلکہ اس کو ﴿فرض الباطل مع الخصم﴾ یا ﴿معاریض﴾ کہا جاتا ہے اور یہ طریقہ استدلال مخالف کو اپنی غلطی کے اعتراف پر مجبور کر دیتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جمہور کے ساتھ مناظرہ میں دلیل کا یہی پہلو اختیار کیا تھا جس نے صنم پرستوں کو مجبور کر دیا کہ وہ

اقرار کرلیں کہ بیشک بت کسی حال میں بھی نہ سنتے ہیں اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔

⑤ اگر ایک مسلم کے والدین مشرک ہوں اور کسی طرح شرک سے باز نہ آتے ہوں تو ان کی مشرکانہ زندگی سے بیزار اور علیحدہ رہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ دنیوی معاملات اور آخرت کی پند ونصائح میں عزت وحرمت کا معاملہ کرنا چاہیے اور سختی اور درشتی کو کام میں نہ لانا چاہیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طرز عمل آزر کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کا طریق عمل ابوطالب کے ساتھ اس مسئلہ کے لیے قطعی اور یقینی شہادت ہے۔

⑥ اگر قلب مومن صحیح عقائد پر اطمینانِ قلب اور زبان وقلب کی مطابقت کے ساتھ ایمان رکھتا ہے، مگر عینی اور حقیقی مشاہدہ ومحسوس کے لیے یا اس کو حق الیقین کے درجہ تک حاصل کرنے کے لیے کسی ایمانی یا اعتقادی مسئلہ میں بھی سوال وجستجو کی راہ اختیار کرتا اور طمانیت قلب کا طالب ہوتا ہے تو یہ جستجو ریب وکفر نہیں ہے بلکہ عین ایمان ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جواب ﴿ولکن لیطمئن قلبی﴾ سے اسی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

⑦ دستر خوان کی وسعت اگر ریاء ونمود سے پاک ہو اور فطری تقاضے کے پیش نظر مہمان نوازی میں وسعت قلب اور فراخ حوصلگی پائی جاتی ہو تو اخلاق کریمانہ میں بہت فضیلت شمار ہوتی ہے اور "سخاءِ نفس" اور "کرم" کے نام سے موسوم ہے۔

یہ وصف گرامی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حقیقت نفس بن چکا تھا اور فطری تھا۔ مہمان نوازی، دستر خوان کی وسعت، آنے والوں کا احترام، ایسے اوصاف تھے جو ابراہیم علیہ السلام میں "مثل اعلیٰ" کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔

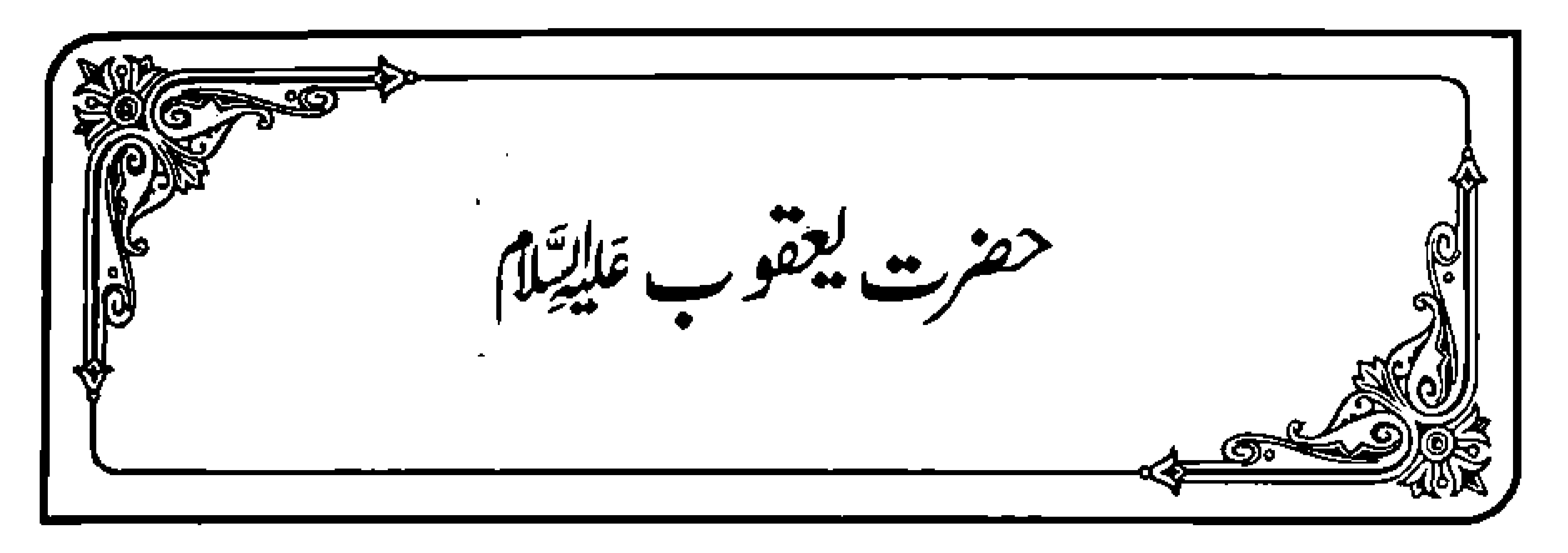
بعض کتابوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی کے سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ منقول ہے، کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حسب دستور حضرت ابراہیم علیہ السلام کسی مہمان کے انتظار میں جنگل میں کھڑے تھے، کیوں کہ بغیر مہمان کے نہ ان کا دستر خوان بچھتا اور نہ وہ کھانا کھاتے تھے، سامنے سے ایک بہت بوڑھا آدمی نظر پڑا جس کی کمر بھی کج ہوگئی تھی اور لکڑی کے سہارے بمشکل چل رہا تھا، ابراہیم علیہ السلام آگے بڑھے اور مسرت کے ساتھ اس کو سہارا دیتے ہوئے گھر لائے، دستر خوان بچھا، اور کھانا چنا گیا، جب سب فارغ ہوگئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا، اس خدائے یکتا کا شکر ادا کر جس نے ہم سب کو یہ نعمتیں عطا فرمائیں، بوڑھے نے غضبناک ہوکر کہا میں نہیں جانتا کہ تیرا خدائے واحد کون ہے، میں تو اپنے معبود (بت) کا شکر ادا کرتا ہوں جو میرے گھر میں رکھا ہے یہ جواب ابراہیم علیہ السلام کو بہت شاق گذرا، اور اس کو فوراً گھر سے رخصت کر دیا، لیکن کچھ وقفہ نہ گذرا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے دل اپنے اس طرز عمل سے تکدر ہوا، انہوں نے سوچا کہ جس خدائے واحد کا شکر میں اس سے کرانا چاہتا تھا اس کی شان تو یہ ہے کہ اس بوڑھے کی اس طویل عمر میں وہ برابر اپنی نعمتوں سے اس کو نوازتا رہا اور اس کی بت پرستی، کفر، اور شرک سے ناراض ہوکر ایک وقت بھی اس پر رزق کا دروازہ بند نہیں کیا پھر تجھ کو کیا حق تھا کہ اگر اس نے تیری بات نہ مانی اور حق کے کلمہ کو قبول نہ کیا تو خفا ہوکر اس کو گھر سے نکال دیا۔

یہ واقعہ اپنی تاریخی حیثیت میں قابل قبول ہو یا ناقابل قبول لیکن اس حقیقت کا ضرور اعلان کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اخلاق کریمانہ کی وہ بلندی جو "حقیقی مثل اعلیٰ" تک پہنچی ہوئی تھی ضرب المثل اور زبان زد خلائق تھی، اور بلاشبہ ان کا یہ فکر، پیغام اور دعوت اسلام کے لیے بہترین اسوہ ہے۔

⑧ اللہ تعالیٰ جن ہستیوں کو اپنے ابلاغ حق کے لیے چن لیتا ہے ان کے قلب و دماغ کو اپنے نور سے اس درجہ روشن کر دیتا ہے کہ ان کے سامنے عشق حق و صداقت کے سوائے دوسری کوئی چیز باقی ہی نہیں رہتی اور اس لیے ان میں شروع ہی سے یہ استعداد ودیعت ہوتی ہے کہ وہ عہد طفولیت ہی سے اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور نمایاں نظر آنے لگتے اور راہ حق میں ابتلاء و امتحان کو خوشی سے سہتے اور صبر و رضاء کا اسوۂ حسنہ پیش کرتے رہتے ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا واقعہ اس کی شہادت کے لیے شاہد عدل اور باعث صد ہزار عبرت و عظمت ہے۔

⑨ حضرت لوط علیہ السلام اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے برادر زادہ اور ان کے پیرو تھے مگر شرف نبوت سے بھی سرفراز ہو چکے تھے اور خدا کے ایلچی بنا دیئے گئے تھے اس لیے سدوم اور عامورہ میں ہمہ قسم کے مصائب اور وطن سے دور دشمنوں کے نرغہ کی تکالیف کے باوجود انہوں نے صبر و استقامت سے کام لیا اور اپنے بزرگ چچا اور خاندان کی مدد کی طلب کی بجائے صرف خدائے عزوجل ہی پر بھروسہ رکھتے ہوئے اس کے احکام کے سامنے رضا و تسلیم کا ثبوت دیا۔ یہ مقام "مقربین و انبیاء" کا مقام ہے۔





حضرت یعقوب علیہ السلام

○ نسب نامہ ○ قرآن عزیز میں ذکر یعقوب علیہ السلام ○ اولاد یعقوب علیہ السلام ○ ولادت یوسف علیہ السلام

نسب نامہ:

حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے ہیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے بتوئیل کے نواسہ، ان کی والدہ کا نام رفقہ یا ربقہ تھا، یہ اپنی والدہ کے چہیتے اور پیارے تھے اور ان کا حقیقی بھائی عیسو والد کا محبوب اور پیارا اور دونوں حقیقی بھائی تھے۔

تورات سے ان دونوں بھائیوں کی باہم ناراضی کا واقعہ گذشتہ سطور میں نقل کیا جا چکا ہے حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی والدہ کے اشارہ پر جب فدان آرام چلے گئے تو ان کے ماموں لابان نے ان سے یہ عہد لیا کہ وہ دس سال ان کے یہاں رہ کر ان کی بکریاں چرائیں تو وہ اس مدت کو مہر قرار دے کر اپنی لڑکی سے شادی کر دیں گے۔ جب یعقوب علیہ السلام نے اس مدت کو پورا کر دیا تو لابان نے اپنی لڑکی لیہ سے ان کا نکاح کرنا چاہا مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنا رجحان طبع چھوٹی لڑکی راحیل کی جانب ظاہر کیا، لابان نے یہ عذر کیا کہ یہاں کے دستور کے مطابق بڑی لڑکی کے نکاح سے قبل چھوٹی لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا، اس لیے تم اس رشتہ کو منظور کرو، اور اپنے قیام کو دس سال اور طویل کرو اور میری خدمت میں رہو تو راحیل بھی تمہارے نکاح میں دی جا سکے گی (کیونکہ اس زمانہ میں دو بہنوں کا ایک نکاح میں جمع ہونا شرعاً ممنوع نہ تھا) چنانچہ یعقوب علیہ السلام نے اس مدت کو بھی پورا کر دیا، اور راحیل سے شادی کر لی، ان دونوں کے علاوہ لیہ کی خانہ زاد زلفا اور راحیل کی خانہ زاد بلہا بھی ان کی زوجیت کے رشتہ میں منسلک ہو گئیں اور ان سب سے اولاد بھی ہوئی۔ اور بنیامین کے علاوہ یعقوب علیہ السلام کی تمام اولاد اپنے ماموں کے ہی یہاں پیدا ہوئی اور جب یعقوب علیہ السلام وطن واپس آ گئے تو یہاں بنیامین پیدا ہوئے لابان نے یعقوب علیہ السلام کو بیس سال اپنے پاس رکھنے کے بعد بہت سا مال و متاع اور ریوڑ دے کر رخصت کیا اور یہ پھر اپنے دادا کے دارالہجرت فلسطین میں آ کر مقیم ہو گئے۔

یعقوب علیہ السلام جس زمانہ میں فدان آرام چلے گئے تھے، اس زمانہ میں عیسو ناراض ہو کر اپنے چچا اسماعیل علیہ السلام کے پاس آ بسے تھے اور ان کی بیٹی سے شادی کر کے قریب ہی آباد ہو گئے تھے، یہ تاریخ میں ادوم کے نام سے مشہور ہیں، اس عرصہ میں دونوں بھائیوں کے درمیان جو چپقلش تھی وہ بھی دور ہو گئی اور دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ پھر استوار ہو گیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو تحائف بھیجنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

یہ تمام واقعات تورات کی کہانی اور داستان ہے، قرآن عزیز ان تفصیلات کے حق میں قطعاً خاموش ہے اور صرف حضرت

یعقوب علیہ السلام کے جلیل القدر نبی، صاحب صبر و عزیمت اور یوسف علیہ السلام کے برگزیدہ باپ ہونے کا ذکر کرتا ہے اور اسی ضمن میں نام لیے بغیر یوسف علیہ السلام کے دوسرے بھائیوں کا بھی ذکر آ جاتا ہے۔

ذکر یعقوب علیہ السلام قرآن مجید میں:

قرآن عزیز میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام دس جگہ آتا ہے اور اگرچہ سورۂ یوسف میں جگہ جگہ ضمائر اور اوصاف کے لحاظ سے اور بعض دوسری سورتوں مثلاً "مومنون" میں اوصاف کے اعتبار سے ان کا تذکرہ موجود ہے، مگر نام کے ساتھ صرف دو ہی جگہ ان کا ذکر کیا گیا ہے، مسطورۂ ذیل جدول اس کی وضاحت کرتی ہے۔

نام سورہ	آیت	شمار
بقرہ	۱۳۶، ۱۳۳، ۱۴۰	۴
انعام	۸۴	۱
مریم	۶، ۴۹	۲
صٓ	۴۵	۱

نام سورہ	آیت	شمار
الانبیاء	۷۲	۱
نساء	۱۶۳	۱
یوسف	۶، ۳۸، ۶۸	۳

اسرائیل:

حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام عبرانی میں اسرائیل ہے، یہ اسرا (عبد) اور ایل (اللہ) دو لفظوں سے مرکب ہے، اور عربی میں اس کا ترجمہ "عبداللہ" کیا جاتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ اسحاقی خاندان جو ان کی نسل سے ہے اسی لیے "بنی اسرائیل" کہلاتا ہے اور آج بھی یہود و نصاریٰ کے قدیم خاندان اسی نسبت کے ساتھ منسوب ہیں۔

اولادِ یعقوب علیہ السلام:

یعقوب علیہ السلام کے بارہ لڑکے تھے اور گزشتہ سطور میں واضح ہو چکا ہے کہ بنیامین کے علاوہ ان کی تمام اولاد فدان آرام ہی میں پیدا ہو چکی تھی، صرف بنیامین فلسطین (ارض کنعان) میں پیدا ہوئے، حضرت یعقوب کی یہ اولاد چونکہ چند بیبیوں سے ہے اس لیے ان کی تفصیل یہ ہے۔

لیہ یا لیا بنت لابان سے ① راوبین ② شمعون ③ لاوی ④ یہودا ⑤ ویسا کر ⑥ زلوبون پیدا ہوئے۔

راحیل بنت لابان سے ⑦ یوسف ⑧ بنیامین پیدا ہوئے۔

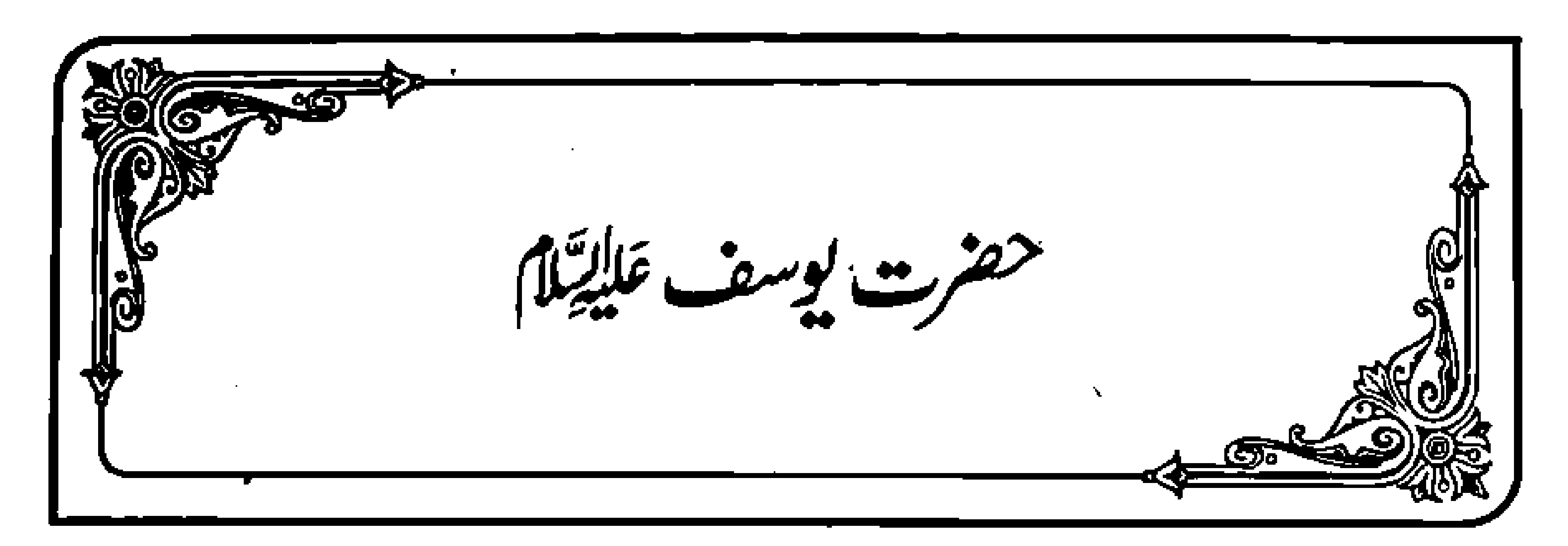
بلہا جاریہ راحیل سے ⑨ دان ⑩ نفتالی۔

اور زلفا جاریہ لیہ سے ⑪ جاد اور ⑫ اشیر پیدا ہوئے۔[1]

پیغمبری:

حضرت یعقوب علیہ السلام خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے اور کنعانیوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے انہوں نے برسوں اس خدمت حق کو انجام دیا، قرآن عزیز میں چونکہ ان کا ذکر بیشتر حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا گیا ہے، اس لیے وہیں قابل مراجعت ہے۔

[1] تورات پیدائش باب ۳۵ آیات ۲۱-۲۶



حضرت یوسف علیہ السلام

○ یوسف علیہ السلام کا نسب نامہ ○ یوسف علیہ السلام کا ذکر قرآن حکیم میں ○ سورہ یوسف کا نزول ○ برادران یوسف علیہ السلام ○ یوسف علیہ السلام کا خواب ○ برادران یوسف علیہ السلام کی سازش ○ یوسف علیہ السلام آزمائشوں میں ○ چاہ کنعان ○ یوسف علیہ السلام بحالت غلامی ○ عزیز مصر اور یوسف علیہ السلام ○ عزیز مصر کی بی بی اور یوسف علیہ السلام ○ یوسف علیہ السلام اور آیت ﴿وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ﴾ ○ شاہی خاندان کی عورتیں اور یوسف علیہ السلام ○ قید خانہ ○ قید خانہ میں دعوت و تبلیغ ○ تعبیر خواب ○ شاہ مصر اور یوسف علیہ السلام ○ یوسف علیہ السلام تخت شاہی پر ○ برادران یوسف کا قافلہ ○ حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن سلوک ○ عذر خواہی اور معافی ○ حضرت یعقوب علیہ السلام کی مصر میں آمد اور لخت جگر سے ملاقات ○ یوسف علیہ السلام کی وفات ○ آخری وصیت ○ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں وصیت پر عمل۔

نسب نامہ:

یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پڑپوتے ہیں اور ان کی والدہ کا نام راحیل بنت لابان ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام کو ان کے ساتھ بے حد محبت تھی بلکہ عشق تھا، اور اس لیے کسی وقت بھی ان کی جدائی گوارا نہ کرتے تھے۔

یہ بھی اپنے والد، دادا، اور پردادا کی طرح سن رشد کو پہنچ کر خدائے برتر کے جلیل القدر پیغمبر بنے اور ملت ابراہیمی کی دعوت و تبلیغ کی خدمت سرانجام دی یہی وجہ ہے کہ ابتدائے زندگی ہی سے ان کی دماغی اور فطری استعداد دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں بالکل جدا اور نمایاں تھی، یعقوب علیہ السلام کے عشق و محبت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ یوسف علیہ السلام کی پیشانی کا چمکتا ہوا نور نبوت پہچانتے، اور وحی الٰہی کے ذریعہ اس کی اطلاع پا چکے تھے۔

قرآن عزیز میں حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر:

حضرت یوسف علیہ السلام کا نام قرآن عزیز نے چھبیس مرتبہ ذکر کیا ہے جن میں سے چوبیس جگہ صرف سورۂ یوسف میں اور ایک جگہ سورۂ انعام میں اور ایک جگہ سورۂ غافر میں ذکر آیا ہے، اور ان کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ پردادا ابراہیم علیہ السلام کی طرح ان کے نام پر بھی قرآن عزیز کی ایک سورت (سورۂ یوسف) نازل ہوئی ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات سے متعلق عبرت و موعظت کا بے نظیر ذخیرہ ہے۔

نام سورہ	آیت	شمار
انعام	۸۴	۱
غافر	۳۴	۱

نام سورہ	آیت	شمار
یوسف	۴،۷،۱۰،۱۱،۱۷،۲۱،۲۹،۴۶،۵۱،۵۶،۶۹،۷۶	۲۴
	۷۷،۸۳،۸۴،۸۵،۸۷،۸۹،۹۰،۹۴،۹۹	

سورۂ یوسف:

قرآن عزیز نے یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو "احسن قصص" کہا ہے اس لیے کہ اس ایک واقعہ میں جس قدر عبرتیں، حکمتیں اور مواعظ ونصائح ودیعت ہیں دوسرے کسی واقعہ میں یکجا میسر نہیں ہیں، درحقیقت یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عجیب دل کش اور زمانہ کے عروج وزوال کی زندہ یادگار ہے، یہ ایک فرد کے ذریعہ قوموں کے بننے اور بگڑنے، گرنے اور اُبھرنے کی ایسی بولتی تصویر ہے جو کسی تشریح وتوضیح کی محتاج نہیں رہتی، یہ بدوی اور خانہ بدوش قبیلہ کے ایک ایسے فرد یگانہ اور انمول موتی کی حیرت زدہ تاریخ ہے جس کو خدائے تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے اعجاز نے اس زمانہ کی بڑی سے بڑی متمدن قوم کی رہنمائی اور ان پر حاکمانہ اقتدار کے لیے چن لیا تھا اور شرف نبوت سے نوازا تھا۔

قرآن عزیز تورات کی طرح داستان گوئی یا محض اشخاص واقوام کے تاریخی حالات کا مرقع نہیں ہے بلکہ وہ جن واقعات تاریخی کو بیان کرتا ہے اس کے سامنے صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ عبرت وموعظت اور تذکیر وپند کا مقصد وحید ہے۔

پس جبکہ یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں بے نظیر عبرتیں اور بصیرتیں پنہاں تھیں مثلاً رشد وہدایت کی اہمیت، ابتلاء اور آزمائشوں پر صبر واستقامت، رضاء وتسلیم کے مظاہرے، افراد واقوام کے عروج واقبال کے وقائع، خدائے تعالیٰ کے عدل ورحم کی کرشمہ سازیاں، انسانی اور بشری لغزشیں اور ان کے انجام ومآل، عصمت اور ضبط نفس کی عجوبہ کاریاں، تو بلاشبہ وہ "احسن قصص" ہے، اور کتاب ماضی کا وہ حسین ورق جو اپنی شان زیبائی میں یکتا اور فرد کہلانے کا مستحق ہے۔

﴿الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۞ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۞﴾

(یوسف: ۱۔۳)

"الرٰ ۞ یہ روشن کتاب کی آیتیں ہیں، ہم نے اس قرآن کو عربی میں نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھ سکو، اے پیغمبر! ہم اس قرآن کے ذریعہ سے جو ہم نے تمہاری طرف بھیجا ہے ایک نہایت اچھا قصہ (واقعہ) سناتے ہیں اور تم اس سے پہلے بے خبر تھے۔"

سورۂ یوسف کے شان نزول کے بارہ میں حدیثی روایات اور مفسرین کے اقوال کا حاصل یہ ہے کہ کفار مکہ نے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق "یہود" سے گفتگو کی اور اپنی درماندگی اور پریشانی کا اظہار کیا، اس پر یہود نے ان سے کہا کہ اس مدعی نبوت کو زچ کرنے اور جھوٹا بنانے کے لیے تم ان سے یہ سوال کرو کہ یعقوب علیہ السلام کی اولاد شام سے مصر کیوں منتقل ہوئی اور یوسف علیہ السلام سے متعلق جو واقعات ہیں ان کی تفصیل کیا ہے؟ اگر یہ نبی نہیں ہے تو ہرگز نہ بتا سکے گا۔

کفار مکہ نے یہود کی ہدایت کے مطابق ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دونوں سوال کیے اور آپ نے وحی الٰہی کے ذریعہ وہ سب کچھ ان کو سنا دیا جو سورۂ یوسف میں موجود ہے۔

یوسف علیہ السلام کا خواب اور برادران یوسف علیہ السلام:

ان واقعات کا حاصل یہ ہے کہ جبکہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی تمام اولاد میں حضرت یوسف علیہ السلام سے بے حد محبت رکھتے

تھے تو حضرت یعقوب علیہ السلام کا حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ والہانہ عشق و محبت برادرانِ یوسف علیہ السلام کے لیے بے حد شاق اور ناقابل برداشت تھا، اور وہ ہر وقت اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ یا حضرت یعقوب علیہ السلام کے قلب سے اس محبت کو نکال ڈالیں اور یا پھر یوسف علیہ السلام ہی کو اپنے راستہ سے ہٹا دیں تاکہ قصہ پاک ہو جائے۔

ان بھائیوں کے حاسدانہ تخیل پر مزید تازیانہ یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام نے ایک خواب دیکھا کہ گیارہ ستارے اور شمس و قمر اُن کے سامنے سجدہ ریز ہیں، حضرت یعقوب علیہ السلام نے چہیتے بیٹے کا خواب سنا تو سختی کے ساتھ ان کو منع کر دیا کہ اپنا یہ خواب کسی کے سامنے نہ دہرانا، ایسا نہ ہو کہ اس کو سن کر تیرے بھائی برے پیش آئیں، کیوں کہ شیطان انسان کے پیچھے لگا ہے اور تیرا خواب اپنی تعبیر میں بہت صاف اور واضح ہے۔

﴿اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ۝ قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۝ وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ عَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝﴾ (یوسف: ۴۔۶)

”جب یوسف (علیہ السلام) نے اپنے باپ سے کہا: اے باپ! میں نے خواب میں گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے، دیکھتا کیا ہوں کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں، انہوں نے کہا: اے میرے بیٹے! تو اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں کو نہ سنانا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تیرے ساتھ کوئی چال چل جائیں، بلاشبہ شیطان انسان کے لیے کھلا دشمن ہے اور اس طرح تیرا پروردگار تجھ کو برگزیدہ کرے گا، اور سکھائے گا تاویل احادیث، اور اپنی نعمت کو تجھ پر اور اولاد یعقوب پر تمام کرے گا، جس طرح کہ اس نعمت (نبوت) کو پورا کیا تیرے اجداد پر پہلے سے (یعنی) ابراہیم و اسحاق پر، بیشک تیرا پروردگار جاننے والا حکمت والا ہے۔“

اس مقام پر تورات اور قرآن عزیز کے بیانات میں تفاوت و اختلاف پایا جاتا ہے۔

① قرآن عزیز بیان کرتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جب اپنا خواب حضرت یعقوب علیہ السلام کو سنایا تو دوسرے بھائی وہاں موجود نہ تھے، اور تورات کہتی ہے کہ یہ معاملہ بھائیوں کی موجودگی میں پیش آیا۔

② قرآن عزیز سناتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اس خواب سے بحق یوسف علیہ السلام بے حد مسرور ہوئے اور ان کو نبوت و علوم الٰہیہ کی بشارت سنائی مگر تورات کہتی ہے کہ یعقوب علیہ السلام خواب سن کر بہت خفا ہوئے اور فرمانے لگے کہ شاید اس سے تیرا منشاء یہ ہے کہ میں، تیری والدہ، اور تیرے سب بھائی تیرے سامنے سجدہ ریز ہوں گے؟۔

واقعات کی اس ترتیب کے اعتبار سے جو آگے چل کر قرآن عزیز اور تورات میں مشترک ہے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عزیز ہی کا بیان صحیح اور درست ہے، نیز تقاضائے فطرت اسی کا داعی ہے کہ یوسف علیہ السلام اپنے اس خواب کو بھائیوں سے الگ ہو کر بیان کریں اور یعقوب علیہ السلام بیٹے کے اس خواب کو سن کر مسرور ہوں کہ ہر ایک باپ اپنی اولاد کی ترقی درجات اور بلندی مناصب

کا خواہش مند ہوتا ہے۔ خصوصاً جبکہ یعقوب علیہ السلام نبی ہونے کی وجہ سے خواب کی تعبیر میں یوسف علیہ السلام کے لیے جو بلندی دیکھ رہے تھے وہ موجب صد ہزار مسرت تھی نہ کہ باعث رنج والم۔

آخر کار حسد کی بھڑکتی ہوئی آگ نے ایک روز برادران یوسف کو یوسف علیہ السلام کے خلاف سازش کرنے پر مجبور کر ہی دیا۔

﴿اِذْ قَالُوْا لَیُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِیْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنِ ۝ اِقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِیْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ ۝ قَالَ قَآىٕلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ۝﴾ (یوسف: ۸۔۱۰)

"جبکہ وہ کہنے لگے البتہ یوسف اور اس کا بھائی (بنیامین) ہمارے باپ کو زیادہ پیارا ہے اور ہم ان سے زیادہ قوت والے ہیں، بلاشبہ ہمارا باپ صریح خطاء پر ہے یوسف کو مار ڈالو یا کسی ملک میں پھینک دو تا کہ تمہارے باپ کی توجہ تمہاری طرف سمٹ آئے اور ہو رہنا بعد میں نیک قوم، ان میں سے ایک نے کہا یوسف کو قتل نہ کرو اور اس کو گمنام کنوئیں میں ڈال دو کہ اٹھا لے جائے اس کو کوئی مسافر اگر تم کو کرنا ہی ہے۔"

اس مشورہ کے بعد سب جمع ہو کر حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ یوسف کو ہمارے ساتھ سیر کرنے کس لیے نہیں بھیجتے، کیا آپ کو ہم پر اعتماد نہیں ہے، ہم سے زیادہ اس کا محافظ دوسرا کون ہو سکتا ہے؟

﴿قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى یُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ۝ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا یَّرْتَعْ وَ یَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۱۱۔۱۲)

"(اے باپ) کیا بات ہے کہ تجھ کو یوسف کے بارہ میں ہم پر اعتماد نہیں ہے حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں، کل اس کو ہمارے ساتھ بھیج کہ وہ کھائے پیئے اور کھیلے کودے اور بلاشبہ ہم اس کے نگہبان ہیں۔"

حضرت یعقوب علیہ السلام سمجھ گئے کہ ان کے دلوں میں کھوٹ ہے اور یہ یوسف علیہ السلام کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں، مگر صاف لفظوں میں اس بات کو ظاہر نہیں فرمایا تا کہ بگڑ کر وہ اعلانیہ دشمنی پر آمادہ نہ ہو جائیں اور یہ بھی خیال کیا کہ اشارہ کنایہ سے ممکن ہے وہ اپنی ظالمانہ سازش سے باز رہیں اس لیے اشارہ اشارہ میں ان پر حقیقت حال واضح کر دی کہ واقعی مجھ کو یوسف علیہ السلام کے بارہ میں تم سے اندیشہ ہے۔

﴿قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۱۳)

"یعقوب (علیہ السلام) نے کہا مجھے اس سے رنج اور دکھ پہنچتا ہے کہ تم اس کو (اپنے ساتھ) لے جاؤ، اور مجھے یہ خوف ہے کہ اس کو بھیڑیا کھا جائے اور تم غافل رہو۔"

برادرانِ یوسف علیہ السلام نے یہ سن کر بہ یک زبان کہا:

﴿قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ﴾ (یوسف: ۱۴)

"اگر کھا گیا اس کو بھیڑیا جبکہ ہم سب طاقتور ہیں تو بلاشبہ ایسی صورت میں تو ہم نے سب کچھ گنوا دیا۔"

ایک جگہ تورات کا بیان یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے خود اپنے حکم سے یوسف علیہ السلام کو اس کے بھائیوں کے ساتھ جنگل میں کھیلنے کودنے کے لیے بھیجا تھا۔ [1] مگر آگے کے واقعات خود تورات کے بیان کی تغلیط کرتے ہیں۔

چاہ کنعان:

غرض برادرانِ یوسف، یوسف علیہ السلام کو جنگل کی سیر کرانے کے بہانے لے گئے اور مشورہ کے مطابق ایک ایسے کنوئیں میں اس کو ڈال دیا جس میں پانی نہ تھا، اور عرصہ سے خشک پڑا تھا، اور واپسی میں اس کے قمیص کو کسی جانور کے خون میں تر کر کے روتے ہوئے حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس آئے اور کہنے لگے: اے باپ! اگرچہ ہم اپنی صداقت کا کتنا ہی یقین دلائیں مگر تجھ کو ہرگز یقین نہ آئے گا کہ ہم دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں مشغول تھے کہ اچانک یوسف کو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے پیراہن یوسف کو دیکھا تو خون آلود تھا مگر کسی ایک جگہ سے بھی پھٹا ہوا نہ تھا اور نہ چاک داماں تھا، فوراً حقیقت حال سمجھ گئے، مگر جھڑکنے، طعن و تشنیع کرنے اور نفرت و حقارت کا طرز عمل اختیار کرنے کی بجائے پیغمبرانہ حلم و فراست اور علم و سماحت کے ساتھ یہ بتا دیا کہ باوجود حقیقت حال کو چھپانے کی سعی کے تم اسے چھپا نہ سکے۔

﴿قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰي مَا تَصِفُوْنَ﴾ (یوسف: ۱۸)

"(حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا) یہ ہرگز نہیں بلکہ بنا دی ہے تمہارے نفسوں نے تمہارے لیے ایک بات، اب صبر ہی بہتر ہے اور جو بات تم ظاہر کرتے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔"

یوسف علیہ السلام اور غلامی:

یہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی اور یوسف علیہ السلام کے ساتھ یہ قصہ پیش آیا کہ حجازی اسماعیلیوں (مدیانیوں) کا ایک قافلہ شام سے مصر کو بخورات، بلساں اور مسالہ لاد کر لیے جا رہا تھا، کنواں دیکھ کر انہوں نے پانی کے لیے ڈول ڈالا، یوسف علیہ السلام سمجھے کہ شاید بھائیوں کو رحم آ گیا ڈول پکڑ کر لٹک گئے، تاجر نے ڈول نکالا تو یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر جوش سے شور مچایا۔

﴿يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ۭ﴾ (یوسف: ۱۹)

"بشارت ہو ایک غلام ہاتھ آیا۔"

تورات میں ہے کہ برادرانِ یوسف علیہ السلام نے جب اسماعیلی قافلہ کو دیکھا تو آپس میں کہنے لگے کہ یوسف کو کنوئیں سے نکال کر اس قافلہ کے ہاتھ فروخت کر دو مگر اس سے پہلے ہی مدیانیوں (اسماعیلیوں) نے ان کو نکال کر غلام بنا لیا اور سب سے بڑا بھائی

---

[1] پیدائش باب ۳۷ آیات ۱۳۔۱۴

راؤبین جب کنوئیں پر پہنچا اور دیکھا کہ یوسف علیہ السلام وہاں نہیں ہے تو روتا ہوا واپس آ گیا، راؤبین کو یہ رائے یہودا نے دی تھی اور راؤبین شروع ہی سے اس فکر میں تھا کہ یوسف علیہ السلام کو کنوئیں سے نکال کر خاموشی سے باپ کے سپرد کر آئے اسی لیے اس نے قتل یوسف علیہ السلام کی سخت مخالفت کی تھی۔

اس مقام پر بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو خود برادران یوسف نے ہی کنوئیں سے نکال کر اسماعیلیوں کے قافلہ میں فروخت کر دیا تھا، مگر مفسرین کے اس قول کی نہ تورات موافقت کرتی ہے اور نہ قرآن عزیز، بلکہ دونوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ والوں نے ہی یوسف علیہ السلام کو کنوئیں سے نکالا اور اپنا غلام بنالیا۔

اسی طرح صاحب قصص الانبیاء کو تورات کے بیان سے قافلہ کے متعلق غلط فہمی ہوگئی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اسماعیلی اور مدیانی کو دو جدا جدا قافلے سمجھا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ شام سے مصر جانے والا یہ قافلہ ایک ہی قافلہ تھا جو نسلی اعتبار سے اسماعیلی اور ملکی اعتبار سے مدیانی [1] (حجازی) تھا۔ غرض اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو اسماعیلی تاجروں کے قافلہ نے اپنا غلام بنالیا اور مال تجارت کے ساتھ ان کو بھی مصر لے گئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا یہ پہلو اپنے اندر کیسی عظمتیں پنہاں رکھتا ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو چشم بصیرت رکھتا ہو، چھوٹی سی عمر ہے، والدہ کا انتقال ہو چکا ہے، باپ کی آغوش محبت تھی وہ بھی چھوٹی، وطن چھوٹا، بھائیوں نے بے وفائی کی، آزادی کی جگہ غلامی نصیب ہوئی مگر ان تمام باتوں کے باوجود نہ شور وشیون ہے، نہ واویلا، نہ جزع وفزع ہے اور نہ الحاح وزاری قسمت پر شاکر، مصائب پر صابر اور خدا کے فیصلہ پر راضی بہ رضاء، سر نیاز خم کیے، مصر کے بازار میں فروخت ہونے جا رہے ہیں، سچ ہے۔ نزدیکاں را بیش بود حیرانی۔

یوسف علیہ السلام مصر میں:

تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح "مصر" تمدن وتہذیب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا، یہاں کے حکمران عمالقہ (ہیکسوس) تھے جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام کنعان سے ایک بدوی غلام کی حیثیت میں مصر میں داخل ہوئے، مصر کا دارالسلطنت اس زمانہ میں رعمسیس تھا، یہ غالباً اس مقام پر واقع تھا جہاں آج صان کی بستی آباد ہے۔ جغرافی حیثیت سے اس کا جائے وقوع مشرق کی جانب دریائے نیل کے قریب بتایا جاتا ہے، مصری افواج کا افسر، شاہی خاندان کا ایک رئیس فوطیفار تھا، یہ سیر کے لیے مصر کے بازار سے گذر رہا تھا کہ یوسف پر نظر پڑی اور اس نے معمولی قیمت دے کر ان کو خرید لیا۔

ابھی ذکر ہو چکا ہے کہ اس زمانہ میں مصری خود کو دنیا کی بہترین مہذب اور متمدن قوم سمجھتے تھے اور بدوی اور صحرائی قبائل کو نہایت ذلت وحقارت سے دیکھتے اور اپنے شہروں میں ان کے ساتھ اچھوت کی طرح معاملہ کرتے تھے، انہی قبائل میں سے ایک قبیلہ

---

[1] جدید نسلی وجغرافی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جس مقام کو تورات میں مدین یا مدیان کہا ہے اس سے وہ علاقہ مراد ہے جو ساعیر (سراۃ) ہے بحر احمر کے کنارے شام سے یمن تک چلا گیا ہے، اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے بنی اسرائیل مدین اور اسماعیلی شروع سے ہی حجاز کہتے تھے، اس لیے ایک ہی مقام کے یہ دو نام ہیں۔ (ارض القرآن جلد ۲ ص ۷، ۴۹)

نسل ابراہیمی کی یادگار کنعان میں آباد تھا، یہاں مدنیت و حضارت کا نام ونشان تک نہ تھا، شکار پر ان کے رزق کا مدار تھا اور خس پوش جھونپڑیوں اور بکریوں کے گلے ان کا دھن دولت تھے۔

ان حالات میں یوسف علیہ السلام کے متعلق خدائے تعالیٰ کی کارسازی اور معجز نمائی دیکھئے کہ ایک بدوی اور وہ بھی غلام، ایک متمدن اور صاحب شوکت وحشمت رئیس کے یہاں جب پہنچتا ہے تو اپنی عصمت مآب زندگی، حلم و وقار اور امانت و سلیقہ مندی کے پاک اوصاف کی بدولت اس کی آنکھوں کا تارا اور دل کا مالک بن جاتا ہے اور وہ اپنی بیوی سے کہتا ہے:

﴿ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ﴾(یوسف:۲۱)

"(دیکھو) اس کو عزت سے رکھو کچھ عجب نہیں کہ یہ ہم کو فائدہ بخشے یا ہم اس کو اپنا بیٹا بنالیں۔"

اور یہ کس لیے ہوا، اور یوسف علیہ السلام میں یہ پسندیدہ اطوار و اخلاق کہاں سے پیدا ہو گئے، ایک بدوی نے کس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی، اور ایک غلام نے کس مربی سے اس پاک طینت کو پایا؟ اس کے متعلق قرآن عزیز جواب دیتا ہے:

﴿ وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝﴾(یوسف:۲۲)

"اور جب وہ سن رشد کو پہنچ گیا تو ہم نے اس کو فیصلہ کی قوت اور علم عطاء کیے اور ہم اسی طرح نیکوکاروں کو جزا دیا کرتے ہیں۔"

بہر حال فوطیفار نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ غلاموں کا سا معاملہ نہیں کیا، بلکہ اپنی اولاد کی طرح عزت و احترام کے ساتھ رکھا اور اپنی ریاست، دولت و ثروت اور گھریلو زندگی کی تمام ذمہ داریاں ان کے سپرد کر دیں اور ان سب کا امین بنا دیا، گویا کنعان کے گلہ بان کو عنقریب جو جہانداری و جہاں بانی سپرد ہونے والی تھی یہ اس کی تمہید تھی، اسی لیے ارشاد ہوا:

﴿ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ؗ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝﴾(یوسف:۲۱)

"اور اسی طرح جگہ دی ہم نے یوسف (علیہ السلام) کو اس ملک میں اور اس واسطے کہ اس کو سکھائیں باتوں کا نتیجہ اور مطلب نکالنا، اور اللہ طاقتور رہتا ہے اپنے کام میں، لیکن اکثر آدمی ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔"

عزیز مصر کی بیوی اور یوسف علیہ السلام:

ایک مشہور صوفی ابن عطاء اللہ السکندری کا قول ہے "ربما كنت المنن فی المحن "[1] (خدا کے اکثر احسانات و کرم مصائب کے اندر مستور ہوتے ہیں) حضرت یوسف علیہ السلام کی ساری زندگی اسی مقولہ کا ہو بہو مصداق ہے۔

بچپن کی پہلی مصیبت یا آزمائش نے کنعان کی بدوی زندگی سے نکال کر تہذیب و تمدن کے گہوارہ "مصر" کے ایک بہت بڑے گھرانے کا مالک بنا دیا، غلامی میں آقائی اسی کو کہتے ہیں۔

اب وقت کی دوسری اور کٹھن آزمائش شروع ہوئی، وہ یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا جوانی کا عالم تھا، حسن و خوبروئی کا کوئی

[1] قصص الانبیاء للنجار

پہلو ایسا نہ تھا جو ان کے اندر موجود نہ ہو، جمال اور رعنائی کا پیکر مجسم، رخ روشن شمس وقمر کی طرح منور، عصمت وحیاء کی فراوانی سونے پر سہاگہ اور پھر ہر وقت کا ساتھ، عزیز مصر کی بیوی دل پر قابو نہ پا سکی اور یوسف علیہ السلام پر پروانہ وار نثار ہونے لگی، مگر ابراہیم علیہ السلام کا پوتا، اسحاق ویعقوب علیہما السلام کا نور دیدہ، خانوادہ نبوت کا چشم وچراغ اور منصب نبوت کے لیے منتخب، بھلا اس سے یہ کس طرح ممکن تھا کہ ناپاکی اور فحش میں مبتلا ہو اور عزیز کی بیوی کے ناپاک عزائم کو پورا کرے۔

لیکن مصر کی اس آزاد عورت نے جب اس طرح جادو چلتے نہ دیکھا تو ایک روز بے قابو ہو کر مکان کا دروازہ بند کر دیا اور اصرار کرنے لگی کہ مجھے شاد کام کر، حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے یہ وقت سخت آزمائش کا وقت تھا، شاہی خاندان کی نوجوان عورت، شعلہ حسن سے لالہ رو، محبوب نہیں بلکہ عاشق، آرائش حسن وزینت کی بے پناہ نمائش، عشوہ طرازیوں کی بارش، ادھر یوسف علیہ السلام خود نوجوان حسین اور حسن کی خوبی سے آشنا، دروازے بند، رقیب کا خوف نہ ڈر، مالکہ خود ذمہ دار، مگر ان تمام سازگار حالات نے کیا یوسف علیہ السلام کے دل میں ایک لمحہ کے لیے بھی عزیز مصر کی بیوی کی حوصلہ افزائی کی، کیا اس کے دل نے قرار چھوڑ کر بے قراری اختیار کی کیا نفس نے جہان قلب کو ایک لمحہ کے لیے بھی متزلزل کیا؟ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ اس کے برعکس اس پیکر عصمت، امین نبوت، مہبط وحی الٰہی نے دو ایسے دلکش اور محکم دلائل سے "مصری عورت" کو سمجھایا جو ایک ایسی ہستی سے ہی ممکن تھے جس کی تربیت براہ راست آغوش الٰہی میں ہوئی ہو۔ فرمایا: "یہ ناممکن ہے، پناہ بخدا" میں اور اس کی نافرمانی کروں جس کا اسم جلالت "اللہ" ہے، اور وہ تمام کائنات کا مالک، اور کیا میں اپنے اس مربی "عزیز مصر" کی امانت میں خیانت کروں جس نے غلام رہنے کی بجائے یہ حرمت وعزت عطاء کی؟ اگر میں ایسا کروں تو ظالم ٹھہروں گا اور ظالموں کے لیے انجام ومال کے اعتبار سے کبھی فلاح نہیں ہے۔

مگر عزیز مصر کی بیوی پر اس نصیحت کا مطلق اثر نہ ہوا اور اس نے اپنے ارادہ کو عملی شکل دینے پر اصرار کیا تب یوسف علیہ السلام نے اپنے اس برہان رب کے پیش نظر جس کا ذکر وہ کر چکا تھا صاف انکار کر دیا۔

﴿وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَ قَالَتْ هَیْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۲۴﴾﴾ (یوسف: ۲۳۔۲۴)

"اور پھسلایا یوسف کو اس عورت نے جس کے گھر میں وہ رہتے تھے اس کے نفس کے معاملہ میں اور دروازے بند کر دیے اور کہنے لگی آ میرے پاس آ، یوسف (علیہ السلام) نے کہا، پناہ بخدا! بلاشبہ وہ (عزیز مصر) میرا مربی ہے جس نے مجھ کو عزت سے رکھا، بلاشبہ ظالم فلاح نہیں پاتے، اور البتہ اس عورت نے یوسف سے ارادہ بد کیا اور وہ بھی ارادہ کرتے اگر اپنے پروردگار کے برہان کو نہ دیکھ لیتے، اسی طرح ہوا تاکہ ہٹائیں ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو، بیشک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے۔"

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا کی تفسیر:

مفسرین نے آیت وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا کی مختلف تفسیریں کی ہیں لیکن ہم نے جو معنی بیان کیے ہیں وہی زیادہ

موزوں اور مناسب مقام ہیں قرآن عزیز نے اول سے آخر تک اس واقعہ میں عزیز مصر کی بیوی کی شناعت کار اور حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت و جلالت قدر کا تذکرہ فرمایا ہے، اس لیے یوسف کے ﴿مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ فرمانے کے بعد یہی معنی برمحل ہو سکتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کی زبان سے برہان رب کو سن لینے کے بعد بھی جب عورت اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئی اور اپنے ارادہ پر مصر رہی تو یوسف علیہ السلام نے اس کے ارادہ کو قطعاً رد کر دیا اور برہان رب کے سامنے اس کے ﴿هَمَّ﴾ کی مطلق پروانہ کی اور نتیجہ یہ نکلا کہ یوسف علیہ السلام اس سے بچنے کے لیے دروازہ کی طرف بھاگے اور عزیز مصر کی بیوی نے ان کا پیچھا کیا۔

بعض مفسرین نے اس تفسیر پر یہ اعتراض کیا ہے کہ عربی گرامر کا تقاضا ہے کہ ﴿لَوْلَآ﴾ کلام کے شروع میں استعمال ہو اس لیے کہ وسط کلام میں اس کا استعمال نحوی قاعدہ کے خلاف ہے مگر اس تفسیر کے مطابق "لولا" وسط کلام میں استعمال ہوگا اور تعبیر یہ ہوگی۔

﴿وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ﴾ (یوسف: ۲۴)

"اور یوسف بھی گناہ کا قصد کر لیتا اگر اپنے رب کے برہان کو نہ دیکھ لیتا"۔

مگر یہ اعتراض اس لیے درست نہیں کہ اس مقام پر بھی ﴿لَوْلَآ﴾ کا استعمال شروع کلام ہی میں ہوا ہے اور نحوی قاعدہ کے مطابق دال علی الجواب مقدم ہے اور ﴿لَوْلَآ﴾ کا جواب جو بعد میں مذکور ہوتا اس دال علی الجواب کی وجہ سے مقدر و محذوف ہے۔ اور یہ اس لیے صحیح ہے کہ فصاحت و بلاغت کا تقاضا ہے کہ ایک جانب مناسبت کلام کو قائم رکھا جائے یعنی دونوں کے ارادہ و عدم ارادہ کا ایک ہی جگہ ذکر ہو اور دوسری جانب نحوی قاعدہ کے پیش نظر ﴿لَوْلَآ﴾ کا جواب اس کے بعد میں آئے اور یہ دونوں باتیں جب ہی ہو سکتی ہیں کہ ﴿هَمَّ بِهَا﴾ کو دال علی الجواب بنا کر ﴿هَمَّتْ بِهٖ﴾ کے ساتھ ذکر کیا جائے اور ﴿لَوْلَآ﴾ کا جواب ﴿فَهَمَّ بِهَا﴾ کو مقدر تسلیم کیا جائے۔

لہٰذا مسطورہ بالا تفسیر ہی شک و شبہ سے بالاتر حقیقت حال کو واضح اور ظاہر کرتی ہے۔ کلام مجید میں اس کی نظیر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے تذکرہ سے متعلق یہ آیت ہے:

﴿اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰي قَلْبِهَا﴾ (القصص: ۱۰)

"قریب تھا کہ وہ (والدۂ موسیٰ علیہ السلام) اس کو ظاہر کر دے اگر ہم اس کے دل کو مضبوط نہ بنا دیتے"۔

یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل کو مضبوط کر دیا تو وہ موسیٰ علیہ السلام کے راز کو ظاہر نہ کر سکیں اور اگر ہم ایسا نہ کرتے تو وہ ظاہر کر دیتیں۔

دیکھئے یہاں بھی ﴿لَوْلَآ﴾ سے دال علی الجواب مقدم ہے اور ﴿لَوْلَآ﴾ کا جواب ﴿لَتُبْدِيْ بِهٖ﴾ مقدر و محذوف ہے، اسی طرح اس مقام پر یہ معنی ہیں کہ اگر یوسف کو برہان رب حاصل نہ ہوتا تو وہ بھی ارادۂ بد کر لیتے لیکن انہوں نے ارادہ بد نہیں کیا کیونکہ وہ برہان رب دیکھ چکے تھے۔

اس جگہ یہ بھی ایک سوال ہے کہ وہ "برہان رب" کیا تھا جس کا قرآن عزیز یہاں ذکر کر رہا ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن عزیز نے اپنی بلیغانہ اور معجزانہ خطابت میں خود ہی اس کو اس طرح ادا کر دیا ہے کہ سوال کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، دروازہ

بند ہو جانے پر عزیز کی بیوی کو حضرت یوسف علیہ السلام نے جو جواب دیا ایسے مقام کے لحاظ سے اس سے بہتر جواب کیا ہو سکتا تھا سو یہی وہ "برہان رب" تھا جو یوسف علیہ السلام کو عطا ہوا اور جس نے عصمت یوسف کو بے داغ رکھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن عزیز نے بڑے شد و مد سے اس کے بعد یہ بیان کیا ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ (یونہی ہوا) ﴿ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ ﴾ تاکہ ہٹائیں ہم اس سے برائی اور بے حیائی ﴿ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ (بیشک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے) یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کا دامن اس قسم کے ﴿ هَمَّ ﴾ سے اس لیے پاک رہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عصمت و پاکی کا فیصلہ شروع ہی سے کر دیا تھا، پھر کیسے ممکن تھا کہ اس کی عصمت و حفاظت کے بعد اس کے خلاف کوئی شائبہ بھی ان میں پایا جاتا؟

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت نظر آنا اور ان کا اشارہ سے منع کرنا یا فرشتہ کا ظاہر ہو کر ان کو اس سے روکنا، یا عزیز مصر کا گھر میں رکھے ہوئے صنم پر اس کی بیوی کا پردہ ڈالنا اور حضرت یوسف علیہ السلام کا اس سے عبرت حاصل کرنا، یہ اور اس قسم کے تمام اقوال کے مقابلہ میں "برہان رب" کی تفسیر وہی بہتر تفسیر ہے جو خود قرآن عزیز کی نظم و ترتیب سے ثابت ہے یعنی ① ایمان باللہ کا حقیقی تصور ② اور مربی مجازی کے احسان کی احسان شناسی اور وصف امانت، عزیز مصر نے یوسف علیہ السلام کے متعلق اپنی بیوی سے کہا تھا ﴿ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ ﴾ (اس یوسف علیہ السلام) کو عزت سے رکھنا یوسف علیہ السلام نے اسی کو پیش نظر رکھ کر فرمایا ﴿ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ﴾ (اس (عزیز مصر) نے مجھ کو عزت دی) تب یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں خیانت کر کے اس کو بے عزت کروں۔

بہرحال حضرت یوسف علیہ السلام جب دروازہ کی جانب بھاگے تو عزیز کی بیوی نے پیچھا کیا، اور دروازہ کسی طرح کھل گیا، سامنے عزیز مصر اور عورت کا چچازاد بھائی کھڑے نظر آئے، عورت کا عشق ابھی خام تھا اس لیے وہ صحیح حال کہنے پر قادر نہ ہوئی اور اصل حقیقت کو چھپانے کے لیے غیظ و غضب میں آ کر کہنے لگی کہ ایسے شخص کی سزا قید خانہ یا دردناک عذاب کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے جو تیرے اہل کے ساتھ ارادۂ بد رکھتا ہو؟ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے مکر و فریب کو سنا تو فرمایا کہ یہ اس کا بہتان ہے؟ اصل حقیقت یہ ہے کہ خود اس نے میرے ساتھ ارادہ بد کیا تھا مگر میں نے کسی طرح نہ مانا اور بھاگ کر باہر نکل جانا چاہتا تھا کہ اس نے پیچھا کیا اور سامنے آپ نظر آ گئے تو اس نے یہ جھوٹ گھڑ لیا۔

عزیز کی بیوی کا چچازاد بھائی ذکی، فطین اور بہت ہوشیار تھا اس نے کہا کہ یوسف کا پیراہن دیکھنا چاہیے اگر وہ سامنے سے چاک ہے تو عورت راست باز ہے، اور اگر پیچھے سے چاک ہے تو یوسف صادق القول ہے اور عورت جھوٹی ہے، دیکھا تو پیراہن یوسف علیہ السلام پیچھے سے چاک تھا، عزیز مصر نے اصل حالت کو بھانپ لیا مگر اپنی عزت و ناموس کی خاطر معاملہ کو ختم کرتے ہوئے کہا، یوسف سچے تم ہی ہو، اور اس عورت کے معاملہ سے درگزر کرو، اور اس کو یہیں ختم کر دو، اور پھر بیوی سے کہا، یہ سب تیرا مکر و فریب ہے اور تم عورتوں کا مکر و فریب بہت ہی بڑا ہوتا ہے، بلاشبہ تو ہی خطاء کار ہے لہٰذا اپنی اس حرکت بد کے لیے استغفار کر اور معافی مانگ۔

﴿ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَ هُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَ هُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ

مِنْ كَيْدِكُنَّ ۭ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ۞ يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ښ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ۞﴾ (یوسف: ۲۵۔۲۹)

”کہنے لگی، اس شخص کی کیا سزا ہے جو تیرے اہل کے ساتھ برائی کا ارادہ رکھتا ہو مگر یہ کہ قید کر دیا جائے یا دردناک عذاب میں مبتلاء کیا جائے، یوسف علیہ السلام نے کہا، اسی نے مجھ کو میرے نفس کے بارہ میں پھسلایا تھا، اور فیصلہ کیا عورت ہی کے گھرانے کے ایک شخص نے کہ اگر پیراہن یوسف سامنے سے چاک ہے تو عورت سچی ہے اور یوسف جھوٹا، اور اگر پیچھے سے چاک ہے تو عورت کاذب ہے، اور یوسف صادق، پس جب اس کی قمیص کو دیکھا تو پیچھے سے چاک تھا، کہا بیشک اے عورت یہ تیرے مکروفریب سے ہے، بلاشبہ تمہارا مکر بہت بڑا ہے، یوسف تو اس معاملہ سے درگزر اور اے عورت تو اپنے گناہ کی معافی مانگ! تو بلاشبہ خطاء کار ہے۔“

عزیز مصر نے اگرچہ فضیحت و رسوائی سے بچنے کے لیے اس معاملہ کو یہیں پر ختم کر دیا مگر بات پوشیدہ نہ رہ سکی اور شدہ شدہ شاہی خاندان کی عورتوں میں یہ چرچا ہونے لگا کہ عزیز مصر کی بیوی کس قدر بے حیاء ہے کہ اپنے غلام پر ریجھ گئی، اتنے بڑے مرتبہ کی عورت اور غلام سے اختلاط کا ارادہ؟ آہستہ آہستہ یہ خبر عزیز کی بیوی تک بھی پہنچ گئی، اس کو یہ طعن بیحد شاق گذرا اور اس نے چاہا کہ اس کا انتقام لے، اور ایسا انتقام لے کہ جس بات پر وہ مجھ پر طعن کرتی ہیں اسی میں ان کو بھی مبتلا کیا جائے، یہ سوچ کر ایک روز اس نے شاہی خاندان اور عمائدین شہر کی عورتوں کو دعوت دی، جب سب دسترخوان پر بیٹھ گئیں اور سب نے کھانا کھانے کے لیے چھریاں ہاتھ میں لے لیں تاکہ اس سے گوشت یا ترنج جیسی چیزوں کو کاٹیں، تب عزیز کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ باہر آئیں، حضرت یوسف علیہ السلام مالکہ کے حکم سے باہر نکلے تو تمام عورتیں جمال یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر حیران رہ گئیں، اور رخ انور کی تجلی و تابانی سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ چیزیں کاٹنے کی بجائے چھریوں سے ہاتھ کاٹ لیے، اور بے ساختہ کہنے لگیں کہ کون کہتا ہے یہ انسان ہے، بخدا یہ تو نور کا پتلا اور بزرگ فرشتہ ہے، یہ دیکھ کر عزیز کی بیوی بیحد محظوظ ہوئی اور اپنی کامیابی اور ان کی شکست پر فخر کرتے ہوئے کہنے لگی یہی تو وہ غلام ہے جس کے عشق و محبت کے بارہ میں تم نے مجھ کو مطعون کر رکھا ہے اور تیر ملامت کا نشانہ بنایا ہوا ہے، اب اس کو دیکھ کر یہ تمہارا حال کیا ہے؟ بتاؤ میرا یہ عشق بیجا ہے یا بجا، اور تمہاری ملامت بے محل ہے یا برمحل؟

﴿وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۞ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۞ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ﴾ (یوسف: ۳۰۔۳۲)

”اور (جب اس معاملہ کا چرچا پھیلا) تو شہر کی بعض عورتیں کہنے لگیں دیکھو عزیز کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈالنے لگی کہ اسے رجھالے، وہ اس کی چاہت میں دل ہار گئی، ہمارے خیال میں تو وہ صریح بدچلنی میں پڑ گئی، پس جب عزیز کی بیوی نے

ان عورتوں کے مکر کو سنا تو ان کو بلا بھیجا اور ان کے لیے مسندیں آراستہ کیں اور (دستور کے موافق) ہر ایک کو ایک ایک چھری پیش کر دی، پھر یوسف (علیہ السلام) سے کہا ان سب کے سامنے نکل آؤ، جب یوسف (علیہ السلام) کو ان عورتوں نے دیکھا تو اس کی بڑائی کی قائل ہو گئیں، انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور (بے اختیار) پکار اٹھیں یہ تو انسان نہیں ہے ضرور ایک فرشتہ ہے بڑے مرتبہ والا فرشتہ (عزیز کی بیوی) بولی تم نے دیکھا، یہ ہے وہ آدمی جس کے بارہ میں تم نے مجھے طعنے دیئے۔"

عزیز کی بیوی نے یہ بھی کہا کہ بیشک میں نے اس کا دل اپنے قابو میں لینا چاہا تھا مگر وہ بے قابو نہ ہوا، مگر میں یہ کہے دیتی ہوں کہ اگر اس نے میرا کہانہ مانا تو یہ ہو کر رہے گا کہ وہ قید کیا جائے اور بے عزتی میں پڑے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ سنا اور پھر عزیز کی بیوی کے علاوہ اور سب عورتوں کے چلتر اپنے بارے میں دیکھے تو اللہ تعالیٰ کے حضور میں دست بدعا ہوئے اور کہنے لگے، خدایا! جس بات کی جانب یہ عورتیں بلا رہی ہیں اس کے مقابلہ میں مجھے قید میں رہنا کہیں زیادہ پسند ہے، اگر تو نے میری مدد نہ کی اور مجھ کو ان مکاریوں سے نہ بچایا تو عجب نہیں کہ میں ان کی جانب مائل ہو جاؤں اور نادانوں میں سے بن جاؤں، یوسف کی دعا درگاہِ الٰہی میں قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے سب مکر و فریب رفع کر دیئے، اور کامیابی کا سہرا یوسف علیہ السلام ہی کے سر رہا۔

﴿قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝﴾

(یوسف: ۳۳۔۳۴)

"یوسف (علیہ السلام) نے کہا اے میرے پروردگار! جس بات کی طرف یہ مجھ کو بلاتی ہیں مجھے اس کے مقابلہ میں قید خانہ زیادہ پسند ہے اور اگر تو نے ان کے مکر کو مجھ سے نہ ہٹا دیا اور میری مدد نہ کی تو میں کہیں ان کی جانب جھک نہ جاؤں اور نادانوں سے نہ ہو جاؤں، پس اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی اور اس سے ان کا مکر ہٹا دیا بیشک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔"

اس واقعہ میں مذکور ہے ﴿قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ؗ﴾ (ان عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے) عام طور پر مفسرین اس کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ جمال یوسف علیہ السلام سے مدہوش ہو کر واقعی یہ حالت ہو گئی تھی کہ ان کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا اور کاٹنے والی چیز کی بجائے ہاتھوں کو کاٹ لیا۔

مگر بعض مفسرین عصر [1] نے اس تفسیر کو صحیح نہیں سمجھا، ان کے نزدیک مصری عورتوں کا یہ بھی تریا چرتر تھا اور وہ یوسف علیہ السلام کو اپنی جانب مائل کرنے کے لیے یہ بتانا چاہتی تھیں "کہ ہم تیرے حسن کے اس قدر متوالے ہیں کہ تیری صورت دیکھ کر ہوش و حواس بھی جاتے رہے اور ہاتھوں کو زخمی کر لیا" اور اپنی اس تفسیر کی تائید میں اس آیت سے استدلال کیا ہے ﴿اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ﴾ یعنی یوسف علیہ السلام نے ان کی اس حالت کو ﴿كَیْدَ﴾ (مکر سے تعبیر کیا ہے اگر یہ اضطراری حالت ہوتی تو پھر وہ بے قصور تھیں، ایسی حالت میں ان کے اس طرز عمل کو ﴿كَیْدَ﴾ کہنے کے کیا معنی؟ نیز جب یوسف علیہ السلام کو شاہ مصر نے زندان سے نکالنے کا

[1] مولانا آزاد ترجمان القرآن سورۂ یوسف

حکم دیا ہے تو اس وقت بھی حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ فرمایا تھا کہ:

﴿ فَسۡـَٔلۡهُ مَا بَالُ النِّسۡوَةِ الّٰتِیۡ قَطَّعۡنَ اَیۡدِیَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ بِکَیۡدِهِنَّ عَلِیۡمٌ ۝ ﴾(یوسف:۵۰)

"پس تو بادشاہ سے جا کر دریافت کر کہ ان عورتوں کا معاملہ کیا تھا جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، بلاشبہ میرا رب ان کے مکر سے خوب واقف ہے۔"

بہرحال عزیز پر چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کی صداقت ظاہر ہو چکی تھی اس لیے اس نے نہ چاہا کہ یوسف علیہ السلام کو کسی قسم کی گزند پہنچائے لیکن اس کی بیوی پر عشق کا بھوت بری طرح سوار تھا سو جب اس نے خوشامد، چاپلوسی، مکر وحیلہ، کسی طرح سے مطلب براری نہ دیکھی تو دھمکیوں سے کام لینا شروع کیا اور جب کوہ استقامت کو اس کے باوجود بھی مطلق حرکت نہ ہوئی تو اب عزیز نے یوسف علیہ السلام کی صداقتوں کی تمام نشانیاں دیکھنے اور سمجھ لینے کے باوجود اپنی بیوی کی فضیحت و رسوائی ہوتی دیکھ کر یہ طے کر ہی لیا کہ یوسف علیہ السلام کو ایک مدت کے لیے زندان میں بند کر دیا جائے تاکہ یہ معاملہ لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائے اور یہ چرچے بند ہو جائیں، اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو زندان جانا پڑا۔

اس موقعہ پر حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر[1] فرمایا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنی دُعا کے ساتھ چونکہ یہ بھی کہہ دیا کہ مجھے ان کی بے حیائی کی دعوت کے مقابلہ میں زندان زیادہ پسند ہے تو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے مکر سے تو ان کو بچا لیا مگر قید ان کی قسمت میں مقدر کر دی، ان کو چاہیے تھا کہ وہ یہ جملہ نہ کہتے اور بلاء و امتحان کو دعوت نہ دیتے، اور حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے اس لطیفہ کو قوی بنانے کے لیے ایک دوسرے محقق مفسر نے ایک حدیث کا حوالہ بھی دے دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص خدا سے دُعا مانگا کرتا تھا:

"اللّٰهم انی اسئلك الصبر"۔ "اے اللہ میں تجھ سے صبر مانگتا ہوں"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا تو بلاء و مصیبت کیوں مانگتا ہے، اس سے عافیت کا طالب کیوں نہیں ہوتا۔

ہمیں ان دونوں بزرگوں کی جلالت قدر کے پیش نظر اگرچہ جرأت گویائی نہیں ہے لیکن یوسف علیہ السلام جیسے عظیم المرتبت پیغمبر کی زندگی کے اس عدیم النظیر کارنامہ کو ایک لطیفہ کی نذر ہوتے دیکھ کر رہا نہیں جاتا، اور بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ جملہ ﴿ اَلسِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَیۡهِ ﴾ ان کے علوشان، تقرب الی اللہ، استقامت فی الدین، عزیمت فی الحق اور رضاء و تسلیم کا بے نظیر مظاہرہ ہے جو ان جیسے اولوالعزم پیغمبروں کا ہی حصہ ہے۔

غور کیجیے عزیز کی بیوی اور گھر کی مالکہ نے خوشامد و چاپلوسی کی کون سی راہ اختیار نہیں کی جس سے یوسف علیہ السلام کو رام کیا جا سکے، پھر اس میں ناکامی کے بعد دوسری عورتوں کی مدد حاصل کی اور انہوں نے اپنے ممکن داؤں گھات یوسف علیہ السلام پر استعمال کیے مگر پھر بھی ناکامی رہی، اب آخری درجہ یہ تھا کہ اس نے دھمکی دی کہ یا یوسف اس کو شاد کام کرے ورنہ قید خانہ میں ڈالا جائے گا۔ ایسی حالت میں ایک باخدا انسان، صاحب عزیمت و استقامت ہستی، اور خوف خدا کو تمام کائنات کے غیظ و غضب پر غالب رکھنے والا

---

[1] موضح القرآن

انسان، اس سے بہتر اور کیا جواب دے سکتا تھا کہ خدایا میں اس عمل بد کے مقابلہ میں زندان کو ترجیح دیتا ہوں، مجھے قید و بند سب کچھ منظور ہے مگر تیری نافرمانی منظور نہیں۔

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ قید کی طلب ہے، زندان کے شوق کا اظہار ہے، بلاؤ مصیبت کو دعوت ہے، ہرگز نہیں بلکہ یہاں تو لطیف پیرایہ میں وہ کہا جا رہا ہے جو اعلان حق اور خدارسی کا صحیح درجہ ہے، یوسف علیہ السلام نے یہ بھی گوارہ نہیں کیا کہ عزیز کی بیوی کو مخاطب کرے یا مہمان عورتوں کو اپنی گفتگو میں تخاطب کا موقع دے بلکہ اس نے اپنے خدا کو پکارا، مگر ان گمراہ اور بدقماش عورتوں پر یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھا کہ جس طرح ان کے تمام مکر و فریب، خوشامد اور چاپلوسی ناکام رہیں، اسی طرح ان کی دھمکی اور ان کا عذاب بھی میرے ارادہ حق، اور خدارسی کو باطل نہیں کر سکتا، یہ کہتی ہے کہ "یوسف یا مجھ کو شادکام کرے ورنہ جیل خانہ جائے" تو میں جیل خانہ کو اس کے ارادہ بد کے مقابلہ میں لاکھ بار ترجیح دوں گا۔ ﴿السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ﴾۔

اب فرمایئے کہ اس اعلان حق اور اظہار استقامت کا اس دُعا سے کیا تعلق جو ایک شخص خواہ مخواہ اپنے لیے "صبر" مانگ کر خود کو آزمائش میں پڑنے کی دعوت دے رہا تھا، وہاں نہ آزمائش تھی نہ امتحان، بلکہ مفت میں بلاؤ مصیبت کا داعی بن رہا تھا اور یہاں امتحان سر پر ہے، آزمائش موجود ہے، مصیبت کی دھمکی دی جا رہی ہے، بلا نازل کرنے کا خوف دلایا جا رہا ہے کیا ایسے نازک موقع پر صرف یہ جواب کافی ہوتا کہ یوسف علیہ السلام گڑگڑا کر جناب باری میں امراۃ عزیز سے چھٹکارا پا لینے کی دُعا کرتے اور بس، اگر ایسا ہوتا، تو امتحان، آزمائش اور بلاؤ مصیبت کے وقت استقامت، اعلان حق، بے خوفی اور تمام دنیوی رعونتوں کے مقابلہ میں اعلائے کلمتہ اللہ کا سبق کون سکھاتا اور عزیمت کی زندگی کون بتاتا باطل سے بے خوفی کی تعلیم کس سے ملتی اور حق و باطل میں امتیاز کی شان کون پیدا کرتا؟

یوسف علیہ السلام زندان میں:

بہرحال یوسف علیہ السلام کو قید خانہ بھیج دیا گیا اور ایک بے خطاء کو خطاء کار اور معصوم کو مجرم بنا دیا گیا تا کہ عزیز کی بیوی فضیحت سے بچ جائے اور مجرم کو کوئی مجرم نہ کہہ سکے۔

تورات میں ہے کہ یوسف علیہ السلام کے علمی اور عملی جوہر قید خانہ میں بھی نہ چھپ سکے اور قید خانہ کا داروغہ اس کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گیا اور جیل کا تمام انتظام و انصرام اس کے سپرد کر دیا، وہ قید خانہ بالکل مختار ہو گیا اور خداوند نے وہاں بھی اسے اس کے تمام کاموں میں اقبال [1] مند کیا۔

قرآن عزیز سے بھی اس کی تائید نکلتی ہے اس لیے کہ اس زمانے کے قید خانوں کے حالات کے پیش نظر یوسف علیہ السلام کے پاس قیدیوں کا اس طرح آنا جانا اور پھر ان کی عظمت و نیک نفسی کا اعتراف، اس کو واضح کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے پاک اوصاف کی قید خانہ میں کافی شہرت تھی۔

---

[1] پیدائش باب ۳۹ آیت ۲۳۔

دعوت و تبلیغ:

حسن اتفاق کہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ دونو جوان اور قید خانہ میں داخل ہوئے، ان میں سے ایک شاہی ساقی تھا اور دوسرا شاہی باورچی خانہ کا داروغہ،[1] ایک روز دونوں خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور ان میں سے ساقی کہنے لگا، میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ میں شراب بنانے کے لیے انگور نچوڑ رہا ہوں، اور دوسرے نے کہا، میں نے یہ دیکھا ہے کہ میرے سر پر روٹیوں کا خوان ہے اور پرند اس سے کھا رہے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نبی زادہ تھے، اسلام کی تبلیغ کا ذوق ان کے ریشہ ریشہ میں پیوست تھا، پھر خدا نے ان کو بھی نبوت کے لیے چن لیا تھا اس لیے دین حق کی اشاعت ان کی زندگی کا نصب العین تھا، گو قید میں تھے مگر مقصد حیات کو کیسے بھول جاتے اور اگرچہ مصیبت و محن میں تھے لیکن اعلاء کلمۃ اللہ کو فراموش کر دیں یہ کیسے ممکن تھا، موقعہ کو غنیمت جانا اور ان سے نرمی اور محبت سے فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے جو باتیں مجھے تعلیم فرمائی ہیں منجملہ ان کے یہ علم بھی اس نے عطا فرمایا ہے، میں اس سے پہلے کہ تمہارا مقررہ کھانا تم تک پہنچے تمہارے خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا مگر میں تم سے ایک بات کہتا ہوں، ذرا اس پر بھی غور کرو اور سمجھو بوجھو۔

"میں نے ان لوگوں کی ملت کو اختیار نہیں کیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بھی منکر ہیں، میں نے اپنے باپ دادوں یعنی ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کی ملت کی پیروی کی ہے، ہم ایسا نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک ٹھہرائیں، یہ اللہ تعالیٰ کا ایک فضل ہے جو اس نے ہم پر اور لوگوں پر کیا ہے لیکن اکثر لوگ اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے۔"

"اے دوستو! تم نے اس پر بھی غور کیا، جدا جدا معبودوں کا ہونا بہتر ہے یا اللہ کا جو یکتا اور سب پر غالب ہے؟ تم اس کے علاوہ جن کی عبادت بھی کرتے ہو ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جن کو تمہارے باپ دادا نے گھڑ لیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ہرگز کوئی سند نہیں اتاری، حکومت تو صرف اللہ کے ہی لیے ہے، اس نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو، یہی سیدھا دین ہے، مگر اکثر آدمی نہیں جانتے۔"

﴿يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۳۹-۴۰)

"اے یاران مجلس! (تم نے اس پر بھی غور کیا کہ) جدا جدا معبودوں کا ہونا بہتر ہے یا اللہ کا جو یگانہ اور سب پر غالب ہے تم اس کے سواء جن ہستیوں کی بندگی کرتے ہو ان کی حقیقت اس سے زیادہ کیا ہے کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کوئی سند نہیں اتاری، حکومت تو اللہ ہی کے لیے ہے، اس کا فرمان یہ ہے کہ صرف اس کی بندگی کرو اور کسی کی نہ کرو، یہی سیدھا دین ہے، مگر اکثر آدمی ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔"

[1] پیدائش باب ۴۰ آیت ۱

رشد و ہدایت، کے اس پیغام کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام ان کے خوابوں کی تعبیر کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے:

"دوستو! جس نے یہ دیکھا ہے کہ وہ انگور نچوڑ رہا ہے وہ پھر آزاد ہو کر بادشاہ کے ساقی کی خدمت انجام دے گا اور جس نے روٹیوں والا خواب دیکھا ہے اس کو سولی دی جائے گی، اور پرند اس کے سر کو نوچ نوچ کھائیں گے، جن باتوں کے بارہ میں تم نے سوال کیا تھا وہ فیصل ہو چکی، اور فیصلہ یہی ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ ساقی اور داروغہ، باورچی خانہ پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے بادشاہ کے کھانے پینے کی چیزوں میں زہر ملایا، جب تحقیقات ختم ہو گئیں تو داروغہ پر یہ جرم ثابت ہو گیا اور ساقی کو بری کر دیا گیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام جب تعبیر خواب سے فارغ ہو گئے تو ساقی سے یہ سمجھ کر کہ وہ نجات پا جائے گا، فرمانے لگے ﴿اذْكُرْنِي عِندَ رَبِّكَ﴾ اپنے بادشاہ سے میرا ذکر کرنا، ساقی جب رہا ہو گیا تو اس کو اپنی مشغولیات میں کچھ بھی یاد نہیں رہا کہ زندان میں کیا وعدہ کر آیا تھا، اور شیطان نے اس کے دماغ سے یہ سب بھلا دیا اور اس طرح چند سال تک یوسف علیہ السلام کو قید خانہ میں ہی رہنا پڑا۔

اس مقام پر اکثر مفسرین کی تفسیر کا ماحصل یہ ہے کہ ﴿اذْكُرْنِي عِندَ رَبِّكَ﴾ سے یوسف علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ بادشاہ سے کہنا کہ ایک بے قصور اور بے گناہ انسان اس طرح مجرم بنا کر زندان میں ڈال دیا گیا ہے اور اس تفسیر کے بعد وہ یہ نکتہ پیدا کرتے ہیں کہ اگرچہ مصائب اور ضرورت کے موقعہ پر انسان کا انسانوں سے مدد لینا اور استعانت طلب کرنا حق گوشی اور خدا پرستی کے خلاف نہیں ہے تاہم بمصداق ﴿حسنات الابرار سیئات المقربین﴾ "نیکوں کی بعض بھلائیاں مقربین بارگاہِ الٰہی کے شایان شان نہیں ہوتیں" حضرت یوسف علیہ السلام جیسی ہستی کے لیے یہ موزوں نہ تھا کہ وہ خدا پر بھروسہ کے ساتھ ساتھ دنیوی اسباب پر بھروسہ کریں، اور بادشاہ سے اپنی مظلومیت کے دفاع کے طالب ہوں، اس لیے خدا کا فیصلہ یہ ٹھہرا کہ ان کو ابھی چند سال اور قید خانہ میں رکھے اور ساقی کو شیطان نے ایسا بھلایا کہ وہ یوسف کا کچھ بھی ذکر نہ کر سکا۔ اور ابن جریر اور بغوی نے بعض سلف سے نقل کیا ہے کہ وہ ﴿فانساہ﴾ کی ضمیر کو یوسف علیہ السلام کی جانب پھیرتے اور یہ معنی کرتے ہیں کہ شیطان نے یوسف علیہ السلام کو بھلا دیا کہ ان کا بادشاہ کی مدد کے لیے ساقی سے کہنا ناموزوں ہے، مگر ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کو سختی کے ساتھ رد کر دیا اور اس تفسیر کو غلط ثابت کیا ہے، [1] آئندہ سطور میں توراۃ سے اس سلسلہ میں جو نقل کیا گیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہے۔

اس تفسیر کے برعکس بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ "بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرنا کہ ایسا ایک شخص ہم کو اس طرح دین حق کی تلقین کرتا ہے، اور وہ اپنی ملت کو ہماری ملت سے جدا بتاتا، اور اس پر بہترین دلائل دیتا ہے۔"

اور اس تفسیر کی صحت کے لیے قرینہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر قرآن عزیز میں یوسف علیہ السلام اور ان دو [2] شخصوں کے درمیان صرف دو ہی باتوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے، ایک دعوت و تبلیغ اسلام کا اور دوسرے خواب اور اس کی تعبیر کا، تیسری کسی بات کا اشارہ تک نہیں، یعنی کسی اشارہ اور کنایہ سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان ہر دو اشخاص کے سامنے اپنا قصہ بیان

---

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ یوسف [2] پیدائش باب ۴۰ آیت ۱۲-۱۵

کیا ہو، اور ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہو، پھر بغیر ذکر سابق کے اس طرح ﴿اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ﴾ میں اجمال کے کیا معنیٰ؟
علاوہ ازیں اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے زندان سے باہر آنے کی طلب وجستجو کا یہ حال تھا تو جب ساقی کے یاد آنے اور بادشاہ کے خواب کی تعبیر دینے کے بعد بادشاہ نے ان کی رہائی کا حکم دے دیا تو کیوں فوراً باہر نہ نکل آئے اور تفتیش حال کا مطالبہ کیوں کیا، یہ تو رہائی کے بعد بھی ہوسکتی تھی، اور عصمت، اور بے گناہی کا فیصلہ باہر آ کر بھی کیا جاسکتا تھا۔

آیات کی ترتیب وانجام کے پیش نظر یہی تفسیر قابل ترجیح ہے۔ تورات میں اس واقعہ کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

"تب یوسف بولا اس کی تعبیر یہ ہے کہ یہ تین ڈالیاں تین دن ہیں اور فرعون اب سے تین دن میں تیری روبکاری کرے گا، اور تجھے تیرا منصب پھیر دے گا اور آگے کی طرح جب تو فرعون کا ساقی تھا اس کے ہاتھ میں پھر جام دے گا، لیکن جب تو خوش حال ہو تو مجھے یاد کیجیو اور مجھے اس گھر سے مخلصی دلوائیو کہ وہ عبرانیوں کی ولایت سے مجھے چرا لائے، اور یہاں بھی میں نے ایسا کام نہیں کیا کہ وہ مجھے اس قید میں رکھیں۔" [1]

فرعون کا خواب:

حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ واقعہ "فراعنہ مصر" کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے، یہ خاندان شاہی نسلی اعتبار سے "عمالقہ" میں سے تھا، مصر کی تاریخ میں ان کو "ہکسوس" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان کی اصلیت کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ چرواہوں کی ایک قوم تھی، جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قوم عرب سے آئی تھی اور دراصل یہ "عرب عاربہ" ہی کی ایک شاخ تھی، نیز قدیم قبطی اور عربی زبانوں کی باہمی مشابہت ان کے عرب ہونے کی مزید دلیل ہے۔ [2]

اور مصر کے مذہبی تخیل کی بنا پر ان کا لقب "فاراع" [3] (فرعون) تھا، اس لیے کہ مصری دیوتاؤں میں سے بڑا اور مقدس دیوتا آمن راع (سورج دیوتا) تھا اور بادشاہ وقت اس کا اوتار اور "فاراع" کہلاتا تھا، یہی فاراع عبرانی میں فارعٔن اور عربی میں فرعون کہلایا اور اس زمانہ کے فرعون کا نام عرب مؤرخوں نے ریان بتایا ہے اور مصری آثار میں آپوفی کے نام سے موسوم ہے۔

بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام ابھی زندان ہی میں تھے کہ وقت کے فرعون نے ایک خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں اور سات دُبلی، اور دُبلی گائیں موٹی کو نگل گئیں، اور سات سرسبز وشاداب بالیں ہیں اور سات خشک اور خشک بالوں نے سرسبز کو کھالیا، بادشاہ صبح اُٹھا تو پریشان خاطر تھا اور اس عجیب وغریب خواب سے حیران، فوراً دربار کے مشیروں سے اپنا خواب کہا اور خواب کی تعبیر چاہی درباری بھی اس کو سن کر فکر وتردد میں پڑ گئے اور جب حل نہ کر سکے تو اپنی درماندگی وبے چارگی کو چھپانے کے لیے کہنے لگے، بادشاہ! یہ خواب نہیں ہے بلکہ پریشان خیالات ہیں جن کا کوئی خاص مطلب نہیں ہے، ہم سچے خواب کی تعبیر تو دے سکتے ہیں لیکن پریشان خیالات حل نہیں کر سکتے۔

---

[1] پیدائش باب ۴۰ آیت ۱۲۔۱۵ [2] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۳۶۶

[3] مصری مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے اور ان سب سے بلند تر "آمن راع" تھا، یعنی سورج دیوتا نیز مصریوں میں الوہیت آمیز شاہی کا تصور بھی پوری طرح نشوونما پاچکا تھا اور تاجدارانِ مصر نے نیم خدا کی حیثیت اختیار کرلی تھی، ان کا لقب فاراع اسی لئے ہوا کہ وہ راع یعنی سورج دیوتا کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ (ترجمان القرآن ج ۲ ص ۳۶۲) پھر بھی یہی فارع عربی میں جاکر فرعون بن گیا۔

بادشاہ کو دربار یوں کے اس جواب سے اطمینان نہ ہوا، کہ اس اثناء میں ساقی کو اپنا خواب اور یوسف کی تعبیر کا واقعہ یاد آ گیا، اس نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کی کہ اگر کچھ مہلت دیجئے تو میں اس کی تعبیر لا سکتا ہوں، مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دیجئے۔ بادشاہ کی اجازت سے وہ اسی وقت قید خانہ پہنچا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو بادشاہ کا خواب سنایا اور کہا کہ آپ اس کو حل کیجئے کیونکہ آپ سچائی اور تقدس کے پیکر ہیں، آپ ہی اس کو حل کر سکتے ہیں، اور کیا عجب ہے کہ جن لوگوں نے مجھے بھیجا ہے جب میں صحیح تعبیر لے کر ان کے پاس واپس جاؤں تو وہ آپ کی حقیقی قدر و منزلت معلوم کر لیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا کمال صبر و استقلال، اور جلالت قدر کا اندازہ کیجئے، ساقی کو نہ ملامت کی اور نہ برسوں تک بھولے رہنے پر جھڑکا، اور نہ عطاء علم میں بخل سے کام لیا اور نہ یہ سوچا کہ جن ظالموں نے مجھ کو بے قصور زندان میں ڈالا ہے وہ اگر تباہ ہو جائیں اور اس خواب کا حل نہ پا کر برباد ہو جائیں تو اچھا ہے، ان کی یہی سزا ہے، نہیں ایسا کچھ بھی نہیں کیا بلکہ اسی وقت خواب کی تعبیر دی اور اپنی جانب سے اس سلسلہ میں صحیح تدبیر بھی بتلا دی، اور ساقی کو پوری طرح مطمئن کر دیا۔ فرمایا:

اس خواب کی تعبیر، اور اس کی بنا پر جو کچھ تم کو کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ تم سات برس تک لگا تار کھیتی کرتے رہو گے اور یہ تمہاری خوش حالی کے سال ہوں گے، جب کھیتی کے کٹنے کا وقت آئے تو جس قدر مقدار تمہارے سال بھر کھانے کے لیے ضروری ہو اس کو الگ کر لو اور باقی غلہ کو ان کی بالوں میں ہی رہنے دو تا کہ محفوظ رہے اور گلے سڑے نہیں۔ اس کے بعد سات برس بہت سخت مصیبت کے آئیں گے وہ تمہارا جمع کیا ہوا تمام ذخیرہ ختم کر دیں گے، اس کے بعد پھر ایک برس ایسا آئے گا کہ خوب پانی برسے گا، کھیتیاں ہری بھری ہوں گی اور لوگ پھلوں اور دانوں سے عرق اور تیل بہتات کے ساتھ نکالیں گے، یعنی موٹی گائیں اور بالیں خوش حالی کے سال ہیں اور دُبلی گائیں اور بالیں خشک سالی کے برس جو خوش حالی کی پیداوار کو کھا جائیں گے۔

﴿قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ۝ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۴۷۔۴۹)

"کہا تم کھیتی کرو گے سات برس جم کر سو جو کاٹو اس کو چھوڑ دو اس کی بال میں مگر تھوڑا سا جو تم کھاؤ، پھر آئیں گے اس کے بعد سات برس سختی کے کھا جائیں گے جو رکھا تم نے ان کے واسطے مگر تھوڑا سا جو روک رکھو گے بیج کے واسطے، پھر آئے گا، ایک برس اس کے پیچھے اس میں مینہ برسے گا لوگوں پر اور اس میں رس نچوڑیں گے۔"

یہ قرآن عزیز کی بلاغت کلام کا اعجاز ہے کہ اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر خواب اور اس سے متعلق تدبیر کو ایک ہی جملہ میں ساتھ ساتھ بیان کر دیا ہے تا کہ کلام میں تکرار اور دہرانے کی ضرورت باقی نہ رہے۔

ساقی نے یہ سب معاملہ بادشاہ کے سامنے جا سنایا، بادشاہ نے ساقی کی زبان سے پہلے کچھ جملے یوسف علیہ السلام کی تعریف میں سنے تھے، تعبیر خواب کا معاملہ دیکھ کر ان کے علم و دانش، اور جلالت قدر کا قائل ہو گیا اور نادیدہ مشتاق بن کر کہنے لگا کہ ایسے شخص کو میرے پاس لاؤ۔

جب بادشاہ کا پیامبر یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا اور بادشاہ کے طلب و اشتیاق کا حال سنایا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانے سے باہر آنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ اس طرح تو میں جانے کو تیار نہیں ہوں، تم اپنے آقا کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ یہ تحقیق کرے کہ ان عورتوں کا معاملہ کیا تھا، جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ پہلے یہ بات صاف ہو جائے کہ انہوں نے کیسی کچھ مکاریاں کی تھیں اور میرا پروردگار تو ان کی مکاریوں سے خوب واقف ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام بے قصور اور بے خطاء برسوں سے قید خانہ میں بند تھے اور بلا وجہ ان کو زندانی بنایا ہوا تھا۔ اب جب کہ بادشاہ نے مہربان ہو کر رہائی کا مژدہ سنایا تو چاہیے تھا کہ وہ مسرت و خوشی کے ساتھ زندان سے باہر نکل آتے، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور گذشتہ معاملہ کی تحقیق کا مطالبہ شروع کر دیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام خانوادۂ نبوت سے ہیں اور خود بھی برگزیدہ نبی و پیغمبر ہیں، اس لیے غیرت و حمیت اور عزت نفس کے بدرجہ اتم مالک ہیں، انہوں نے سوچا کہ اگر بادشاہ کی اس مہربانی پر میں رہا ہو گیا تو یہ بادشاہ کا رحم و کرم سمجھا جائے گا اور میرا بے قصور اور صاحب عصمت ہونا پردۂ خفا میں رہ جائے گا، اس طرح صرف عزت نفس ہی کو ٹھیس نہیں لگے گی بلکہ دعوت و تبلیغ کے اس اہم مقصد کو بھی نقصان پہنچے گا جو میری زندگی کا نصب العین ہے پس اب بہترین وقت ہے کہ معاملہ کی اصل صورت سامنے آ جائے اور حق ظاہر و واضح ہو جائے۔

صحیحین (بخاری و مسلم) کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس واقعہ کا ذکر فرماتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کے ضبط و صبر کو بہت سراہا اور تواضع و کسر نفسی کی حد تک اس کو بڑھا کر یہ ارشاد فرمایا:

((لَو لَبِثْتُ فِی السجنِ مَا لَبِثَ یُوسُفُ لَاَجَبْتُ الدَّاعِیَ)). (الحدیث) [1]

"اگر میں اس قدر دراز مدت تک قید میں رہتا۔ جس قدر کہ یوسف علیہ السلام رہے تو بلانے والے کی دعوت فوراً قبول کر لیتا۔"

اس جگہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگرچہ یوسف علیہ السلام کا معاملہ براہ راست عزیز کی بیوی کے ساتھ پیش آیا تھا مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کا ذکر نہیں کیا بلکہ ان مصری عورتوں کا حوالہ دیا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسا کیوں کیا، اس کی دو وجہیں تھیں، ایک یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اگرچہ عزیز کی بیوی سے زیادہ تکلیف پہنچی تھی مگر قید کے اس معاملہ میں ان عورتوں کی بھی سازش تھی اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک یوسف علیہ السلام کی عاشق اور ان کو اپنی جانب مائل کرنے کی آرزومند تھی، اور ناکامی کی صورت میں سب نے مل کر عزیز کی بیوی کو اس کے قید والے فیصلہ میں شہ دی اور عملی جامہ پہنا کر چھوڑا یہی وجہ ہے کہ زندان کا معاملہ ان عورتوں کے قضیہ کے بعد پیش آیا، دوسری وجہ یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام سمجھتے تھے کہ عزیز نے میرے ساتھ ممکن حسن سلوک برتا ہے، میری عزت اور میرا احترام کیا ہے اس لیے موزوں نہیں ہے کہ میں اس کی بیوی کا نام لے کر اس کی رسوائی کا باعث بنوں۔

غرض بادشاہ نے جب یہ سنا تو ان عورتوں کو بلوایا اور ان سے کہا کہ صاف صاف اور صحیح صحیح بتاؤ کہ اس معاملہ کی اصل حقیقت کیا ہے جب کہ تم نے یوسف علیہ السلام پر ڈورے ڈالے تھے تا کہ تم اس کو اپنی طرف مائل کر لو؟ وہ ایک زبان ہو کر بولیں:

---

[1] بخاری کتاب الانبیاء

﴿ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ﴾(یوسف:۵۱)

"بولیں، حاشاء اللہ ہم نے اس میں برائی کی کوئی بات نہیں پائی۔"

مجمع میں عزیز کی بیوی بھی موجود تھی اور اب وہ عشق و محبت کی بھٹی میں خام نہ تھی کندن تھی، اور ذلت و رسوائی کے خوف سے آگے نکل چکی تھی اس نے جب یہ دیکھا کہ یوسف علیہ السلام کی خواہش ہے کہ حقیقت حال سامنے آ جائے تو بے اختیار بول اٹھی:

﴿ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۡ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾(یوسف:۵۱)

"جو حقیقت تھی وہ اب ظاہر ہوگئی، ہاں وہ میں ہی تھی جس نے یوسف (علیہ السلام) پر ڈورے ڈالے کہ اپنا دل ہار بیٹھے، بلاشبہ وہ (اپنے بیان میں) بالکل سچا ہے۔"

اور یہ بھی کہا:

﴿ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۝ وَ مَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾(یوسف:۵۲-۵۳)

"یہ میں نے اس لیے کہا کہ اس (یوسف علیہ السلام) کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پیٹھ پیچھے اس کے معاملہ میں خیانت نہیں کی۔ نیز اس لیے کہ (واضح ہو جائے) اللہ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی (کامیابی) کی راہ نہیں کھولتا، میں اپنے نفس کی پاکی کا دعویٰ نہیں کرتی، آدمی کا نفس تو برائی کے لیے بڑا ہی اُبھارنے والا ہے مگر ہاں اسی حال میں کہ میرا پروردگار رحم کرے، بلاشبہ میرا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا، بڑا ہی رحم کرنے والا ہے۔"

ہم نے اس آیت کا ترجمہ مشہور مفسر ابن حیان اندلسی کی تفسیر کے مطابق کیا ہے، دوسرے مفسرین اس کے علاوہ تفسیر کرتے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے شاگرد رشید حافظ عماد الدین بن کثیر اپنی تفسیر میں اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

"یہ میں نے اس لیے کہا کہ اس (عزیز) کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس کی (اس سے زیادہ اور کوئی) خیانت نہیں کی (جس کا حال اسے معلوم ہے) اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے مکر کو کامیاب نہیں کرتا (سو اگر میں نے اس سے زیادہ خیانت کی ہوتی تو اس کا بھی پردہ فاش ہو کر رہتا) اور میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتی، بیشک نفس البتہ برائی کے لیے اُبھارنے والا ہے مگر جس پر میرا پروردگار رحم کر دے، بیشک میرا پروردگار بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔"

یعنی انہوں نے اس مقولہ کو عزیز کی بیوی کا مقولہ قرار دے کر ﴿ لَمْ اَخُنْهُ ﴾ کی ضمیر کا مرجع عزیز کو قرار دیا ہے۔

اور عام مفسرین اس پورے مقولے کو حضرت یوسف علیہ السلام کا مقولہ قرار دیتے ہیں اور ﴿ لَمْ اَخُنْهُ ﴾ کی ضمیر کو اسی طرح عزیز کی بیوی کی جانب پھیرتے ہیں جس طرح حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے ہے اور آیت کا اس طرح ترجمہ کرتے ہیں:

"یوسف علیہ السلام نے کہا یہ اس واسطے کہ عزیز کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی اور اللہ تعالیٰ دغابازوں کا فریب کامیاب نہیں کرتا، اور میں اپنے نفس کو پاک نہیں کہتا، بیشک نفس سکھلاتا ہے برائی مگر یہ کہ رحم کرے میرا پروردگار بیشک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔"

اور ﴿مَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ﴾ کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے چونکہ اپنی عصمت نفس کا اس موقعہ پر زبردست مظاہرہ کیا تھا تو ایک جلیل القدر نبی اور مقرب بارگاہِ الٰہی ہونے کی وجہ سے یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری تھا کہ میری پاکبازی اور عصمت کا یہ معاملہ میرے اپنے نفس کی بدولت نہیں ہے کیونکہ نفس انسانی تو اکثر برائی پر اُبھارتا ہے بلکہ یہ محض خدا کی رحمت و عنایت کا صدقہ ہے اور یہی رحمت، عصمت انبیاء کی کفیل ہے۔

بہرحال وقت آ پہنچا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت و پاکبازی اور صداقت و طہارت کا معاملہ تہمت لگانے والوں کی زبان ہی سے واضح ہو جائے چنانچہ واضح اور ظاہر ہو گیا اور شاہی دربار میں مجرموں نے اعتراف جرم کر کے بتا دیا کہ یوسف (علیہ السلام) کا دامن ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک اور منزہ ہے۔

لطیفہ:

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام خدا کے سچے پیغمبر اور نبی معصوم تھے اس لیے ان کا دامن ہر قسم کی آلائش سے پاک صاف تھا، اور ان کی مقدس زندگی کا ایک لمحہ بھی کسی آلودگی سے ملوث نہیں ہوا تھا، اس لیے خدائے تعالیٰ کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق جس قدر بھی شخصیتیں تھیں ان سب کی زبانی ان کی طہارت نفس اور عصمت کا اعتراف کرایا۔

اَلفضلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ

اچھا یوسف علیہ السلام کے علاوہ اس واقعہ کی شخصیتیں کون ہیں؟ عزیز مصر کی بیوی، شہری عورتیں، اور عزیز کی بیوی کا رشتہ دار، یہی افراد ہیں جو کسی نہ کسی طرح تحقیق طلب معاملہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں سب سے پہلے عزیز کی بیوی کا رشتہ دار سامنے آتا ہے اور پیراہن کے چاک ہونے کا عاقلانہ فیصلہ دے کر یوسف علیہ السلام کی پاکی کا اظہار کرتا، اور عورت کو مجرم ٹھہراتا ہے، اس کے بعد حقیقت حال واضح ہو جانے پر عزیز بھی اقرار کرتا ہے کہ یوسف بے گناہ، بے خطا اور معصوم ہے اور ﴿يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا﴾ کہہ کر یوسف علیہ السلام سے معذرت کرتا اور اپنی ناموس کی حفاظت کی خاطر معاملہ کو ختم کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ تیسرا نمبر شہری عورتوں کا ہے، جب بادشاہ نے بھرے دربار میں یوسف علیہ السلام کے معاملہ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بے تامل کہہ دیا ﴿حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ﴾ اور اس طرح یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی پر مہر لگا دی، یہ سب شہادتیں اگرچہ یوسف علیہ السلام کے عزیزوں، رشتہ داروں اور حامیوں کی جانب سے نہ تھیں بلکہ ایک اجنبی ملک عزیز کی بیوی کے ہم قوم اور اہل خاندان کی شہادتیں تھیں، تاہم وہم و گمان ہو سکتا تھا کہ کچھ عجب نہیں کہ اس معاملہ میں کسی حد تک "اگرچہ بہت تھوڑا ہی سہی" یوسف کا بھی ضرور قصور ہوگا، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم الشان فضل و کرم تھا کہ اس نے اپنے پاک اور مقدس بندہ کی عصمت کے اعلان اور اس کے بارہ میں شائبہ سوءظن کے انہدام کے لیے علی روس الاشہاد خود مجرم سے اقرار جرم کرایا، اور اس ہی کی زبان سے یوسف علیہ السلام کی عصمت و صداقت کی شہادت لا کر حقیقت حال آشکارا کر دی اور شاہی دربار میں عزیز کی بیوی کو یہ کہنا پڑا کہ:

﴿ اَلْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۡ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۵۱ ﴾ (یوسف: ۵۱)

"اب حق ظاہر ہو گیا میں نے ہی اس کو اپنے نفس کے لیے پھسلایا تھا اور بلاشبہ وہ سچا ہے۔"

﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾ (المائدہ:۵۴)

"اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطاء کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والے ہیں۔"

فرعون پر جب حقیقت حال منکشف ہوگئی تو اس کے قلب میں حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت و جلالت قدر کا سکہ بیٹھ گیا، ساقی کا حسن عقیدت کے ساتھ یوسف علیہ السلام کی عقل و دانش کا ذکر اپنی خواب کی بہترین اور دل لگتی تعبیر اور عصمت نفس کا یہ انکشاف، یہ سب امور تھے جنہوں نے مل کر بادشاہ کو اس بزرگ اور پر عظمت ہستی کی دید اور اس سے استفادہ کا عاشق بنا دیا، وہ کہنے لگا:

﴿ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ﴾(یوسف:۵۴)

"اس کو (جلد) میرے پاس لاؤ کہ میں اس کو خاص اپنے کاموں کے لیے مقرر کروں۔"

یوسف علیہ السلام اب بایں رعنائیں و دلبری، بایں عصمت و پاکبازی، اور بایں عقل و دانش زندان سے نکل کر بادشاہ کے دربار میں تشریف لائے، بات چیت ہوئی تو بادشاہ حیران رہ گیا کہ اب تک جس کی راست بازی، امانت داری اور وفاء عہد کا یہ کچھ تجربہ کیا تھا وہ عقل و دانش اور حکمت و فطانت میں بھی آپ اپنی نظیر ہے اور مسرت کے ساتھ کہنے لگا:۔

﴿اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ۝ ﴾(یوسف:۵۴)

"بلاشبہ آج کے دن تو ہماری نگاہوں میں بڑا صاحب اقتدار اور امانت دار ہے۔"

پھر ان سے دریافت کیا کہ میرے خواب میں جس قحط سالی کا ذکر ہے اس کے متعلق مجھ کو کیا کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں، حضرت یوسف علیہ السلام نے جواب دیا۔

﴿قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰي خَزَاۗىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّىْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾(یوسف:۵۵)

یوسف علیہ السلام نے کہا: "اپنی مملکت کے خزانوں پر آپ مجھے مختار کیجئے میں حفاظت کرسکتا ہوں، اور میں اس کام کا جاننے والا ہوں۔"

چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی تمام مملکت کا امین و کفیل بنا دیا، اور شاہی خزانوں کی کنجیاں ان کے حوالہ کر کے مختار عام کر دیا، تورات میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"یہ تعبیر فرعون کی نگاہ میں اور اس کے سب نوکروں کی نظر میں اچھی معلوم ہوئی، فرعون نے اپنے نوکروں کو کہا کیا ہم ایسا جیسا یہ جو کہ جس میں خدا کی روح ہے پا سکتے ہیں؟ اور فرعون نے یوسف علیہ السلام سے کہا از بس کہ خدا نے تجھے اس سب میں بینائی دی ہے سو تجھ سا عاقل و دانشور نہیں ہے تو میرے گھر کا مختار ہوا اور اپنا حکم میری سب رعیت پر جاری کر، فقط تخت نشینی میں میں تجھ سے بزرگ تر رہوں گا، پھر فرعون نے یوسف علیہ السلام سے کہا دیکھ میں نے تجھے ساری زمین مصر پر حکومت بخشی اور فرعون نے اپنی انگشتری اپنے ہاتھ سے نکال کر یوسف کے ہاتھ میں پہنا دی اور اس کو کتان کا لباس پہنایا اور سونے کا طوق اس کے گلے میں ڈالا اور اس نے اسے مصر کی ساری مملکت پر حاکم کیا، اور فرعون نے یوسف کو کہا میں فرعون ہوں اور بغیر تیرے مصر کی ساری زمین میں کوئی انسان اپنا ہاتھ یا پاؤں نہ اٹھائے گا۔"

پیدائش باب ۴۱ آیات ۳۷۔۴۴

اللہ اللہ! خدائے تعالیٰ کی قدرت اور اس کے عطاء و کرم کی یہ کیسی بوالعجبی ہے کہ کل جس ہستی کو مصر کی متمدن قوم، بدوی اور صحرائی سمجھتی تھی، جو بدوی تھا اور غلام بھی اس کو پہلے ایک سردار کے گھر کا مختار، اس کی نگاہوں میں محترم و معزز اور امین و فطین بنایا، اور پھر قید خانہ کی زندگی سے نکالا تو مملکت مصر، اور قوم مصر کا مالک و مختار بنا دیا، اور اس مرتبہ پر پہنچا دیا کہ اسباب دنیوی کے ماتحت جس کا تصور بھی ممکن نہ تھا، یہ قادر مطلق کی کارفرمائی کا معجزانہ مظاہرہ نہیں تو اور کیا ہے کہ کل جو کنعان میں گلہ بانی کر رہا تھا وہ آج وقت کی سب سے بڑی متمدن قوم کا مختار و مالک بن کر جہاں بانی کر رہا ہے، سچ ہے جس کو وہاں قبولیت کا شرف حاصل ہو گیا اس کے لیے راہ کی تمام دشواریاں ہیچ ہیں اور حالات کی نامساعدت پر کاہ کی وقعت بھی نہیں رکھتی۔

اسی لیے حق تعالیٰ نے "عزیز" کے کاروبار کا مختار بنا کر یوسف علیہ السلام کے لیے یہ فرمایا تھا کہ ہم نے اس کو "تمکین فی الارض" عطا کر دی اور اب جبکہ اس آغاز کی یہ انتہا نمود میں آ گئی تو پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ؕ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۵۶-۵۷)

"اور اس طرح ہم نے سرزمین مصر میں یوسف (علیہ السلام) کے قدم جما دیئے جس جگہ سے چاہے حسب مرضی رہنے سہنے کا کام لے، ہم جسے چاہتے ہیں (اسی طرح) اپنی رحمت سے فیض یاب کر دیتے ہیں، اور نیک عملوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے، اور جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور بدعملیوں سے بچتے رہے ان کے لیے تو آخرت کا اجر اس سے کہیں بہتر ہے۔"

سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے دو جگہ ﴿تمکین فی الارض﴾ (زمین کا مالک بنا دینا) کی بشارت سنائی گئی ہے اور دونوں مقام پر تعبیر کا نیا اسلوب اختیار کیا گیا ہے، اس کے متعلق مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں کیا خوب کہا ہے:

حضرت یوسف علیہ السلام کی مصری زندگی کے دو انقلاب انگیز نقطے تھے، ایک وہ جب غلام ہو کر بکے اور پھر عزیز کی نظروں میں ایسے معزز ہوئے کہ اس کے علاقے کے مختار ہو گئے، دوسرا یہ کہ قید خانہ سے نکلے اور نکلتے ہی وہاں پہنچ گئے کہ حکمرانی کی مسند جلال پر جلوہ آرا نظر آئے پس جب پہلے انقلاب تک سرگذشت پہنچی تھی تو آیت (۲۱) میں حکمت الٰہی کی کرشمہ سنجیوں پر توجہ دلائی تھی کہ ﴿كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ﴾ اور اب کہ دوسرا انقلاب پیش آیا تو اسی آیت (۵۶) میں فرمایا ﴿كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ﴾ وہاں چونکہ معاملہ مصر کی ابتداء ہوئی تھی اور ابھی حضرت یوسف علیہ السلام کو حکمرانی کی دانش سیکھنی باقی تھی اس لیے فرمایا تھا ﴿وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ﴾ (یوسف: ۲۱) یہاں چونکہ تکمیل کار کے بعد اس کا نتیجہ ظاہر ہو گیا تھا اس لیے فرمایا ﴿لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (یوسف: ۵۶) یہ اس لیے ہوا کہ ہمارا قانون ہے نیک عمل کا بیج کبھی ضائع نہیں ہوتا ضروری ہے کہ پھل لائے۔ [1]

شروع واقعہ میں یہ کہا گیا ہے کہ سورۂ یوسف کا نزول یہودیوں کے اس سوال پر ہوا جو انہوں نے مشرکین مکہ کے ذریعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا: وہ یہ کہ "ابراہیم علیہ السلام کی نسل مصر میں کیسے آئی؟"

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۲۳۵ (نوٹ)

اس لیے آیت زیر بحث کی تفسیر میں شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ جواب ہوا ان کے سوال کا کہ "اولاد ابراہیم اس طرح شام سے آئی مصر میں" اور بیان ہوا کہ بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو گھر سے دور پھینکا تاکہ ذلیل ہو، اور اللہ نے زیادہ عزت دی اور ملک پر اختیار دیا" ویسا ہی ہوا ہمارے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ [1]

غرض حضرت یوسف علیہ السلام نے سلطنت مصر کے مختار کل ہونے کے بعد خواب سے متعلق وہ تمام تدابیر شروع کر دیں جو چودہ سال کے اندر مفید کار ہو سکیں اور رعایا قحط سالی کے ایام میں بھی بھوک اور پریشان حالی سے محفوظ رہ سکے، چونکہ یہ تفصیل، خواب اور اس کی تعبیر کے ضمن میں خود بخود ذہن میں آ جاتی ہے، اس لیے قرآن عزیز نے واقعہ کے ان غیر ضروری حصوں کو بیان نہیں کیا۔ البتہ توراۃ نے ان تفصیلات کو بھی دہرایا ہے۔

"اور یوسف علیہ السلام جس وقت مصر کے بادشاہ فرعون کے حضور کھڑا ہوا تیس (۳۰) برس کا تھا، اور یوسف علیہ السلام فرعون کے حضور سے نکل کر مصر کی ساری زمین میں پھرا، اور بڑھتی کے سات برس میں زمین مالا مال ہوئی تب اس نے ان سات برسوں کی ساری چیزیں کھانے کی جو سرزمین مصر میں تھیں جمع کیں اور اس نے ان کھانے کی چیزوں کو بستیوں میں ذخیرہ کیا اور ان کھیتوں کی جو ہر بستی کے آس پاس تھے کھانے کی چیزیں اسی بستی میں رکھیں، اور یوسف علیہ السلام نے غلہ بہت کثرت سے جیسے دریا کی ریت ایسا کہ وہ حساب کرنے سے باز رہا جمع کیا کیونکہ وہ بے حساب تھا، اور سات برس سستی کے جو زمین مصر میں تھے آخر ہوئے اور گرانی کے سات برس جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے کہا تھا آنے شروع ہوئے اور سب زمین میں گرانی ہوئی، پر ہنوز مصر کی ساری زمین میں روٹی تھی پھر جب ساری زمین مصر بھوک سے ہلاک ہونے لگی تو خلق روٹی کے لیے فرعون کے آگے چلائی، فرعون نے سب مصریوں کو کہا کہ یوسف علیہ السلام کے پاس جاؤ وہ جو تمہیں کہے سو کرو، اور تمام روئے زمین پر کال تھا، اور یوسف علیہ السلام نے ذخیرے کے کھتے کھول کے مصریوں کے ہاتھ بیچے اور مصر کی زمین میں کال بہت بڑھا، اور سارے ملک مصر میں مول لینے آئے، کیونکہ سب ملکوں میں سخت کال تھا۔

جب یعقوب علیہ السلام نے دیکھا کہ مصر میں غلہ ہے تب یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم کیوں ایک دوسرے کو تاکتے ہو، دیکھو، میں نے سنا ہے کہ مصر میں غلہ ہے تم وہاں جاؤ اور وہاں سے ہمارے لیے مول لو، تاکہ ہم جئیں اور مریں نہیں۔ [2]

غرض جب قحط سالی کا زمانہ شروع ہوا تو مصر اور اس کے قرب و جوار کے علاقہ میں بھی سخت کال پڑا اور کنعان میں خاندان یعقوب علیہ السلام بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا، جب حالت نزاکت اختیار کر گئی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاحبزادوں سے کہا کہ مصر میں عزیز مصر نے اعلان کیا ہے کہ اس کے پاس غلہ محفوظ ہے تم سب جاؤ اور غلہ خرید کر لاؤ چنانچہ باپ کے حکم کے مطابق یہ کنعانی قافلہ عزیز مصر سے غلہ لینے کے لیے مصر روانہ ہوا، خدا کی قدرت دیکھئے کہ برادران یوسف علیہ السلام کا یہ قافلہ اسی بھائی سے غلہ لینے چلا ہے جس کو اپنے خیال میں وہ کسی مصری گھرانے کا معمولی اور گمنام غلام بنا چکے تھے، مگر اس یوسف فروش قافلہ کو کیا معلوم کہ وہ کل کا غلام آج مصر کے تاج و تخت کا مالک و مختار کل ہے اور اس کو اسی کے سامنے عرض حال کرنا ہے بہرحال کنعان سے چلے اور مصر جا پہنچے اور

---

[1] موضح القرآن سورۂ یوسف

[2] پیدائش باب ۴۱ آیات ۴۶، ۴۹، ۵۳، ۵۷ و باب ۴۲، آیات ۱-۲

اور جب دربار یوسفی میں پیش ہوئے تو یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا۔ اور کیوں نہ پہچانتے، رنگ ڈھنگ بول چال، لب ولہجہ نقشہ و صورت اور ساری ادائیں یوسف علیہ السلام کی جانی پہچانی تھیں، البتہ وہ یوسف کو نہ پہچان سکے، اور کس طرح پہچانتے؟ کل جو چھوٹا سا بچہ تھا آج وہ تقریباً چالیس (۴۰) سالہ تجربہ کار انسان ہے نقشہ و رنگ اور بول چال سے کچھ شبہ بھی کرتے تو کس طرح؟ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ یوسف علیہ السلام اور تخت شاہی مگر یہ واقعہ تھا، حقیقت تھی اور اپنے برگزیدہ بندہ کے ساتھ رب العالمین کا وہ معاملہ تھا جو صفحہ دنیا پر ثبت ہو کر رہا۔

﴿وَ جَآءَ اِخْوَةُ یُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَیْهِ فَعَرَفَهُمْ وَ هُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۵۸)

"اور (پھر ایسا ہوا کہ قحط سالی کے زمانہ میں) یوسف علیہ السلام کے بھائی (غلہ خریدنے مصر سے) آئے، وہ جب یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو اس نے فوراً ان کو پہچان لیا اور وہ یوسف (علیہ السلام) کو نہ پہچان سکے۔"

تورات کا بیان ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام پر جاسوسی کا الزام لگایا گیا اور اس طرح ان کو یوسف علیہ السلام کے سامنے حاضر ہو کر بالمشافہ گفتگو کرنے کا موقعہ ملا۔

غرض حضرت یوسف علیہ السلام نے والد، حقیقی بھائی، اور گھر کے حالات کو خوب کرید کرید کر پوچھا اور آہستہ آہستہ سب کچھ معلوم کر لیا، اور پھر ان کو حسب مرضی غلہ بھر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ قحط اس قدر سخت ہے کہ تم کو دوبارہ یہاں آنا پڑے گا اس لیے یاد رکھو کہ اب کی مرتبہ اگر تم اپنے چھوٹے بھائی بنیامین کو ساتھ نہ لائے جس کے متعلق تم نے مجھ سے کہا ہے کہ اس کا بھائی یوسف گم ہو گیا ہے اور اس لیے تمہارا باپ اس کو کسی طرح جدا نہیں کرتا، تو تم کو ہرگز غلہ نہیں ملے گا۔

﴿وَ لَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِیْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِیْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْۤ اُوْفِی الْكَیْلَ وَ اَنَا خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَا كَیْلَ لَكُمْ عِنْدِیْ وَ لَا تَقْرَبُوْنِ ۝﴾ (یوسف: ۵۹۔۶۰)

"اور جب یوسف (علیہ السلام) نے ان کا سامان مہیا کر دیا تو کہا اب کے آنا تو اپنے سوتیلے بھائی بنیامین کو بھی ساتھ لانا، تم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ میں تمہیں (غلہ) پورا تول دیتا ہوں اور باہر سے آنے والوں کے لیے بہتر مہمان نواز ہوں لیکن اگر تم اسے میرے پاس نہ لائے تو پھر یاد رکھو نہ تمہارے لیے میرے پاس خرید و فروخت ہوگی نہ تم میرے پاس جگہ پاؤ گے۔"

برادران یوسف علیہ السلام نے کہا کہ ہم اپنے والد سے کہیں گے اور ہر طرح ترغیب دیں گے کہ وہ بنیامین کو ہمارے ساتھ یہاں بھیجنے پر راضی ہو جائے پھر جب وہ چلنے لگے اور یوسف علیہ السلام سے رخصت ہونے آئے تو انہوں نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ خاموشی کے ساتھ ان کے کجاووں میں ان کی وہ پونجی بھی رکھ دو جو انہوں نے غلہ کی قیمت کے نام سے دی ہے تاکہ جب گھر جا کر اس کو دیکھیں تو عجب نہیں کہ پھر دوبارہ واپس آئیں، جب یہ قافلہ کنعان واپس پہنچا تو انہوں نے اپنی تمام سرگذشت اپنے باپ یعقوب علیہ السلام کو سنائی اور ان سے کہا کے مصر کے والی نے صاف صاف ہم سے کہہ دیا ہے کہ اس وقت تک یہاں نہ آنا اور نہ غلہ کی خرید کا دھیان کرنا، جب تک کہ اپنے سوتیلے بھائی بنیامین کو ساتھ نہ لاؤ، لہٰذا تم کو چاہیے کہ اس کو ہمارے ساتھ کر دو، ہم اس کے ہر طرح نگہبان اور محافظ ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کیا تم پر اسی طرح اعتماد کروں جس طرح اس کے بھائی یوسف کے معاملہ میں کر چکا ہوں، اور تمہاری حفاظت ہی کیا؟ خدا ہی سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی رحم کرنے والا نہیں ہے۔

﴿قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝﴾ (یوسف: ٦٤)

"(یعقوب علیہ السلام نے) کہا کیا میں تم پر اس (بنیامین) کے بارہ میں ایسا ہی اعتماد کروں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی یوسف کے بارہ میں کر چکا ہوں سو اللہ ہی بہترین حفاظت کرنے والا ہے اور وہی سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔"

اس گفتگو سے فارغ ہونے کے بعد اب انہوں نے اپنا سامان کھولنا شروع کیا، دیکھا تو ان کی پونجی ان ہی کو واپس کر دی گئی ہے، یہ دیکھ کر وہ کہنے لگے اے باپ! اس سے زیادہ اور کیا ہم کو چاہیے؟ دیکھئے غلہ بھی ملا اور ہماری پونجی بھی جوں کی توں لوٹا دی گئی اس نے تو ہم سے قیمت بھی نہ لی اب ہمیں اجازت دے کہ ہم دوبارہ اس کے پاس جائیں اور گھر والوں کے لیے رسد لائیں اور بنیامین کو بھی ہمارے ساتھ بھیج دے ہم اس کی پوری حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ کا بوجھ اور زیادہ لائیں گے کیونکہ یہ غلہ جو پہلے ہم لائے تھے تھوڑا ہے۔

اور تورات [1] میں ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام پونجی کو دیکھ کر ڈر گئے تھے کہ نہ معلوم اب کیا نئی آفت آئے مگر واقعات کی ترتیب اور حضرت یوسف علیہ السلام کے طرز عمل کے پیش نظر جس کا ذکر قرآن اور تورات دونوں میں یکساں طور پر کیا گیا ہے یہی صحیح ہے جو قرآن عزیز نے بیان کیا ہے، برادران یوسف علیہ السلام خود اپنے ہاتھ سے غلہ کی قیمت ادا کر چکے تھے، لیکن اس کے بعد ہی قافلہ کو روانگی کی اجازت ملی تھی پھر ہر ایک بھائی کے کجاوہ میں سے علیحدہ علیحدہ اسی طرح قیمت کی واپسی، ہر عقلمند کے لیے یہی راہنمائی کرتی ہے کہ جس طرح والی مصر نے دوران قیام میں ہمارا اعزاز کیا اسی طرح یہ پونجی بھی اس نے واپس کر دی اور منت احسان سے بچانے کے لیے اس کا اظہار بھی مناسب نہ سمجھا۔

بہر حال یعقوب علیہ السلام نے فرمایا میں بنیامین کو ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک تم اللہ کے نام پر مجھ سے عہد نہ کرو اور وہ یہ کہ جب تک ہم خود نہ گھیر لیے جائیں اور ہر طرح مجبور نہ کر دیے جائیں ہم ضرور ضرور اس کو تیرے پاس صحیح وسلامت لوٹائیں گے، جب ان سب نے متفق ہو کر باپ کے سامنے اس کا پختہ عہد کیا اور ہر طرح اطمینان دلایا تب حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ کچھ ہوا محض اسباب ظاہری کی بنا پر ہے ورنہ کیا تم اور کیا تمہاری حفاظت، اور کیا ہم اور کیا ہمارا عہد، ہم سب کو اپنے اس معاملہ کو خدا کی نگہبانی میں دینا چاہیے۔

﴿قَالَ اللّٰهُ عَلٰي مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۝﴾ (یوسف: ٦٦)

"یعقوب (علیہ السلام) نے کہا ہم نے جو قول و قرار کیا ہے اس پر اللہ نگہبان ہے۔"

---

[1] پیدائش باب ۴۳۔ آیت ۳۵

عہد و پیمان کے بعد برادران یوسف علیہ السلام کا قافلہ دوبارہ کنعان سے مصر کو روانہ ہورہا ہے اور اس مرتبہ بنیامین بھی ہمراہ ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے رخصت کرتے وقت نصیحت فرمائی کہ دیکھو سب ایک ہی دروازہ سے مصر میں داخل نہ ہونا بلکہ متفرق دروازوں سے شہر میں داخل ہونا اور یہ بھی فرمایا کہ اس نصیحت کا مقصد یہ نہیں کہ تم اپنی تدابیر پر مغرور ہو بیٹھو کیونکہ میں تمہیں کسی ایسی بات سے ہرگز نہیں بچا سکتا جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہونے والی ہو، فرماں روائی تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور تمام بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے، اس لیے میں نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف احتیاطی تدابیر کے طور پر ہے اور خدا پر بھروسہ اور یقین کے ساتھ اسباب ظاہری کو احتیاطی تدبیر کے لیے استعمال کرنا خدا پرستی کے خلاف نہیں ہے۔

علماء تفسیر عام طور پر حضرت یعقوب علیہ السلام کی اس نصیحت کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ عزیز مصر (حضرت یوسف علیہ السلام) نے چونکہ پہلی مرتبہ ان کا کافی اعزاز کیا تھا اور یہ قافلہ خاص شان کے ساتھ یوسف علیہ السلام کی دعوت پر مصر میں داخل ہورہا ہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ مصری ان سے حسد کرنے لگیں اور یہ ان کی تکلیف کا باعث بن جائے۔

لیکن بعض مفسرین اور مؤرخین اس کی وجہ دوسری بتلاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ تورات سے اس قدر ثابت ہو چکا ہے کہ پہلی مرتبہ برادران یوسف علیہ السلام پر جاسوسی کا گمان کیا جا چکا تھا اور اگرچہ یوسف علیہ السلام نے یہ الزام نہ لگایا ہو لیکن مصریوں نے ضرور ان پر شبہ کیا تھا، اور حضرت یعقوب علیہ السلام بیٹوں کی زبانی پوری تفصیل سن چکے تھے لہٰذا انہوں نے سوچا کہ اگر گیارہ نوجوان اس کروفر سے ایک ساتھ شہر میں داخل ہوں گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ عزیز مصر کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر لیے جائیں، اس لیے نصیحت فرما دی کہ ایک جتھ بنا کر شہر میں داخل نہ ہونا جدا جدا دروازوں سے ایک مسافر کی طرح داخل ہونا۔

اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کی جانب بھی توجہ دلائی ہے کہ یعقوب علیہ السلام چونکہ صاحب علم و بصیرت تھے اور یہ دولت علم ہم نے ہی اس کو بخشی تھی اس لیے اس نے بیٹوں سے یہ نصیحت کی بات کہہ دی جو اس کے خیال میں آ گئی تھی ورنہ تو باپ کے حکم کی تعمیل کرنے کے باوجود خدائے تعالیٰ کی مشیت نے جو کچھ مقرر کر دیا تھا اس کے مقابلہ میں ان کی یہ احتیاط کچھ بھی کام نہ آ سکی۔

﴿وَ لَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَ اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۶۸)

"پھر جب یہ مصر میں اسی طرح داخل ہوئے جس طرح ان کے باپ نے ان کو حکم کیا تھا تو یہ (احتیاط) ان کو اللہ تعالیٰ (کی مشیت) کے مقابلہ میں کچھ کام نہ آئی مگر یہ ایک خیال تھا یعقوب کے جی میں جو اس نے پورا کر لیا اور بلاشبہ وہ صاحب علم تھا اور ہم نے ہی اس کو یہ علم سکھایا تھا لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔"

مطلب یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے جو کچھ کیا اس کو بمقتضائے علم یہی کرنا چاہیے تھا کیونکہ علم کی یہ دولت ہم نے ہی اس کو بخشی تھی مگر یہ ضروری نہیں کہ احتیاطی تدابیر ہر جگہ راست ہی آ جائیں اگر خدائے تعالیٰ کی مشیت اس کے برعکس مصلحت دیکھتی ہے تو پھر وہی ہو کر رہتا ہے اور سب تدبیریں بیکار ہو جاتی ہیں جیسا کہ آنے والے واقعہ میں بنیامین کے ساتھ پیش آیا کہ وہ روک لیے گئے اور ایسی مصلحت کے زیر اثر روک لیے گئے کہ اس کا انجام تمام خاندان یعقوب علیہ السلام کے حق میں بہتر ثابت ہوا۔

صورت یہ پیش آئی کہ جب برادران یوسف علیہ السلام کنعان سے روانہ ہوئے تو راستہ میں بنیامین کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ کبھی اس کو باپ کی محبت و عشق کا طعنہ دیتے اور کبھی اس بات پر حسد کرتے کہ عزیز مصر نے خصوصیت کے ساتھ اس کو کیوں بلایا ہے، بنیامین یہ سب کچھ سنتا اور خاموش رہتا، جب یہ سب منزل مقصود پر پہنچے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو اپنا تمام حال سنایا اور بتایا کہ میں تیرا حقیقی بھائی یوسف ہوں اور پھر تسلی و تشفی کی کہ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں، ان کی بدسلوکیوں کا دور ختم ہو گیا، اب یہ تجھ کو کسی قسم کی ایذاء نہیں پہنچا سکیں گے۔

﴿وَ لَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىٕسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۶۹﴾

(یوسف: ۶۹)

"اور جب یہ سب یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے بھائی (بنیامین) کو اپنے پاس بٹھالیا اور اس سے (آہستہ سے) کہا میں تیرا بھائی (یوسف) ہوں، بس جو بدسلوکی یہ تیرے ساتھ کرتے آئے ہیں، تو اس پر غمگین نہ ہو۔"

تورات میں ہے کہ یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی بڑی مدارات کی اور نوکروں کو حکم دیا کہ ان کو شاہی مہمان خانہ میں اتاریں، اور ان کے لیے پر تکلف دعوت کا سامان کیا، چند روز کے قیام کے بعد جب یہ رخصت ہونے لگے تو یوسف علیہ السلام نے حکم دیا کہ ان کے اونٹوں کو اس قدر لاد دو جتنا کہ یہ لے جاسکیں، حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح اپنے عزیز بھائی بنیامین کو اپنے پاس روک لیں مگر انتہائی اضطراب اور بے قراری کے باوجود اس کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا اس لیے کہ حکومت مصر کے قانون میں کسی غیر مصری کو بغیر کسی معقول وجہ کے روک لینا سخت ممنوع تھا، اور حضرت یوسف علیہ السلام یہ کسی طرح نہیں چاہتے تھے کہ اس وقت لوگوں پر یا ان کے بھائیوں پر اصل حقیقت منکشف ہو، بدیں وجہ خاموش رہے اور جب قافلہ روانہ ہونے لگا تو کسی کو اطلاع کیے بغیر نشانی کے طور پر اپنا چاندی کا پیالہ بنیامین کے کجاوہ میں رکھ دیا۔

کنعان کے اس قافلہ نے ابھی تھوڑی ہی مسافت طے کی ہوگی کہ یوسف علیہ السلام کے کارندوں نے شاہی برتنوں کی دیکھ بھال کی تو اس میں پیالہ ندارد پایا سمجھے کہ شاہی محل میں کنعانیوں کے سوا دوسرا کوئی نہیں آیا اس لیے انہوں نے ہی یہ چوری کی ہے، فوراً دوڑے اور چلائے قافلہ والو ٹھہرو تم چور ہو، برادران یوسف علیہ السلام کارندوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے ہم کو خواہ مخواہ کیوں الزام دیتے ہو آخر معلوم تو ہو کہ تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے کارندے کہنے لگے کہ بادشاہ کا پیمانہ (پیالہ) گم ہو گیا ہے اور ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا کہ جو شخص اس چوری کا پتہ لگا دے گا اس کو ایک اونٹ غلہ انعام میں ملے گا اور میں اس بات کا ضامن ہوں، برادران یوسف علیہ السلام نے کہا: "خدا علیم ہے کہ ہم مصر میں فساد اور شرارت کی غرض سے نہیں آئے اور تم جانتے ہو کہ ہم اس سے پہلے بھی یہاں آچکے ہیں، ہم میں چوری کی قطعاً عادت نہیں ہے" کارندوں نے کہا اچھا جس کے پاس سے یہ چوری نکلے اس کی سزا کیا ہونی چاہیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ خود آپ اپنی سزا ہے یعنی وہ تمہارے حوالے کر دیا جائے گا تاکہ وہ اپنے جرم کی پاداش میں پکڑا رہے، اور ہم اپنے یہاں ایسی زیادتی کرنے والوں کو یہی سزا دیا کرتے ہیں۔

کارندوں نے یہ جواب سنا تو پہلے دوسرے بھائیوں کے بوروں کی تلاشی لیے اور جب ان میں پیالہ نہ نکلا تو آخر میں بنیامین کے بورے کی تلاشی لی تو اس میں پیالہ موجود تھا انہوں نے وہ پیالہ نکال لیا اور قافلہ کو واپس لوٹا کر عزیز مصر "یوسف علیہ السلام" کی خدمت

میں معاملہ کو پیش کیا، حضرت یوسف علیہ السلام نے معاملہ کی نوعیت کو سنا تو دل میں بے حد مسرور ہوئے اور خدائے تعالیٰ کی کارسازی پر شکر ادا کیا کہ جس بات کے لیے میں بیقرار تھا کہ کسی طرح بنیامین میرے پاس رک جائے اور وہ میرے ہاتھوں کسی طرح نہ بن پڑی اس کو حق تعالیٰ نے اس حکمت کے ساتھ پورا کر دیا اور یہ سوچ کر قطعاً خاموش رہے اور یہ ظاہر نہیں فرمایا کہ یہ پیالہ میں نے خود بنیامین کی خورجی میں اپنی نشانی کے طور پر رکھ دیا تھا، ادھر بنیامین بھی جو کہ قبل ہی اپنے برادر بزرگ یوسف علیہ السلام سے واقف ہو چکا تھا اس واقعہ کو مرضی کے مطابق پا کر خاموش رہا۔

برادران یوسف علیہ السلام نے جب یہ دیکھا تو ان کی حاسدانہ رگ بھڑک اُٹھی اور انہوں نے یہ جھوٹ بولنے کی جرأت کی کہ اگر بنیامین نے یہ چوری کی ہے تو تعجب کا مقام نہیں ہے اس سے پہلے اس کا بڑا بھائی یوسف (علیہ السلام) بھی چوری کر چکا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ دیکھ کر بھی کہ میرے منہ پر ہی جھوٹ بول رہے ہیں ضبط سے کام لیا اور راز فاش نہ کیا اور دل میں کہنے لگے "تمہارے لیے سب سے بری جگہ ہے کہ تم ایسا جھوٹا الزام لگا رہے ہو اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت کا خوب جاننے والا ہے" یا خود ان ہی سے مخاطب ہو کر فرمایا جیسا کہ بعض مفسرین کی تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے، یعنی ان کو شرمندہ کرتے ہوئے کہا کہ ابھی تو یہ کہتے تھے کہ ہم چوری کے قریب تک نہیں ہیں اور یا اب غیر حاضر بھائی پر بھی چوری کا الزام لگا رہے ہو جس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا خاندان ہی چوری پیشہ ہے، یہ کیسا برا مقام ہے جو تم نے اختیار کیا ہے۔

برادران یوسف علیہ السلام نے جب یہ رنگ دیکھا تو بہت گھبرائے اور باپ کا عہد و پیمان یاد آ گیا آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ کس طرح بنیامین کو حاصل کریں؟ ہم تو پہلے ہی قول ہار چکے، صرف ایک ہی پہلو باقی تھا کہ التجائیں اور خوشامدانہ عرض معروض کر کے عزیز مصر کو بنیامین کی واپسی کی ترغیب دلائیں، کہنے لگے: "عزیز مصر! ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے اس کو اس کے پہلے بھائی کا بھی بے حد غم ہے اور اسی لیے اس کا عاشق و متوالا ہے، اس پر رحم کیجئے اور اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو سزا کے لیے روک لیجئے، آپ ہم پر مہربان رہے ہیں اور ان لوگوں میں سے ہیں جو احسان کرنے والے ہیں" عزیز مصر یوسف علیہ السلام نے کہا: "پناہ بخدا یہ کیسے ممکن ہے ہم اگر ایسا کریں تو ظالم ہوں گے"۔

جب اس جانب سے مایوس ہو گئے تو اب الگ خلوت میں بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے، ان میں سے بڑے نے کہا: "بھائی تم کو معلوم ہے کہ والد نے بنیامین کے متعلق کس قدر سخت اور پختہ عہد و پیمان ہم سے لیا ہے اور اس سے پہلے تم یوسف علیہ السلام کے ساتھ جو ظلم و زیادتی کر چکے ہو وہ بھی سامنے ہے اس لیے میں تو اب اس جگہ سے اس وقت تک ٹلنے والا نہیں کہ یا والد مجھ کو کنعان آنے کی اجازت دیں اور یا خدا میرے لیے کوئی دوسرا فیصلہ کر دے، جاؤ تم سب ان کے پاس جاؤ اور عرض کرو کہ تمہارے بیٹے بنیامین نے چوری کی اور جو بات ہمارے جاننے میں آئی وہی سچ سچ آپ کے سامنے کہہ دی ہم کو کچھ غیب کا علم تو تھا نہیں کہ پہلے سے جان لیتے کہ اس سے ایسی حرکت سرزد ہونے والی ہے، اور یہ بھی کہنا کہ آپ مصر کے لوگوں سے اس کی تصدیق کر لیں نیز اس قافلہ سے بھی کہ جس کے ساتھ ہم مصر سے یہاں آئے ہیں کہ ہم اس معاملہ میں بالکل سچے ہیں۔

اس مشورہ کے مطابق وہ کنعان واپس آئے اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے بے کم و کاست سارا واقعہ کہہ سنایا، قرآن عزیز نے یوسف علیہ السلام کے سوتیلے بھائیوں کی اس گفتگو کو جو اس سلسلہ میں انہوں نے یعقوب علیہ السلام سے کی اس طرح نقل کیا ہے:۔

﴿ فَقُوْلُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ ﴾ (یوسف: ۸۱)

"پس (باپ کے پاس جا کر) کہنا اے باپ تیرے بیٹے نے چوری کر لی۔"

اور اس سے وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے ان سوتیلے بھائیوں کی شقاوت کا اندازہ کیجئے کہ ایسے سخت وقت میں بھی بوڑھے باپ کو طعن و تشنیع اور ملامت سے نہ چھوڑا اور یہ نہ کہا کہ ہمارے بھائی سے یہ غلطی ہوگئی بلکہ ان کی طرف نسبت کر کے یہ کہا کہ تیرے بیٹے ہاں چہیتے اور پیارے بیٹے نے چوری کر کے ہم سب کو ذلیل کیا ہم کو کیا معلوم تھا کہ اس کے ایسے گن ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں ان کی صداقت کا تجربہ کر چکے تھے اس لیے فرمایا: "نہیں تمہارے جی نے ایک بات بنالی ہے واقعہ یوں نہیں ہے" بنیامین اور چوری؟" یہ نہیں ہوسکتا۔ خیر اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں" ایسا صبر کہ بہتر سے بہتر ہو" خدائے تعالیٰ سے کیا بعید ہے کہ وہ ایک دن ہم ان گم گشتگان کو پھر جمع کر دے اور ایک ساتھ ان دونوں کو مجھ سے ملا دے بلاشبہ وہ دانا حکمت والا ہے، اور ان کی جانب سے رخ پھیر لیا اور فرمانے لگے: "آہ فراق یوسف کی غم انگیزی" حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں شدت غم میں روتے روتے سپید پڑگئی تھیں اور سینہ غم کی سوزش سے جل رہا تھا، مگر صبر کے ساتھ اللہ پر تکیہ کیے بیٹھے تھے۔

بیٹے یہ حال دیکھ کر کہنے لگے: "بخدا تم ہمیشہ اسی طرح یوسف علیہ السلام کی یاد میں گھلتے رہو گے یا اسی غم میں جان دے دو گے" حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا: "میں کچھ تمہارا تو شکوہ نہیں کرتا اور نہ تم کو ستاتا ہوں۔"

﴿ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (یوسف: ۸۶)

"(بلکہ) میں تو اپنی حاجت اور اپنا غم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتا ہوں میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

ہم نے شاہی پیالہ کے واقعہ کی تفسیر میں عام تفاسیر سے جدا، مفسرین کے اس قول کو اختیار کیا ہے جس کو متاخرین کے یہاں "قول شاذ کا درجہ" حاصل ہے، مگر اس مقام پر سب سے بہتر اور بے غل و غش تفسیر ہے، کتب تفاسیر میں عام طور پر آیت ﴿ جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ ﴾ (یوسف: ۷۰) "رکھ دیا یوسف نے پیالہ کو بھائی (بنیامین) کے کجاوہ میں) میں حضرت یوسف علیہ السلام کے اس عمل کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ وہ چونکہ بنیامین کو روکنا چاہتے تھے اور مصر کا قانون اس کی اجازت نہ دیتا تھا اس لیے انہوں نے یہی سمجھ کر یہ پیالہ رکھ دیا تھا کہ اس طرح بنیامین چور بن جائے گا اور میں اس کو روک سکوں گا اور پھر آیت ﴿ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ ﴾ میں پکارنے والی شخصیت بھی یوسف علیہ السلام ہی کو بتاتے ہیں، اور اس طرح جب ان پر جھوٹ کا الزام عائد ہونے لگتا ہے تو اس کو "توریہ" سے تعبیر کر کے ان کی معصوم شخصیت کو اس الزام سے بری کرتے ہیں، حالانکہ قرآن عزیز کے اسلوب بیان میں کوئی ایسا اشارہ تک موجود نہیں ہے جس سے حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت پر جھوٹ کا شبہ بھی ہوسکتا ہو یا توریہ کہنے کی ضرورت پیش آتی ہو۔

یہ مانا کہ کسی محمود اور نیک مقصود کی خاطر "توریہ" بری اور معیوب بات نہیں ہے، بلکہ اچھی بات ہے لیکن یہ کہنے والے اس کو بھول جاتے ہیں کہ معاملہ ہمارا تمہارا یا صالحین اور ابرار کا نہیں ہے بلکہ خدا کے پیغمبر اور رسول کا معاملہ ہے، ان کی اخلاقی زندگی کا معیار اس قسم کی اصطلاحی تعبیروں سے بہت بلند اور برتر ہے، وہ اپنی نیک خواہشات میں بھی عزیمت کی بلندی کو ہاتھ سے نہیں جانے

دیتے، پھر کیا ضرورت کہ ایسے موقعہ پر جہاں قرآن عزیز کا اسلوب بیان مجبور نہ کرتا ہو اور احادیث صحیحہ اس کی تائید نہ کرتی ہوں خواہ مخواہ ان کی جانب ایسی بات منسوب کی جائے جس کے درست کرنے اور پیغمبرانہ معصومیت کو محفوظ رکھنے کے لیے "توریہ" کی پناہ لینی پڑے۔

اس مقام پر قرآن عزیز میں حضرت یوسف علیہ السلام کا صرف یہ عمل مذکور ہے کہ انہوں نے شاہی پیمانہ (چاندی کے کٹورے) کو بنیامین کی خورجی میں رکھ دیا (تاکہ بھائی کے پاس ایک نشانی رہے)۔

﴿جَعَلَ السِّقَايَةَ فِىۡ رَحۡلِ اَخِيۡهِ﴾(یوسف:۷۰)

"اس (یوسف علیہ السلام) نے اپنے بھائی (بنیامین) کے کجاوہ میں کٹورہ رکھ دیا۔"

اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کا کوئی ذکر نہیں بلکہ تمام گفتگو کا معاملہ بھائیوں اور کارندوں کے درمیان دائر نظر آتا ہے۔

﴿ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الۡعِيۡرُ اِنَّكُمۡ لَسٰرِقُوۡنَ ۝ قَالُوۡا وَ اَقۡبَلُوۡا عَلَيۡهِمۡ مَّا ذَا تَفۡقِدُوۡنَ ۝ قَالُوۡا نَفۡقِدُ صُوَاعَ الۡمَلِكِ وَلِمَنۡ جَآءَ بِهٖ حِمۡلُ بَعِيۡرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِيۡمٌ ۝ قَالُوۡا تَاللّٰهِ لَقَدۡ عَلِمۡتُمۡ مَّا جِئۡنَا لِنُفۡسِدَ فِى الۡاَرۡضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيۡنَ ۝ قَالُوۡا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ كٰذِبِيۡنَ ۝ قَالُوۡا جَزَآؤُهٗ مَنۡ وُّجِدَ فِىۡ رَحۡلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِى الظّٰلِمِيۡنَ ۝﴾(یوسف:۷۰-۷۵)

"پھر پکارا پکارنے والے نے اے قافلہ والو! تم تو البتہ چور ہو، وہ کہنے لگے ان کی جانب منہ کر کے تمہاری کیا چیز گم ہوگئی، وہ (کارندے) بولے ہم نہیں پاتے بادشاہ (یوسف علیہ السلام) کا پیمانہ (کٹورا) اور جو کوئی اس کو لائے اس کو ملے ایک اونٹ کا بوجھ (غلہ) اور میں ہوں اس کا ضامن۔ وہ بولے خدا کی قسم تم کو معلوم ہے کہ ہم شرارت کرنے کو نہیں آئے ملک (مصر) میں اور نہ ہم کبھی چور تھے، وہ کارندے بولے پھر کیا سزا ہے اس کی اگر تم نکلے جھوٹے۔ کہنے لگے اس کی سزا یہ ہے کہ جن کے اسباب میں سے ہاتھ آئے وہی اس کے بدلے میں جائے ہم یہی سزا دیتے ہیں ظالموں کو۔"

اس تمام مرحلے کے بعد یہ معاملہ قانونی طور پر عزیز مصر (یوسف علیہ السلام) کے سامنے پیش ہوا اور ان کی تلاشی لی گئی تو بنیامین کے کجاوہ میں چاندی کا وہ پیمانہ موجود تھا۔

﴿فَبَدَاَ بِاَوۡعِيَتِهِمۡ قَبۡلَ وِعَآءِ اَخِيۡهِ ثُمَّ اسۡتَخۡرَجَهَا مِنۡ وِّعَآءِ اَخِيۡهِ ؕ﴾(یوسف:۷۶)

"پھر یوسف (علیہ السلام) نے ان کی خورجیاں دیکھنی شروع کیں اپنے بھائی کی خورجی سے پہلے، آخر میں وہ برتن نکالا اپنے بھائی کی خورجی سے۔"

اس تفصیل کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے احسان و انعام کا ذکر کرتا اور بتاتا ہے کہ یوسف علیہ السلام جس بات کے لیے بے قرار تھے اور مصری قانون کے تحت اس کو نہیں کر سکتے تھے ہم نے اپنی خفیہ تدبیر سے اس کا سامان بہم پہنچایا۔

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾ (یوسف: ۷۶)

"یوں خفیہ تدبیر کردی ہم نے یوسف کے لیے، وہ ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی بنیامین کو اس بادشاہ (مصر) کے طریقے کے مطابق مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی چاہے ہم درجے بلند کرتے ہیں جس کے چاہیں، اور ہر جاننے والے سے اوپر جاننے والا ہے۔"

پس اس قدر صاف اور واضح بات کی ایسی تشریح کس لیے کی جائے کہ جس میں یوسف علیہ السلام کے کلام کو توریہ پر محمول کرنے کی ضرورت پڑے اور کیوں نہ وہ معنی لیے جائیں کہ جس سے نہ کوئی شبہ پیدا ہو اور نہ اس کے لیے تاویلات کی ضرورت پیش آئے۔

بہرحال حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے فرمایا: "دیکھو ایک مرتبہ پھر مصر جاؤ اور یوسف علیہ السلام اور اس کے بھائی کی تلاش و جستجو کرو اور خدا کی رحمت سے نا اُمید و مایوس نہ ہو، اس لیے کہ خدا کی رحمت سے نا اُمیدی کافروں کا شیوہ ہے۔"

﴿يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ اَخِيْهِ وَ لَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾﴾ (یوسف: ۸۷)

"اے میرے بیٹو! (مصر) جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو، بلاشبہ اللہ کی رحمت سے کافروں کے سوا کوئی نا اُمید نہیں ہوتا۔"

حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کے ساتھ یوسف علیہ السلام کا بھی نام لیا حالانکہ بظاہر اس مقام پر ان کے سراغ کا کوئی جوڑ نہیں لگتا، معلوم ہوتا ہے کہ اب حضرت حق نے یعقوب علیہ السلام کے غم اور دکھ کی زندگی ختم کرنے کا ارادہ کرلیا اور یعقوب علیہ السلام کو یہ اشارہ کردیا کہ بنیامین کے اس قصہ میں یوسف علیہ السلام کی ملاقات کا راز بھی محفوظ ہے اور تب ہی تو یوسف علیہ السلام کے پیغام بشارت آنے پر (جس کی تفصیل آنے والی ہے) انہوں نے یہ ارشاد فرمایا:

﴿اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾﴾ (یوسف: ۹۶)

"کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

غرض برادران یوسف علیہ السلام نے کچھ تو باپ کے اصرار پر اور کچھ اس لیے کہ واقعی قحط کی شدت انتہائی درجہ پر پہنچی ہوئی تھی اور غلہ کا آس پاس نام ونشان نہ تھا تیسری بار پھر مصر کا ارادہ کیا، اور جب دربار شاہی میں پہنچے تو کہنے لگے اے عزیز! ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو قحط نے سخت پریشانی میں ڈال دیا ہے اور اس مرتبہ ہم پونجی بھی بہت تھوڑی لائے ہیں، یہ حاضر ہے اب معاملہ خرید وفروخت اور لین دین کا نہیں ہے ہم سے قیمت ادا نہیں ہوسکتی، اس لیے تیری خدمت میں ہماری یہ درخواست ہے کہ ازراہ کرم ہم کو غلہ کی پوری تول دیجیے اور ہمیں ضرورت مند سمجھ کر اپنی جانب سے احسان فرمایئے اللہ تعالیٰ صدقہ وخیرات کرنے والے کو نیک بدلہ دیتا ہے۔"

حضرت یوسف علیہ السلام نے والدین اور بھائیوں کی اس پریشانی کا حال سنا اور ان کی اس عاجزانہ درخواست اور نیاز مندانہ

طلب کی مجبور کن حالت پر غور کیا تو دل بھر آیا اور اب ضبط نہ ہو سکا کہ خود کو چھپائیں اور راز ظاہر نہ ہونے دیں، آخر فرمانے لگے:

﴿هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ۝﴾(یوسف:۸۹)

"کیوں جی تم جانتے ہو کہ تم نے یوسف (علیہ السلام) اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا معاملہ کیا جبکہ تم جہالت میں سرشار تھے۔"

بھائیوں نے اس موقع پر غیر متوقع گفتگو سنی تو چونکے اور لب ولہجہ پر غور کر کے ایک دم ان کو کچھ خیال آیا اور کہنے لگے:

﴿قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ﴾(یوسف:۹۰)

"(انہوں نے کہا) کیا تو واقعی یوسف (علیہ السلام) ہی ہے۔"

یعنی اس حیرانی اور پریشانی میں تھے کہ ہم "عزیز مصر" کے دربار میں کھڑے ہیں، اس سے باتیں کر رہے ہیں یہ بے محل یوسف علیہ السلام کا ذکر کیسا؟ صورت شکل اور گفتگو کے طرز و انداز کو اب دوسری نیت سے دیکھا تو یوسف علیہ السلام کی شکل نگاہ کے سامنے پھر گئی اور سمجھ گئے کہ بیشک یہ یوسف ہے مگر حالت موجودہ کے پیش نظر قدرتی طور پر یہ جرأت نہیں کی کہ یہ کہہ اٹھیں کہ تو یوسف علیہ السلام ہے بلکہ ایسے موقعہ کے مناسب لب ولہجہ سے کہنے لگے کیا آپ واقعی یوسف علیہ السلام ہی ہیں؟ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ اَنَا يُوْسُفُ وَ هٰذَآ اَخِيْ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾(یوسف:۹۰)

"ہاں میں یوسف ہوں اور یہ (بنیامین) میرا ماں جایا بھائی ہے اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان کیا، اور جو شخص بھی برائیوں سے بچے اور (مصیبتوں میں) ثابت قدم رہے تو اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔"

اب برادرانِ یوسف علیہ السلام کے پاس ندامت، شرمساری، خفت اور اعتراف خطا و جرم کے سوا کیا تھا معاً یوسف علیہ السلام کی تباہی و بربادی کے لیے اپنی تمام بیہودگیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور جب ان پر یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ جس کو کل کنعان کے کنوئیں میں پھینک کر آئے تھے وہ آج "عزیز مصر" بلکہ مصر کے تاج و تخت کا مالک ہے، تو سر جھکا کر کہنے لگے:

﴿قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ۝﴾(یوسف:۹۱)

"(انہوں نے کہا) بخدا اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو ہم پر برتری و بلندی بخشی اور بلاشبہ ہم سراسر قصوروار تھے۔"

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے سوتیلے بھائیوں کی اس خستہ حالی اور پشیمانی کو دیکھا تو ان کی اخلاقی برتری اور پیغمبرانہ رحمت ورافت اس کو برداشت نہ کر سکی اور عفو و درگذر اور حلم و کرم کے ساتھ فوراً یہ ارشاد فرمایا:

"آج کے دن میری جانب سے تم پر کوئی سرزنش نہیں، اللہ تعالیٰ تمہارا قصور بخش دے اور وہ تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔"

یعنی جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اب ہم سب کو یہ تمام داستان فراموش کر دینی چاہیے میں درگاہِ الٰہی میں دُعا کرتا ہوں کہ وہ تمہاری اس غلطی کو معاف فرما دے کیونکہ وہی سب سے بڑھ کر رحیم و کریم ہے۔

اب تم کنعان واپس جاؤ اور میرا پیراہن لیتے جاؤ، یہ والد کی آنکھوں پر ڈال دینا۔ ان شاء اللہ شمیم یوسف ان کی آنکھوں کو روشن کر دے گی اور تمام خاندان کو مصر لے آؤ۔

برادران یوسف علیہ السلام کے لیے بھی اس سے بڑھ کر سعادت اور کیا ہو سکتی تھی؟ یوسف علیہ السلام کو چاہ کنعان میں ڈال کر یعقوب علیہ السلام کے پاس خون آلود پیراہن لے کر آئے تھے اور جھوٹ اور فریب کے ساتھ ان کے دل و جگر کو زخمی کیا تھا، آج بھی انہی کو پیراہن یوسف علیہ السلام لے جانا چاہیے تا کہ اس زخم کا مرہم بنے اور رنج و غم مسرت و شادمانی سے بدل جائے۔

یہاں یہ باتیں ختم ہو کر برادران یوسف علیہ السلام کا کارواں کنعان کو پیراہن یوسف علیہ السلام لے کر چلا تو اِدھر خدا کے برگزیدہ پیغمبر یعقوب علیہ السلام کو وحی الٰہی نے شمیم یوسف سے مہکا دیا، فرمانے لگے اے خاندان یعقوب علیہ السلام! اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے میں اس کی عقل ماری گئی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھ کو یوسف علیہ السلام کی مہک آ رہی ہے، وہ سب کہنے لگے: "بخدا تم تو اپنے اسی پرانے خبط میں پڑے ہو" یعنی اس قدر عرصہ گذر جانے کے بعد بھی جبکہ یوسف علیہ السلام کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا تمہیں یوسف علیہ السلام ہی کی رٹ لگی ہوئی ہے۔

کنعان کا قافلہ بخیریت تمام پہنچ گیا اور برادرانِ یوسف علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق ان کا پیراہن یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر ڈال دیا اور یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں فوراً روشن ہو گئیں، اور وہ فرمانے لگے: "دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ" اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"۔

﴿فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۹۶)

"پھر جب بشارت دینے والا آ پہنچا تو اس نے پیراہن یوسف کو یعقوب کے چہرہ پر ڈال دیا، پس اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں (بینائی لوٹ آئی) یعقوب نے کہا کیا میں تم سے نہ کہتا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

برادرانِ یوسف علیہ السلام کے لیے یہ وقت بہت کٹھن تھا، شرم و ندامت میں غرق سر جھکائے ہوئے بولے، اے باپ! آپ خدا کی جناب میں ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لیے دُعا فرمایئے، کیوں کہ اب یہ تو ظاہر ہی ہو چکا کہ بلاشبہ ہم سخت خطا کار اور قصور وار ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا:

﴿سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ (یوسف: ۹۸)

"عنقریب میں اپنے رب سے تمہارے لیے مغفرت کی دُعا کروں گا، بلاشبہ وہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔"

مفسرین کہتے ہیں کہ برادرانِ یوسف علیہ السلام نے مصر میں اپنی خطا کا اعتراف کرتے ہوئے یوسف علیہ السلام سے بھی مغفرت کی دُعا کی استدعاء کی تھی اور کنعان میں اپنے والد یعقوب علیہ السلام سے بھی یہی درخواست کی، مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے تو اسی وقت ان کی بات منظور کر لی، اور ﴿يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ کہہ دیا، مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ نہیں کیا بلکہ ﴿سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ﴾ کہہ کر صرف توقع ہی دلائی، اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ اور پھر حسب ذیل دو جواب دیتے ہیں۔

① برادرانِ یوسف علیہ السلام کی ان تمام خطا کاریوں کا معاملہ براہ راست حضرت یوسف علیہ السلام سے تعلق رکھتا تھا اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے بالواسطہ اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے اخلاق کریمانہ کی راہ سے اسی وقت ان کا اطمینان کر دیا۔ مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ سمجھ کر کہ چونکہ اس معاملہ کا تعلق یوسف علیہ السلام سے ہے اس لیے اس کی مرضی بھی معلوم کر لینا ضروری ہے، اس طرح جواب دیا کہ توقع اور اُمید تک بات رہے اور ساتھ ہی اپنی طبیعت کا رجحان بھی ظاہر کر دیا کہ ان کی خواہش یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ان خطا کاریوں کو معاف کر دے۔

② حضرت یوسف علیہ السلام نوجوان تھے اس لیے ان کے کریمانہ وصف میں حزم و احتیاط کا پہلو نہ تھا انہوں نے فوراً معاف کر دیا، مگر حضرت یعقوب علیہ السلام تجربہ کار، محتاط اور پھر باپ تھے اس لیے چاہتے تھے کہ بیٹوں کا امتحان کریں کہ ان کا یہ انفعال اور ندامت کا اظہار محض وقتی اور ہنگامی ہے اور صرف دفع الوقتی کے لیے یا اب ان کی طبیعت میں حقیقی ندامت و شرمساری کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے اور یہ واقعی اپنی خطا پر صداقت سے نادم ہیں، اس لیے ان کو بالکل مایوس بھی نہیں کیا اور رجحان طبیعت کا اظہار کرتے ہوئے صرف توقع اور اُمید تک ہی معاملہ کو چھوڑ دیا۔

خاندان یعقوب علیہ السلام مصر میں:

غرض حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے سب خاندان کو لے کر مصر روانہ ہو گئے، تورات میں اس واقعہ کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

اور یہی ذکر فرعون کے گھر میں سنا گیا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائی آئے اور اس سے فرعون اور اس کے چاکر بہت خوش ہوئے اور فرعون نے یوسف علیہ السلام کو کہا کہ اپنے بھائیوں کو کہہ تم یہ کام کرو، اپنے جانور لادو اور جاؤ اور کنعان کی سرزمین میں جا پہنچو اور اپنے باپ اور اپنے گھرانے کو لو اور میرے پاس آؤ اور میں تم کو مصر کی سرزمین کی اچھی چیزیں دوں گا اور تم اس سرزمین کے تحائف کھاؤ گے اب تجھے حکم ملا تو ان کو کہہ تم یہ کرو کہ اپنے لڑکوں اور اپنی جوروؤں کے لیے مصر کی زمین سے گاڑیاں لے جاؤ اور اپنے باپ کو لے آؤ اور اپنے اسباب کا کچھ افسوس نہ کرو کیونکہ مصر کی ساری زمین کی خوشی تمہارے لیے ہے اور اسرائیل کے فرزندوں نے یہی کیا اور یعقوب علیہ السلام اپنی سب نسل سمیت مصر میں آئے، وہ اپنے بیٹوں اور اپنے بیٹوں کے بیٹوں کو جو اس کے ساتھ تھے اور اپنی بیٹیوں اور اپنے بیٹوں کی بیٹیوں کو اور اپنی سب نسل کو اپنے ساتھ مصر میں لائے، سو وہ سب جو یعقوب علیہ السلام کے گھرانے کے تھے اور مصر میں آئے ستر (۷۰) جانیں تھیں۔ [1]

جب حضرت یوسف علیہ السلام کو اطلاع ہوئی کہ ان کے والد خاندان سمیت شہر کے قریب پہنچ گئے تو وہ فوراً استقبال کے لیے باہر نکلے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب مدت دراز کے بچھڑے ہوئے لخت جگر کو دیکھا تو سینہ سے چمٹا لیا اور جب یہ مسرت افزا اور رقت آمیز ملاقات ہو چکی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے والد سے عرض کیا کہ اب آپ عزت و احترام اور امن و حفاظت کے ساتھ شہر میں تشریف لے چلیں۔

---

[1] پیدائش باب ۴۵ آیات ۱۶، ۲۰ و باب ۴۶ آیات ۷، ۲۷

اس وقت مصر کا دارالسلطنت رعمسیس تھا اور وہ "جشن کا شہر" کہلاتا تھا، حضرت یوسف علیہ السلام والد ماجد اور تمام خاندان کو بڑے کروفر کے ساتھ شاہی سواریوں میں بٹھا کر شہر میں لائے اور شاہی محل میں اتارا۔

جب ان تمام باتوں سے فراغت پائی تو اب ارادہ کیا کہ دربار منعقد کریں تا کہ مصریوں کا بھی بزرگ باپ اور خاندان سے تعارف ہو جائے اور تمام درباری ان کے عزت و احترام سے آگاہ ہو جائیں، دربار منعقد ہوا، تمام درباری اپنی مقررہ نشستوں پر بیٹھ گئے، یوسف علیہ السلام کے حکم سے ان کے والدین [1] کو تخت شاہی پر ہی جگہ دی گئی اور باقی تمام خاندان نے حسب مراتب نیچے جگہ پائی، جب یہ سب انتظامات مکمل ہو گئے تب حضرت یوسف علیہ السلام شاہی محل سے نکل کر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوئے، اسی وقت تمام درباری "حکومت کے دستور کے مطابق" تخت کے سامنے تعظیم کے لیے سجدہ میں گر پڑے، موجودہ صورت کو دیکھ کر تمام خاندان یوسف علیہ السلام نے بھی یہی عمل کیا۔ [2] یہ دیکھ کر یوسف علیہ السلام کو فوراً اپنے بچپنے کا خواب یاد آ گیا، اور اپنے والد سے کہنے لگے:

﴿ وَ قَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ؗ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَ قَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ ﴾ (یوسف: ۱۰۰)

"اور یوسف (علیہ السلام) نے کہا اے باپ! یہ ہے تعبیر اس خواب کی جو مدت ہوئی میں نے دیکھا تھا، میرے پروردگار نے اسے سچا ثابت کر دیا، یہ اسی کا احسان ہے کہ مجھے قید سے رہائی دی تم سب کو صحرا سے نکال کر میرے پاس پہنچا دیا اور یہ سب کچھ اس کے بعد ہوا کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں اختلاف ڈال دیا تھا، بلاشبہ میرا پروردگار ان باتوں کے لیے جو وہ کرنی چاہے بہتر تدبیر کرنے والا ہے کہ وہ سب کچھ جاننے والا اور (اپنے کاموں میں) حکمت والا ہے۔"

اور جبکہ یہ تمام واقعات ایک عجیب و غریب ترتیب سے وقوع میں آئے اور قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سنجیوں اور چارہ سازیوں کے بے نظیر مظاہرے پیش آتے رہے تو ان تمام آغاز و انجام کے اس حسن خاتمہ کو دیکھ کر یوسف (علیہ السلام) بے اختیار ہو گئے اور خدا کی جناب میں شکر و دعا کا اس طرح اظہار فرمانے لگے:

﴿ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۫ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ ﴾ (یوسف: ۱۰۱)

"اے پروردگار! تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا تعلیم فرمایا، اے آسمان اور زمین کے

---

[1] حضرت یوسف علیہ السلام کی حقیقی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔

[2] تعظیم کا یہ طریقہ انبیاء سابقین میں شاید جائز رہا ہو، اگرچہ مجھے اس میں بھی شک ہے اور میرے نزدیک اس آیت کی دوسری تفسیر ہے جس کو میں نے اس جگہ قصداً ذکر نہیں کیا، تاہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی تعظیم کو اپنی اُمت کے لئے حرام قرار دیا ہے اور اس کو صرف ذاتِ الٰہی کے لئے ہی مخصوص بتایا ہے۔ (ترمذی، ابوداؤد، باب النکاح)

بنانے والے تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، تو یہ بھی کیجیو کہ دُنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں۔"

تورات میں ہے کہ اس واقعہ کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کا تمام خاندان مصر ہی میں آباد ہو گیا، کیونکہ فرعون نے حضرت یوسف علیہ السلام سے اصرار کے ساتھ یہ کہا کہ تم اپنے خاندان کو مصر ہی میں آباد کرو، میں ان کو بہت عمدہ زمین دوں گا اور ہر طرح ان کی عزت کروں گا۔

یہ دیکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد بزرگوار اور خاندان کے دوسرے افراد کو یہ سمجھا دیا کہ فرعون جب ان سے مصر میں رہنے کی درخواست کرتے ہوئے زمین اور مقام کے انتخاب کے لیے کہے تو تم فلاں حصہ زمین طلب کرنا اور کہنا کہ چونکہ ہم قبائلی زندگی کے عادی اور مویشی چرانے کا شوق رکھتے ہیں اس لیے ہم عام شہری زندگی سے علیحدگی پسند کرتے ہیں چنانچہ فرعون نے خاندان یوسف علیہ السلام کو وہ سرزمین بطور جاگیر بخش دی اور اس طرح بنی اسرائیل سرزمین مصر میں آباد ہو گئے۔

اور فرعون نے یوسف علیہ السلام کو کہا کہ اپنے بھائیوں کو کہہ تم یہ کام کرو، اپنے جانور لادو اور جاؤ اور کنعان کی سرزمین میں جا پہنچو اور اپنے باپ اور اپنے گھرانے کو لو اور میرے پاس آؤ اور میں تم کو مصر کی سرزمین کی اچھی چیزیں دوں گا اور تم اس زمین کے تحائف کھاؤ گے، اب تجھے حکم ملا کہ تو ان کو کہے کہ تم یہ کرو کہ اپنے لڑکوں اور اپنی جوروؤں کے لیے مصر کی زمین سے گاڑیاں لے جاؤ اور اپنے باپ کو لے آؤ اور اپنے اسباب کا کچھ فکر نہ کرو کیونکہ مصر کی ساری زمین کی خوشی تمہارے لیے ہے اور اسرائیل کے فرزندوں نے یہی کیا۔"[1]

اور یوں ہوگا کہ جب فرعون تم کو بلائے اور کہے کہ تمہارا پیشہ کیا ہے؟ تو تم کہیو کہ تیرے غلام جوانی سے لے کر اب تک چوپانی کرتے رہے ہیں، کیا ہم اور کیا ہمارے آباء، تاکہ تم جشن کی زمین میں رہو اس لیے کہ مصریوں کو ہر ایک چوپان سے نفرت ہے۔"[2]

حضرت یوسف علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ اس طرح مصریوں سے الگ رہنے سے بنی اسرائیل اپنی مذہبی زندگی پر قائم، مصری بت پرستی سے متنفر اور مصری بداخلاقی اور مبتذل شہری عادات و خصائل سے محفوظ رہیں گے، اور اپنی شجاعانہ بدویانہ زندگی کو کبھی نہ بھولیں گے۔

وفات:

بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی زندگی کے طویل حصہ عمر کو مصر ہی میں گزارا اور جب ان کی عمر ایک سو دس سال کو پہنچی تو ان کی وفات ہو گئی، حضرت یوسف علیہ السلام نے وفات سے پہلے اپنے خاندان والوں سے یہ عہد لیا کہ وہ مجھ کو مصر کی زمین میں نہ دفن کریں گے، بلکہ جب خدا کا یہ وعدہ پورا ہو کہ بنی اسرائیل دوبارہ فلسطین یعنی آباؤ اجداد کی سرزمین میں واپس ہوں تو میری ہڈیاں وہیں لے جا کر سپرد خاک کرنا، چنانچہ انہوں نے وعدہ کیا اور جب حضرت یوسف علیہ السلام کا انتقال ہو گیا تو ان کو حنوط (ممی) کر کے تابوت میں محفوظ رکھ دیا اور جب موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو اس تابوت کو بھی ساتھ لیتے گئے اور آباؤ اجداد کی سرزمین ہی میں لے جا کر سپرد خاک کر دیا۔ حموی کہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کی قبر بلاطہ میں ہے جو فلسطین کے علاقہ نابلس کا ایک گاؤں ہے، یہ قبر ایک درخت کے نیچے ہے، اور تورات میں ہے:

---

[1] پیدائش باب ۴۶ آیات ۱۶۔۱۹ [2] پیدائش باب ۴۶ آیات ۳۳۔۳۴

"اور یوسف (علیہ السلام) اور اس کے باپ کے گھرانے نے مصر میں سکونت کی اور یوسفؑ ایک سو دس برس جیا اور یوسفؑ نے افرائیم کے لڑکے جو تیری پشت تھے دیکھے اور منسی کے بیٹے مکیر کے بیٹے بھی یوسف کے گھٹنوں پر پالے گئے اور یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا میں مرتا ہوں اور خدا یقیناً تم کو اس سرزمین میں جس کی بابت اس نے ابراہام اور اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) سے قسم کی ہے لے جائے گا اور یوسف علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے قسم لے کے کہا خدا یقیناً تم کو یاد کرے گا، اور تم میری ہڈیوں کو یہاں سے لیجائیو سو یوسف علیہ السلام ایک سو دس (۱۱۰) برس کا بوڑھا ہو کے مرگیا اور انہوں نے اس میں خوشبو بھری اور اسے مصر میں صندوق میں رکھا..... [1]

"اور موسیٰ علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کی ہڈیاں ساتھ لیں کیونکہ اس نے بنی اسرائیل کو تاکیداً قسم دے کر کہا تھا کہ خدا یقیناً تمہاری خبر گیری کرے گا تم یہاں سے میری ہڈیاں اپنے ساتھ لے جائیو۔" [2]

اہم اخلاقی مسائل:

حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ عجیب و غریب قصہ ارباب بصیرت کے لیے اپنی آغوش میں نہایت اہم اخلاقی مسائل رکھتا ہے، دراصل یہ قصہ ایک واقعہ نہیں ہے بلکہ فضائل اخلاق کی ایسی زریں داستان ہے جس کا ہر پہلو موعظت و بصیرت کے جواہر سے لبریز ہے۔

قوت ایمانی، استقامت، ضبط نفس، صبر، شکر، عفت، دیانت و امانت، عفو و درگذر، جذبہ تبلیغ و اعلاء کلمۃ اللہ کا عشق اور اصلاح و تقویٰ جیسے اخلاق فاضلہ اور صفات کاملہ کا ایک نادر سلسلۃ الذہب ہے جو اس قصہ کے ہر نقش میں منقش نظر آتا ہے مگر ان میں سے یہ چند امور خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

① اگر کسی شخص کی ذاتی سرشت عمدہ ہو اور اس کا ماحول بھی پاک، مقدس اور لطیف ہو تو اس شخص کی زندگی اخلاق کریمانہ میں نمایاں اور صفات عالیہ میں ممتاز ہوگی اور وہ ہر قسم کے شرف و مجد کا حامل ہوگا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی مقدس زندگی اس کی بہترین مثال ہے، وہ یعقوب، اسحاق اور ابراہیم علیہم السلام جیسے جلیل القدر نبیوں اور پیغمبروں کی اولاد تھے اس لیے نبوت و رسالت کے گہوارہ میں نشوونما پائی اور خانوادۂ نبوت کے ماحول میں تربیت حاصل کی، ذاتی نیک نہادی اور فطری پاکی نے جب ایسے لطیف ماحول کو دیکھا تو تمام فضائل و اوصاف حمیدہ چمک اٹھے اور بچپن جوانی اور کہولت کی زندگی کے تمام گوشے تقویٰ، عفت، صبر و استقامت، دیانت اور عشق الٰہی کے ایسے روشن مظہر بن گئے کہ عقل انسانی اس مجموعہ کمالات ہستی کو دیکھ کر محو حیرت ہو جاتی ہے۔

② اگر کسی شخص میں ایمان باللہ مستقیم و مستحکم ہو اور اس پر اس کا یقین راسخ اور مضبوط ہو تو پھر اس راہ کی تمام صعوبتیں اور مشکلات اس پر آسان بلکہ آسان تر ہو جاتی ہیں اور رؤیت حق کے بعد تمام خطرات اور مصائب ہیچ ہو کر رہ جاتے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام کی تمام زندگی میں یہ بات نمایاں نظر آتی ہے۔

③ ابتلاء و آزمائش، مصیبت و ہلاکت کی شکل میں ہو یا دولت و ثروت اور خواہشات نفسانی کے خوبصورت اسباب کی صورت میں،

---

[1] پیدائش باب ۵۰ آیات ۲۲۔۲۶ [2] خروج باب ۱۳ آیت ۱۹۔

ہر حالت میں انسان کو خدائے تعالیٰ کی جانب ہی رجوع کرنا چاہیے اور اسی سے التجا کرنی چاہیے کہ وہ امر حق پر ثابت قدم رکھے اور استقامت بخشے۔

عزیز کی بیوی اور حسین مصری عورتوں کی ترغیبات اور ان کی مرضیات پوری نہ کرنے پر قید کی دھمکیاں اور پھر قید و بند کے مصائب، ان تمام حالات میں حضرت یوسف علیہ السلام کا اعتماد اور ان کی دعاؤں اور التجاؤں کا مرکز صرف ایک ہی ہستی سے وابستہ نظر آتا ہے، وہ نہ عزیز مصر کے سامنے عرض رساں نظر آتے ہیں نہ فرعون کے سامنے ملتجی، وہ نہ ان خوبرویان مصر اور عشوہ طراز ان حسن و جمال سے جی لگاتے ہیں اور نہ اپنے مربی کی خوبرو بیوی سے، بلکہ ہر موقعہ پر خدائے تعالیٰ ہی سے مدد کے طالب نظر آتے ہیں۔

﴿ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ﴾ (یوسف: ۳۳)

﴿ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۭ﴾ (یوسف: ۲۳)

④ جب خدائے تعالیٰ کی محبت اور اس کا عشق، قلب کی گہرائیوں مین اُتر جاتا ہے تو پھر انسان کی زندگی کا تمام تر مقصد وہی بن جاتا ہے اور اس کے دین کی دعوت و تبلیغ کا عشق ہر وقت رگ و پے میں دوڑتا رہتا ہے، چنانچہ قید خانہ کی سخت مصیبت کے وقت اپنے رفیقوں سے سب سے پہلا کلام یوسف علیہ السلام کا یہی تھا:

﴿ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾ (یوسف: ۳۹)

⑤ دیانت و امانت ایک ایسی نعمت ہے کہ اس کو انسان کی دینی و دنیوی سعادتوں کی کلید کہنا چاہیے، عزیز مصر کے یہاں یوسف علیہ السلام جس طرح داخل ہوئے تھے واقعہ کی تفصیلات سے معلوم ہو چکا ہے، یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی دیانت و امانت ہی کا نتیجہ تھا کہ پہلے وہ عزیز مصر کی نظروں میں بلند و باوقار اور محبوب بنے پھر مصر کی حکومت کے مالک ہو گئے۔

⑥ خود اعتمادی انسان کے بلند اوصاف میں سے ایک بڑا وصف ہے، خدائے تعالیٰ نے جس شخص کو یہ دولت بخش دی ہے وہی دنیا کے مصائب و آلام سے گذر کر دنیوی و دینی رفعت و بلندی حاصل کر سکتا ہے۔

خود اعتمادی کی مختلف اقسام میں سے ایک قسم "عزت نفس" بھی ہے، جو شخص خودداری اور عزت نفس سے محروم ہے، وہ انسان نہیں، ایک مضغہ گوشت ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کی عزت نفس کے تحفظ کا یہ عالم ہے کہ برسوں کے بعد جب قید خانہ سے رہائی کا حکم ملتا، اور بادشاہ وقت کا پیغام سربلندی حاصل ہوتا ہے تو مسرت و شادمانی کے ساتھ فوراً اس کو لبیک نہیں کہتے بلکہ صاف انکار کر دیتے ہیں کہ میں اس وقت تک قید خانہ سے باہر نہیں آؤں گا تاوقتیکہ یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ مصری عورتوں نے مکر و فریب سے جس قسم کا معاملہ میرے ساتھ کیا تھا اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟

﴿ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ﴾ (یوسف: ۵۰)

⑦ صبر ایک عظیم الشان "خلق" ہے اور بہت سی برائیوں کے لیے سپر اور ڈھال کا کام دیتا ہے، قرآن حکیم میں ستر سے زیادہ مقامات پر اس کی فضیلت کا اعلان کیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے بہت سے مراتب علیا اور درجات رفیعہ کا مدار اسی فضیلت پر رکھا ہے۔

﴿ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ﴾ (السجدہ: ۲٤)

"اور ہم نے ان میں سے مقتدا بنائے جو ہمارے احکام کے ہادی بنے جبکہ وہ فضیلت صبر سے مزین ثابت ہوئے۔"

﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا ﴾ (الاعراف: ۱۳۷)

"اور پورا ہوا تیرے رب کا نیک کلمہ بنی اسرائیل پر اس وجہ سے کہ وہ صابر رہے۔"

﴿ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ ﴾

(البقرہ: ۱۵۵۔۱۵٦)

"اور بشارت دے دو ان صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو کہہ اٹھتے ہیں "بیشک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور بیشک ہم اسی جانب لوٹ جانے والے ہیں۔"

﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ﴾ (الاحقاف: ۳۵)

"(اے محمد ﷺ) تم اسی طرح صبر کرو جس طرح بلند عزیمت والے پیغمبروں نے کیا۔"

﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ (البقرہ: ٤۵)

"اور (اللہ) سے مدد چاہو صبر اور نماز کے ذریعہ۔"

((وَقَالَ رسول الله صلى الله عليه وسلَّمَ الصَّبْرُ نِصْفُ الایمانِ)). (بیہقی فی شعب الایمان)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "صبر نصف ایمان ہے۔"

((وَسُئِلَ عنِ الایمانِ فقال الصبرُ وَالسَّماحَةُ)). (بیہقی)

نبی کریم ﷺ سے ایک مرتبہ ایمان کی تعریف پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا: "صبر اور دریا دلی۔"

حقیقت میں "صبر" ایک ایسی صفت کا نام ہے جس کے ذریعہ انسان برائیوں سے باز رہ سکے اور نفس ان کی طرف اقدام سے رک جائے، اس لیے یہ صرف انسان ہی کا خاصہ ہے اور تمام حیوانات سے اس کو امتیاز بخشتا ہے۔

صبر کی مختلف اقسام ہیں یا یوں کہیے کہ ان اشیاء کی نسبت کے لحاظ سے جن کی جانب "صبر" کو منسوب کیا جاتا ہے وہ مختلف ناموں سے موسوم ہے۔

پس اگر پیٹ اور شرمگاہ کی خواہشات کے مقابلہ میں صبر ہے تو اس کا نام "عفت" ہے اور اگر مصائب پر صبر ہے تو اس کو "صبر" ہی کہتے ہیں اور اس کی ضد کا نام "جزع وفزع" ہے اور اگر ثروت و دولت کی بہتات کی حالت میں صبر ہے تو اس کا نام "ضبط نفس" ہے اور اس کی ضد کو "بطر" (چھچھورپن) کہتے ہیں، اور اگر میدان جنگ اور اسی قسم کے مہلک حالات پر صبر ہے تو وہ "شجاعت" کہلاتا ہے اور اس کی ضد کا نام "جبن" (بزدلی) ہے، اور اگر غیظ و غضب کے حالات پر صبر ہے تو اس کو "حلم" کہتے ہیں اور اس کی ضد کو "تذمر" (بے قابو ہونا) کہا جاتا ہے، اور اگر حوادثات زمانہ پر صبر ہے تو اس کا نام "وسعت صدر" (کشادہ دلی اور حوصلہ مندی) ہے اس کی

مخالف صفت کو "ضجر" (تنگ دلی اور بے صبری) کہتے ہیں، اور اگر دوسروں کے پوشیدہ رازوں پر صبر ہے تو اس کا نام "کتمان سر" (پردہ پوشی) ہے اور بقدر کفاف معیشت پر صبر ہے تو اس کو "قناعت" کہتے ہیں اور اگر ہر قسم کی عیش پسندی کے مقابلہ میں صبر ہے تو اس کا نام "زہد" ہے۔

صبر کی ان تمام اقسام کا بیان جامع ایجاز و اعجاز کے ساتھ قرآن عزیز کی اس آیت میں کیا گیا ہے:

﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾

"اور ہر قسم کی مصیبتوں اور مضرتوں اور میدان جنگ کی ہولناکیوں میں صبر کرنے والے یہی دراصل صادق ہیں اور یہی متقی و پرہیزگار ہیں۔" (البقرہ:۱۷۷)

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو صبر و رضا کے ان تمام مراحل میں وہ کمال عطا فرمایا تھا جس کو "مثل اعلیٰ" کہا جاتا ہے، مثلاً:

① برادران یوسف علیہ السلام کی ایذا رسانیوں پر صبر۔

② آزاد ہونے کے باوجود غلام بن جانے اور ایسے ملک اور ایسی قوم کے ہاتھوں میں فروخت ہو جانے پر صبر جو معاشرت و معیشت میں بھی مخالف اور دین و ایمان میں بھی دشمن تھی۔

③ عزیز مصر کی بیوی اور مصری عورتوں کی پرفریب ترغیبات پر صبر۔

④ قید خانہ کے مصائب پر صبر۔

⑤ عزیز مصر کی تمام دولت و ثروت کے وکیل بن جانے پر صبر یعنی خدا کی شکر گذاری کا اظہار اور شیخی سے پرہیز۔

⑥ مملکت مصر کے حاکم مطلق ہونے پر صبر یعنی ظلم، کبر، شیخی سے پرہیز۔

⑦ ہر دو حالتوں میں قناعت و زہد کی زندگی کو ترجیح۔

⑧ ایذا رسا بھائیوں کی ندامت کے وقت اختیار صبر یعنی وسعت قلب کا ثبوت ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ﴾۔

⑨ اخلاق حسنہ میں "شکر" بھی بہترین خلق ہے اس لیے کہ یہ اخلاق الٰہیہ میں سے بہت بلند خلق ہے، قرآن عزیز میں ہے ﴿وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾ انسانی اوصاف میں "شکر" ایسی صفت کا نام ہے جس کے ذریعہ منعم حقیقی کی نعمت کا اعتراف کیا جائے، اور اس پر مسرت و شادمانی کا اظہار ہو اور اس کو محسن و منعم کے مرغوب اور پسندیدہ طریقہ پر استعمال کیا جائے، قرآن عزیز میں ہے۔

﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ﴾ (البقرہ:۱۵۲)

"پس تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا اور تم میرا شکر کرو اور ناشکری نہ کرو۔"

﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ﴾ (النساء:۱۴۷)

"اللہ تم پر عذاب نہ لائے گا، اگر تم اس کے شکر گذار اور اس پر ایمان والے رہے۔"

﴿لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ (ابراھیم:۷)

"اگر تم شکر گذار ہو تو ہم (تمہاری) نعمتوں میں اضافہ کرتے رہیں گے۔"

مگر افسوس یہ ہے کہ انسانی دنیا میں حقیقی شکر گذار اور سپاس گذار بہت ہی کم ہیں۔

﴿وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝﴾ (سبا: ۱۳)

"اور میرے بندوں میں حقیقی شکر گذار بہت کم ہیں۔"

لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ صفت بھی بدرجہ کمال عطا فرمائی تھی ان کی زندگی کے حالات پڑھو اور اندازہ کرو کہ کس طرح جگہ جگہ شکر اور سپاس گذاری کا مظاہرہ نمایاں نظر آتا ہے خصوصاً ختم قصہ پر ان کی جو دعا مذکور ہے وہ ان کے اس وصف کو اور زیادہ نمایاں کرتی ہے۔

﴿رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۫ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝﴾ (یوسف: ۱۰۱)

"اے پروردگار! بلاشبہ تو نے مجھ کو حکومت بخشی اور باتوں کے فیصلہ کی سمجھ بوجھ عطا فرمائی اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا مددگار ہے تو مجھ کو اپنی اطاعت پر موت دینا اور صالحین کے زمرہ میں شامل کر لینا۔"

⑩ حسد اور بغض کا انجام حاسد اور بغض کرنے والے کے حق میں ہی مضر ہوتا ہے اور اگرچہ کبھی محسود و مبغوض کو بھی دنیوی نقصان پہنچ جانا ممکن ہے لیکن حاسد کسی حال میں بھی فلاح نہیں پاتا، اور خسر الدنیا والاخرۃ کا مصداق ہی رہتا ہے، الا یہ کہ تائب ہو جائے اور حاسدانہ زندگی کو ترک کر دے۔

برادران یوسف علیہ السلام کے واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور ان کا انجام بھی مگر چشم بصیرت شرط ہے۔

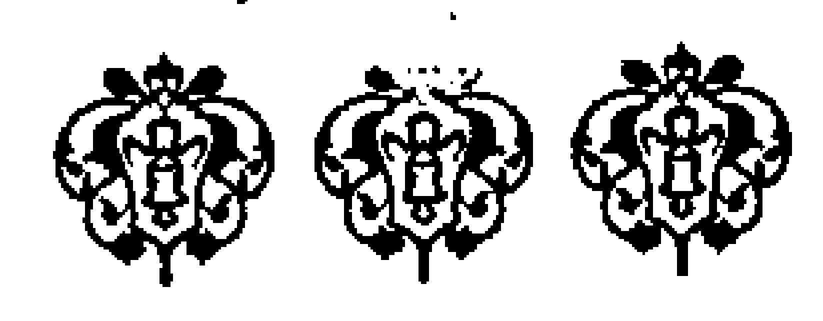
⑪ صداقت، دیانت، امانت، صبر اور شکر جیسے صفات عالیہ سے متصف زندگی ہی حقیقی اور کامیاب زندگی ہے، اور اگر انسان میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے تو پھر وہ انسان نہیں بلکہ حیوان ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر۔

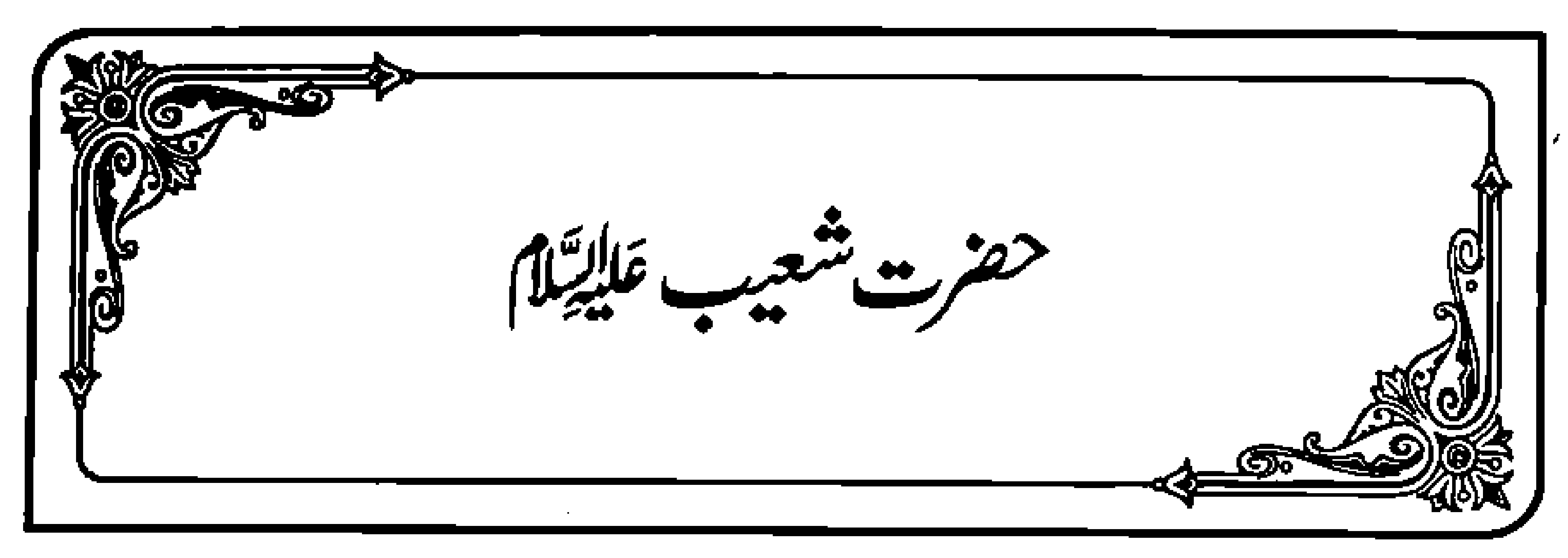
﴿ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ﴾ (الاعراف: ۱۷۹)

"(یہ متمرد و سرکش انسان) چوپاؤں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گذرے۔"

⑫ حضرت یوسف علیہ السلام کے اخلاق کریمانہ اور صفات عالیہ کی مدحت و منقبت میں سب سے اہم وہ جملہ ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں فرمایا: "الکریم بن الکریم بن الکریم بن الکریم" یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم، یعنی وہ سلسلہ نسب جو چار پشتوں سے کرامت نبوت سے مستفیض ہے، یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم کا سلسلہ ہے، اور ایک روایت میں ہے:

((اکرمُ النّاس یوسفُ نبیُّ اللّٰہِ بن نبیِ اللّٰہ بن نبیِ اللّٰہ بن خلیلِ اللّٰہ))۔ (بخاری کتاب التفسیر)





حضرت شعیب علیہ السلام

○ حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر قرآن عزیز میں ○ قوم شعیب علیہ السلام ○ مدین واصحاب ایکہ
○ زمانہ بعثت ○ دعوت حق ○ قوم کی سرکشی ○ سرکشی کا انجام ○ بصائر وعبر

حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر قرآن میں:

قرآن حکیم میں حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا تذکرہ اعراف، ہود اور شعراء میں قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے اور حجر اور عنکبوت میں مختصر ہے، ان سورتوں میں حجر کے علاوہ حضرت شعیب علیہ السلام کا نام دس جگہ مذکور ہے، ذیل کا نقشہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔

نام سورۃ	آیات	شمار
اعراف	۸۵۔۸۸۔۹۰۔۹۲	۴
ہود	۸۴۔۸۷۔۹۰۔۹۱۔۹۵	۵
شعراء	۱۷۷	۱
عنکبوت	۳۶	۱
	میزان	۱۱

قوم شعیب علیہ السلام:

حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت مدین یا مدیان میں ہوئی تھی، مدین کسی مقام کا نام نہیں ہے بلکہ "قبیلہ"* کا نام ہے، یہ قبیلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے مدین کی نسل سے تھا جو ان کی تیسری بیوی قطورا سے پیدا ہوا، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خاندان بنی قطورا کہلاتا ہے۔

"مدین" اپنے اہل وعیال کے ساتھ اپنے سوتیلے بھائی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پہلو ہی میں حجاز میں آباد ہو گیا تھا، یہی خاندان آگے چل کر ایک بڑا قبیلہ بن گیا اور شعیب علیہ السلام بھی چونکہ اسی نسل اور اسی قبیلہ سے تھے اس لیے ان کو بعثت کے بعد یہ "قوم شعیب" کہلایا ہے۔

* اسی قبیلہ کے نام پر بستی کا نام مدین مشہور ہوا۔

مدین یا اصحاب ایکہ:

یہ قبیلہ کس مقام پر آباد تھا؟ اس کے متعلق عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ یہ حجاز میں شام کے متصل ایسی جگہ آباد تھا کہ جس کا عرض البلد افریقہ کے جنوبی صحرا کے عرض البلد کے مطابق پڑتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ شام کے متصل معان کے حصہ زمین پر آباد تھا۔ قرآن عزیز نے اس قبیلہ کی آبادی کے متعلق ہم کو دو باتوں سے تعارف کرایا ہے۔ ایک یہ کہ وہ "امام مبین" پر آباد تھا۔

﴿وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ﴾ (الحجر:۷۹)

"اور لوط (علیہ السلام) کی قوم اور مدین دونوں بڑی شاہراہ پر آباد تھے۔"

عرب کے جغرافیہ میں جو شاہراہ حجاز کے تاجر قافلوں کو شام، فلسطین، یمن بلکہ مصر تک لے جاتی اور بحر قلزم کے مشرقی کنارے سے ہو کر گذرتی تھی قرآن اسی کو "امام مبین" (کھلی اور صاف شاہراہ) کہتا ہے، کیونکہ صیف (گرمی) اور شتاء (سردی) دونوں زمانوں میں قریشی قافلوں کے لیے یہ متعارف اور بڑی تجارتی سڑک تھی جس کا سلسلہ بری مسافت کے ساتھ بحری سے بھی ڈانڈے ملا دیتا تھا۔

دوسرے یہ کہ "وہ اصحاب ایکہ" (جھنڈ والے) تھے، عربی میں "ایکہ" ان سرسبز و شاداب جھاڑیوں کو کہتے ہیں جو ہرے بھرے درختوں کی کثرت کی وجہ سے جنگلوں اور بنوں میں اُگی رہتی ہیں، اور جھاندے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

ان دونوں باتوں کے جان لینے کے بعد مدین کی آبادی کا پتہ آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے وہ یہ کہ مدین کا قبیلہ بحر قلزم کے مشرقی کنارہ اور عرب کے مغرب شمال میں ایسی جگہ آباد تھا جو شام کے متصل حجاز کا آخری حصہ کہا جا سکتا ہے اور حجاز والوں کو شام، فلسطین بلکہ مصر تک جانے میں اس کے کھنڈر راہ میں پڑتے تھے اور جو تبوک کے بالمقابل واقع تھا۔ [1]

مفسرین اس بارہ میں مختلف ہیں کہ مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قبیلہ کے دو نام ہیں یا دو جدا جدا قبیلے ہیں، بعض کا خیال ہے کہ دونوں جدا جدا قبیلے ہیں، مدین متمدن اور شہری قبیلہ تھا اور "اصحاب ایکہ" دیہاتی اور بدوی قبیلہ جو جنگل اور بن میں آباد تھا، اس لیے اس کو "بن والا" یا "جنگل والا" کہا گیا، اور آیت ﴿وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ﴾ میں ﴿هُمَا﴾ ضمیر تثنیہ سے یہی دونوں مراد ہیں نہ مدین اور قوم لوط۔

اور دوسرے مفسرین دونوں کو ایک ہی قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آب و ہوا کی لطافت نہروں اور آبشاروں کی کثرت نے اس مقام کو اس قدر شاداب و پُرفضا بنا دیا تھا اور یہاں میووں، پھلوں اور خوشبودار پھولوں کے اس قدر باغات اور چمن تھے کہ اگر شخص آبادی سے باہر کھڑے ہو کر نظارہ کرتا تھا تو اس کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ نہایت خوبصورت اور شاداب گھنے درختوں کا ایک جھنڈ ہے اسی وجہ سے قرآن عزیز نے اس کو "ایکہ" کہہ کر تعارف کرایا ہے۔

ان مفسرین میں سے حافظ عماد الدین ابن کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہاں "ایکہ" نام ایک درخت تھا، اہل قبیلہ چونکہ اس کی پرستش کرتے تھے لہٰذا اس کی نسبت سے "مدین" کو "اصحاب ایکہ" کہا گیا، نیز چونکہ یہ نسبت نسبی نہ تھی بلکہ مذہبی تھی اس لیے جن آیات

---

[1] معجم البلدان ج ۵ ص ۴۱۸

میں ان کو اس لقب سے یاد کیا گیا ہے ان میں حضرت شعیب علیہ السلام کو ﴿ اَخُوْهُمْ ﴾ ان کا بھائی، یا اسی قسم کے نسبی علاقہ سے یاد نہیں کیا، البتہ جن آیات میں، قوم شعیب علیہ السلام کو مدین کہہ کر یاد کیا ہے، ان میں حضرت شعیب علیہ السلام کو بھی ان کے نسبی رشتہ میں منسلک ظاہر کیا ہے۔

بہر حال راجح یہی ہے کہ مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قبیلہ ہے جو باپ کی نسبت سے مدین کہلایا اور زمین کی طبعی اور جغرافی حیثیت سے "اصحاب ایکہ" کے لقب سے مشہور ہوا۔

زمانہ بعثت اور ایک غلطی کا ازالہ:

عبدالوہاب نجار اپنی کتاب "قصص الانبیاء" میں تحریر فرماتے ہیں کہ ابوالعباس احمد قلقشندی نے "صبح الاعشیٰ" جلد ۴ ص ۱۶ میں یہ تحریر کیا ہے:

ثم ملك بعده. يعني يوثام، ابنه احازست عشرة سنة ايضا و كانت الحرب بينه و بين ملك دمشق و فی زمنه كان شعيب عليه السلام.

"پھر یوثام کے بعد آحاز نے بھی سولہ سال تک حکومت کی اور اس کے اور دمشق کے بادشاہ کے درمیان جنگ رہی اور اسی زمانہ میں حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔"

قلقشندی کی عبارت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صدیوں بعد پیدا ہوئے، یعنی سات سو برس بعد آٹھویں صدی کے اوائل میں، کیونکہ آحاز کی حکومت کا یہی زمانہ تھا، حالانکہ بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے، اس لیے کہ حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام کا زمانہ پایا ہے یا نہیں یہ بات البتہ اختلافی ہے۔

اسی بنا پر قرآن عزیز نے سورۂ اعراف میں حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب (علیہم السلام) کے ذکر کے بعد فرمایا ﴿ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى ﴾ اور اسی طرح سورۂ یونس، سورۂ حج، سورۂ ہود اور سورۂ عنکبوت میں بیان کیا گیا۔

تو قلقشندی سے اس جگہ لغزش ہوگئی ہے کہ اس نے شعیاء علیہ السلام کی جگہ شعیب علیہ السلام تحریر کر دیا، بلاشبہ آحاز کی حکومت کا زمانہ شعیاء نبی کا زمانہ ہے۔ [1]

دعوت حق:

بہر حال شعیب علیہ السلام جب اپنی قوم میں مبعوث ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ خدا کی نافرمانی اور معصیت کا ارتکاب صرف افراد و آحاد میں ہی نہیں پایا جاتا بلکہ ساری قوم گرداب ہلاکت میں مبتلا ہے اور اپنی بداعمالیوں میں اس قدر سرمست و سرشار ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی ان کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ جو کچھ ہو رہا ہے معصیت اور گناہ ہے بلکہ وہ اپنے ان اعمال کو باعث فخر سمجھتے ہیں۔

---

[1] قصص الانبیاء للنجار ص ۱۸۵

ان کی بہت سی بداخلاقیوں اور نافرمانیوں سے قطع نظر جن قبیح امور نے خصوصیت کے ساتھ ان میں رواج پالیا تھا، وہ یہ تھے:

① بت پرستی اور مشرکانہ رسوم وعوائد ② خرید وفروخت میں پورا لینا اور کم تولنا یعنی دوسرے کو اس کے حق سے کم دینا اور اپنے لیے حق کے مطابق لینا بلکہ اس سے زیادہ ③ تمام معاملات میں کھوٹ اور ڈاکہ زنی۔

قوموں کے عام رواج کے مطابق دراصل ان کی رفاہیت، خوش عیشی، دولت وثروت کی فراوانی، زمین اور باغوں کی زرخیزی اور شادابی نے ان کو اس قدر مغرور بنا دیا تھا کہ وہ ان تمام امور کو اپنی ذاتی میراث اور اپنا خاندانی ہنر سمجھ بیٹھے تھے، اور ایک ساعت کے لیے بھی ان کے دل میں یہ خطرہ نہیں گذرتا تھا کہ یہ سب کچھ خدائے تعالیٰ کی عطا وبخشش ہے کہ شکر گذار ہوتے اور سرکشی سے باز رہتے، غرض ان کی فارغ البالی نے ان میں طرح طرح کی بداخلاقیاں اور قسم قسم کے عیوب پیدا کر دیئے تھے۔

آخر غیرت حق حرکت میں آئی اور سنت اللہ کے مطابق ان کو راہ حق دکھانے، فسق وفجور سے بچانے اور امین ومتقی اور بااخلاق بنانے کے لیے ان ہی میں سے ایک ہستی کو چن لیا اور شرف نبوت ورسالت سے نواز کر اس کو دعوت اسلام اور پیغام حق کا امام بنایا یہ ہستی حضرت شعیب علیہ السلام کی ذات گرامی تھی۔

خدا کی توحید اور شرک سے بیزاری کا اعتقاد تو تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کی مشترک بنیاد اور اصل ہے جو حضرت شعیب علیہ السلام کے حصہ میں بھی آئی تھی مگر قوم کی مخصوص بداخلاقیوں پر توجہ دلانے اور ان کو راہ راست پر لانے کے لیے انہوں نے اس قانون کو بھی اہمیت دی کہ خرید وفروخت کے معاملہ میں یہ ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ جو جس کا حق ہے وہ پورا پورا اس کو ملے کہ دنیوی معاملات میں یہ ایک ایسی بنیاد ہے جو متزلزل ہو جانے کے بعد ہر قسم کے ظلم، فسق وفجور اور مہلک خرابیوں اور بداخلاقیوں کا باعث بنتی ہے۔

الحاصل حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کی بداعمالیوں کو دیکھ کر سخت دکھ محسوس کیا اور رشد وہدایت کی تعلیم دیتے ہوئے قوم کو انہی اصول کی طرف بلایا جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت وارشاد کا خلاصہ ہے۔

انہوں نے فرمایا: "اے قوم! ایک خدا کی عبادت کر! اس کے علاوہ کوئی پرستش کے قابل نہیں ہے، اور خرید وفروخت میں ناپ تول کو پورا رکھ، اور لوگوں کے ساتھ معاملات میں کھوٹ نہ کر، کل تک ممکن ہے کہ تجھ کو ان بداخلاقیوں کی برائیوں کا حال معلوم نہ ہوا ہو، مگر آج تیرے پاس خدا کی حجت، نشانی، اور برہان آ چکا، اب جہل ونادانی، عفو ودرگذر کے قابل نہیں ہے، حق کو قبول کر اور عمل سے باز آ، کہ یہی کامرانی اور کامیابی کی راہ ہے، اور خدا کی زمین میں فتنہ وفساد نہ کر، جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی صلاح وخیر کے تمام سامان مہیا کر دیئے، اگر تجھ میں ایمان ویقین کی صداقت موجود ہے تو سمجھ کہ یہی فلاں وبہبودی کی راہ ہے اور دیکھ ایسا نہ کر کہ دعوت حق کی راہ کو روکنے اور لوگوں کو لوٹنے کے لیے ہر راہ پر جا بیٹھے اور جو آدمی بھی ایمان لائے اس کو خدا کی راہ اختیار کرنے پر دھمکیاں دینے لگے اور اس میں کج روی پیدا کرنے کے درپے ہو جائے، اے افراد قوم اس وقت کو یاد کرو، اور خدا کا احسان مانو کہ تم بہت تھوڑے تھے پھر اس نے امن وعافیت دے کر تمہاری تعداد کو بیش از بیش بڑھا دیا۔

اے میری قوم! ذرا اس پر بھی غور کر کہ جن لوگوں نے خدا کی زمین پر فساد پھیلانے کا شیوہ اختیار کیا تھا ان کا انجام کس قدر عبرتناک ہوا، اور اگر تم میں سے ایک جماعت مجھ پر ایمان لے آئی اور ایک جماعت ایمان نہیں لائی تو صرف اتنی ہی بات پر معاملہ ختم ہو جانے والا نہیں، بلکہ صبر کے ساتھ انتظار کر، تا آنکہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان آخری فیصلہ کر دے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا

ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے، شیریں کلامی، حسن خطابت، طرز بیان اور طلاقت لسانی میں بہت نمایاں امتیاز رکھتے تھے، اسی لیے مفسرین ان کو خطیب الانبیاء کے لقب سے یاد کرتے ہیں، پس انہوں نے نرم و گرم ہر طریقہ سے قوم کو رشد و ہدایت کے یہ کلمات ارشاد فرمائے مگر اس بد بخت قوم پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا، اور چند ضعیف اور کمزور ہستیوں کے علاوہ کسی نے پیغام حق پر کان نہ دھرا، وہ خود بھی اسی طرح بداعمال رہے اور دوسروں کی راہ بھی مارتے رہے، وہ راستوں میں بیٹھ جاتے اور حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس آنے جانے والوں کو قبول حق سے روکتے اور اگر موقعہ لگ جاتا تو لوگوں کو لوٹ لیتے اور اگر اس پر بھی کوئی خوش قسمت حق پر لبیک کہہ دیتا تو اس کو ڈراتے، دھمکاتے اور طرح طرح سے کج روی پر آمادہ کرتے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت حق کا سلسلہ برابر جاری رہا تو ان میں سے سر برآوردہ اشخاص نے کہ جن کو اپنی شوکت و طاقت پر غرور تھا، حضرت شعیب علیہ السلام سے کہا: "اے شعیب (علیہ السلام)! دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہو کر رہے گی، یا ہم تجھ کو اور تجھ پر ایمان لانے والوں کو اپنی بستی میں سے نکال دیں گے اور تیرا دیس نکالا کریں گے یا تم کو مجبور کریں گے کہ پھر ہمارے دین میں واپس آ جاؤ۔"

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا: "اگر ہم تمہارے دین کو غلط اور باطل سمجھتے ہوں تب بھی زبردستی مان لیں یہ تو بڑا ظلم ہے؟ اور جبکہ ہم کو خدائے تعالیٰ نے تمہارے اس دین سے نجات دے دی تو پھر ہم اس کی طرف لوٹ جائیں تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم نے جھوٹ بول کر خدائے تعالیٰ پر بہتان باندھا، یہ ناممکن ہے، ہاں اگر اللہ کی (جو کہ ہمارا پروردگار ہے) یہی مرضی ہو تو وہ جو چاہے گا کرے گا، ہمارے رب کا علم تمام اشیاء پر چھایا ہوا ہے، ہمارا تو صرف اسی پر بھروسہ ہے، اے پروردگار! تو ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق اور سچائی کے ساتھ فیصلہ کر دے تو ہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے، قوم کے سرداروں نے جب حضرت شعیب علیہ السلام کا یہ عزم و استقلال دیکھا تو اب ان سے روئے سخن پھیر کر اپنی قوم کے لوگوں سے کہنے لگے: "خبردار! اگر تم نے شعیب علیہ السلام کا کہنا مانا تو تم ہلاک و برباد ہو جاؤ گے۔"

حضرت شعیب علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا: "دیکھو خدائے تعالیٰ نے مجھ کو اس لیے بھیجا ہے کہ میں اپنے مقدور بھر تمہاری اصلاح کی سعی کروں اور میں جو کچھ کہتا ہوں اس کی صداقت اور سچائی کے لیے خدا کی حجت اور دلیل اور نشانی بھی پیش کر رہا ہوں، مگر افسوس کہ تم اس واضح حجت کو دیکھ کر بھی سرکشی و نافرمانی پر قائم ہو اور مخالفت کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو تم سے چھوٹا ہوا ہو پھر میں تم سے اپنی اس رشد و ہدایت کے بدلہ میں کوئی اجرت بھی نہیں مانگتا اور نہ کوئی دنیوی نفع کا طالب ہوں، میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے، اور اگر تم اب بھی نہ مانو گے تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں خدا کا عذاب تم کو ہلاک و برباد نہ کر ڈالے، اس کا فیصلہ اٹل ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کو رد کر دے۔

قوم کے سردار تیوری چڑھا کر بولے۔ شعیب (علیہ السلام)! کیا تیری نماز ہم سے یہ چاہتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے دیوتاؤں کو پوجنا چھوڑ دیں اور ہم کو اپنے مال و دولت میں یہ اختیار نہ رہے کہ جس طرح چاہیں معاملہ کریں، اگر ہم کم تولنا چھوڑ دیں، لوگوں کے کاروبار میں کھوٹ نہ کریں تو مفلس و قلاش ہو کر رہ جائیں۔ پس کیا ایسی تعلیم دینے میں تجھ کو کوئی متین اور سچا رہبر کہہ سکتا ہے۔؟

حضرت شعیب علیہ السلام نے نہایت دل سوزی اور محبت کے ساتھ فرمایا: "اے قوم! مجھے یہ خوف لگ رہا ہے کہ تیری بے باکیاں اور خدا کے مقابلہ میں نافرمانیاں کہیں تیرا بھی وہی انجام نہ کریں، جو تجھ سے پہلے قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح اور قوم لوط کا ہوا، اب بھی

کچھ نہیں گیا، خدا کے سامنے جھک جا، اور اپنی بدکرداریوں کے لیے بخشش کی طلب گار بن اور ہمیشہ کے لیے ان سے تائب ہو جا، بلاشبہ میرا پروردگار رحم کرنے والا بہت ہی مہربان ہے، وہ تیری تمام خطائیں بخش دے گا۔

قوم کے سرداروں نے یہ سن کر جواب دیا "شعیب (علیہ السلام)! ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ تو کیا کہتا ہے؟ تو ہم سب سے کمزور اور غریب ہے، اگر تیری باتیں سچی ہوتیں تو تیری زندگی ہم سے زیادہ اچھی ہوتی، اور ہم کو صرف تیرے خاندان کا خوف ہے ورنہ تجھ کو سنگسار کر چھوڑتے، تو ہرگز ہم غالب نہیں آ سکتا۔"

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا: "افسوس ہے تم پر! کیا تمہارے لیے خدا کے مقابلہ میں میرا خاندان زیادہ ڈر کا باعث بن رہا ہے حالانکہ میرا رب تمہارے تمام اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔

خیر اگر تم نہیں مانتے تو تم جانو، تم وہ سب کچھ کرتے رہو جو کر رہے ہو عنقریب خدا کا فیصلہ بتا دے گا کہ عذاب کا مستحق کون ہے اور کون جھوٹا اور کاذب ہے تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں؟"

آخر وہی ہوا جو قانون الٰہی کا ابدی و سرمدی فیصلہ ہے "یعنی حجت و برہان کی روشنی آنے کے بعد بھی جب باطل پر اصرار ہو اور اس کی صداقت کا مذاق اڑایا جائے اور اس کی اشاعت میں رکاوٹیں ڈالی جائیں تو پھر خدا کا عذاب اس مجرمانہ زندگی کا خاتمہ کر دیتا، اور آنے والی قوموں کے لیے اس کو عبرت و موعظت بنا دیا کرتا ہے۔"

نوعِ عذاب:

قرآن عزیز کہتا ہے کہ نافرمانی اور سرکشی کی پاداش میں قوم شعیب علیہ السلام کو دو قسم کے عذاب نے آ گھیرا، ایک زلزلہ کا عذاب، اور دوسرا آگ کی بارش کا عذاب، یعنی جب وہ اپنے گھروں میں آرام کر رہے تھے تو یک بیک ایک ہولناک زلزلہ آیا اور ابھی یہ ہولناکی ختم نہ ہوئی تھی کہ اوپر سے آگ برسنے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ صبح کو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ کل کے سرکش اور مغرور آج گھٹنوں کے بل اوندھے جھلسے ہوئے پڑے ہیں۔

﴿فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۷۸)

"پھر آ پکڑا ان کو زلزلے نے پس صبح کو رہ گئے اپنے اپنے گھروں کے اندر اوندھے پڑے۔"

﴿فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝﴾ (الشعراء: ۱۸۹)

"پھر انہوں نے شعیب (علیہ السلام) کو جھٹلایا پس آ پکڑا ان کو بادل والے عذاب نے (جس میں آگ تھی) بیشک وہ بڑے ہولناک دن کا عذاب تھا۔"

﴿وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ۝ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاۗءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَ مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ
تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ
الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَ مَآ اُرِيْدُ
اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَ مَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ
عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾ وَ يٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ
اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ وَ مَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ وَ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ
اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَ لَوْ
لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۡ وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ
وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۹۲﴾ وَ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ
عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ وَ ارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ
رَقِيْبٌ ﴿۹۳﴾ وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ اَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا
الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ
ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾ ﴾(ھود: ۸۴-۹۵)

"اور ہم نے (قبیلہ) مدین کی طرف سے اس کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو بھیجا اس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم خوشحال ہو (یعنی خدا نے تمہیں بہت کچھ دے رکھا ہے، پس کفرانِ نعمت سے بچو) میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایسا دن نہ آ جائے جو سب پر چھا جائے گا"۔ اور اے میری قوم کے لوگو! ناپ تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو، لوگوں کو ان کی چیزیں (ان کے حق سے) کم نہ دو، ملک میں فساد پھیلاتے نہ پھرو، اگر تم میرا کہا مانو تو جو کچھ اللہ کا دیا (کاروبار میں) بچ رہے، اسی میں تمہارے لیے بہتری ہے اور دیکھو (میرا کام تو صرف نصیحت کر دینا ہے) میں کچھ تم پر نگہبان نہیں" (کہ جبراً اپنی راہ پر چلا دوں) لوگوں نے کہا: اے شعیب (علیہ السلام)! کیا تیری یہ نمازیں (جو تو اپنے خدا کے لیے پڑھتا ہے) تجھے یہ حکم دیتی ہیں کہ ہمیں آ کر کہے: ان معبودوں کو چھوڑ دو جنہیں ہمارے باپ دادے پوجتے رہے ہیں، یا یہ کہ ہمیں اختیار نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہیں کریں۔ بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو، شعیب علیہ السلام نے کہا" اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن رکھتا ہوں اور اس کے فضل و کرم کا یہ حال ہو کہ اچھی (سے اچھی) روزی عطا فرما رہا ہو (تو پھر بھی میں چپ رہوں اور تمہیں راہ حق کی

طرف نہ بلاؤں) اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جس بات سے تمہیں روکتا ہوں اس سے تمہیں تو روکوں اور خود اس کے خلاف چلوں میں تمہیں جو کچھ کہتا ہوں اسی پر عمل بھی کرتا ہوں میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ جہاں تک میرے بس میں ہے اصلاح حال کی کوشش کروں، میرا کام بنتا ہے تو اللہ ہی کی مدد سے بنتا ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف رجوع ہوں" اور اے میری قوم کے لوگو! میری ضد میں آ کر کہیں ایسی بات نہ کر بیٹھنا کہ تمہیں بھی ویسا ہی معاملہ پیش آ جائے جیسا قوم نوح کو یا قوم ہود کو یا قوم صالح کو پیش آ چکا ہے، اور قوم لوط (کا معاملہ) تم سے کچھ دور نہیں، اور دیکھو اللہ سے (اپنے گناہوں کی) معافی مانگو۔ اور اس کی طرف لوٹ جاؤ۔ میرا پروردگار بڑا ہی رحمت والا۔ بڑا ہی محبت والا ہے" لوگوں نے کہا: "اے شعیب (علیہ السلام)! تم جو کچھ کہتے ہو اس میں سے اکثر باتیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہم لوگوں میں ایک کمزور آدمی ہو، اگر (تمہارے ساتھ) تمہاری برادری کے آدمی نہ ہوتے تو ہم ضرور تمہیں سنگسار کر دیتے" تمہاری ہمارے سامنے کوئی ہستی نہیں، شعیب (علیہ السلام) نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! کیا اللہ سے بڑھ کر تم پر میری برادری کا دباؤ ہوا؟ اور اللہ تمہارے لیے کچھ نہ ہوا کہ اسے پیچھے ڈال دیا؟ (اچھا) جو تم کرتے ہو میرے پروردگار کے احاطہ (علم) سے باہر نہیں، اے میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ، میں بھی اپنی جگہ، سرگرم عمل ہوں، بہت جلد معلوم کر لو گے کہ کس پر عذاب آتا ہے، جو اسے رسوا کرے گا اور کون فی الحقیقت جھوٹا ہے، انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں اور پھر جب ہماری ٹھہرائی ہوئی بات کا وقت آ پہنچا تو ایسا ہوا کہ ہم نے شعیب (علیہ السلام) کو اور ان کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا اور جو لوگ ظالم تھے انہیں ایک سخت آواز نے آ پکڑا، پس جب صبح ہوئی تو اپنے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے۔ وہ اس طرح اچانک ہلاک ہو گئے، گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے، تو سن رکھو کہ قبیلہ مدین کے لیے بھی محرومی ہوئی جس طرح ثمود کے لیے محرومی ہوئی تھی۔"

قبر شعیب علیہ السلام:

حضرموت میں ایک قبر ہے جو زیارت گاہ عوام و خواص ہے، وہاں کے باشندوں کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ شعیب (علیہ السلام) کی قبر ہے، حضرت شعیب علیہ السلام مدین کی ہلاکت کے بعد یہاں بس گئے تھے اور یہیں ان کی وفات ہوئی، حضرموت کے مشہور شہر "شیون" کے مغربی جانب میں ایک مقام ہے جس کو "شبام" کہتے ہیں، اس جگہ اگر کوئی مسافر وادی ابن علی کی راہ ہوتا ہوا، شمال کی جانب چلے تو وادی کے بعد وہ جگہ آتی ہے جہاں یہ "قبر" ہے، یہاں مطلق کوئی آبادی نہیں ہے اور جو شخص بھی یہاں آتا ہے صرف زیارت ہی کے لیے آتا ہے۔ [1]

عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ مجھ کو اس قبر کے متعلق شک ہے کہ یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر ہے، لیکن انہوں نے اس شک کے لیے کوئی وجہ نہیں بیان فرمائی۔

---

[1] قصص الانبیاء

بصائر و عبرت:

پچھلی امتوں اور قوموں کے یہ واقعات کہانیاں نہیں ہیں بلکہ عبرت ہیں نگاہوں کے لیے سرمایہ صد ہزار عبرت ہیں، اگر زیادہ غور و فکر سے بھی کام نہ لیا جائے تب بھی بآسانی مسطورۂ بالا واقعات سے ہم حسب ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

① سورۂ اعراف میں مذکور ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی حجت و بینہ آ چکی ﴿ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ مگر قرآن عزیز نے دیگر انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت شعیب علیہ السلام کے کسی معجزہ ﴿آيَةُ اللهِ﴾ کا ذکر نہیں کیا، علماء نے اس سے دو نتیجے نکالے ہیں، ایک یہ کہ اگر نبی اور پیغمبر کسی قسم کا معجزہ نہ بھی لائے اور صرف خدا کے پیغام کے لیے روشن دلائل و براہین کی حجت ہی پیش کرے تو یہ روشن برہان ہی اس کا سب سے بڑا اور عظیم الشان معجزہ ہے، دوسرے یہ کہ اس مقام پر "بینہ" کی تفصیلات کو خدا کے سپرد کرنا چاہیے، اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ شریعت کے روشن دلائل کے علاوہ حضرت شعیب علیہ السلام کو بھی خدا کی جانب سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح کوئی نشان ﴿آيَةُ اللهِ﴾ بطور معجزہ عطا کیا گیا ہو اور اگرچہ قرآن نے اس جگہ اس کی تصریح نہیں کی مگر شعیب علیہ السلام کے اس خطاب میں اسی جانب اشارہ ہو۔

② ہماری غلطیوں میں سب سے بڑی مہلک غلطی عرصہ سے یہ رہی ہے کہ ہم قرآن عزیز کی تعلیم سے یکسر غافل ہونے کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے کہ اسلامی زندگی کے ارکان میں صرف "عبادات" ہی اہم رکن ہیں اور معاملات میں درست کاری اور اصلاح معاشرت کو اسلام میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں فساق امت کا تو ذکر ہی کیا اکثر اتقیاء اور پرہیزگار بھی حقوق العباد اور معاملات میں بے پروا نظر آتے ہیں، مگر حقوق العباد کی حفاظت معاشرتی درستکاری اور معاملات میں دیانت و امانت کو اسلام میں کس درجہ اہم شمار کیا گیا ہے وہ اس سے ظاہر ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک جلیل القدر پیغمبر کی بعثت کا مقصد اسی کو قرار دیا اور ان کو انہی امور کی اصلاح حال کے لیے رسول بنا کر بھیجا۔

③ خرید و فروخت میں دوسروں کے حق کو پورا نہ کر دینا انسانی زندگی میں ایسا روگ لگا دیتا ہے کہ یہ بداخلاقی بڑھتے بڑھتے تمام حقوق العباد کے بارے میں حق تلفی کی خصلت پیدا کر دیتی، اور اس طرح انسانی شرافت اور باہمی اخوت و مودت کے رشتہ کو منقطع کر کے لالچ، حرص، خود غرضی اور خست و نائت جیسے رذائل کا حامل بنا دیا کرتی ہے اسی لیے خدائے برتر کا ارشاد ہے:

﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ ﴾ (مطففین: ۱۔۳)

"ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو دوسروں سے جب لیتے ہیں تو پورے پیمانے سے لیتے ہیں اور جب خود اپنی چیز دیتے ہیں تو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں اور کم تولتے ہیں۔"

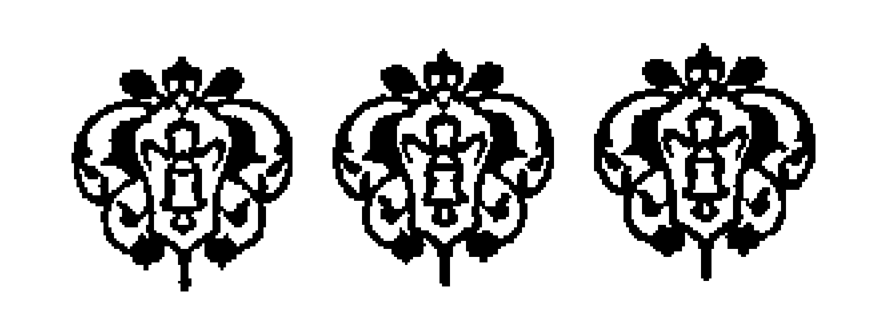
پس ﴿ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ﴾ (ھود: ۸۵) کہہ کر اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ ناپ تول میں انصاف صرف اشیاء کی خرید و فروخت ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ انسانی کردار کا یہ کمال ہونا چاہیے کہ خدا اور اس کے بندوں کے تمام حقوق و فرائض میں ایک اصل کو بنیاد کار بنائے اور کسی موقع اور کسی حالت میں بھی عدل و انصاف کی ترازو کو ہاتھ سے نہ دے اور خرید و

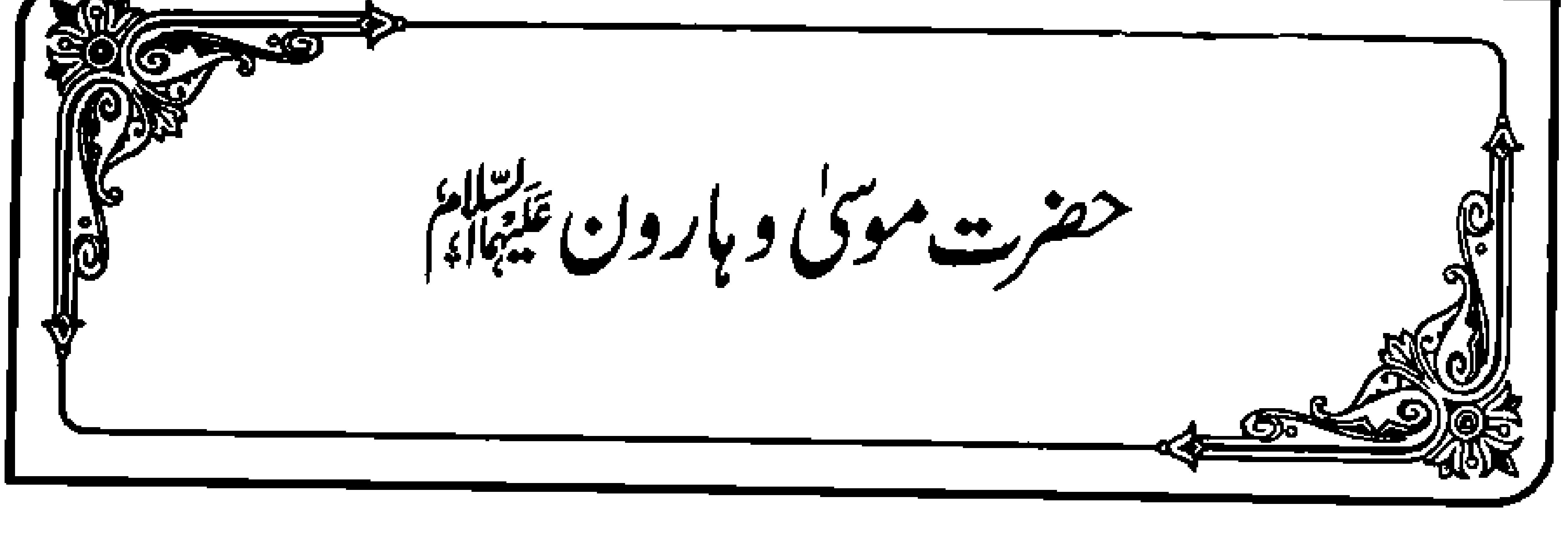
فروخت کے درمیان ناپ تول میں کمی نہ کرنا اور انصاف کو برقرار رکھنا گویا ایک کسوٹی ہے کہ جو انسانی زندگی کے معمولی لین دین میں عدل وانصاف نہیں برتتا اس سے کیا توقع ہوسکتی ہے کہ وہ اہم معاملات دینی و دنیوی میں عدل وقسط کو کام میں لائے گا؟

④ اصلاح حال کے بعد خدا کی زمین میں فساد پیدا کرنے سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں ہے۔ اس لیے کہ ظلم، کبر، قتل اور عصمت ریزی جیسے بڑے بڑے جرائم کی بنیاد اور اصل یہی رذیلہ ہے۔

⑤ باطل کی ایک بڑی شناخت یہ ہے کہ نہ وہ اپنے لیے دلائل کی روشنی رکھتا ہے اور نہ روشن دلائل کو برداشت کرتا ہے بلکہ جب اس کے سامنے روشنی آتی ہے تو وہ منہ پھیر لیتا ہے، اور آنکھیں بند کر لیتا ہے اور اس کی موجودگی کو برداشت نہ کرتے ہوئے دلائل کا جواب غصہ، دھمکی اور قتل سے دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے، تم انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیروان حق کی زندگی اور پھر ان کے مقابل اور مخالف باطل پرستوں کی زندگی کا موازنہ کرو اور تاریخ کے اوراق سے واضح شہادت لو تو تم کو قدم قدم پر یہ حقیقت آشکارا اور روشن نظر آئے گی کہ انبیاء علیہم السلام روشن دلائل دے رہے ہیں، آیات اللہ اور خدا کی نشانیاں دکھا رہے ہیں، محبت اور رحم کے جذبات کا اظہار کر رہے ہیں اور اپنی دعوت وتبلیغ پر مخاطبین پر مالی دباؤ نہ ڈالنے کا اطمینان دلا رہے ہیں مگر ان تمام باتوں کے باوجود دوسری جانب سے ان کو کہا جا رہا ہے کہ ہم تمہارا دیس نکالا کر دیں گے، ہم تم کو سنگسار کر دیں گے، ہم تم کو قتل کر دیں گے، اور اگر خدا کے پیغمبر آخری طور پر یہ کہتے ہیں کہ اگر تم ہماری آواز پر لبیک نہیں کہتے تو کم از کم ہمارے وجود کو برداشت کرو اور اتنا تو صبر کرو کہ خدا تمہارے اور ہمارے درمیان حق و باطل کا خود ہی فیصلہ کر دے تو دوسری جانب سے اس کے جواب میں بھی انکار، تمسخر اور یہ مطالبہ پیش ہوتا ہے کہ بس اب اپنی نصیحت ختم کرو اور اگر سچے ہو تو جس عذاب سے ڈراتے ہو وہ ابھی لے آؤ، ورنہ تو ہم ہمیشہ کے لیے تمہارا اور تمہارے مشن کا خاتمہ کر دیں گے۔

⑥ حق و باطل کا یہی وہ آخری مرحلہ ہے جس کے بعد خدائے تعالیٰ کا وہ قانون جس کو "قانون پاداشِ عمل" کہا جاتا ہے، ایسی سرکش اور متکبر قوموں کے لیے دنیا ہی میں نافذ ہو جاتا ہے اور ان کو ہلاک و تباہ کر کے آنے والی نسلوں اور قوموں کے لیے سامان عبرت وموعظت مہیا کر دیتا ہے۔





حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام

○ بنی اسرائیل مصر میں ○ موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا ذکر قرآن میں ○ نسب و ولادت موسیٰ علیہ السلام ○ ارض مدین اور موسیٰ علیہ السلام کا مصر سے خروج ○ وادی مقدس و بعثت موسیٰ علیہ السلام ○ واپسی مصر اور فرعون کو دعوت اسلام ○ آیات اللہ اور فرعون کا انکار ○ قتل موسیٰ علیہ السلام کا مشورہ ○ بنی اسرائیل کی ہجرت اور فرعون کی مزاحمت ○ نجات بنی اسرائیل و غرق فرعون ○ عبور قلزم کے بعد بنی اسرائیل کا پہلا مطالبہ ○ قومی پستی کا مظاہرہ ○ دیگر مطالبات اور آیات بینات کا ظہور ○ موسیٰ علیہ السلام کا طور پر اعتکاف ○ نزول تورات ○ گوسالہ پرستی کا واقعہ ○ سامری؟ ستر سرداروں کا انتخاب ○ حیات بعد الموت ○ بنی اسرائیل اور جبل طور ○ ارض مقدس اور بنی اسرائیل ○ ذبح بقرہ کا واقعہ ○ موسیٰ علیہ السلام اور قارون ○ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ایذاء بنی اسرائیل ○ حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات ○ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام ○ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ○ بنی اسرائیل کا قومی مزاج اور خدا کی جانب سے تذکیر نعمت ○ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ثناء و منقبت قرآن میں ○ ایک لطیف تاریخی نکتہ ○ بصیرتیں اور عبرتیں۔

بنی اسرائیل مصر میں:

قرآن عزیز نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں بنی اسرائیل کا ذکر صرف اسی قدر کیا تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کا خاندان حضرت یوسف علیہ السلام سے ملنے مصر میں آئے مگر اس کے بعد صدیوں بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں پھر ایک مرتبہ قرآن حکیم، بنی اسرائیل کے واقعات تفصیل کے ساتھ سناتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر ہی میں بس گئے تھے اور ان تمام پچھلی صدیوں میں ان کی تاریخ مصر ہی سے وابستہ رہی ہے، تورات کی یہ تفصیلات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں:

"تب فرعون یوسف علیہ السلام سے متکلم ہوا اور کہا کہ تیرے باپ اور تیرا بھائی تیرے پاس آئے ہیں، مصر کی زمین تیرے آگے ہے، اپنے باپ اور اپنے بھائیوں کو اس سرزمین کے ایک مقام میں جو سب سے بہتر ہے بسا، جشن کی زمین میں انہیں رہنے دے، اور اگر تو جانتا ہے کہ بعضے ان کے درمیان چالاک ہیں تو ان کو میری مواشی پر مختار کر [1] اور یوسف (علیہ السلام) نے اپنے باپ اور بھائیوں کو ملک مصر کی ایک بہتر زمین میں جو رعمسیس کی زمین ہے جیسا فرعون نے فرمایا تھا بٹھایا اور انہیں اس کا مالک کیا اور یوسف نے اپنے باپ اور اپنے بھائیوں اور اپنے باپ کے سب گھرانے کی، ان کے لڑکے بالوں کے موافق

[1] پیدائش باب ۴۷ آیات ۵۔۶

روٹی سے پرورش کی۔ ❶

اور اسرائیل نے مصر کی زمین میں جشن کے ملک میں سکونت کی اور وہ وہاں ملکیتیں رکھتے اور وہ بڑھے اور بہت زیادہ ہوئے اور یعقوب علیہ السلام مصر کی زمین میں ستر (۷۰) برس جیا، سو یعقوب علیہ السلام کی ساری عمر ایک سو سینتالیس (۱۴۷) برس کی ہوئی۔ ❷

تورات میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے فرعون سے اپنے باپ اور اہل خاندان کے لیے "ارض جاشان" طلب کی جو فرعون نے بخوشی ان کے سپرد کر دی۔ ❸

مصر کے نقشہ میں یہ جگہ بلبیس کے شمال میں واقع ہے، اس علاقہ کا ایک موجودہ شہر فکوسہ (سفط الحنہ) ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں ہم بتا چکے ہیں کہ شہری آبادی سے دور حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے خاندان کے لیے یہ جگہ غالباً اس لیے منتخب کی تھی کہ یہاں رہ کر ان کے خاندان کی بدویانہ زندگی بحالہ باقی رہے گی اور اس کی وجہ سے مصری بت پرست ان کے ساتھ اختلاط نہ کر سکیں گے، اور ان کی مشرکانہ رسوم اور بداخلاقیاں بنی اسرائیل میں سرایت نہ کر سکیں گی کیونکہ مصری لوگ چرواہوں، کاشتکاروں اور بدوی لوگوں کو کمتر اور نجس سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ اختلاط کو معیوب جانتے تھے۔

تورات میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلا کر وصیت کی کہ مجھ کو سرزمین مصر میں دفن نہ کیا جائے بلکہ باپ دادا کے وطن فلسطین میں میری قبر بنائی جائے، حضرت یوسف علیہ السلام نے باپ کو پورا اطمینان دلایا اور انتقال کے بعد ان کے جسد اطہر کو حنوط (ممی) کر کے تابوت میں رکھا اور فسلطین لے جا کر سپرد خاک کیا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے وفات سے پہلے ساری اولاد کو جمع کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے صاحبزادوں افرائیم اور منسی کو بھی بلایا اور ان سب کو اول دعاء برکت دی اور محبت و شفقت کے ساتھ ان کو نوازا اس کے بعد ان کو نصیحت کی کہ "دیکھو میرے بعد اپنے ایمانیات و اعتقادات کو کہیں خراب نہ کر لینا اور خدا کے اس پاک رشتہ کو جو میں نے اور میرے باپ دادا نے ہمیشہ مضبوط رکھا مشرکانہ رسوم وعوائد سے شکست و ریخت نہ کر دینا۔ ❹

قرآن عزیز نے بھی یعقوب علیہ السلام کی اس مقدس وصیت کا ان معجزانہ جملوں میں ذکر کیا ہے:

﴿ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ ۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ ﴾

(البقرہ:۱۳۳)

"(اے محمد ﷺ) کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت تھا، جبکہ اس نے اپنی اولاد سے کہا "میرے بعد کس کی پرستش کرو گے (یعنی کون سا دین اختیار کرو گے) تو انہوں نے جواب دیا "ہم اسی ایک خدا کی پرستش کریں گے

---

❶ پیدائش باب ۴۷ آیات ۱۱۔۱۲ ❷ پیدائش باب ۴۷ آیات ۲۷۔۲۸

❸ پیدائش باب ۴۷ آیات ۳۰۔۳۱ ❹ پیدائش باب ۴۷ آیات ۳۰۔۳۱

جو تیرا اور تیرے باپ دادا ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق (علیہم السلام) کا خدا ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں اور ہم تو اسی کے فرمانبردار ہیں۔"

تورات نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کی وفات کے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ان کی عمر اور ان کی نسل کا بھی ذکر حسب ذیل عبارت میں کیا ہے:

"اور یوسف (علیہ السلام) اور اس کے باپ کے گھرانے نے مصر میں سکونت کی اور یوسف (علیہ السلام) ایک سو دس (۱۱۰) برس جیا، اور یوسف (علیہ السلام) نے افرائیم کے لڑکے جو تیسری پشت میں تھے دیکھے اور منسی کے بیٹے مکیر کے بیٹے بھی یوسف (علیہ السلام) کے گھٹنوں پر پالے گئے، اور یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا میں مرتا ہوں اور خدا یقیناً تم کو یاد کرے گا اور تم کو اس زمین سے باہر اس زمین میں جس کی بابت اس نے ابراہام، اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) سے قسم کی ہے لے جائے گا اور یوسف نے بنی اسرائیل سے قسم لے کر کہا خدا یقیناً تم کو یاد کرے گا اور تم میری ہڈیوں کو یہاں سے لے جائیو، سو یوسف (علیہ السلام) ایک سو دس برس (۱۱۰) برس کا بوڑھا ہو کے مر گیا اور انہوں نے اس میں خوشبو بھری اور اسے مصر میں صندوق میں رکھا۔" [1]

اور موسیٰ (علیہ السلام) نے یوسف کی ہڈیاں ساتھ لیں کیونکہ اس نے بنی اسرائیل کو تاکیداً قسم دے کے کہا تھا کہ خدا یقیناً تمہاری خبر گیری کرے گا، تم یہاں سے میری ہڈیاں ساتھ لے جائیو۔ [2]

چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کی وصیت کے مطابق ان کی اولاد نے ان کے جسم مبارک کو بھی حنوط (ممی) کر کے تابوت میں محفوظ کر دیا، اور جب موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل مصر سے ہجرت کر کے چلے ہیں تو یوسف (علیہ السلام) کی وصیت کو پورا کرنے کے لیے ان کا تابوت بھی ساتھ لے گئے اور نبیوں کی سرزمین میں لا کر دفن کر دیا، یہ مقام کونسا ہے؟ اس کے متعلق اہل جبرون یہ کہتے ہیں کہ وہ جبرون میں مدفون ہیں اور حرم خلیلی میں مکفیلہ کے قریب ایک محفوظ تابوت کے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہی تابوت یوسف علیہ السلام ہے۔ لیکن عبدالوہاب مصری اس کو وہم بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت فاضل محمد نمر حسن نابلسی اور نابلس کے سرکردہ عالم حضرت فاضل امین بک عبدالہادی نے بیان کیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی ضریح مبارک نابلس میں ہے اور یہی صحیح ہے، اس لیے کہ توریت کہتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ارض فرائیم میں دفن ہوئے اور نابلس ارض فرائیم ہی میں ہے اور اس کو قدیم زمانہ میں شکیم کہتے تھے۔ [3]

بہر حال ان تفصیلات سے یہ واضح ہو گیا کہ بنی اسرائیل حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیانی صدیوں میں مصر میں آباد رہے۔

فرعون موسیٰ:

گذشتہ واقعات میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ "فرعون" شاہان مصر کا لقب ہے، کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں ہے، تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہو کر عہد سکندر تک فراعنہ کے اکتیس خاندان مصر پر حکمران رہے ہیں، سب سے آخری خاندان فارس کی شہنشاہی

---

[1] پیدائش باب ۵۰ آیات ۲۲-۲۶ [2] خروج باب ۱۳ آیت ۱۹ [3] قصص الانبیاء ص ۱۸۷

جو ۳۳۲ قبل از مسیح سکندر کے ہاتھوں مفتوح ہوگیا، ان میں سے حضرت یوسف علیہ السلام کا فرعون (ہیکسوس) (عمالقہ) کے خاندان سے تھا جو دراصل عرب خاندانوں ہی کی ایک شاخ تھی تو اب سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد کا فرعون کون ہے اور کس خاندان سے متعلق ہے؟

عام مؤرخین عرب اور مفسرین اس کو بھی "عمالقہ" ہی کے خاندان کا فرد بتاتے ہیں، اور کوئی اس کا نام ولید بن مصعب بن ریان بتاتا اور کوئی مصعب بن ریان کہتا ہے اور ان میں سے ارباب تحقیق کی رائے یہ ہے کہ اس کا نام ریان یا ریان ابا تھا، ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کی کنیت ابومرہ تھی۔

یہ سب اقوال قدیم مؤرخین کی تحقیقی روایات پر مبنی تھے مگر اب جدید مصری اثری تحقیقات اور حجری کتبات کے پیش نظر اس سلسلہ میں دوسری رائے سامنے آئی ہے، وہ یہ کہ موسیٰ کے زمانہ کا فرعون رعمسیس ثانی کا بیٹا منفتاح ہے جس کا دور حکومت ۱۲۹۲ ق م سے شروع ہوکر ۱۲۲۵ ق م پر ختم ہوتا ہے۔

اس تحقیقی روایت کے متعلق احمد یوسف احمد آفندی نے ایک مستقل مضمون لکھا ہے، یہ مصری دارالاثار کے مصور ہیں اور اثری وحجری تحقیق کے بہت بڑے عالم ہیں، ان کے اس مضمون کا خلاصہ نجار نے قصص الانبیاء میں نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے۔

"یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ یوسف علیہ السلام جب مصر میں داخل ہوئے ہیں تو یہ فراعنہ کے سولہویں خاندان کا زمانہ تھا اور اس فرعون کا نام "ابابی الاول" تھا، میں نے اس کی شہادت اس حجری کتبہ سے حاصل کی جو عزیز مصر "فوتی فارع" (فوطیفار) کے مقبرہ میں پایا گیا، اور سترھویں خاندان کے بعض آثار سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اس خاندان سے قبل مگر قریب ہی زمانہ میں مصر میں ہولناک قحط پڑ چکا تھا، لہٰذا ان تعینات کے بعد آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا داخلہ مصر "ابابی الاول" کے زمانے میں تقریباً ۱۶۰۰ ق م ہوا ہے، اور حضرت یوسف علیہ السلام کا عزیز مصر کے یہاں رہنا اور پھر قید خانہ کی زندگی بسر کرنا ان دونوں کی مدت کا اندازہ کر کے کہا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل حضرت یوسف علیہ السلام سے تقریباً ستائیس سال بعد مصر میں اس نشان سے داخل ہوئے جس کا ذکر قرآن حکیم اور تورات میں کیا گیا ہم اگرچہ فراعنہ مصر کی حکومت اور شاہی خاندانوں کے متعلق اچھی طرح آگاہی پا چکے ہیں اور مصری آثار نے اس میں ہم کو کافی مدد دی ہے مگر ابھی تک ان اثریات میں وہ تفصیلی تصریحات دستیاب نہیں ہوئیں جو فرعون اور بنی اسرائیل کی عداوت، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور غرق فرعون ونجات بنی اسرائیل سے متعلق ہیں، تورات میں مذکور ہے کہ جس فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ عداوت کا معاملہ کیا اور ان کو سخت مصائب میں مبتلا رکھا، اس نے بنی اسرائیل سے دو شہروں رعمسیس اور فیثوم کی تعمیر کی خدمت بھی لی اور ان کو مزدور بنایا، تو اثری حضریات (پرانے آثار کی کھدائی) میں ان دو شہروں کا پتہ تو لگ چکا ہے، ایک کے کتبہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس کا نام "بر۔توم" یا "فیثوم" ہے اس کا ترجمہ ہے "خدائے توم کا گھر" اور دوسرے کا نام "برر عمسیس" ہے جس کا ترجمہ "قصر رعمسیس" ہوتا ہے۔

اور شرقی جانب میں جو مقام اب "تل مسخوطہ" کے نام سے مشہور ہے یہیں "فیثوم" کی آبادی تھی، اور جس جگہ اب قنتیر یا قدیم مصری زبان کے اعتبار سے خعت نفر واقع ہے اس مقام پر رعمسیس آباد تھا، اس کو رعمسیس ثانی نے اس لیے آباد کیا تھا کہ یہ مصر کی

بحری جانب کے سینٹر میں بہترین قلعہ کا کام دے اور فیثوم کی آبادی کا بھی یہی مقصد تھا، اس شہر کی چہار دیواری کے جو کھنڈر معلوم ہوئے ہیں وہ بلاشبہ اس کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ دونوں شہر مصر کے بہترین حفاظتی قلعے تھے نہ کہ تورات کے بیان کے مطابق غلوں کے گودام۔

اس تمام قیل وقال کا مطلب یہ ہے کہ جس فرعون نے بنی اسرائیل کو مصائب میں مبتلا کیا وہ یہی "ریمسیس دوم" ہو سکتا ہے، یہ مصر کے حکمرانوں کا انیسواں خاندان تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور اسی کی آغوش میں پرورش پائی، تاریخ اثریات سے پتہ چلتا ہے کہ "اسیویہ" قبائل جو مصر کے قریب آباد تھے ان کے اور فراعنہ کے اس خاندان کے درمیان پیہم نو سال تک سخت جنگ و پیکار رہی، بدیں وجہ یہ قرین قیاس ہے کہ ریمسیس دوم نے اس خوف سے کہ کہیں بنی اسرائیل کا یہ عظیم الشان قبیلہ جو لاکھوں نفوس پر مشتمل تھا اندرونی بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائے بنی اسرائیل کو ان مصائب میں مبتلا کرنا ضروری سمجھا جن کا ذکر توراۃ اور قرآن حکیم میں کیا گیا ہے۔ ✿

ریمسیس دوم اس زمانہ میں بہت مسن اور معمر ہو چکا تھا، اس لیے اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے بیٹے منفتاح کو شریک حکومت کر لیا ریمسیس کی ڈیڑھ سو اولاد میں سے یہ تیرھواں لڑکا تھا، لہٰذا منفتاح ہی وہ فرعون ہے جس کو حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے اسلام کی دعوت دی اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کیا، اور اسی کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر سے نکلے اور یہی غرق دریا ہوا، چونکہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے گھر میں پرورش پاتے دیکھا تھا اس لیے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو اسلام کا پیغام سنایا تو قرآن عزیز کے ارشاد کے مطابق اس نے یہ طعنہ دیا:

﴿ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّ لَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴾ (الشعراء: ۱۸)

"کیا ہم نے اپنے یہاں تیرے بچپن میں تیری پرورش نہیں کی؟ اور تو اپنی عمر کے چند سال ہم میں بسر کر چکا ہے۔"

تورات میں ہے کہ خروج سے پہلے مصر کے بادشاہ کا انتقال ہو گیا، اس سے مراد وہی ریمسیس دوم ہے جو منفتاح کا باپ تھا۔

علامہ فلانڈرس نے ایک حجری کتبہ دریافت کیا ہے جس پر سیاہ حروف کندہ ہیں اور وہ ۵۹۹ مصری میں لکھا گیا ہے، یہ دراصل ایک بہت بڑی چٹان ہے جس کی بلندی ۳ میٹر ✿ اور ۱۴ سم ✿ ہے، یہ "کتبہ" دو وجہ سے معرض تحریر میں آیا تھا، ایک یہ کہ ان تمام تفصیلات کو بیان کیا جائے جو اٹھارھویں خاندان کے بادشاہ امنحتب نے "معبد امون" کی خدمات کے متعلق انجام دی تھیں، اور دوسرے یہ کہ انیسویں خاندان کے بادشاہ "منفتاح" بن ریمسیس دوم کی تعریف میں کچھ لکھا جائے، اس لیے اس کتبہ کی عبارت شاعرانہ اسلوب پر لکھی گئی ہے اور منفتاح نے یوسین پر جو فتح حاصل کی تھی اس کا بڑے فخر و مباہات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اور عسقلان جیرز، یانوعیم جو فلسطین کے علاقہ کے مشہور شہر تھے ان کے سقوط کی جانب اشارات کئے گئے ہیں، اسی کے ضمن میں بنی

✿ تورات سے بھی اس قیاس کی تائید ہوتی ہے، اس سے کہا گیا ہے "اور اس نے اپنے لوگوں سے کہا دیکھو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہیں، آؤ ہم ان سے دانشمندانہ معاہدہ کریں تاکہ یہ نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہوں اور جنگ پڑے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل جائیں اور ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں۔ (خروج باب ۱ آیت ۱۰-۱۱)

✿ ۱ میٹر = ۱.۰۹۳ گز ✿ سم (سینٹی میٹر) میٹر ۱۱۰ / ۱ حصہ

اسرائیل کے متعلق بھی مختصر عبارت میں اظہار خیال کیا گیا اور یہ سب سے پہلا اثری نقش اور حضریات مصری کا پہلا کتبہ ہے جس میں بنی اسرائیل کا صراحت کے ساتھ ذکر موجود ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

لقد سحق بنو اسرائیل و لم یبق لھم بذر.

بنی اسرائیل تمام ہلاک ہو گئے اور اب ان کی نسل کا خاتمہ ہو گیا۔"

ایک باریک بین اس عبارت کو دیکھ کر بآسانی یہ علم حاصل کر سکتا ہے کہ یہ تحریر منفتاح کے زمانے میں نہیں لکھی گئی ورنہ تو مصری دستور کے مطابق بنی اسرائیل جیسے عظیم الشان قبیلہ کی ہلاکت کے واقعہ کو اس معمولی اور مختصر الفاظ میں درج نہ کیا جاتا، بلکہ منفتاح کی شان میں بڑے زبردست قصیدہ کے ساتھ اس دشمن پر کامیابی کا اظہار کیا جاتا، اور جن واقعات پر اس کتبہ میں اشارہ کیا گیا ہے ان کی اہمیت اور عظمت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ یونہی ضمنی طور پر اور وہ بھی سابق بادشاہ کے حالات سے متعلق کتبہ پر درج نہ کر دیئے جاتے بلکہ ان اہم واقعات کے لیے منفتاح کے زمانہ میں مستقل الگ ایک کتبہ اسی غرض سے تحریر کیا جاتا۔

مگر ایسا کیوں نہ ہوا؟ سو بات بہت واضح ہے وہ یہ کہ مصری کاہنوں کو اس واقعہ ہائلہ کی ہرگز توقع نہ تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ یعنی غرض فرعون کی شکل میں ظاہر ہوا اور وہ منفتاح کی موت کے لیے ایک عجلت کے متوقع نہ تھے، اس زمانہ کی عمر طبعی کے لحاظ سے ابھی کافی زمانہ تھا کہ منفتاح کے کاہن، مصری دستور کے مطابق اس انیسویں خاندان کے بادشاہ کے ان حالات کو مرتب کر کے لوح پر محفوظ کر دیں تاکہ وہ بادشاہ کے مقبرہ پر کندہ ہو سکے، اب جبکہ یہ واقعہ ہائلہ پیش آ گیا تو اصل حقیقت کو چھپانے کی سعی کی گئی تاکہ آئندہ قبطی نسلیں اس ذلت و رسوائی کو معلوم نہ کر سکیں جو ان کے واجب الاحترام دینی عقائد پر خدا کی طرف سے سخت ضرب کا باعث بن چکی تھی۔ پس انہوں نے بیجا جسارت اور تاریخی بددیانتی کے ساتھ حالات کو منقلب کر کے معاملہ کو بالکل مخالف شکل میں تحریر کر دیا اور بنی اسرائیل کی کامیاب واپسی وطن کو ان مسطورہ بالا الفاظ میں ظاہر کیا تاکہ غرق فرعون کا قصہ آئندہ مصریوں کے سامنے باقی ہی نہ رہے۔

اس نتیجہ کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مصری دستور کے مطابق ہر ایک بادشاہ کا مقبرہ جدا ہوتا تھا اور اس کے تمام حالات اور خصوصی نمایاں امتیازات کی تاریخ اور اس کے زمانہ کی بعض شاہی اشیاء اور جواہرات اس کی قبر کے ساتھ ہی محفوظ کر کے رکھے جاتے تھے۔ لیکن منفتاح کی اس شان کے باوجود جس کا مذکورہ بالا کتبہ میں اشارہ کیا گیا ہے نہ اس کا علیحدہ مقبرہ بنایا گیا اور نہ وہ تمام رسوم انجام پا سکیں جو ہمیشہ بادشاہوں کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھیں، بلکہ اس کو عجلت کے ساتھ امنتحب کے مقبرہ ہی میں دفن کر دیا گیا اور اٹھارویں خاندان کے بادشاہ اور انیسویں خاندان کے بادشاہ کی نعشیں ایک ہی جگہ جمع کر دی گئیں۔ [1]

مصری عجائب خانہ میں یہ نعش آج بھی محفوظ ہے اور قرآن عزیز کے اس کلام بلاغت نظام کی تصدیق کر رہی ہے:۔

﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً﴾ (یونس: ۹۲)

"پس آج کے دن ہم تیرے جسم کو (دریا سے) نجات دیں گے تاکہ وہ تیرے بعد آنے والوں کے لیے (خدا کا) نشان رہے۔"

---

[1] قصص الانبیاء نجار ص ۲۳۹، ۲۴۱

اور محمد احمد عدوی کتاب "دعوۃ الرسل الی اللہ" میں لکھتے ہیں کہ اس نعش کی ناک کے سامنے کا حصہ ندارد ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی حیوان کا کھایا ہوا ہے غالباً دریائی مچھلی نے خراب کیا ہے اور پھر اس کی نعش خدائی فیصلہ کے مطابق کنارہ پر پھینک دی گئی۔ ❁

ان نقول کے لیے کسی شرح کی ضرورت نہیں ہے، البتہ یہ یورپ کے ان مقلدین کے لیے ضرور سرمایہ صد عبرت ہیں جو جلد بازی کے ساتھ مستشرقین کی ہر ایک تحقیق پر بغیر کسی پس و پیش کے ﴿اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا﴾ کہہ دینے کے عادی ہیں، جو قرآن اور خدا کے نبی کے احکام پر شک کر سکتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں مگر یورپین مؤرخین اور مستشرقین کی تحقیقات علمی کو وحی الٰہی سے زیادہ سمجھتے ہیں، جو اپنے علماء اسلام کی تقلید کو حرام جانتے مگر علماء یورپ کے ہر نوشتہ کو نوشتہ الٰہی یقین کرتے ہیں۔

چنانچہ یورپ کے مؤرخین جدید نے یہ دعویٰ کیا کہ حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ علیہما السلام اور فراعنہ مصر کے درمیان جو واقعات، تورات و قرآن عزیز سے ثابت ہوتے ہیں وہ تاریخی معیار پر اس لیے غلط اور بے اصل ہیں کہ مصری حضریات و اثریات میں ان اہم اور عظیم الشان حالات و واقعات کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا، حالانکہ یہ مسلم ہے کہ مصری اپنی تاریخ کی تدوین میں بہت زیادہ چست و چالاک اور سب سے پیش پیش ثابت ہوئے ہیں اور آج ان کے اس طرز عمل کی بدولت تین ہزار سال قبل مسیح کے حالات کی صحیح تاریخ مرتب ہو سکی ہے۔

تو اس دعویٰ کی کورانہ تقلید میں ہندوستان کے بعض یورپ زدہ مسلمانوں نے بھی ان واقعات کی صحت سے انکار کر دیا اور خدا کی سچی وحی سے اعراض کرتے ہوئے ان تخمینی قیاسات کو یقینی اور الہامی نوشتہ کی حیثیت دی، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

لیکن آج جبکہ مصری حضریات و اثریات میں صراحت کے ساتھ اس زمانہ کے فرعون اور بنی اسرائیل کی عداوت کا حال روشنی میں آ چکا ہے اور مسطورۂ بالا ترتیبی واقعات خود بخود ان حقائق کو سامنے لے آتے ہیں جن کا ذکر قرآن عزیز میں موجود ہے، تو اب نہ معلوم جلد بازی سے انکار کرنے والے ان مدعیان علم کی علمی روش کیا صورت اختیار کرے گی؟ اپنی نادانی اور کورانہ تقلید کی پردہ دری کے خوف سے انکار پر اصرار یا حقیقت کے اقرار کے ساتھ ساتھ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی راہ یقین (وحی الٰہی) کے سامنے اظہار ندامت و تاسف؟

بہر حال وہ اپنا معاملہ جو کچھ بھی رکھیں یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اذعان اور یقین کی جو راہ وحی الٰہی یعنی قرآن عزیز کے ذریعہ حاصل ہو چکی ہے اس کو ذرہ برابر اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور استقراء و قیاس سے حاصل شدہ علم اس وقت تک برابر گردش میں رہے گا جب تک قرآنی صداقت پر آ کر نہ ٹھہر جائے۔

فرعون کا خواب:

تورات اور مؤرخین کہتے ہیں کہ فرعون کو بنی اسرائیل کے ساتھ اس لیے عداوت ہو گئی تھی کہ اس زمانہ کے کاہنوں، نجومیوں اور قیافہ شناسوں نے اس کو بتایا تھا کہ تیری حکومت کا زوال ایک اسرائیلی لڑکے کے ہاتھ سے ہوگا اور بعض تاریخی روایات میں ہے کہ فرعون نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر دربار کے منجموں اور کاہنوں نے وہی دی تھی جس کا ذکر ابھی گذر چکا ہے، مفسرین

❁ دعوۃ الرسل الی اللہ ص ۱۸۱

نے بھی انہی روایات کو کتب تفسیر میں نقل فرمایا ہے، تورات میں یہ اور اضافہ ہے کہ فرعون نے "دایہ" مقرر کر دی تھیں کہ قلمرو مصر میں جس اسرائیلی کے یہاں لڑکا پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے مگر ان عورتوں کے دلوں میں ایسی ہمدردی پیدا ہوئی کہ انہوں نے اس عمل کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا اور جب فرعون نے باز پرس کی تو یہ معذرت پیش کی کہ اسرائیلی عورتیں شہری عورتوں کی طرح نازک اندام نہیں ہیں، وہ خود ہی بچہ جن لیتی ہیں اور ہم کو مطلق خبر نہیں دیتیں، اس پر فرعون نے ایک جماعت کو اس لیے مقرر کیا کہ وہ تفتیش اور تلاش کے ساتھ اسرائیلی لڑکوں کو قتل کر دیں اور لڑکیوں کو چھوڑ دیا کریں۔ [1]

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا ذکر قرآن میں:

قرآن عزیز میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر بے شمار مقامات میں آیا ہے، چونکہ ان کے بیشتر حالات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک حالات سے بہت زیادہ مطابقت رکھتے ہیں، اور ان واقعات میں غلامی اور آزادی کے باہم معرکہ آرائی اور حق و باطل کے مقابلہ کی بے نظیر داستان ودیعت ہے، نیز ان کے اندر بصائر و مواعظ کا نادر ذخیرہ جمع ہے، اس لیے قرآن عزیز نے حسب ضرورت اور حسب موقع و محل جگہ جگہ اس قصہ کے اجزاء کو مجمل اور مفصل طریقہ پر بیان کیا ہے۔

مندرجہ ذیل نقشہ سے "اعداد و شمار کے ساتھ ساتھ" اس واقعہ کی اہمیت کا بھی صحیح اندازہ ہو سکے گا اور اس اولوالعزم پیغمبر کی عظمت و شان کا بھی۔

اس نقشہ کے دو (۲) حصے ہیں پہلے حصے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام یا بنی اسرائیل اور فرعون کے واقعات کن کن سورتوں اور کتنی آیات میں مذکور ہیں، اور دوسرا حصہ یہ واضح کرتا ہے کہ قرآن عزیز میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے نامہائے مبارک کتنی جگہ مذکور ہیں اور ان کی مجموعی تعداد کیا ہے؟

نقشہ (۱)

نام سورۃ	آیات	شمار
بقرہ	۴۷ تا ۶۱، ۶۳ تا ۷۵، ۸۳ تا ۸۷، ۹۲ تا ۹۳، ۱۰۸، ۱۲۶ تا ۲۴۳، ۲۵۱	۶۵
نساء	۱۵۳ تا ۱۵۶، ۱۶۴	۱۲
مائدہ	۱۲، ۱۳، ۲۰ تا ۲۵، ۳۲، ۴۵، ۷۰، ۷۱، ۷۸، ۷۹	۳۷
انعام	۸۴ تا ۹۰، ۱۴۶، ۱۵۴، ۱۸۹	۲۱
اعراف	۱۰۳ تا ۱۵۷، ۱۵۹ تا ۱۷۱	۶۸
انفال	۵۴	۱
یونس	۷۴ تا ۹۳	۲۰
ھود	۹۶ تا ۹۹، ۱۱۰	۵

[1] خروج باب ۱ آیات ۱۵۔۲۲

نام سورۃ	آیات	شمار
ابراہیم	۵، ۶، ۸	۳
نحل	۱۲۴	۱
بنی اسرائیل	۲ تا ۸، ۱۰۱ تا ۱۰۴	۱۱
کہف	۶۰	۲۳
مریم	۵۱ تا ۵۳	۳
طٰہٰ	۹۰ تا ۹۸	۹
انبیاء	۴۸، ۴۹	۲
مومنون	۴۵ تا ۴۹	۵
فرقان	۳۵ تا ۳۶	۲
شعراء	۱۰ تا ۶۶	۵۷
نمل	۷ تا ۱۴	۸
قصص	۳ تا ۴۸	۴۶
عنکبوت	۳۹، ۴۰	۲
سجدہ	۲۳، ۲۴	۲
احزاب	۲۹	۱
الصافات	۱۱۴ تا ۱۲۲	۹
مومن	۲۳ تا ۴۵	۲۳
زخرف	۳۶ تا ۵۶	۲۱
دخان	۱۷ تا ۳۳	۱۷
جاثیہ	۱۶، ۱۷	۲
الذاریات	۳۸، ۴۰	۳
قمر	۴۱ تا ۵۵	۱۵
صف	۵	۱
جمعہ	۵، ۶	۲
تحریم	۱۱	۱

الحاقہ	۹، ۱۰	۲
مزمل	۱۵، ۱۶	۲
النازعات	۱۵ تا ۲۵	۱۱
فجر	۱۰ تا ۱۳	۴
	میزان	۵۱۴

نقشہ (۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام

نام سورۃ	شمار
بقرہ	۱۳
نساء	۳
مائدہ	۳
انعام	۳
اعراف	۲۱
یونس	۸
ہود	۳
ابراہیم	۳
بنی اسرائیل	۳
کہف	۲
مریم	۱
طٰہٰ	۱۷
انبیاء	۱
مومنون	۲
فرقان	۱
شعراء	۸
نمل	۳
قصص	۱۸

حضرت ہارون علیہ السلام

نام سورۃ	شمار
بقرہ	۱
نساء	۱
انعام	۱
اعراف	۲
یونس	۱
یونس	۱
یونس	۱
یونس	۱
یونس	۱
یونس	۲
طٰہٰ	۴
انبیاء	۱
مومنون	۱
فرقان	۱
شعراء	۲
شعراء	۲
قصص	۱

سورۃ	تعداد
سجدہ	۱
احزاب	۲
الصافات	۲
مومن	۴
زخرف	۱
الذاریات	۱
صافات	۱
النازعات	۱
میزان	۱۲۶

سورۃ	تعداد
قصص	۱
قصص	۱
قصص	۲
قصص	۲
قصص	۲
قصص	۲
قصص	۲
قصص	۲
میزان	۲۰

نسب وولادت:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسب چند واسطوں سے حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچتا ہے، ان کے والد کا نام عمران اور والدہ کا نا[م] یوکابدتھا، باپ کا سلسلہ نسب یہ ہے: عمران بن قامت بن الاوی بن یعقوب (علیہ السلام) اور حضرت ہارون (علیہ السلام) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے حقیقی اور بڑے بھائی تھے۔

عمران کے گھر میں موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ایسے زمانہ میں ہوئی جبکہ فرعون اسرائیلی لڑکوں کے قتل کا فیصلہ کر چکا تھا اس لیے ان کی والدہ اور اہل خاندان ان کی ولادت کے وقت سخت پریشان تھے کہ کس طرح بچہ کو قاتلوں کی نگاہ سے محفوظ رکھیں؟ بہرحال جوں توں کر کے تین مہینہ تک ان کو ہر ایک کی نگاہ سے اوجھل رکھا اور ان کی پیدائش کی مطلق کسی کو خبر نہ ہونے دی، لیکن جاسوسوں کی دیکھ بھال اور حالات کی نزاکت کی وجہ سے زیادہ دیر تک اس واقعہ کے پوشیدہ رہنے کی توقع نہ ہو سکی اور اس لیے ان کی والدہ سخت پریشان رہنے لگی۔

اس سخت اور نازک وقت میں آخر خدائے قدوس نے مدد کی اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں یہ القاء کیا کہ ایک تابوت کی طرح کا صندوق بناؤ جس پر رال اور روغن کی پالش کرو تا کہ پانی اندر اثر نہ کر سکے اور اس میں اس بچہ کو محفوظ رکھ دو اور پھر اس صندوق کو نیل کے بہاؤ پر چھوڑ دو۔ [1]

موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ایسا ہی کیا، اور ساتھ ہی اپنی بڑی لڑکی اور موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیر کو مامور کیا کہ وہ اس صندوق کے ساتھ ساتھ کنارے کنارے چل کر صندوق کو نگاہ میں رکھے اور دیکھے کہ خدا اس کی حفاظت کا وعدہ کس طرح پورا کرتا ہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو خدائے تعالیٰ نے یہ بشارت پہلے ہی سنا دی تھی کہ ہم اس بچہ کو تیری ہی جانب واپس کر دیں گے اور یہ ہمارا پیغمبر اور رسول ہوگا۔

[1] خروج ۲ آیت ۲۰

فرعون کے گھر میں تربیت:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیر برابر صندوق کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ کنارے کنارے نگہداشت کرتی جا رہی تھیں کہ انہوں نے دیکھا کہ صندوق تیرتے ہوئے شاہی محل کے کنارے آ لگا اور فرعون کے گھرانے میں سے ایک عورت نے اپنے خادموں کے ذریعے اس کو اٹھوا لیا اور شاہی محل میں لے گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیر یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور حالات کی صحیح تفصیل معلوم کرنے کے لیے شاہی محل کی خادماؤں میں شامل ہوگئی۔

قرآن عزیز نے اس شاہی خاندان کی عورت کو فرعون کی بیوی بتایا ہے اور تورات کے حصہ "خروج" میں اس کو فرعون کی بیٹی کہا ہے مگر مؤرخین اس اختلاف کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے، اور کہتے ہیں کہ یہ ہوسکتا ہے کہ پانی میں بہتے ہوئے صندوق کو فرعون کی بیٹی نے اٹھایا ہو اور پھر بیٹا بنانے کی آرزو، اور فرعون سے اس بچہ کے قتل نہ کرنے اور خود پالنے کی خواہش کا اظہار اور فرعون سے سفارش فرعون کی بیوی (آسیہ) نے کی ہو۔

قرآن کریم کے اسلوب بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو دریا سے نکالنے والے کے متعلق کہا ہے:

﴿فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ﴾ (القصص: ۸)

"اس کو اٹھایا فرعون کے گھر والوں نے"

اور بیٹا بنانے کی آرزو اور اس کے قتل نہ کرنے کی سفارش کرنے والے کے متعلق فرمایا:

﴿وَ قَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ﴾ (القصص: ۸)

"اور فرعون کی بیوی نے کہا"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی منقول ہے۔

بہرحال فرعون کے گھر والوں نے جب صندوق کھولا تو دیکھا کہ ایک حسین اور تندرست بچہ آرام سے لیٹا ہوا انگوٹھا چوس رہا ہے، فرعون کی بیٹی فوراً اس کو محل میں لے گئی، فرعون کی بیوی نے بچہ کو دیکھا تو باغ باغ ہوگئی اور انتہائی محبت سے اس کو پیار کیا، محل کے شاگرد پیشہ میں سے کسی نے کہا کہ یہ تو اسرائیلی معلوم ہوتا ہے اور ہمارے دشمنوں کے خاندان کا بچہ ہے اس کا قتل کر دینا ضروری ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی ہمارے خواب کی تعبیر ثابت ہو؟ اس بات کو سن کر فرعون کو بھی خیال پیدا ہوا، فرعون کی بیوی نے شوہر کے تیور دیکھے تو کہنے لگی کہ ایسے پیارے بچہ کو قتل نہ کرو، کیا عجب کہ یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک بنے، یا ہم اس کو اپنا بیٹا ہی بنا لیں اور ہمارے لیے اس کا وجود نفع بخش ثابت ہو، یعنی اگر یہ وہی اسرائیلی بچہ ثابت ہو جو تیرے خواب کی تعبیر بننے والا ہے تو ہماری محبت اور آغوش تربیت شاید اس کو مضر ہونے کے بجائے مفید ثابت کر دے، مگر فرعون اور اس کے خاندان کو یہ کیا معلوم کہ خدا کی تقدیر ان پر ہنس رہی ہے کہ رب العالمین کی کرشمہ سازی دیکھو کہ تم اپنی نادانی اور بے خبری میں اپنے دشمن کی پرورش پر نگران مقرر کیے گئے ہو۔

غرض اب یہ سوال پیدا ہوا کہ بچہ کے لیے دودھ پلائی مقرر کی جائے مگر خدائے تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ سے کیے گئے

وعدہ کو پورا کرنے کے لیے بچہ کی طبیعت میں یہ بات پیدا کر دی کہ وہ کسی عورت کے پستان کو منہ ہی نہیں لگاتا، شاہی دایہ تھک کر بیٹھ گئی مگر موسیٰ علیہ السلام نے کسی ایک پستان سے بھی دودھ نہ پیا، یہ سارا حال موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیر مریم دیکھ رہی تھیں، کہنے لگیں اگر اجازت ہو تو میں ایک ایسی دایہ کا پتہ بتاؤں جو نہایت نیک اور اس خدمت کے لیے بہت موزوں ہے بلکہ حکم ہو تو میں خود اس کو ساتھ لے کر آ ؤں؟ فرعون کی بیوی نے دایہ کو لانے کا حکم دے دیا، اور موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیر خوش خوش گھر کو روانہ ہوئیں کہ والدہ کو لے کر آئیں۔

شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ موضح القرآن میں فرماتے ہیں...... فرعون کی عورت تھی بنی اسرائیل میں سے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چچا کی بیٹی اس لفظ سے وہ پہچان گئی کہ لڑکا ان کا ہے۔ [1]

یہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا ادھر برا حال تھا، ایک الہامی خیال سے بچہ کو سپرد دریا تو کر آئیں مگر ماں کی مامتا نے زور کیا اور بے چین ہو کر اس پر آمادہ ہو گئیں کہ اپنے اس راز کو افشاء کر دیں، اسی اضطراب و بے چینی کی حالت میں خدائے تعالیٰ نے ان پر اپنے فضل و کرم کی بارش کی اور ان کے قلب میں اطمینان و سکون نازل کیا، اب لطیفہ غیبی کے انتظار میں چشم براہ تھیں کہ لڑکی نے آ کر پوری داستان کہہ سنائی اور بتایا کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے کسی دایہ کا بھی دودھ نہ پیا تو میں نے کہا اسرائیلی قبیلہ میں ایک نہایت شریف اور نیک عورت ہے وہ اس بچہ کو اپنی اولاد کی طرح پرورش کر سکتی ہے، فرعون کی بیوی نے یہ سن کر مجھ کو حکم دیا ہے کہ فوراً آپ کو لے کر آؤں، یہ ہم پر خدا کا بڑا احسان اور فضل و کرم ہوا، اب تم چل کر اپنے بچہ کو سینے سے لگاؤ اور آنکھیں ٹھنڈی کرو اور اس کا شکر ادا کرو کہ اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

﴿وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوْسٰۤی اَنْ اَرْضِعِیْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْهِ فَاَلْقِیْهِ فِی الْیَمِّ وَ لَا تَخَافِیْ وَ لَا تَحْزَنِیْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِیَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕیْنَ ۝ وَ قَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَیْنٍ لِّیْ وَ لَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖۗ عَسٰۤی اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝ وَ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰی فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِیْ بِهٖ لَوْ لَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰی قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَ قَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّیْهِ ۟ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝ وَ حَرَّمْنَا عَلَیْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤی اَهْلِ بَیْتٍ یَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَ هُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ۝ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤی اُمِّهٖ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ وَ لِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (القصص: ۷۔۱۳)

"اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ (علیہ السلام) کی ماں کو کہ اس کو دودھ پلاتی رہ پھر جب تجھ کو ڈر ہو اس کا تو ڈال دے اس کو دریا میں اور نہ خطرہ کر اور نہ غمگین ہو، ہم پھر پہنچا دیں گے اس کو تیری طرف اور کریں گے اس کو رسولوں سے، پھر اٹھا لیا اس کو فرعون

---

[1] مفسرین نے فرعون کی اس بیوی کا نام "آسیہ" بتایا ہے اور قرآن عزیز امراۃ فرعون کو مومنہ قرار دیتا ہے، بایں ہمہ یہ قول کہ وہ اسرائیلی تھیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چچازاد بہن ضعیف ہے، صحیح یہ ہے کہ وہ فرعون ہی کے خاندان سے تھیں۔ (روح المعانی جلد ۲۰ ص ۱)۔

کے گھر والوں نے کہ ہوان کا دشمن اور غم میں ڈالنے والا، بیشک فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر تھے چوکنے والے، اور بولی فرعون کی عورت یہ تو آنکھوں کی ٹھنڈک ہے میرے لیے اور تیرے لیے اس کو مت مارو کچھ بعید نہیں جو ہمارے کام آئے یا ہم اس کو بنالیں بیٹا، اور ان کو کچھ خبر نہ تھی اور صبح کو موسیٰ (علیہ السلام) کی ماں کے دل میں قرار نہ رہا۔ قریب تھی کہ ظاہر کر دے بے قراری کو اگر ہم نہ مضبوط کر دیتے اس کے دل کو تا کہ رہے یقین کرنے والوں میں اور کہہ دیا اس کی بہن کو پیچھے چلی جا، پھر دیکھتی رہی اس کو اجنبی ہو کر اور ان کو خبر نہ ہوئی اور روک رکھا تھا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے دائیوں کو پہلے سے، پھر بولی میں بتاؤں تم کو ایک گھر والے کہ اس کو پال دیں تمہارے لیے اور وہ اس کا بھلا چاہنے والے ہیں، پھر ہم نے پہنچا دیا اس کو اس کی ماں کی طرف کہ ٹھنڈی رہے اس کی آنکھ اور غمگین نہ ہو اور جانے کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے پر بہت لوگ نہیں جانتے۔"

﴿ وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ۞ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ۞ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِى التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِى الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّىْ وَ عَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّىْ ۚ وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِىْ ۞ اِذْ تَمْشِىْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَىْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ ؕ﴾ (طٰہٰ: ۳۷۔۴۰)

"اور (تجھے معلوم ہے) ہم تجھ پر پہلے بھی ایک مرتبہ کیسا احسان کر چکے ہیں؟ ہم تجھے بتاتے ہیں، اس وقت کیا ہوا تھا جب ہم نے تیری ماں کے دل میں بات ڈال دی تھی، ہم نے اسے سمجھایا تھا کہ بچہ کو ایک صندوق میں ڈال دے اور صندوق میں ڈال دے اور صندوق کو دریا میں چھوڑ دے، دریا اسے کنارے پر دھکیل دے گا، پھر اسے وہ اٹھا لے گا جو میرا (یعنی میری مسلم قوم کا) دشمن ہے، نیز اس بچہ کا بھی دشمن، اور (اے موسیٰ علیہ السلام) ہم نے اپنے فضل خاص سے تجھ پر محبت کا سایہ ڈال دیا تھا (کہ اجنبی بھی تجھ سے محبت کرنے لگے) اور یہ اس لیے تھا کہ ہم چاہتے تھے تو ہماری نگرانی میں پرورش پائے، تیری بہن جب وہاں سے گذری، تو (یہ ہماری ہی کارفرمائی تھی کہ) اس نے (فرعون کی لڑکی سے) کہا میں تمہیں ایسی عورت بتلا دوں جو اسے پالے پوسے؟ اور اس طرح ہم نے تجھے پھر تیری ماں کی گود میں لوٹا دیا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور (بچہ کی جدائی سے) غمگین نہ ہو۔"

توراۃ میں ہے کہ جب موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ نے موسیٰ علیہ السلام کا دودھ چھڑایا تو انہوں نے ان کو فرعون کی بیٹی کے سپرد کر دیا، اور اس کے بعد عرصہ تک وہ شاہی محل میں زیر تربیت رہے اور وہیں نشوونما پائی، مگر توراۃ کا یہ کہنا واقعہ کے بالکل خلاف ہے کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون کی لڑکی کے بیٹے بنے۔

جب لڑکا بڑھا وہ اسے فرعون کی بیٹی پاس لائی اور وہ اس کا بیٹا ٹھہرا اور اس نے اس کا نام موسیٰ (عبرانی موشی) رکھا اور کہا اس سبب سے کہ میں نے اسے پانی سے نکالا۔ [1]

---

[1] خروج باب ۲ آیت ۱۰

موسیٰ علیہ السلام کا مصر سے نکلنا:

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک عرصہ تک شاہی تربیت میں بسر کرتے کرتے شباب کے دور میں داخل ہوئے تو نہایت قوی الجثہ اور بہادر جوان نکلے، چہرہ سے رعب ٹپکتا اور گفتگو سے ایک خاص وقار اور شان عظمت ظاہر ہوتی تھی، ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اسرائیلی ہیں اور مصری خاندان سے ان کا کوئی رشتہ قرابت نہیں ہے، انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ بنی اسرائیل پر سخت مظالم ہو رہے ہیں اور وہ مصر میں نہایت ذلت اور غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، یہ دیکھ کر ان کا خون کھولنے لگتا اور موقعہ بہ موقعہ عبرانیوں کی حمایت و نصرت میں پیش پیش ہو جاتے۔

طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام جوان ہو گئے اور قوی ہیکل جوان ثابت ہوئے تو عبرانیوں کے معاملات میں ان کی نصرت وحمایت کا یہ اثر ہوا کہ مصری گماشتوں کے مظالم عبرانیوں پر کم ہونے لگے۔ (طبری)

اور اس میں شک نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کی ذلت وغلامی پر غم وغصہ اور ان کی حمایت ونصرت کا عمیق اور بے پناہ جذبہ ایک فطری اور قدرتی جذبہ تھا۔

اب اللہ تعالیٰ کے عطاء ونوال کا ہاتھ اور آگے بڑھا اور جسمانی طاقت وقوت کے ساتھ اس نے ان کو زیور علم وحکمت سے بھی نوازا اور سن رُشد کو پہنچ کر ان کی قوت فیصلہ اور دقت علم ونظر بھی عروج تک پہنچ گئے اور اس طرح ان کو جسمانی وروحانی تربیت کا کمال حاصل ہو گیا۔

﴿وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝﴾ (القصص: ۲۲)

"اور جب (موسیٰ علیہ السلام) پہنچا اپنے زور پر اور سنبھالا تو بخشا ہم نے اس کو (قوت) فیصلہ اور علم اور اس طرح ہم نیکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔"

غرض موسیٰ علیہ السلام شہر میں گشت کرتے ہوئے اکثر ان حالات کا مشاہدہ کرتے رہتے اور گاہے گاہے بنی اسرائیل کی مدد کرتے۔

ایک مرتبہ شہری آبادی سے ایک کنارہ جا رہے تھے کہ دیکھا ایک مصری ایک اسرائیلی کو بیگار کے لیے گھسیٹ رہا ہے، اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تو لگا فریاد کرنے اور مدد چاہنے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصری کی اس جابرانہ حرکت پر سخت غصہ آیا اور اس کو باز رکھنے کی کوشش کی، مگر مصری نہ مانا، موسیٰ علیہ السلام نے غصہ میں آ کر ایک طمانچہ رسید کر دیا، مصری اس ضرب کو برداشت نہ کر سکا اور اسی وقت مر گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھا تو بہت افسوس کیا کیونکہ ان کا ارادہ ہرگز اس کے قتل کا نہ تھا، اور ندامت وشرمندگی کے ساتھ دل میں کہنے لگے کہ بلاشبہ یہ کار شیطان ہے، وہی انسان کو ایسی غلط راہ پر لگاتا ہے، اور خدائے تعالیٰ کی درگاہ میں عرض کرنے لگے کہ یہ جو کچھ ہوا نادانستگی میں ہوا، میں تجھ سے مغفرت کا خواستگار ہوں، خدا نے بھی ان کی غلطی کو معاف کر دیا اور مغفرت کی بشارت سے نوازا۔ ادھر شہر میں مصری کے قتل کی خبر شائع ہو گئی مگر قاتل کا کچھ پتہ نہ چلا، آخر مصریوں نے فرعون کے پاس استغاثہ کیا کہ یہ کام کسی اسرائیلی کا ہے لہٰذا آپ دادرسی فرمائیے، فرعون نے کہا کہ اس طرح ساری قوم سے تو بدلہ نہیں لیا جا سکتا تم قاتل کا پتہ لگاؤ، میں ضرور اس کو کیفر کردار تک پہنچاؤں گا۔

سوء اتفاق کہئے یا حسن اتفاق کہ دوسرے دن بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر کے آخری کنارہ پر سیر فرما رہے تھے کہ دیکھا وہی اسرائیلی ایک قبطی سے جھگڑ رہا ہے اور قبطی غالب ہے، موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر کل کی طرح آج بھی اس نے فریاد کی اور دادرسی کا خواستگار ہوا۔ اس واقعہ کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوہری ناگواری محسوس کی، ایک جانب قبطی کا ظلم تھا اور دوسری جانب اسرائیلی کا شور و غوغا اور گذشتہ واقعہ کی یاد تھی، اس جھنجھلاہٹ میں ایک طرف انہوں نے مصری کو باز رکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور ساتھ ہی اسرائیلی کو بھی جھڑکتے ہوئے فرمایا ﴿اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ﴾ تو بھی بلاشبہ کھلا ہوا گمراہ ہے، یعنی خواہ مخواہ جھگڑا مول لے کر دادفریاد کرتا رہتا ہے۔

اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہاتھ بڑھاتے، اور پھر اپنے متعلق ناگوار اور تلخ الفاظ کہتے سنا تو یہ سمجھا کہ یہ مجھ کو مارنے کے لیے ہاتھ بڑھا رہے ہیں اور مجھ کو گرفت میں لینا چاہتے ہیں، اس لیے شرارت آمیز انداز سے کہنے لگا:

﴿ اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ ﴾ (القصص: ۱۹)

"جس طرح تو نے کل ایک جان (قبطی) کو ہلاک کر دیا تھا اسی طرح آج مجھ کو قتل کر دینا چاہتا ہے۔"

مصری نے جب یہ سنا تو اسی وقت فرعونیوں سے جا کر ساری داستان کہہ سنائی انہوں نے فرعون کو اطلاع دی کہ مصری کا قاتل موسیٰ ہے، فرعون نے یہ سنا تو جلاد کو حکم دیا کہ موسیٰ (علیہ السلام) کو گرفتار کر کے حاضر کرے، مصریوں کے اس مجمع میں ایک معزز مصری وہ بھی تھا جو دل و جان سے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے محبت رکھتا اور اسرائیلی مذہب کو حق جانتا تھا، یہ فرعون ہی کے خاندان کا فرد تھا اور دربار کا حاضر باش، اس نے فرعون کا یہ حکم سنا تو فرعونی جلادوں سے پہلے ہی دربار سے نکل کر دوڑتا ہوا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ان سے سارا قصہ بیان کیا، اور ان کو مشورہ دیا کہ اس وقت مصلحت یہی ہے کہ خود کو مصریوں سے نجات دلایئے اور کسی ایسے مقام میں ہجرت کر جایئے جہاں ان کی دسترس نہ ہو سکے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے مشورہ کو قبول فرمایا اور ارض مدین کی جانب خاموشی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ اس مقام پر یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن عزیز نے اس شخص کے متعلق اس قدر کہا ہے:

﴿ وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ﴾ (القصص: ۲۰)

"اور شہر کے آخری کنارہ سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔"

مگر ہم نے اس کے اوصاف میں "شریف" اور "معزز" کا اضافہ کر دیا تو بقول نجار اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس آنے والے شخص کے متعلق دو صفات بیان کی ہیں۔

① وہ شہر کے آخری کنارے سے آیا تھا، اور عرب میں یہ مثل مشہور ہے کہ:

الاطراف سکنی الاشراف۔ "شہر کے کنارے شرفاء کے رہنے کی جگہ ہیں۔"

② اس نے آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا:

﴿اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ﴾ "بھری جماعت تیرے قتل کا مشورہ کر رہی ہے۔"

اور یہ ظاہر ہے کہ یہ علم اسی شخص کو ہو سکتا ہے جو فرعون اور اس کے ارکان کے درمیان نمایاں حیثیت رکھتا ہو۔ [1]

[1] قصص الانبیاء ص ۱۹۷۔

﴿ وَ دَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۗ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَ هٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۗ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ۝ فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤى اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝ فَلَمَّاۤ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَ مَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝ وَ جَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ؗ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ؗ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾ (القصص : ۱۵۔۲۱)

”اور آیا شہر کے اندر جس وقت بے خبر ہوئے تھے وہاں کے لوگ، پھر پائے اس میں دو مرد لڑتے ہوئے یہ ایک اس کے رفیقوں میں اور یہ دوسرا اس کے دشمنوں میں، پھر فریاد کی اس سے اس نے جو تھا اس کے رفیقوں میں اس کے مقابلہ میں جو تھا اس کے دشمنوں میں پھر مکا مارا اس کو موسیٰ (علیہ السلام) نے پھر، اس کو تمام کر دیا، بولا یہ ہوا شیطان کے کام سے، بیشک وہ دشمن ہے بہکانے والا صریح موسیٰ (علیہ السلام) بولا! اے میرے رب میں نے برا کیا اپنا سو بخش مجھ کو، پھر اس کو بخش دیا بیشک وہی ہے بخشنے والا مہربان، بولا اے رب جیسا تو نے فضل کر دیا مجھ پر پھر میں کبھی نہ ہوں گا مددگار گنہگاروں کا پھر صبح کو اٹھا اس شہر میں ڈرتا ہوا انتظار کرتا ہوں پھر ناگہاں دیکھا جس نے کل مدد مانگی تھی وہ آج پھر فریاد کرتا ہے، اس سے کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے بیشک بے راہ ہے صریح پھر جب چاہا کہ ہاتھ ڈالے اس پر جو دشمن تھا ان دونوں کا، بول اٹھا فریاد کرنے والا ”اے موسیٰ (علیہ السلام) کیا تو چاہتا ہے کہ خون کرے میرا جیسے خون کر چکا ہے کل ایک جان کا، تیرا یہی جی چاہتا ہے کہ زبردستی کرتا پھرے ملک میں اور نہیں چاہتا کہ ہو صلح کرا دینے والا، اور آیا شہر کے پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا، کہا اے موسیٰ (علیہ السلام)! دربار والے مشورہ کرتے ہیں تیرے متعلق کہ تجھ کو مار ڈالیں سو نکل جا، میں تیرا بھلا چاہنے والا ہوں، پھر نکلا وہاں سے ڈرتا ہوا راہ دیکھتا، بولا! اے رب بچا لے مجھ کو اس قوم بے انصاف سے۔“

﴿ وَ قَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۟ ﴾ (طٰہٰ : ۴۰)

”اور تو نے ایک شخص کو مار ڈالا پھر ہم نے تجھ کو غم سے نجات دی اور جانچا تجھ کو معمولی جانچنا۔“

اس مقام پر قرآن عظیم اور تورات کے بیانات میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے:

① قرآن حکیم نے دوسرے دن کے جھگڑا کرنے والوں میں سے ایک کو عبرانی بتایا ہے، اور دوسرے کو مصری (فرعونی) اور تورات دونوں کا عبرانی ہونا ظاہر کرتی ہے۔

② تورات میں اس شخص کا کوئی ذکر نہیں ہے جس نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعونیوں کے مشورہ کی اطلاع دی تھی۔

مگر ان دونوں باتوں کے متعلق (بلالحاظ جانبداری) عقل اور فطرت اسی جانب رہنمائی کرتی ہے کہ قرآن عزیز کی تفصیلات صحیح ہیں، اور اسی پر یقین رکھنا ضروری ہے، اس لیے کہ فرعون اور فرعونیوں کے نزدیک تو اسرائیلیوں کی جان کی کوئی وقعت ہی نہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام جیسے شاہی خاندان میں رہنے والے شخص کے مقابلہ میں قصاص کے طالب ہوتے اور دوسری بات تورات کے بیان پر ایک فطری اضافہ ہے جو علم ویقین کے ساتھ کیا گیا۔

موسیٰ علیہ السلام اور ارض مدین:

حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعات میں "مدین" کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب مصر سے روانہ ہونے کا ارادہ کیا تو اسی جگہ کو منتخب فرمایا، مدین کی آبادی مصر سے آٹھ منزل پر واقع تھی۔ [1] غالباً یہ انتخاب اس لیے کیا گیا کہ یہ قبیلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نزدیک کی قرابت رکھتا تھا اس لیے کہ حضرت موسیٰ، حضرت اسحاق بن ابراہیم (علیہما السلام) کی نسل سے ہیں اور یہ قبیلہ اسحاق علیہ السلام کے بھائی مدین بن ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ فرعون کے خوف سے بھاگے تھے اس لیے ان کے ہمراہ نہ کوئی رفیق اور رہنما تھا اور نہ زادراہ، اور تیز روی کی وجہ سے برہنہ پاؤں تھے، طبری بروایت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں کہ اس تمام سفر میں موسیٰ علیہ السلام کی خوراک درختوں کے پتوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھی، اور برہنہ پاؤں ہونے کی وجہ سے سفر کی طوالت نے پاؤں کے تلووں کی کھال تک اڑا دی تھی، اس پریشان حالی میں موسیٰ علیہ السلام ارض مدین میں داخل ہوئے۔ [2]

ماءِ مدین:

جب مدین کی سرزمین میں قدم رکھا تو دیکھا کہ کنوئیں کے سامنے پانی کے حوض (پیاؤ) پر بھیڑ لگی ہوئی ہے اور جانوروں کو پانی پلایا جا رہا ہے مگر اس جماعت سے ذرا فاصلہ پر دو لڑکیاں کھڑی ہیں اور اپنے جانوروں کو پانی پر جانے سے روک رہی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہاں بھی وہی سب ہو رہا ہے جو دنیا کی ظالم طاقتوں نے اختیار کر رکھا ہے اور خدائے برتر کے بہترین قانون کو توڑ کر قوموں کا سارا نظام ظلم کی بنیادوں پر قائم کر دیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیاں کمزور اور ضعیف گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں تب ہی تو اس انتظار میں ہیں کہ قوی اور سرکش جب اپنے جانوروں کو سیراب کر چکیں اور ہر وارد وصادر پانی پر سے چلا جائے تو بچا کھچا پانی ان کے جانوروں کا حصہ بنے، ہر قوی نے ضعیف کے لیے یہی قانون تجویز کر دیا ہے کہ ہر فائدے میں وہ مقدم ہے اور ضعیف مؤخر، اور قوی کا "اول ش خور" عرب کا مشہور شاعر عمرو بن کلثوم کہتا ہے:

ونشرب ان وردنا الماء صفوا و یشرب غیرنا کدرا وطینا

---

[1] طبری عن سعید بن جبیرؓ ج ۱ ص ۲۰۵ [2] تاریخ طبری ج ۱ ص ۲۰۵

"اور ہم جب کسی پانی پر آتے ہیں تو عمدہ اور صاف پانی ہمارے حصہ میں آتا ہے اور ہمارے غیروں کے (جو ہم سے کمزور ہیں) حصہ میں گدلا پانی اور مٹی ہے۔"

درحقیقت یہ شعر تنہا عمرو بن کلثوم اور اس کے قبیلے کی حالت کا نقشہ نہیں ہے بلکہ ساری دنیا کے ظالمانہ نظام کا ٹھیک ٹھیک آئینہ دار ہے۔

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ حالت نہ دیکھی گئی اور آگے بڑھ کر لڑکیوں سے دریافت کیا "تم کیوں پانی نہیں پلاتیں، پیچھے کس لیے کھڑی ہو؟" دونوں نے جواب دیا ہم مجبور ہیں اگر جانوروں کو آگے لے کر بڑھتے ہیں تو یہ طاقتور زبردستی ہم کو پیچھے ہٹا دیتے ہیں، اور ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں ان میں اب یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ ان کی مزاحمت کو دور کر سکیں پس جب یہ سب پانی پلا کر واپس ہو جائیں گے تب بچا ہوا پانی ہم پلا کر لوٹیں گے یہی ہمارا روز کا دستور ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوش آ گیا اور آگے بڑھ کر تمام بھیڑ کو چیرتے ہوئے کنوئیں پر جا پہنچے اور کنوئیں کا بڑا ڈول اٹھایا اور تنہا کھینچ کر لڑکیوں کے مویشیوں کو پانی پلا دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مجمع کو چیرتے ہوئے درانہ گھسنے لگے تو اگرچہ لوگوں کو ناگوار گذرا مگر ان کی پرجلال صورت اور جسمانی طاقت سے مرعوب ہو گئے اور ڈول کو تنہاء کھینچتے دیکھ کر اسی قوت سے ہار مان گئے جس کے بل بوتے پر کمزوروں اور ناتوانوں کو پیچھے ہٹا دیا کرتے اور ان کی حاجات کو پامال کرتے رہتے تھے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ کنوئیں کے منہ پر بہت بڑا پتھر ڈھکا ہوا ہے جو ایک جماعت کے متفقہ زور لگانے سے اپنی جگہ سے ہٹتا ہے، مگر وہ آگے بڑھے اور تنہا اس کو ہٹا کر لڑکیوں کے مویشیوں کے لیے پانی بھر دیا، عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ یہ قول قرآن حکیم کی تصریح کے خلاف ہے، قرآن کہتا ہے:

﴿ وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ﴾ (القصص: ۲۳)

"اور جب وہ مدین کے پانی پر پہنچے تو اس پر ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ پانی پلا رہی ہے۔"

تو پھر یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ کنوئیں کا منہ پتھر سے ڈھکا ہوا ہو اور جس طرح یہ قول صحیح نہیں اسی طرح یہ تاویل بھی درست نہیں ہے کہ اس مقام پر دو کنوئیں تھے ایک سے مدین کے لوگ پانی پلا رہے تھے اور دوسرے کا منہ پتھر سے ڈھکا ہوا تھا اور یہ کہ اس زمانہ میں بھی اس مقام پر دو کنوئیں موجود پائے گئے ہیں۔

اس تاویل کے درست نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اول تو قرآن حکیم نے دوسرے کنوئیں کا قطعی کوئی ذکر نہیں کیا اور جو کچھ بیان کیا ہے ایک ہی سے متعلق بیان کیا ہے، دوسرے بعد میں اس جگہ دو کنوئیں ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس وقت بھی وہاں اسی طرح دو کنوئیں موجود تھے، ہو سکتا ہے کہ عرصہ دراز کے بعد یا اسلامی عہد میں ضرورت کے لحاظ سے یہاں دوسرا کنواں تیار کیا گیا ہو، پس قرآن حکیم کے صاف اور سادہ بیان کو محض ایک غیر مستند روایت کی خاطر پیچیدہ بنانا قطعی بے محل اور غیر مناسب ہے۔

غرض جب ان لڑکیوں کے گلے نے پانی پی لیا تو وہ گھر کو واپس چلیں، گھر پہنچیں تو خلاف عادت جلد واپسی پر ان کے والد کو سخت تعجب ہوا، دریافت کرنے پر لڑکیوں نے گذرا ہوا ماجرا کہہ سنایا کہ کس طرح ایک "مصری" نے ان کی مدد کی، باپ نے کہا عجلت

سے جاؤ اور اس کو میرے پاس لے کر آؤ۔

یہاں تو باپ بیٹی کے درمیان یہ گفتگو ہو رہی تھی اور ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام پانی پلانے کے بعد قریب ہی ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ کر ستانے لگے، مسافرت و غربت اور پھر بھوک پیاس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی "پروردگار! اس وقت جو بھی بہتر سامان میرے لیے تو اپنی قدرت سے نازل کرے میں اس کا محتاج ہوں"۔

لڑکی تیزی سے وہاں پہنچی تو دیکھا کہ کنوئیں کے قریب ہی وہ بیٹھے ہوئے ہیں شرم و حیاء کے ساتھ نیچی نظریں کیے لڑکی نے کہا: "آپ ہمارے گھر چلیے والد بلاتے ہیں، وہ آپ کے اس احسان کا بدلہ دیں گے" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوچا کہ شاید اس سلسلہ میں کوئی بہتر صورت نکل آئے اس لیے چلنا ہی بہتر ہے اور اس کی دعوت کو رَد کرنا مناسب نہیں، خدا نے میری دعاء سن لی اور یہ اسی کا پیش خیمہ ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اٹھ کھڑے ہوئے اور لڑکی کو ہدایت کی کہ وہ آگے نہ چلے بلکہ میرے پیچھے پیچھے چلے اور ٹھیکری یا اشارے کے ساتھ راہ کی رہنمائی کرے۔

موسیٰ علیہ السلام چل تو پڑے لیکن طبعی اور فطری غیرت اور عزت نفس کے پیش نظر بار بار اس جملہ سے متاثر ہو رہے تھے: "میرا باپ تم کو اس محنت کا عوض دینا چاہتا ہے" مگر مسافرت اور حالات کی نزاکت نے آخر یہی مشورہ دیا کہ اس وقت اس گرانی کو بھی انگیز کر لو تا کہ اس غربت میں ایک غم خوار اور مونس و ہمدم کی مستقل ہمدردی کو حاصل کیا جا سکے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام چلتے چلتے منزل مقصود پر پہنچے اور اس بزرگ صورت و سیرت انسان کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف ملاقات سے بہرہ اندوز ہوئے بزرگ نے پہلے کھانا کھلایا اور پھر اطمینان کے ساتھ بٹھا کر ان کے حالات سنے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عین وعن اپنی ولادت اور فرعون کے بنی اسرائیل پر مظالم سے شروع کر کے آخر تک ساری داستان کہہ سنائی، سب کچھ سننے کے بعد بزرگ نے موسیٰ علیہ السلام کو تسلی دی اور فرمایا کہ خدا کا شکر کرو کہ اب تم کو ظالموں کے پنجہ سے نجات مل گئی، اب کوئی خوف کا مقام نہیں ہے۔

یہاں قوم ظالمین کے ظلم سے بنی اسرائیل کے بچوں کا قتل اور ان کی غلامی و تباہ حالی کے واقعات ہی مراد ہو سکتے ہیں، نیز ان کا کفر اور فساد فی الارض، ورنہ تو قبطی کے قتل میں تو خود موسیٰ علیہ السلام بھی اپنے فعل پر نادم تھے اور خود کو قصور وار سمجھتے تھے۔

﴿وَ لَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝ وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ وَ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ وَ اَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ۝ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰۤى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ۝ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا فَلَمَّا جَآءَهٗ وَ قَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ قَالَ لَا تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ (القصص: ۲۲-۲۵)

"اور جب منہ کیا مدین کی سیدھ پر، بولا امید ہے کہ میرا رب لے جائے مجھ کو سیدھی راہ پر اور جب پہنچا مدین کے پانی پر

پایا وہاں ایک جماعت کو لوگوں کی پلانی پلاتے ہوئے اور پایا ان سے ورے دو عورتوں کو کہ روکے ہوئے کھڑی تھیں اپنی بکریاں، بولا تمہارا کیا حال ہے، بولیں ہم نہیں پلاتیں پانی چرواہوں کے پھیر لے جانے تک اور ہمارا باپ بوڑھا ہے بڑی عمر کا پھر اس نے پانی پلا دیا اس کے جانوروں کو، پھر ہٹ کر آیا چھاؤں کی طرف، بولا اے رب! تو جو چیز اتارے میری طرف اچھی میں اس کا محتاج ہوں، پھر آئی اس کے پاس ان دونوں میں سے ایک چلتی تھی شرم سے بولی میرا باپ تجھ کو بلاتا ہے کہ بدلے میں دے حق اس کا کہ تو نے پانی پلا دیا ہمارے جانوروں کو، پھر جب پہنچا اس کے پاس اور بیان کیا اس سے احوال، کہا مت ڈر بچ آیا تو اس قوم بے انصاف سے۔"

تورات میں اس موقعہ پر بھی دو جگہ اختلاف موجود ہے:

① وہ لڑکیوں کی تعداد دو کی جگہ سات بتاتی ہے۔

② اس کا بیان ہے کہ لڑکیوں نے حوض کو پانی سے بھر لیا تھا مگر دوسرے لوگوں نے زبردستی ان کو ہٹا کر اپنے جانوروں کو پانی پلانا شروع کر دیا، یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غصہ آیا۔

ہم کو اس موقع پر بھی قرآن عزیز کے بیان پر ہی بھروسہ کرنا چاہئے اول اس لئے کہ سابق اختلافات میں قرآن عزیز کے بیانات کی روش عقل اور فطرت کے مطابق رہی ہے، دوسرے اس لئے کہ اس جگہ بھی تعداد کے معاملہ سے قطع نظر تورات کی دوسری بات اس لئے صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ لڑکیاں مدین ہی کے قبیلہ اور ان ہی کی بستی کی ساکن تھیں اور پانی کا معاملہ روزانہ ہی ان کے ساتھ پیش آتا رہتا تھا، لہٰذا ان کو یہ معلوم تھا کہ یہ قوی گروہ کسی حالت میں بھی ہم کو پیش قدمی نہیں کرنے دے گا، اور عرب کے شعرا کے کلام سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ پانی کے معاملہ میں خصوصیت کے ساتھ ان کے یہاں قوی کو ضعیف پر ترجیح حاصل تھی، اور عرب کے ماسواء دنیا کے ہر گوشہ میں یہی حال تھا، تو وہ کیسے اس اقدام کی جرأت کر سکتی تھیں، صحیح بات یہی ہے کہ وہ ضعیف گھرانے کی فرد ہونے اور پھر عورت ہونے کی وجہ سے اسی پر اکتفاء کرتی تھیں کہ جب سب پانی پلا کر واپس ہو جائیں تو بچے ہوئے پانی سے یہ فائدہ اٹھا لیں اور بس۔

رہا لڑکیوں کی تعداد کا معاملہ سو ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ہر دو اقوال کی مطابقت کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ مدین کے اس بزرگ کے سات لڑکیاں ہوں جیسا کہ تورات میں مذکور ہے مگر مدین کے پانی پر جو واقعہ پیش آیا اس میں صرف دو لڑکیاں ہی موجود تھیں جیسا کہ قرآن حکیم کی تصریح سے ظاہر ہوتا ہے۔

شیخ سے رشتۂ مصاہرت:

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قبیلہ مدین کے بزرگ میزبان کے درمیان یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اس لڑکی نے جو موسیٰ علیہ السلام کو بلانے گئی تھی اپنے باپ سے کہا: "اے باپ! آپ اس مہمان کو اپنے مویشیوں کے چرانے اور پانی مہیا کرنے کے لیے اجیر رکھ لیجئے اجیر وہی بہتر ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی"۔

مفسرین کہتے ہیں کہ باپ کو لڑکی کی یہ گفتگو عجیب سی معلوم ہوئی اور اس نے دریافت کیا، "تجھ کو اس مہمان کی قوت و امانت کا حال کیا معلوم؟" لڑکی نے جواب دیا: "میں نے مہمان کی قوت کا اندازہ تو اس سے کیا کہ کنوئیں کا بڑا ڈول (چرس) اس نے تنہا کھینچ

کھینچ لیا، اور امانت کی آزمائش اس طرح کی کہ جب میں اس کو بلانے گئی تو اس نے مجھے دیکھ کر نیچی نظریں کر لیں، اور گفتگو کے دوران میں ایک مرتبہ بھی میری طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا، اور جب یہاں آنے لگا تو مجھ کو پیچھے چلنے کو کہا اور خود آگے آگے چلا، اور صرف اشاروں سے میں اس کی رہنمائی کرتی رہی۔ [1]

بزرگ باپ نے بیٹی کی ان باتوں کو سنا تو بہت مسرور ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اگر تم آٹھ سال تک میرے پاس رہو اور میری بکریاں چراؤ تو میں اپنی اس بیٹی کی تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں اور اگر تم اس مدت کو دو سال بڑھا کر دس سال کر دو تو اور بھی بہتر ہے، یہی اس لڑکی کا مہر ہوگا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس شرط کو منظور کر لیا اور فرمایا کہ یہ میری خوشی پر چھوڑیے کہ میں ان دونوں مدتوں میں سے جس کو چاہوں پورا کر دوں، آپ کی جانب سے مجھ پر اس بارہ میں کوئی جبر نہ ہوگا۔ طرفین کی اس باہمی رضامندی کے بعد بزرگ میزبان نے اس بیان کردہ مدت کو مہر قرار دے کر موسیٰ علیہ السلام سے اپنی اس بیٹی کی شادی کر دی۔

اور بعض مفسرین کا خیال ہے کہ مدت ختم ہونے پر "عقد" عمل میں آیا، اور عقد کے فوراً بعد ہی موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی کو لے کر روانہ ہو گئے، مفسرین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیوی کا نام "صفورہ" بتایا ہے۔

﴿قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۖ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ۞ قَالَ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ۗ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۞ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ۗ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۞﴾ (القصص: ۲۶-۲۸)

"بولی ان دونوں میں سے ایک، اے باپ اس کو نوکر رکھ لے، البتہ بہتر نوکر جس کو تو نوکر رکھنا چاہے وہ ہے جو زور آور ہو امانت دار، کہا میں چاہتا ہوں کہ بیاہ دوں تجھ کو ایک بیٹی اپنی ان دونوں میں سے اس شرط پر کہ تو میری نوکری کرے آٹھ برس، پھر اگر تو پورے کر دے دس برس تو وہ تیری طرف سے ہے، اور میں نہیں چاہتا کہ تجھ پر تکلیف ڈالوں تو پائے گا مجھ کو اگر اللہ نے چاہا نیک بختوں سے بولا یہ وعدہ ہو چکا میرے اور تیرے بیچ جونسی مدت ان دونوں میں پوری کر دوں سو زیادتی نہ ہو مجھ پر اور اللہ پر بھروسہ ہے اس چیز کا جو ہم کہتے ہیں"۔

﴿فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ ۙ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۞ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۞﴾ (طٰہٰ: ۴۰-۴۱)

"پھر تو نے مدین میں چند سال قیام کیا، پھر تو اے موسیٰ مقررہ اندازہ پر پورا اتر آیا اور میں نے تجھ کو اپنے لیے (اپنے خاص کام کے لیے) بنایا ہے"۔

موسیٰ علیہ السلام کے خسر کون ہیں؟:

قرآن عزیز نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور مدین کے شیخ کے متعلق جو واقعات بیان کیے ہیں ان میں کسی ایک جگہ بھی اس شیخ

[1] تفسیر ابن جریر سورۂ قصص

نام نہیں بتایا، اس لیے تاریخی حیثیت سے شیخ مدین کے نام میں مؤرخین ومفسرین کے مختلف اقوال پائے جاتے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

① مفسرین اصحاب سیر اور ادباء عرب کی ایک بڑی جماعت کا یہ خیال ہے کہ یہ حضرت شعیب علیہ السلام ہیں، یہ قول بہت مشہور اور شائع ذائع ہے۔

مشہور مفسر امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے حسن بصری رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"لوگ کہتے ہیں کہ صاحب موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام ہیں"۔ [1]

اور حافظ عماد الدین کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حسن بصری رحمہ اللہ اسی طرف مائل ہیں کہ مدین کے شیخ حضرت شعیب علیہ السلام ہیں اور فرماتے ہیں کہ ابن ابی حاتم نے سلسلہ سند کے ساتھ مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے" کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ صاحب موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام ہیں۔" [2]

② ایک جماعت کہتی ہے کہ شیخ کا نام "یثرون" تھا اور یہ حضرت شعیب علیہ السلام کے بھتیجے تھے، طبری نے سند کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے کہ ابو عبیدہ فرماتے تھے کہ جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اجیر بنایا وہ شعیب علیہ السلام کا برادر زادہ یثرون تھا۔ [3]

③ بعض کہتے ہیں کہ صاحب موسیٰ علیہ السلام کا نام "یثری" تھا طبری نے سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اجیر رکھنے والا مدین کا شیخ "یثری" نامی تھا، اور اسی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں "عورت کے والد کا نام "یثری" تھا مگر یثری والی روایت میں یہ نہیں کہا گیا کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام کا برادر زادہ تھا۔ [4] اور تورات نے اسی سے ملتا جلتا نام "یثرو" بتایا ہے۔ [5]

④ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ "شیخ" حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا ایک "مرد مومن" تھا۔

⑤ ایک جماعت کا گمان ہے کہ یہ "شیخ" نہ شعیب علیہ السلام ہو سکتے ہیں اور نہ ان کے بھتیجے اس لیے کہ قرآن عزیز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے کا زمانہ ہے جس کے درمیان صدیاں ہیں، قرآن حکیم کہتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو نصیحت فرماتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِّنكُم بِبَعِيدٍ﴾ (ھود:٨٩)

"اور قوم لوط (کا معاملہ) تم سے کچھ دور نہیں ہے۔"

یہ ظاہر ہے کہ قوم لوط کی ہلاکت کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ ہے اور ان کے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کی درمیانی مدت چار سو سال سے بھی زیادہ ہے، اور جن لوگوں نے اس مدت کو قریب کر دینے کے لیے یہ کہا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی عمر غیر معمولی طور پر طویل ہوئی، تو یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ [6]

---

[1] تفسیر سورۂ قصص۔ [2] تفسیر ابن کثیر ج ٧ ص ٢٤٨۔ [3] ابن جریر ج ١ ص ٢٠٦۔

[4] تفسیر ابن کثیر ج ٧ ص ٢٤٨۔ [5] تفسیر ابن کثیر ج ٧ ص ٢٤٨۔

[6] ان حوالہ جات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سید سلیمان صاحب کا یہ فرمانا صحیح نہیں ہے کہ "مسلمان مفسرین بھی علی العموم یثرو، حوباب اور شعیب کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔"

اس قول کی تائید کے لیے یہ دلیل بھی قوت رکھتی ہے کہ اگر "صاحب موسیٰ علیہ السلام شعیب علیہ السلام ہوتے تو قرآن عزیز ضرور ان کے نام کی تصریح کرتا، اور اس طرح مجمل و مبہم نہ چھوڑتا۔

ان مختلف پانچ اقوال کی نقل کے بعد ہمارے نزدیک راجح اور صحیح مسلک وہی معلوم ہوتا ہے جو ابن جریر اور ابن کثیر جیسے جلیل القدر محدثین و مفسرین نے اختیار کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نام کی تصریح کے بارہ میں کوئی روایت صحت کو نہیں پہنچتی اور جو روایات نقل کی گئی ہیں، وہ قابل احتجاج نہیں ہیں، اس لیے جس طرح تصریح کیے بغیر قرآن عزیز نے ان کا ذکر کیا ہے، اسی طرح بھی ان کے نام کی تصریح کو خدا کے علم کے حوالہ کر دیں، ابن کثیر کی عبارت یہ ہے:

قال ابوجعفر (الطبری) و ھذا مما لا یدرك علمه الا بخبر و لا خبر بذالك تجب حجة فلا قول فی ذٰلك اولی بالصواب مما قاله الله جل ثناءه.... الخ ❶

"ابوجعفر طبری نے کہا ہے کہ نام کی تصریح کا یہ معاملہ خبر اور اطلاع کے بغیر طے نہیں ہو سکتا اور اس سلسلہ میں کوئی خبر (روایت) ایسی موجود نہیں ہے جو حجت اور دلیل بن سکے پس سب سے بہتر قول اس سلسلہ میں وہی ہے جو قرآن میں اللہ جل شانہٗ نے اختیار فرمایا (یعنی سکوت)۔"

ابن جریر کا اشارہ قرآن عزیز کے اس جملہ کی جانب ہے ﴿وَ اَبُوْنَا شَیْخٌ کَبِیْرٌ ۝﴾ عبدالوہاب نجار فرماتے ہیں کہ مجھ سے ایک بڑے فاضل عالم نے یہ بحث کی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جلیل القدر نبی تھے اس لیے ان کو کوئی معمولی شخص اپنا اجیر رکھنے کا حوصلہ نہیں کر سکتا اور نہ وہ اس کو منظور فرماتے بلکہ ان کا مستاجر نبی اور پیغمبر ہی ہو سکتا ہے اس لیے مدین کے "شیخ کبیر" حضرت شعیب علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ آپ کا یہ ارشاد نہ عقلی حجت و برہان کی حیثیت رکھتا ہے نہ نقلی دلیل و حجت کی، زیادہ سے زیادہ استحسان کے درجہ کا قیاس ہے اور اس سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا بلکہ یہ یقین اور قطعیت کو چاہتا ہے، علاوہ ازیں اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی تھے نبوت سے بعد کو سرفراز کیے گئے۔ ❷

بہرحال یہ طے شدہ امر ہے کہ "شیخ کبیر" کے نام کی تصریح میں کوئی قابل حجت روایت موجود نہیں اور ابن جریر اور ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے "وفاء مدت" کے سلسلہ میں بھی جس قدر روایات نقل کی ہیں ان میں بھی بزار اور ابن ابی حاتم کی طویل روایات کے علاوہ کسی میں بھی نام کا ذکر موجود نہیں ہے اور ان دونوں روایات کی اس "زیادت" کے بارہ میں ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

مدار ھذا الحدیث علی عبداللہ بن لھیعة المصری وفی حفظه سوٗ و اخشٰی ان تکون رفعه خطاءً. ❸

"اس "نام کی تصریح والی" حدیث کا مدار ابن لہیعہ مصری پر ہے اور اس کا حافظہ خراب تھا اور مجھے خوف ہے کہ اس حدیث کو مرفوع کہنے میں غلطی ہوئی ہے۔

ابن جریر فرماتے ہیں: ❹

---

❶ تفسیر ابن کثیر ج ۷ ص ۲۴۸۔ ❷ قصص الانبیاء ص ۲۰۴۔
❸ تفسیر ابن کثیر ج ۷ ص ۲۵۷۔ ❹ تفسیر ابن کثیر جلد ۷

نیز اسی طرح عتبہ بن المنذر سے روایت کی گئی ہے (مگر) ایک یقینی نادر اور غیر معروف زیادت کے ساتھ (وہ زیادت یہی . . . ن . . . احت ہے)۔

ایفائے مدت:

غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے خسر کے یہاں مدت اجارہ پوری کرنے یعنی بکریاں چرانے کے لیے مقیم رہے، مفسرین مستند روایات کے پیش نظر فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے کامل مدت یعنی دس سالہ مدت کو پورا کیا۔

قرآن عزیز نے یہ نہیں بتایا کہ مدت پوری ہونے کے کس قدر بعد تک موسیٰ علیہ السلام نے "شیخ" کے پاس قیام کیا؟ البتہ مفسرین یہ کہتے ہیں کہ مدت ختم ہونے کے فوراً بعد ہی موسیٰ علیہ السلام مصر کو روانہ ہو گئے اور ان کے خسر نے روانگی کے سال میں بکریوں نے جس قدر بچے دیئے تھے ان کے حوالے کر دیئے اور اپنی بیوی اور اس ریوڑ کو لے کر چل پڑے۔ [1] شاید ان کا یہ قول اس آیت کے پیش نظر ہو۔

﴿فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا﴾ (القصص: ۲۹)

"پس جب موسیٰ (علیہ السلام) نے مدت پوری کر دی اور اپنے اہل و لے کر چل دیا تو محسوس . . . . . ن جانب آگ کو۔"

ان حضرات نے مدت کے ایفاء اور روانگی کے بیان میں جو قربت ہے اس سے یہ اندازہ کر لیا کہ وہ فوراً ہی روانہ ہو گئے حالانکہ جب تک خاص قرینہ موجود نہ ہو اس وقت تک "واؤ" نہ تعقیب پر دلالت کرتی ہے اور نہ ترتیب پر۔

اور معالم التنزیل میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وفاء مدت کے بعد دس سال مزید اپنے خسر کے یہاں مقیم رہے۔ [2]

تورات اسی قول کی تائید کرتی ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) مدت ختم ہونے پر فوراً ہی مصر روانہ نہیں ہو گئے تھے بلکہ بکریاں چراتے ہوئے بھولے بھٹکے جب "وادی مقدس" میں پہنچ کر خدا کا حکم ملا کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے رہا کراؤ اور مصر جا کر فرعون کے ظلم سے ان کو نجات دلاؤ تب وہ مصر روانہ ہوئے۔

اور موسیٰ اپنے سسرے یترو کے جو مدیان کا کاہن تھا گلے کی نگہبانی کرتا تھا، تب اس نے گلے کو بیابان کی طرف ہانک دیا اور خدا کے پہاڑ حورب کے نزدیک آیا، اس وقت خدا کا فرشتہ ایک بوٹے میں سے آگ کے شعلہ میں اس پر ظاہر ہوا، اس نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بوٹا آگ کا روشن ہے اور وہ جل نہیں جاتا..... اب دیکھ بنی اسرائیل کی فریاد تجھ تک آئی اور میں نے وہ ظلم جو مصری ان پر کرتے ہیں دیکھا ہے، پس اب تو جا میں تجھے فرعون کے پاس بھیجتا ہوں میرے لوگوں کو جو بنی اسرائیل ہیں مصر سے نکال۔ [3]

تب موسیٰ (علیہ السلام) روانہ ہوا اور اپنے سسر یترو کے پاس گیا اور اسے کہا کہ میں تیری منت کرتا ہوں کہ مجھے رخصت دے کہ اپنے بھائیوں کے پاس جو مصر میں ہیں جاؤں۔ [4]

بہتر یہی ہے کہ حقیقت حال کو علم الٰہی کے ہی سپرد کر دیا جائے "واللہ اعلم بحقیقۃ الحال" تاہم قرآن حکیم کا اسلوب بیان یہ ضرور رہنمائی کرتا ہے کہ عام کتب تفسیر میں جو یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ روانگی جو "طٰہٰ" اور "قصص" میں مذکور ہے:

---

[1] معالم جلد ۵ ص ۱۴۳ [2] حاشیہ خازن ج ۵ ص ۱۴۳ [3] خروج باب ۳ آیات ۱-۱۰ [4] خروج باب ۴ آیات

﴿فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖٓ﴾

مصر کے لیے تھی غالباً صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام گھر کے ارادہ سے چلے تھے تو جب وادی مقدس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو کہا گیا کہ ظالم فرعون اور اس کی قوم کی طرف جاؤ اور ان کو سمجھاؤ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جواب میں یہ نہ فرماتے:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴾ (القصص: ۳۳)

"موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اے پروردگار میں نے ان (فرعونیوں) کے ایک آدمی کو مار ڈالا تھا پس مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں وہ مجھ کو نہ مار ڈالیں (اگر میں مصر گیا)۔"

﴿وَ لَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴾ (الشعراء: ۱۴)

"اور ان (مصریوں) کا میں نے ایک گناہ کیا ہے پس میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھ کو قتل کر دیں گے۔"

یہ جواب خود بول رہا ہے کہ اس گفتگو کے وقت تک قتل والے معاملہ کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر جانے کا حوصلہ نہیں تھا، البتہ جب خدائے تعالیٰ کی عطاء و بخشش نے ان کو نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا اور اس وقت مصر جانے کا حکم ملا تو موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے اپنا اطمینان کر کے یہیں سے مصر روانہ ہو گئے اور حکم الٰہی کے سامنے خسر کے پاس جا کر اجازت لینے کی بھی پرواہ نہ کی۔

بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین میں ایک عرصہ قیام کیا، اور اس پوری مدت میں اپنے خسر کے مویشیوں کی گلہ بانی کرتے رہے، تورات میں مذکور ہے کہ اس قیام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام جیرسون رکھا، مدیانی عبرانی میں اس کے معنی غربت و مسافرت کے ہیں، گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بیٹے کے نام میں اپنی "مسافرت" کو بطور یادگار قائم رکھا، تاکہ خاندان والوں کو یاد رہے کہ اس بچہ کی ولادت "غربت و مسافرت" میں ہوئی تھی، تورات کی عبارت یہ ہے:

"اور اس نے اپنی بیٹی صفورہ موسیٰ (علیہ السلام) کو دی، وہ بیٹا جنی، اس نے اس کا نام "جیرسون" رکھا کیونکہ اس نے کہا، میں اجنبی ملک میں مسافر ہوں۔" [1]

وادی مقدس:

ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے اہل و عیال سمیت بکریاں چراتے چراتے مدین سے بہت دور نکل گئے، گلہ بان قبائل کے لیے یہ بات کوئی قابل تعجب نہ تھی مگر رات ٹھنڈی تھی اس لیے سردی آگ کی جستجو پر مجبور کر رہی تھی، سامنے کوہ سینا کا سلسلہ نظر آ رہا تھا، یہ سینا کا مشرقی گوشہ تھا اور مدین سے ایک روز کے فاصلہ پر بحر قلزم کے دو شاخے کے درمیان مصر کو جاتے ہوئے واقع تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چقماق استعمال کیا مگر سخت خنکی تھی اس نے کام نہ دیا۔

سامنے کی وادی (وادی ایمن) میں نگاہ دوڑائی تو ایک شعلہ چمکتا ہوا نظر پڑا، بیوی سے کہا کہ تم یہیں ٹھہرو میں آگ لے

---

[1] خروج باب ۲ آیات ۲۱-۲۲

آؤں تا پنے کا بھی انتظام ہو جائے گا اور اگر وہاں کوئی رہبر مل گیا تو بھٹکی ہوئی راہ کا بھی کھوج لگ جائے گا۔

﴿ فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝ ﴾(طٰہٰ:۱۰)

"پھر موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی بیوی سے کہا تم یہاں ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے شاید اس میں سے کوئی چنگاری تمہارے لیے لاسکوں یا وہاں الاؤ پر کسی رہبر کو پاسکوں۔"

بعثت:

خدا کے فضل کا موسیٰ علیہ السلام سے پوچھئے احوال: کہ آگ لینے کو جائیں پیغمبری مل جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ عجیب آگ ہے درخت پر روشنی نظر آتی ہے مگر نہ درخت کو جلاتی ہے اور نہ گل ہی ہو جاتی ہے، یہ سوچتے ہوئے آگے بڑھے لیکن جوں جوں آگے بڑھتے جاتے تھے آگ اور دور ہوتی جاتی تھی، یہ دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام کو خوف سا پیدا ہوا اور انہوں نے ارادہ کیا کہ واپس ہو جائیں، جوں ہی وہ پلٹنے لگے آگ قریب آ گئی اور قریب ہوئے تو سنا کہ یہ آواز آ رہی ہے:

﴿ يٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾(القصص:۳۰)

"اے موسیٰ (علیہ السلام)! میں ہوں میں اللہ پروردگار جہانوں کا۔"

﴿فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝ ﴾(طٰہٰ:۱۱۔۱۳)

"پس جب موسیٰ (علیہ السلام) اس (آگ) کے قریب آئے تو پکارے گئے اے موسیٰ (علیہ السلام)! میں ہوں تیرا پروردگار پس اپنی جوتی اتار دے تو طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے اور دیکھ! میں نے تجھ کو اپنی رسالت کے لیے چن لیا ہے پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سن۔"

قرآن عزیز کی سابق آیت اور ان آیات کے پیش نظر دو باتیں کتب تفسیر میں زیر بحث لائی جاتی ہیں:

① موسیٰ علیہ السلام نے جس روشنی کو آگ سمجھا تھا وہ آگ نہ تھی بلکہ تجلی الٰہی کا نور تھا، لیکن جو آواز اس پردۂ نور سے سنی گئی وہ فرشتے کی آواز تھی اور اس کے واسطہ سے خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو شرف ہم کلامی بخشا، یا خود اللہ تعالیٰ کی نداء تھی؟ بعض مفسرین کہتے ہیں یہ فرشتے کی آواز تھی اور اس کے واسطہ سے موسیٰ علیہ السلام کو خدا کی ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا، یہ خدا کی آواز نہ تھی اس لیے کہ

قول اور لحن نے آواز نے

اور ارباب تحقیق کی رائے یہ ہے کہ یہ براہ راست ندائے الٰہی تھی اور موسیٰ علیہ السلام نے اس کو کسی واسطہ سے بھی نہیں سنا بلکہ اسی طرح سنا جس طرح پیغمبران خدا وحی الٰہی کو سنتے اور "من وراء حجاب" اس سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

② وادی مقدس میں موسیٰ علیہ السلام کو جوتی اتارنے کا حکم دیا گیا، حالانکہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مساجد میں جوتیوں سمیت نماز ادا کیا کرتے تھے اور آج امت کے لیے بھی یہی اسلامی مسئلہ ہے کہ اگر جوتیاں پاک ہوں تو ان

سے بے تامل نماز پڑھنا درست ہے تو پھر اس جگہ موسیٰ علیہ السلام سے یہ کیوں کہا گیا کہ "یہ وادی مقدس ہے لہٰذا جوتی اتارو" تو اس کا جواب صحیح حدیث میں موجود ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی وجہ بیان فرمائی ہے۔

((کَانَتَا مِنْ جِلْدِ حِمَارٍ مَیِّتٍ)).

"(موسیٰ علیہ السلام) کی جوتیاں مردہ گدھے کی کھال سے بنائی گئی تھیں (یعنی غیر مدبوغ تھیں اسی لیے طاہر نہ تھیں)۔"

بہرحال اب حضرت موسیٰ علیہ السلام خدائے تعالیٰ کے پیغمبر اور جلیل القدر رسول ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو انبیاء کے سچے دین کی تلقین اور فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کی رہائی کی اہم خدمات کے لیے چن لیا ہے وہ اب وادی مقدس میں حق تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل کر رہے ہیں، وہ موسیٰ علیہ السلام جو مدین کی راہ سے بھٹکے ہوئے تھے آج مصر جیسے متمدن و مہذب ملک اور اس کے سرکش و مغرور بادشاہ کی رہنمائی کرنے کے لیے منتخب کئے گئے ہیں اور جو کل تک اونٹوں اور بکریوں کی گلہ بانی کر رہے تھے آج انسانوں کی قیادت کے فرض کو انجام دینے کے لیے چنے گئے ہیں اور جو نصاب زندگی کل بکریوں کے گلہ کی چرائی سے شروع ہوا تھا وہ آج وادی مقدس میں خدا کی بہترین مخلوق "حضرت انسان" کی گلہ بانی پر تکمیل کو پہنچ رہا ہے، اور کل کا گلہ بان آج جہاں بان بن رہا ہے۔

خدائے تعالیٰ کے ید قدرت کی یہی کرشمہ سازیاں ہیں جو زبان سے انکار کرنے والوں کے دلوں میں بھی اقرار کا کانٹا چبھوئے رکھتی ہیں، کجا خانہ بدوش چرواہا اور کجا متمدن حکومتوں کے لیے خدا کی صداقت کی پیغامبری۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب خدا کی اس آواز کو سنا اور ان کو یہ معلوم ہوا کہ آج ان کے نصیب میں وہ دولت آ گئی ہے جو انسانی شرافت کا طغرائے امتیاز اور خدا کی موہبت کا آخری نشان ہے تو پھولے نہ سمائے اور والہانہ فریفتگی میں مثل مورت حیران کھڑے رہ گئے، آخر پھر اسی جانب سے ابتداء ہوئی اور پوچھا گیا:

﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۱۷)

"موسیٰ (علیہ السلام)! تیرے داہنے ہاتھ میں یہ کیا ہے؟"

پس پھر کیا تھا محبوب حقیقی کا سوال عاشق صادق سے "یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے وارفتگی عشق میں یہ بھی خیال نہ رہا کہ سوال کے پیمانہ ہی پر جواب کو تولا جائے اور جو کچھ پوچھا گیا ہے صرف اسی قدر جواب دیا جائے بولے:

﴿هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ﴾ (طٰہٰ: ۱۸)

"یہ میری لاٹھی ہے، اس پر (بکریاں چراتے وقت) سہارا لیا کرتا ہوں اور اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑ لیتا ہوں۔"

جواب میں صرف یہ کہنا چاہیے تھا "عصا" مگر محبت کے اس ولولہ کو کیسے روکیں جو محبوب کے ساتھ ہمکلامی کے شرف کو طول دے کر سوختہ جانی کے سامان مہیا کرنا چاہتا ہے کہتے ہیں کہ میری لاٹھی ہے اور اس کے فوائد بیان کرنے لگتے ہیں مگر یکایک جذبہ شوق کی جگہ محبوب حقیقی کا پاس ادب دل میں چٹکی لیتا ہے، موسیٰ! خبردار کس دربار میں کھڑے ہو، کہیں یہ طول بیانی گستاخی اور بے ادبی میں شمار ہو جائے موسیٰ علیہ السلام نے یہ سوچ کر فوراً پہلو بدلا اور جناب باری میں عرض کی:

﴿وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۱۸)

"اور میرے لیے اس سے متعلق اور ضروریات بھی ہیں۔"

خدایا! دل کے ولولے اور روح کی بیتابیاں تو چاہتی ہیں کہ کہے جاؤں اور اس لطف بے پایاں کی لذت کو حاصل کیے جاؤں لیکن پاس ادب مانع اور چشم حقیقت بیں کا حکم ہے کہ خاموش ہو جاؤں اس لیے قصہ کوتاہ کرتا ہوں ورنہ داستان عشق تو بہت طویل ہے۔

عشق کہتا ہے جنوں کا جوش رہنا چاہیے
ضبط کی تاکید ہے خاموش رہنا چاہیے
قصہ موسیٰ علیہ السلام! سبق ہے ہوش والوں کے لیے
کس طرح عشاق کو خاموش رہنا چاہیے

آیات اللہ:

اب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ۝ ﴾ (طٰہٰ : ۱۹)

"موسیٰ! اس لاٹھی کو زمین پر ڈال دو۔"

اور موسیٰ علیہ السلام نے اس ارشاد عالی کی تکمیل کی۔

﴿ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ۝ ﴾ (طٰہٰ : ۲۰)

"موسیٰ (علیہ السلام) نے لاٹھی کو زمین پر ڈال دیا، پس ناگاہ وہ اژدھا بن کر دوڑنے لگا۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ حیرت زدا واقعہ دیکھا تو گھبرا گئے، اور بشریت کے تقاضا سے متاثر ہو کر بھاگنے لگے، پیٹھ پھیر کر بھاگے ہی تھے کہ آواز آئی:

﴿ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ٭ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ۝ ﴾ (طٰہٰ : ۲۱)

"(اللہ تعالیٰ نے فرمایا) موسیٰ! اس کو پکڑ لو اور خوف نہ کھاؤ ہم اس کو اس کی اصل حالت پر لوٹا دیں گے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لکڑی دوشاخہ تھی، اب وہی دوشاخہ اژدھے کا منہ نظر آ رہا تھا، سخت پریشان تھے مگر قربت الٰہی نے طمانیت وسکون کی حالت پیدا کر دی اور انہوں نے بے خوف ہو کر اس کے منہ پر ہاتھ ڈال دیا، اس عمل کے ساتھ ہی فوراً وہ دوشاخہ پھر لاٹھی بن گیا۔

اب موسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ پکارا گیا اور حکم ہوا کہ اپنے ہاتھ کو گریبان کے اندر لے جا کر بغل سے مس کیجئے اور پھر دیکھئے وہ مرض سے پاک اور بے داغ چمکتا ہوا نکلے گا۔

﴿ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ۝ ﴾ (طٰہٰ : ۲۲)

"اور ملا دے اپنے ہاتھ کو اپنی بغل کے ساتھ، نکل آئے گا وہ روشن بغیر کسی مرض کے (یعنی برص سے پاک) یہ دوسری نشانی ہے۔"

موسیٰ (علیہ السلام)! یہ ہماری جانب سے تمہاری نبوت و رسالت کے دو بڑے نشان ہیں، یہ تمہارے پیغام صداقت اور دلائل و براہینِ حق کی زبردست تائید کریں گے، پس جس طرح ہم نے تم کو نبوت و رسالت سے نوازا اسی طرح تم کو یہ دو عظیم الشان نشان (معجزے) بھی عطاء کیے۔

﴿لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴾(طٰہٰ : ۲۳)

"تا کہ ہم تجھ کو اپنی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کرادیں۔"

﴿ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡىِٕهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴾(القصص : ۳۲)

"پس تیرے پروردگار کی جانب سے فرعون اور اس کی جماعت کے مقابلہ میں تیرے لیے یہ دو "برہان" ہیں، بلاشبہ وہ فرعون اور اس کی جماعت نافرماں قوم ہیں۔"

اب جاؤ اور فرعون اور اس کی قوم کو راہ ہدایت دکھاؤ، انہوں نے بہت سرکشی اور نافرمانی اختیار کر رکھی ہے اور اپنے غرور و تکبر اور انتہاء ظلم کے ساتھ انہوں نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے سو ان کو غلامی سے رستگاری دلاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جناب باری میں عرض کیا: "پروردگار! میرے ہاتھ سے ایک مصری قتل ہو گیا تھا اس لیے یہ خوف ہے کہ کہیں وہ مجھ کو قتل نہ کر دیں، مجھے یہ بھی خیال ہے کہ وہ میری بڑی زور سے تکذیب کریں گے اور مجھ کو جھٹلائیں گے، یہ منصب عالی جب تو نے عطاء فرمایا ہے تو میرے سینہ کو فراخ اور نور سے معمور کر دے اور اس اہم خدمت کو میرے لیے آسان بنا دے اور زبان میں پڑی ہوئی گرہ کو کھول دے تا کہ لوگوں کو میری بات سمجھنے میں آسانی ہو، اور چونکہ میری گفتگو میں روانی نہیں ہے اور میری بہ نسبت میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح بیان ہے اس لیے اس کو بھی اپنی اس نعمت (نبوت) سے نواز کر میرا شریک کار بنا دے۔"

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اطمینان دلایا کہ تم ہمارا پیغام لے کر ضرور جاؤ اور ان کو حق کی راہ دکھاؤ، وہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، ہماری مدد تمہارے ساتھ ہے، اور جو نشانات ہم نے تم کو بخشے ہیں وہ تمہاری کامیابی کا باعث ہوں گے اور انجام کار تم ہی غالب رہو گے، ہم تمہاری درخواست منظور کرتے ہیں اور تمہارے بھائی ہارون کو بھی تمہارا شریک کار بناتے ہیں، دیکھو تم دونوں، فرعون اور اس کی قوم کو جب ہماری صحیح راہ کی جانب بلاؤ تو اس پیغام حق میں نرمی اور شیریں کلامی سے پیش آنا کیا عجب ہے کہ وہ نصیحت قبول کر لیں، اور خوف خدا کرتے ہوئے ظلم سے باز آ جائیں۔

داخلہ مصر:

سدی کہتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام منصب نبوت سے سرفراز ہو کر کلام ربانی سے فیض یاب بن کر اور دعوت و تبلیغ حق میں کامیابی و کامرانی کا مژدہ پا کر، وادی مقدس سے اترے تو اپنی بیوی کے پاس پہنچے جو وادی کے سامنے جنگل میں ان کی منتظر اور چشم براہ تھیں ان کو ساتھ لیا اور یہیں سے تعمیل حکم الٰہی کے لیے مصر روانہ ہو گئے، منزلیں طے کرتے ہوئے جب مصر پہنچے تو رات ہو گئی تھی، خاموشی کے ساتھ مصر میں داخل ہو کر اپنے مکان میں پہنچے مگر اندر داخل نہ ہوئے اور والدہ کے سامنے ایک مسافر کی حیثیت سے ظاہر ہوئے، یہ بنی اسرائیل میں مہمان نواز گھر تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خوب خاطر و مدارات کی گئی، اسی دوران میں ان کے بڑے بھائی

ہارون علیہ السلام آ پہنچے، یہاں پہنچنے سے قبل ہی ہارون علیہ السلام کو خدا کی طرف سے منصب رسالت عطاء ہو چکا تھا، اس لیے ان کو بذریعہ وحی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سارا قصہ بتا دیا گیا تھا، وہ بھائی سے آ کر لپٹ گئے اور پھر ان کے اہل و عیال کو گھر کے اندر لے گئے اور والدہ کو سارا حال سنایا، تب سب خاندان آپس میں گلے ملا اور بچھڑے ہوئے بھائیوں نے ایک دوسرے کی گذشتہ زندگی سے تعارف پیدا کیا اور والدہ کی دونوں آنکھوں نے ٹھنڈک حاصل کی۔ [1] تورات میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: "اور خداوند نے ہارون علیہ السلام کو کہا کہ بیابان میں جا کے ملاقات کر، وہ گیا اور خدا کے پہاڑ پر اسے ملا اور اسے بوسہ دیا اور موسیٰ علیہ السلام نے خدا کی جس نے اسے بھیجا ساری باتیں اور معجزے کو جن کا اس نے حکم دیا تھا ہارون علیہ السلام سے بیان کئے۔" [2]

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ﴿۲۷﴾

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وادی مقدس میں خدائے تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا تھا کہ میری زبان میں جو گرہ ہے اس کو کھول دے اور یہ کہ میرا بھائی ہارون علیہ السلام مجھ سے زیادہ فصیح ہے تو مفسرین نے اس "عقدۃ" کے متعلق ایک حکایت نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام زمانہ طفولیت میں ایک روز فرعون کی آغوش میں بیٹھے ہوئے تھے، اور فرعون کی ڈاڑھی جواہرات اور موتیوں سے مرصع تھی بچوں کی عادت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ڈاڑھی پر ہاتھ چلا دیا اور چمکتے ہوئے موتیوں کے ساتھ فرعون کی ڈاڑھی کے چند بال بھی اکھڑ آئے، فرعون کو سخت غصہ آیا اور چاہا کہ ان کو قتل کرا دے، آسیہ زوجہ فرعون نے شوہر کا یہ رنگ دیکھا تو عاجزی کے ساتھ عرض کیا کہ بچہ ہے اس کو نہ مارو، یہ ان احترامات سے کیا واقف ہے، اس کے نزدیک تو تمرہ (کھجور) اور جمرہ (چنگاری) دونوں برابر ہیں "راج ہٹ" پرانی مثل ہے، بادشاہ نے کہا کہ میں ابھی اس کا امتحان کرتا ہوں، اگر اس نے انگارہ کو دیکھ کر ہاتھ کھینچا تو ضرور قتل کرا دوں گا، خدائے تعالیٰ کو موسیٰ علیہ السلام سے کام لینا تھا اس لیے ان کی حفاظت کی ذمہ داری کا وعدہ کر لیا تھا، لہٰذا جب فرعون نے چند کھجور کے دانے اور چند دہکتی آگ کے سرخ انگارے منگا کر موسیٰ علیہ السلام کے سامنے رکھے تو موسیٰ علیہ السلام نے جلد ہاتھ بڑھا کر ایک سرخ انگارے کو اٹھا کر منہ میں رکھ لیا، سیکنڈ بھر کا کام تھا ہو گذرا مگر زبان پر داغ پڑ گیا اور زبان موٹی ہو گئی، اس وقت سے موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت آ گئی، اور مسلسل گفتگو میں رکاوٹ ہونے لگی، پس وادی مقدس میں خدائے تعالیٰ کے سامنے موسیٰ علیہ السلام نے اسی "عقدۃ" (گرہ) کا ذکر کیا۔ [3] لیکن عام مفسرین کی اس نقل حکایت سے جدا نجار مصری نے اس سلسلہ میں اپنی ایک قیاسی رائے بیان کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"میں اس قصہ کو صحیح نہیں سمجھتا، میرے خیال میں تو صرف موسیٰ علیہ السلام کی غیر فصیح بیانی اور گفتگو میں رکاوٹ کی دو وجوہات میں سے ایک ہو سکتی ہے۔

① قرآن عزیز میں مذکور ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو دریائے نیل میں سے نکال کر شاہی محل پہنچایا گیا تو دودھ پلانے کے لیے دایہ کی فکر ہوئی، شہر کی بیسیوں دایہ آئیں مگر انہوں نے کسی کا دودھ منہ سے نہ لگایا، تو اس واقعہ میں ضرور عرصہ لگا ہو گا اور موسیٰ علیہ السلام ایک عرصہ دودھ سے محروم رہے ہوں گے، ایسی حالت میں یہ تجربہ کیا گیا ہے کہ بچہ کی زبان موٹی ہو جاتی ہے اور بات کرنے میں

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۱ ص ۲۵۲ [2] خروج باب ۴ آیت ۲۷۔۲۸ [3] تاریخ ابن کثیر ج ۱ ص ۲۴۹

رکاوٹ کا مرض پیدا ہو جاتا ہے لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی یہی صورت پیش آئی ہوگی۔

(۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام ابتداء جوانی ہی میں مصر سے مدین چلے گئے اور وہاں ایک طویل عرصہ رہے، اگر "صاحب معالم التنزیل" یا تورات کی روایات کو صحیح مان لیا جائے تو بیس سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ ہوتا ہے، ایسی صورت میں یہ قدرتی بات ہے کہ وہ مصری زبان سے ایک حد تک ناآشنا اور اس کے محاورات اور اس زبان میں تقریر کے ملکہ سے محروم ہو چکے ہوں گے، اسی کو انہوں نے "عقدۂ لسانی" فرمایا اور ہارون علیہ السلام کے متعلق فرمایا ﴿هُوَ اَفۡصَحُ مِنِّیۡ﴾ اس دوسری وجہ میں البتہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کو صحیح مان لیا جائے تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کس طرح حضرت ہارون علیہ السلام سے بے تکلف بات چیت کرنے پر قادر رہے ہوں گے جبکہ حضرت ہارون علیہ السلام کبھی مصر سے باہر ہی نہیں گئے اور صرف مصری زبان ہی میں بات چیت کر سکتے تھے، سو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام مصری اور عبرانی دونوں زبانوں کے خوب واقف اور ماہر تھے، مصری زبان ان کی ملکی زبان تھی، اور عبرانی زبان ان کی مادری زبان تھی جس کو صدیاں گذرنے کے باوجود بھی بنی اسرائیل نے محفوظ رکھا تھا اور باہمی بات چیت اور نوشت و خواند میں اسی کو استعمال کرتے تھے اور مدیانی اور عبرانی میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا اس لیے کہ دونوں زبانیں ایک ہی جد اعلیٰ (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کی نسل سے متعلق تھیں۔

اور ان ہر دو وجوہ کو نقل کرنے کے بعد نجار کہتے ہیں کہ میری طبیعت کا میلان پہلی وجہ کی جانب ہے اور میں اسی کو راجح سمجھتا ہوں۔[1]

مگر ہمارے نزدیک پہلی وجہ تو کسی طرح بھی قرین قیاس نظر نہیں آتی، اس لیے کہ "دایہ کی تفتیش کا معاملہ قرآن عزیز اور صحیح احادیث میں تو بہت ہی مختصر ہے اور اس کی تفصیل جو توراۃ اور تاریخی روایات سے نقل کی گئی ہے ان سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ صرف چند گھنٹوں کے اندر طے ہو گیا، موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ان کو دودھ پلانے کے لیے لے گئیں، اور شاہی احکام کے بعد ایک بچہ کے دودھ پلانے کے معاملہ میں دنوں کی تاخیر ہو بھی کیسے سکتی تھی نیز دوسری وجہ بھی کچھ زیادہ قابل قبول نہیں ہے اس لیے کہ اس توجیہ کے مطابق حضرت ہارون علیہ السلام کے متعلق ﴿هُوَ اَفۡصَحُ مِنِّیۡ﴾ کا فقرہ تو سمجھ میں آ سکتا ہے لیکن مصری زبان کی فراموشی کو ﴿عُقۡدَةً مِّنۡ لِّسَانِیۡ﴾ کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے، علاوہ ازیں اگر یہ صحیح ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا تو قبول کر لی گئی پھر اس فراموشی کے کیا معنی؟

بلکہ صاف اور بے غل و غش بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسی حالت میں مولود ہوئے کہ ان کی زبان میں لکنت تھی اور بات کرنے میں رکاوٹ واقع ہو جاتی تھی اور حضرت ہارون علیہ السلام لسان اور فصیح البیان تھے، پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے متعلق صرف اسی قدر دعا مانگی کہ زبان کا یہ حصر اور اس کی لکنت اس درجہ شدید نہ رہے کہ گفتگو میں عاجز ہو جانا پڑے، اگر فطری رکاوٹ دور نہیں ہوتی نہ ہو صرف اس قدر خواہش ہے کہ مخاطبین گفتگو کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور فصاحت و طلاقت لسانی کے لیے میری خواہش یہ ہے کہ میرے بھائی ہارون کو میرا قوت بازو بنا دیجئے کہ وہ میرا ویسے بھی دست و بازو ہے، چنانچہ دربار الٰہی میں دونوں باتیں قبول اور منظور ہو گئیں۔

بعض علماء تفسیر نے ﴿يَفۡقَهُوۡا قَوۡلِیۡ﴾ میں ایک اور نکتہ پیدا کیا اور فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف یہ دعا مانگی کہ ان

---

[1] قصص الانبیاء عربی ص ۲۰۸، ۲۰۹

کی زبان کی گرہ اس حد تک کھل جائے کہ جس قوم کو تبلیغ کرنے جا رہے ہیں وہ ان کی گفتگو سمجھ سکے لہٰذا اسی درجہ دعا قبول ہوئی اور ان کی زبان میں قدرے لکنت اور رکاوٹ پھر بھی باقی رہی، موسیٰ علیہ السلام نے شرط لگا کر دعاء کا دائرہ خود ہی تنگ کر دیا، ورنہ وہ بھی فصاحت اور طلاقت لسانی میں فرد ہو جاتے۔

میرے خیال میں اس نکتہ سنجی کی بھی یہاں مطلق ضرورت نظر نہیں آتی اس لیے کہ جس مقام پر اور جس وقت میں موسیٰ علیہ السلام نے درگاہِ الٰہی میں یہ دعا فرمائی ہے اس کی برکت اور عظمت کو ان نکتہ سنجوں نے بالکل فراموش کر دیا اور یہ غور نہیں فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام منصب نبوت سے سرفراز کیے جا رہے ہیں، خدا کا انتہائی فضل و کرم بارش کی طرح ان پر برس رہا ہے، آغوش رحمت وا ہے، اس حالت میں موسیٰ علیہ السلام معاملہ اور ذمہ داری کی اہمیت کو محسوس فرماتے ہوئے آسانی کار کے لیے دعائیں اور استدعائیں کر رہے ہیں اور خدائے تعالیٰ خود موسیٰ علیہ السلام کی مشکلات اور مہم کی نزاکت کا عالم و دانا ہیں تو پھر کیا ایسے وقت میں خدائے تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا یہ تقاضا ہو سکتا تھا کہ وہ عطاء و نوال کی بیکراں نوازش کی جگہ مول تول اور سودے کی طرح لین دین کا سا معاملہ کرتی یا حقیقت حال کے پیش نظر موسیٰ علیہ السلام کے دعائیہ الفاظ کی لفظی گرفت سے درگذر فرما کر وہ سب کچھ عطاء کرتی جو ان کی مشکلات کو ختم کرنے کے لیے معاون و مددگار ثابت ہو سکے، بیشک اس نے ایسا ہی کیا البتہ موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد میں ایک راز تھا جس کو وہ اور ان کا پروردگار دونوں سمجھتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ ان کی اس اہم خدمت میں ان کے بھائی ہارون علیہ السلام ضرور شریک کار بنیں اس لیے کہ وہ بھائی بھی ہیں اور فطری فصاحت و طلاقت لسانی کے مالک بھی، لہٰذا وہ اس سے زیادہ کے خواہش مند ہی نہ تھے کہ ان کو حصر کی دشواری سے نجات مل جائے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح ہارون کو بھی یہ دولت نبوت عطا ہو پس ان کی سفارش کے لیے اسی وصف "فصاحت بیانی" کو خدا کی درگاہ میں پیش کیا، یہ نہ تھا کہ انہوں نے الفاظ دعاء میں تنگی کی تھی، تو خدا نے بھی کم دینے کی خاطر ان کے الفاظ کو پکڑ لیا اور اسی قدر دیا جو ان کی دعاء کے الفاظ میں محدود تھا۔

﴿وَ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۞ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۞ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۞ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۞ وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۞ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۞ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ۞ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ۞﴾ (طٰہٰ: ۹۔۱۶)

"اور اے پیغمبر! موسیٰ کی حکایت تو نے سنی؟ جب اس نے (دور سے) آگ دیکھی تو اپنے گھر کے لوگوں سے کہا: "ٹھہرو مجھے آگ دکھائی دی ہے میں جاتا ہوں ممکن ہے تمہارے لیے ایک انگارہ لیتا آؤں یا (کم از کم) الاؤ پر کوئی راہ دکھانے والا ہی مل جائے، پھر جب وہ وہاں پہنچا تو اس وقت پکارا گیا (ایک آواز اٹھی کہ) اے موسیٰ میں ہوں تیرا پروردگار! پس اپنی جوتی اتار دے۔ تو طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے، اور دیکھ میں نے تجھے (اپنی رسالت کے لیے) چن لیا ہے پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اسے کان لگا کر سن، میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی بندگی کر اور میری ہی

یاد کے لیے نماز قائم کر، بلاشبہ (مقررہ) وقت آنے والا ہے، میں اسے پوشیدہ رکھنے کو ہوں تاکہ (لوگوں کے یقین و عمل کی آزمائش ہو جائے اور) جس شخص کی جیسی کچھ کوشش ہو اسی کے مطابق بدلہ پائے پس دیکھ ایسا نہ ہو کہ جو لوگ اس وقت کے ظہور پر یقین نہ رکھتے ہوں اور اپنی خواہش کے بندے ہوں وہ تجھے بھی (قدم بڑھانے سے) روک دیں اور نتیجہ یہ نکلے تو تباہ ہو جائے۔"

﴿اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖۤ اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ یٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝﴾ (النمل: ۷-۹)

"جب کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے گھر والوں کو میں نے دیکھی ہے ایک آگ اب لاتا ہوں تمہارے پاس وہاں سے کچھ خبر، یا لاتا ہوں انگارہ سلگا کر تاکہ تم تاپو، پھر جب پہنچا اس کے پاس آواز ہوئی کہ برکت ہے اس پر جو کوئی آگ میں ہے اور جو اس کے آس پاس ہے، اور پاک ہے ذات اللہ کی جو رب ہے سارے جہاں کا، اے موسیٰ وہ میں اللہ ہوں زبردست حکمتوں والا۔"

﴿وَ مَا تِلْكَ بِیَمِیْنِكَ یٰمُوْسٰى ۝ قَالَ هِیَ عَصَایَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَیْهَا وَ اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِیْ وَ لِیَ فِیْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ۝ قَالَ اَلْقِهَا یٰمُوْسٰى ۝ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰى ۝ قَالَ خُذْهَا وَ لَا تَخَفْ ٙ سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰى ۝ وَ اضْمُمْ یَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ اٰیَةً اُخْرٰى ۝ لِنُرِیَكَ مِنْ اٰیٰتِنَا الْكُبْرٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۱۷-۲۳)

"اور صدائے غیبی نے پوچھا: اے موسیٰ! تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟ عرض کیا: "میری لاٹھی ہے، چلنے میں اس کا سہارا لیتا ہوں اسی سے اپنی بکریوں کے لیے درختوں کے پتے جھاڑ لیتا ہوں، میرے لیے اس میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں حکم ہوا: "اے موسیٰ! اسے ڈال دے" موسیٰ نے ڈال دیا، اور کیا دیکھتا ہے ایک سانپ ہے، جو دوڑ رہا ہے حکم ہوا "اسے اب پکڑ لے، خوف نہ کھا، ہم اسے پھر اس کی اصل حالت پر کیے دیتے ہیں" اور نیز حکم ہوا "اپنا ہاتھ اپنے پہلو میں رکھ اور پھر نکال بغیر اس کے کہ کسی طرح کا عیب ہو چمکتا ہوا نکلے گا، یہ (تیرے لیے) دوسری نشانی ہوئی (اور یہ دونوں (نشانیاں) اس لیے (دی گئی ہیں) کہ آئندہ تجھے اپنی قدرت سے بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔"

﴿وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِیِّ اِذْ قَضَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَ مَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِیْنَ ۝ وَ لٰكِنَّاۤ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَیْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَ مَا كُنْتَ ثَاوِیًا فِیْۤ اَهْلِ مَدْیَنَ تَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِنَا ۙ وَ لٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِیْنَ ۝ وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَیْنَا وَ لٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ۝﴾ (القصص: ۴۴-۴۶)

"اور تو نہ تھا غرب کی طرف جب ہم نے بھیجا موسیٰ کو حکم اور نہ تھا تو دیکھنے والا لیکن ہم نے پیدا کیں کئی جماعتیں پھر دراز ہوئی ان پر مدت، اور تو نہ رہتا تھا مدین والوں میں کہ ان کو سناتا ہماری آیتیں، پر ہم رہے رسول بھیجتے، اور تو نہ تھا طور کے کنارے جب ہم نے آواز دی، لیکن یہ انعام ہے تیرے رب کا کہ ڈر سنا دے ان لوگوں کو جن کے پاس نہیں آیا کوئی ڈر سنانے والا تجھ سے پہلے تا کہ وہ یاد رکھیں۔"

﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۞ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۞ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۞ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۞ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۞﴾ (النازعات: ۱۵-۱۹)

"کچھ پہنچی ہے تجھ کو بات موسیٰ کی، جب پکارا اس کو اس کے رب نے پاک میدان میں جس کا نام طویٰ ہے۔ جا فرعون کے پاس اس نے سر اٹھایا، پھر کہہ تیرا جی چاہتا ہے کہ تو سنور جائے اور راہ بتاؤں تجھ کو تیرے رب کی طرف پھر تجھ کو ڈر ہو؟"۔

﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۞ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۞ وَ يَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ۞ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۞ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۞ وَ اجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۞ هٰرُوْنَ اَخِي ۞ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۞ وَ اَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۞ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۞ وَّ نَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۞ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۞ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ۞﴾ (طٰہٰ: ۲۴-۳۶)

"(حکم ہوا) اے موسیٰ! فرعون (یعنی بادشاہ مصر) کی طرف جا وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے" موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کیا: "اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے (کہ بڑے سے بڑا بوجھ اٹھانے کے لیے مستعد ہو جاؤں) میرا کام میرے لیے آسان کر دے (کہ راہ کی کوئی دشواری بھی غالب نہ آ سکے) میری زبان کی گرہ کھول دے کہ (خطاب و کلام میں پوری طرح رواں ہو جائے اور) میری بات لوگوں کے دلوں میں اُتر جائے، نیز میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو میرا وزیر بنا دے اس کی وجہ سے میری قوت مضبوط ہو جائے، وہ میرے کام میں میرا شریک ہو، ہم دونوں ایک دل ہو کر) تیری پاکی اور بڑائی کا بکثرت اعلان کریں، تیری یاد میں زیادہ سے زیادہ لگے رہیں، اور بلاشبہ تو ہمارا حال دیکھ رہا ہے (ہم سے کسی حال میں غافل نہیں) ارشاد ہوا، اے موسیٰ! تیری درخواست منظور ہوئی۔"

﴿اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَ لَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۞ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۞ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۞ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۞ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰى ۞ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَ لَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَ السَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۞﴾ (طٰہٰ: ۴۲-۴۷)

"اب تو اور تیرا بھائی، دونوں میری نشانیاں لے کر جاؤ اور میری یاد میں کوتاہی نہ کرو، ہاں تم دونوں (یعنی موسیٰ اور ہارون

کیونکہ اب دونوں اکٹھے ہو گئے تھے اور مصر کے قریب وحی الٰہی نے انہیں دوبارہ مخاطب کیا تھا) فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکشی میں بہت بڑھ چلا ہے، پھر جب اس کے پاس پہنچو تو سختی کے ساتھ پیش نہ آنا۔ نرمی سے بات کرنا (تمہیں کیا معلوم؟) ہوسکتا ہے کہ نصیحت پکڑے یا (عواقب سے) ڈر جائے دونوں نے عرض کیا "پروردگار! ہمیں اندیشہ ہے فرعون ہماری مخالفت میں جلدی نہ کرے یا سرکشی سے پیش آئے ارشاد ہوا کچھ اندیشہ نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں، میں سب کچھ سنتا ہوں، سب کچھ دیکھتا ہوں! تم اس کے پاس (بے دھڑک) جاؤ اور کہو ہم تیرے پروردگار کی نشانی لے کر تیرے سامنے آ گئے، اس پر سلامتی ہو جو سیدھی راہ اختیار کرے۔"

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِیْرًا ۚ فَقُلْنَا اذْهَبَاۤ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِیْرًا ؕ﴾ (الفرقان: ۳۵۔۳۶)

"اور ہم نے دی موسیٰ کو کتاب اور کر دیا ہم نے اس کے ساتھ اس کا بھائی ہارون کام بٹانے والا، پھر کہا ہم نے دونوں جاؤ ان لوگوں کے پاس جنھوں نے جھٹلایا ہماری باتوں کو پھر دے مارا ہم نے ان کو اکھاڑ کر۔"

﴿وَ اِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰۤى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۙ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا یَتَّقُوْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ؕ وَ یَضِیْقُ صَدْرِیْ وَ لَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ۝ وَ لَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ۚ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَاۤ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ۝ فَاْتِیَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ﴾ (الشعراء: ۱۰۔۱۶)

"اور جب پکارا تیرے رب نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کہ جا اس قوم گنہگار کے پاس، قوم فرعون کے پاس، کیا وہ ڈرتے نہیں، بولا اے رب میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھٹلائیں، اور رک جاتا ہے میرا جی اور نہیں چلتی ہے میری زبان، سو پیغام دے ہارون کو اور ان کو مجھ پر ہے ایک گناہ کا دعویٰ، سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو مار ڈالیں، فرمایا کبھی نہیں، تم دونوں جاؤ لے کر ہماری نشانیاں، ہم ساتھ تمہارے سنتے ہیں، سو جاؤ فرعون کے پاس اور کہو ہم پیغام لے کر آئے ہیں پروردگار عالم کا۔"

﴿وَ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ یُعَقِّبْ ؕ یٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۖ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ وَ اَدْخِلْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ۫ فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝﴾ (النمل: ۱۰۔۱۲)

"اور ڈال دے لاٹھی اپنی، پھر جب دیکھا اس کو پھن ہلاتے جیسے سفید پتلا سانپ، لوٹا پیٹھ پھیر کر اور مڑ کر نہ دیکھا۔ اے موسیٰ! مت ڈر میں جو ہوں میرے پاس نہیں ڈرتے رسول مگر جس نے زیادتی کی، پھر بدلے نیکی کی برائی کے پیچھے تو میں

بخشنے والا ہوں اور ڈال دے ہاتھ اپنا اپنے گریبان میں کہ نکلے سفید ہو کر بغیر کسی عیب کے یہ دونوں مل کر نو نشانیاں لے کر جا، فرعون اور اس کی قوم کی طرف بے شک وہ تھے لوگ، نافرمان۔"

﴿فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّيْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْۤ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰۤى اِنِّيْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَ اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَ لَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ۝ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۫ وَّ اضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۝ وَ اَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْۤ ۫ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ۝ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَاۤ ۚ اَنْتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ۝﴾ (القصص ۲۹-۳۵)

"پھر جب پوری کر چکا موسیٰ (علیہ السلام) وہ مدت اور لے کر چلا اپنے گھر والوں کو دیکھی کوہ طور کی طرف سے ایک آگ، کہا اپنے گھر والوں کو ٹھہرو میں نے دیکھی ہے آگ شاید لے آؤں تمہارے پاس وہاں کی کچھ خبر یا انگارہ آگ کا تا کہ تم تاپو، پھر جب پہنچا اس کے پاس آواز ہوئی میدان کے داہنے کنارے سے، برکت والے تختہ میں ایک درخت سے کہ اے موسیٰ میں ہوں میں اللہ جہان کا رب، اور یہ کہ ڈال دے تو اپنی لاٹھی، پھر جب دیکھا اس کو پھن ہلاتے جیسے پتلا سانپ الٹا پھرا منہ موڑ کر اور نہ دیکھا پیچھے پھر کر، اے موسیٰ! آگے آ اور مت ڈر تجھ کو کچھ خطرہ نہیں، ڈال اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں نکل آئے سفید ہو کر نہ کہ کسی برائی سے، اور لائے اپنی طرف اپنا بازو ڈر سے، سو یہ دو سندیں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے سرداروں پر، بیشک وہ تھے لوگ نافرمان، بولا اے رب میں نے خون کیا ہے ان میں ایک جان کا سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو مار ڈالیں گے، اور میرا بھائی ہارون (علیہ السلام) اس کی زبان چلتی ہے مجھ سے زیادہ سو اس کو بھیج میرے ساتھ مدد کو میری تصدیق کرے میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھوٹا کریں، فرمایا ہم مضبوط کر دیں گے تیرے بازو کو تیرے بھائی سے اور دیں گے تم کو غلبہ پھر وہ نہ پہنچ سکیں گے تم تک ہماری نشانیوں سے، تم اور جو تمہارے ساتھ ہو غالب رہو گے۔"

﴿وَ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل ۲-۳)

"اور دی ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب اور کیا اس کو ہدایت بنی اسرائیل کے واسطے کہ نہ ٹھہراؤ میرے سواء کسی کو کارساز تم جو

اولادِ ہواں لوگوں کی جن کو چڑھایا ہم نے نوح کے ساتھ، بیشک وہ تھا بندہ حق ماننے والا۔"

﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآىِٕهٖ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۝ وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۗ وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝﴾(السجدہ: ۲۳۔۲۵)

"اور ہم نے دی ہے موسیٰ کو کتاب سو تو مت رہ دھوکے میں اس کے ملنے سے اور کیا ہم نے اس کو ہدایت بنی اسرائیل کے واسطے اور کیے ہم نے ان میں پیشواء جو راہ چلاتے تھے ہمارے حکم سے جب وہ صبر کرتے رہے اور رہے ہماری باتوں پر یقین کرتے تیرا رب جو ہے وہی فیصلہ کرے گا ان میں دن قیامت کے جس بات میں کہ وہ اختلاف کرتے تھے۔"

ان آیات میں "عصاء موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ یا آیۃ اللہ ہونے کو" مختلف تعبیرات سے ادا کیا گیا ہے سورۂ طٰہٰ میں ﴿حیۃ تسعی﴾ فرمایا اور سورۂ نمل اور قصص میں ﴿جان﴾ کہا گیا، اور شعراء میں ﴿ثعبان مبین﴾ ظاہر کیا، مفسرین فرماتے ہیں کہ "عصاء موسیٰ (علیہ السلام)" کی اگرچہ یہ تعبیرات لفظی اعتبار سے مختلف ہیں لیکن حقیقت اور معنی کے لحاظ سے مختلف نہیں ہیں، بلکہ ایک حقیقت کے مختلف اوصاف کو ادا کیا گیا ہے یعنی جنس کے اعتبار سے وہ "حیہ" سانپ تھا، اور تیز روی کے اعتبار سے "جان" (تیز رو سانپ تھا) اور ضخامت کے پیش نظر وہ "ثعبان" (اژدھا) تھا۔

اور سورۂ قصص میں موسیٰ علیہ السلام کے دونوں معجزوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَّ اضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ﴾(القصص: ۳۲)

"اور اپنی جانب اپنے بازو لے خوف کی حالت میں"۔

اس آیت میں کس قسم کے خوف کا ذکر ہے؟ اس کے متعلق حضرت شاہ صاحب دہلوی نور اللہ مرقدہٗ ارشاد فرماتے ہیں:

"بازو ملا ڈر سے یعنی سانپ کا ڈر جاتا رہے۔"[1]

اور بعض علماء کہتے ہیں کہ اس خوف سے فرعون کے دربار کا خوف مراد تھا یعنی اگر فرعون کے سامنے کسی وقت خوف محسوس ہونے لگے تو اے موسیٰ علیہ السلام! تو اپنے بازو کو بدن کے ساتھ ملا لینا فوراً ڈر جاتا رہے گا، اور دل میں سکون و اطمینان کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ یہ دونشانیوں کے علاوہ تیسری نشانی نہیں تھی بلکہ خوف اور ڈر دور کرنے کا ایک فطری علاج بتلایا گیا تھا جو ایسے موقع پر عموماً فائدہ مند ثابت ہوتا ہے، اور اب جبکہ خدائے تعالیٰ کا فرمودہ تھا تو اس کے راست آنے میں موسیٰ علیہ السلام کو شک کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔[2] ہمارے نزدیک آیت کا سیاق حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کی تائید کرتا ہے اور نجار کی توجیہ ایک دور کی بات معلوم ہوتی ہے۔

فرعون کے دربار میں دعوت حق:

بہرحال حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کے درمیان جب ملاقات اور گفتگو کا سلسلہ ختم ہوا تو اب دونوں نے طے کیا کہ

[1] موضح القرآن [2] قصص الانبیاء للنجار ص ۲۱۲

خدائے تعالیٰ کے امتثال حکم کے لیے فرعون کے پاس چلنا اور اس کو پیغام الٰہی سنانا چاہیے۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ جب دونوں بھائی فرعون کے دربار میں جانے لگے تو والدہ نے غایت شفقت کی بنا پر روکنا چاہا کہ تم ایسے شخص کے پاس جانا چاہتے ہو جو صاحب تخت و تاج بھی ہے اور ظالم و مغرور بھی، وہاں نہ جاؤ وہاں جانا بے سود ہوگا، مگر دونوں نے والدہ کو سمجھایا کہ خدائے تعالیٰ کا حکم ٹالا نہیں جا سکتا، اور اس کا وعدہ ہے کہ ہم کامیاب ہوں گے۔

غرض دونوں بھائی اور خدا کے سچے پیغمبر و نبی فرعون کے دربار میں پہنچے اور بغیر خوف و خطر اندر داخل ہو گئے، جب فرعون کے تخت کے قریب پہنچے تو حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی اور گفتگو شروع ہوئی اور انہوں نے فرمایا:

"فرعون! ہم کو خدا نے اپنا پیغمبر اور رسول بنا کر تیرے پاس بھیجا ہے، ہم تجھ سے دو اہم باتیں چاہتے ہیں، ایک یہ کہ خدا پر یقین لا، اور کسی کو اس کا ساجھی اور سہیم نہ بنا، دوسرے یہ کہ ظلم سے باز آ، اور بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے نجات دے، ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یقین رکھ کہ یہ بناوٹ اور تصنع نہیں ہے اور نہ ہم کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ خدائے تعالیٰ کے ذمہ غلط بات لگائیں، ہماری صداقت کے لیے جس طرح ہماری یہ تعلیم خود شاہد ہے اسی طرح خدائے تعالیٰ نے ہم کو اپنی دو زبردست نشانیاں (معجزات) بھی عطاء فرمائی ہیں۔ لہٰذا تیرے لیے مناسب یہی ہے کہ صداقت و حق کے اس پیغام کو قبول کر اور بنی اسرائیل کو رستگاری دے کر میرے ساتھ کر دے تاکہ میں انہیں پیغمبروں کی اس سرزمین میں لے جاؤں جہاں بجز ذات واحد کے یہ اور کسی کی پرستش نہ کریں کہ یہی راہ حق ہے اور ان کے باپ دادوں کا ابدی شعار۔"

﴿وَ قَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ حَقِيْقٌ عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۰۴-۱۰۵)

"اور موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اے فرعون! میں جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا ایلچی ہوں، میرے لیے کسی طرح زیبا نہیں کہ اللہ پر حق اور سچ کے علاوہ کچھ اور کہوں، بلاشبہ میں تمہارے لیے تمہارے پروردگار کے پاس سے دلیل اور نشان لایا ہوں پس تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔"

فرعون نے جب یہ سنا تو کہنے لگا کہ "موسیٰ (علیہ السلام)! آج تو پیغمبر بن کر میرے سامنے بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کرتا ہے، وہ دن بھول گیا تو نے میرے ہی گھر میں پرورش پائی اور بچپن کی زندگی گذاری اور کیا تو یہ بھی بھول گیا کہ تو نے ایک مصری کو قتل کیا اور یہاں سے بھاگ گیا" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "فرعون! صحیح ہے کہ میں نے تیرے گھر میں پرورش پائی اور ایک مدت تک شاہی محل میں رہا۔ اور مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ غلطی کی بناء پر مجھ سے نادانستہ ایک شخص قتل ہو گیا اور میں اس خوف سے چلا گیا تھا، لیکن یہ خدائے تعالیٰ کی رحمت کا کرشمہ ہے کہ اس نے تمام بیکسانہ مجبوریوں کی حالت میں تیرے ہی گھرانے میں میری پرورش کرائی اور مجھ کو اپنی سب سے بڑی نعمت "نبوت و رسالت" سے سرفراز کیا۔

اے فرعون! کیا یہ طریقہ عدل و انصاف کا طریقہ ہوگا کہ مجھ ایک اسرائیلی کی پرورش کا بدل یہ ٹھہرے کہ بنی اسرائیل کی تمام قوم کو تو غلام بنائے رکھے؟"

﴿ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۱۶﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ﴿۱۷﴾ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّ لَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۙ﴿۱۸﴾ وَ فَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَ اَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ؕ﴿۲۰﴾ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾ وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ﴿۲۲﴾ ﴾ (الشعراء: ۱۶-۲۲)

"پھر وہ دونوں فرعون کے پاس آئے پس انہوں نے کہا: "ہم بلاشبہ جہانوں کے پروردگار کے پیغمبر اور ایلچی ہیں، یہ پیغام لے کر آئے ہیں کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے" فرعون نے کہا: "کیا ہم نے تجھ کو اپنے یہاں لڑکا سا نہیں پالا اور تو ہمارے یہاں ایک مدت نہیں رہا اور تو نے جو کچھ اس زمانے میں کام کیا وہ تجھے خود بھی معلوم ہے اور تو ناشکر گزار ہے" موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "میں نے وہ کام (مصری کا قتل) ضرور کیا اور میں اس میں چوک جانے والوں میں سے ہوں پھر یہاں سے تمہارے خوف سے بھاگ گیا، پھر میرے رب نے مجھ کو صحیح فیصلہ کی سمجھ دی اور مجھ کو اپنے پیغمبروں میں سے بنا لیا (یہ اس کی حکمت کی کرشمہ سازیاں ہیں) اور میری (پرورش) کا یہ احسان جس کو تو مجھ سے جتا رہا ہے کیا ایسا احسان ہے کہ تو بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھے۔"

سورۂ شعراء کی اس آیت ﴿وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ .... الخ﴾ کا ترجمہ عام مفسرین کی تفسیر کے مطابق کیا گیا ہے لیکن اس کے [...]س عبدالوہاب نجار اس آیت کے یہ معنی کرتے ہیں: "اور تیرا یہ انعام ہوگا اور تو مجھ پر احسان کرے گا کہ تو بنی اسرائیل کو عزت بخشے [...]ی ان کو میرے ساتھ بھیج دے کہ وہ اپنے خدا کی عبادت میں آزاد ہو جائیں۔"

اور اس معنی کے جواز میں فرماتے ہیں کہ "عبدت" بمعنی "کرمت" لغت عرب سے ثابت ہے، چنانچہ لسان العرب ص ۲۶۳ [...]۴ میں ہے "المعبد، المکرم" اور یہاں یہ معنی لینے اس لیے ضروری ہیں کہ قرآن عزیز میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ [...]لام کو یہ تلقین کر دی تھی کہ فرعون کے سمجھانے میں نرمی اور لطف و مہربانی کو پیش نظر رکھنا، غصہ یا سخت کلامی کا اظہار نہ کرنا لہٰذا حضرت [...]ی علیہ السلام سے یہ بعید ہے کہ وہ اس ہدایت الٰہی کے خلاف طعن و تشنیع یا معاریض و مجازات سے کام لیں جو رفق و تلطف کے قطعاً [...]ف ہے اور جو معنی عام مفسرین نے لیے ان میں طعن و معاریض کا پہلو نکلتا ہے۔ [1]

مگر نجار نے اس موقعہ پر جو کچھ کہا ہے وہ خود تکلف بارد اور رکیک تاویل کی حیثیت سے زیادہ نہیں ہے، اس لیے کہ عام [...]رین کے معنی کے مطابق یہاں نہ طعن و تشنیع ہے اور نہ معاریض و مجازات بلکہ روشن دلیل اور واضح حجت کے ذریعہ فرعون کو اس کی [...]روی اور متمردانہ سرکشی پر توجہ دلانا ہے جو ایک پیغمبر اور خدا کے سچے رسول کا فرض منصبی ہے۔

فرعون نے اپنی مغرورانہ سرشت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیغمبر خدا ہونے کا استخفاف کیا اور مذاق و تحقیر کرتے [...]ے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت سے بحث شروع کر دی، اپنے گھرانے کے احسان جتائے اور مصری کے قتل والا معاملہ یاد دلا کر [...]زدہ کرنے کی سعی کی مگر موسیٰ علیہ السلام چونکہ ان سب مراحل کے متعلق خدائے برحق سے ہر قسم کا اطمینان کر چکے تھے، اس لیے ان پر

[1] [...]ص الانبیاء عربی ۲۱۶

مطلق نہ خوف کا اثر ہوا اور نہ ان کو غصہ آیا، بلکہ انہوں نے فرعون کے گھرانے کی تربیت کا اعتراف بھی کیا اور مصری کے قتل کی غلطی کو بھی تسلیم کیا مگر ساتھ ہی ایک ایسا مسکت برہان اور خاموش کن دلیل بھی پیش کر دی کہ فرعون واقعی لاجواب ہو گیا اور اس نے ناراضی اور غصہ کے اظہار کی بجائے گفتگو کا پہلو فوراً بدل دیا اور موسیٰ علیہ السلام سے رب العالمین کے متعلق بات چیت شروع کر دی، اور وہ دلیل و حجت یہی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "تو نے جو کچھ کہا میری شخصیت اور ذات سے متعلق ہے لیکن کیا یہ باتیں اس کے لیے جواز کا سبب بن سکتی ہیں کہ بنی اسرائیل کی پوری قوم کو تو غلام بنائے رہے، یہ تو صریح ظلم ہے۔"

لہٰذا مفسرین کی تفسیر اور ترجمہ ہی صحیح ہے اور نجار کے ترجمہ کو تسلیم کر لینے کے بعد کلام کی تمام لطافت اور خوبی فنا ہو جاتی ہے اور سیاق وسباق کے ساتھ بھی بے تکلف اس کا جوڑ نہیں لگتا۔

ربوبیت الٰہی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام و فرعون کا مذاکرہ:

فرعون نے دوران گفتگو میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو یہ طعن کیا تھا کہ تو نے ہمارے یہاں تربیت پائی ہے اور میں تیرا مربی ہوں تو اس کے معنی صرف اسی قدر نہیں تھے بلکہ اس کی تہہ میں وہ عقیدہ کام کر رہا تھا جس کی شکست و ریخت کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث کیے گئے تھے یعنی سلطنت مصر کا بادشاہ صرف بادشاہ ہی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ "راع"[1] (سورج) کا اوتار مانا جاتا تھا اور اس لیے فرعون کے لقب سے ملقب تھا، مصریوں کے عقیدہ میں تربیت کائنات کا معاملہ "راع" دیوتا کے سپرد تھا اور دنیا میں اس کا صحیح مظہر شاہ مصر (فرعون) تھا، اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب خدائے واحد کی پرستش اور دیوتاؤں کی پوجا کے خلاف آواز بلند کی اور فرمایا ﴿اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ تو اول اس نے اپنی اور اپنے باپ دادا کی ربوبیت اس طرح ثابت کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت پر اس کا بوجھ پڑے، اور جب اس طرح اصل مسئلہ کو حل ہوتے نہ دیکھا تو اب مسئلہ کو زیادہ عریاں کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مناظرہ پر آمادہ ہو گیا اور کہنے لگا موسیٰ (علیہ السلام)! یہ تو نئی بات کیا سناتا ہے، کیا میرے علاوہ بھی کوئی رب ہے کہ جس کو تو رب العالمین کہتا ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو اس کی حقیقت بیان کر، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اگر تجھ میں یقین اور ایمان صحیح کی گنجائش ہے تو تجھ کو سمجھنا چاہیے کہ میں جس ہستی کو رب العالمین کہتا ہوں وہ ذات اقدس ہے جس کے قبضۂ قدرت میں آسمان، زمین اور ان دونوں کے درمیان کی کل مخلوقات کی ربوبیت ہے، فرعون! کیا تو دعویٰ کر سکتا ہے کہ ان آسمانوں، زمینوں اور ان کے تمام مخلوقات کو تو نے بنایا ہے یا ان کی ربوبیت کا کارخانہ تیرے ید قدرت میں ہے؟ اگر نہیں اور بلاشبہ نہیں! تو پھر رب العالمین کی ربوبیت عام سے انکار کیوں؟ فرعون نے یہ سنا تو درباریوں کی جانب مخاطب ہو کر تعجب اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا ﴿اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ﴾ کیا تم

---

[1] مصری مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے جن میں سے بعض تو خاص خاص قبیلوں اور علاقوں کے تھے، جیسے نیفات فتاہ اور مات اور بعض عالمگیر قوتوں کے الگ مظاہر تھے، جیسے ازیریں عالم آخرت کا خدا، سیہ ادرت آسمان کا خدا، کینمو، جسم بنانے والا، ایزیر روح بخشنے والی دیوی۔ طوطا عمر کی مقدار مقرر کرنے والا، ہوراس درد وغم دور کرنے والا، حاتو (گائے) رزق بخشنے والی دیوی، اور ان سب سے بلند تر آمن راع تھا یعنی سورج دیوتا۔

نیز مصریوں میں الوہیت آمیز شاہی کا تصور بھی پوری طرح نشو ونما پا چکا تھا اور تاجداران مصر نے نیم خدا کی حیثیت اختیار کر لی تھی، ان کا لقب "فاراع" اس لئے ہوا کہ وہ "راع" یعنی سورج دیوتا کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ (ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۴۶۲) ودائرۃ المعارف للبستانی جلد ۵ مادہ "راع"۔

ہو؟ یہ کیسی عجیب بات کہہ رہا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے درباریوں کے اس تعجب اور حیرانی کی پروانہ کرتے ہوئے اور اپنے سلسلہ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: "رب العالمین" وہ ہستی ہے جس کی ربوبیت کے اثر سے تیرا اور تیرے باپ کا وجود بھی خالی نہیں ہے، یعنی جس وقت تو عالم وجود میں نہ آیا تھا تو تجھ کو پیدا کیا اور تیری تربیت کی اور اسی طرح وہ تجھ سے پہلے تیرے آباء واجداد کو عالم وجود میں لایا اور ان کو اپنی ربوبیت سے نوازا، فرعون نے جب اس مسکت اور زبردست دلیل کو سنا اور کوئی جواب نہ بن پڑا تو درباریوں سے کہنے لگا: "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو خود کو تمہارا پیغمبر اور رسول کہتا ہے مجنون اور پاگل ہے" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ اس سے اب کوئی جواب نہیں بن پڑتا تو سوچا یہ بہتر ہے کہ اور زیادہ دل نشین پیرایہ بیان میں خدا کی ربوبیت کو واضح کیا جائے اس لیے فرمایا: یہ جو مشرق و مغرب اور اس کے درمیان ساری کائنات نظر آتی ہے اس کی ربوبیت جس کے ید قدرت میں ہے اسی کو میں "رب العالمین" کہتا ہوں، تم اگر ذرا بھی عقل و سمجھ سے کام لو تو بآسانی اس حقیقت کو پا سکتے ہو۔

غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ رب العالمین کے حکم کے مطابق برابر شیریں کلامی، نرم گفتاری اور رفق و لطف کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کو راہ حق دکھاتے اور رسالت کا فرض ادا فرماتے رہے اور فرعون کی تحقیر و توہین اور مجنون جیسے سخت الفاظ کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے اس کی رشد و ہدایت کے لیے بہترین دلائل اور مسکت جوابات دیتے رہے۔

﴿قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ۝ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۝ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝﴾

(الشعراء: ۲۳۔۲۸)

"بولا فرعون کیا معنی ہیں پروردگار عالم کے؟ کہا پروردگار آسمان اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے، اگر تم یقین کرو، بولا اپنے گرد والوں سے کیا تم نہیں سنتے ہو؟ کہا پروردگار تمہارا اور پروردگار تمہارے اگلے باپ دادوں کا، بولا تمہارا پیغام لانے والا جو تمہاری طرف بھیجا گیا ضرور باؤلا ہے، کہا پروردگار مشرق کا اور مغرب کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں موجود ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔"

ایک مرتبہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو یاد دلایا کہ جو راستہ تو نے اختیار کیا ہے یہ صحیح نہیں ہے بلکہ رب العالمین ہی وہ ذات ہے جو لائق پرستش ہے اور اس کے مقابلہ میں کسی انسان کا دعوائے ربوبیت کھلا ہوا شرک ہے، اے فرعون! تو اس سے باز آ کیونکہ اس ہستی نے جس کو میں رب العالمین کہہ رہا ہوں ہم پر یہ وحی نازل کی ہے کہ جو شخص اس قول حق کی خلاف ورزی اور تکذیب کرے گا اور اس سے منہ موڑے گا وہ خدا کے عذاب کا مستحق ٹھہرے گا۔

﴿اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۴۸)

"جو کوئی اور سرتابی کرے تو ہم پر وحی اتر چکی کہ اس کے لیے عذاب کا پیام ہے۔"

فرعون نے پھر وہی سوال دہرا دیا "اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں ایسی لاجواب بات کہی کہ فرعون حیران رہ گیا اور پہلو بدل کر بات کا رخ دوسری جانب پھیرنے کی اس طرح سعی کرنے لگا جس طرح باطل گوش مناظرین کا قاعدہ ہے کہ جب صحیح جواب نہ بن پڑے اور حقیقت حال صاف سامنے آ جائے تو پھر اس کو دبانے کے لیے کجروی کے ساتھ بات کا رخ دوسری جانب پھیر دیا کرتے ہیں۔

بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "ہمارا پروردگار تو وہ ایک ہی پروردگار ہے جس نے دنیا کی ہر چیز کو اس کا وجود بخشا اور پھر ہر طرح کی ضروری قوتیں (حواس و عقل وغیرہ) دے کر اس پر زندگی و عمل کی راہ کھول دی، جس نے ہر شئے کو نعمت جسم و وجود عطاء کی اور پھر سب کو منزل کمال کی طرف چلنے کی راہ دکھائی" تب فرعون نے لاجواب ہو کر بات کا رخ یوں بدلا کہنے لگا:

﴿قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۵۱)

"تو پھر پہلے لوگوں کا حال کیا ہوا"۔

مطلب یہ تھا کہ اگر تیری یہ بات صحیح ہے تو پھر ہم سے پہلے لوگ اور ہمارے باپ دادا جن کا عقیدہ تیرے عقیدے کی تائید میں نہ تھا کیا وہ سب عذاب میں گرفتار ہیں اور سب جھوٹے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی کج بحثی کو سمجھ گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ یہ اصل مقصد کو الجھانا چاہتا ہے اس لیے فوراً جواب دیا:

﴿قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝﴾ (طٰہٰ: ۵۲)

"ان پر کیا گذری اور ان کے ساتھ خدا کا کیا معاملہ رہا اس کی ذمہ داری نہ مجھ پر ہے اور نہ تجھ پر، ان کا علم میرے پروردگار کے پاس محفوظ ہے۔ ہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میرا پروردگار بھول چوک اور خطاء سے پاک ہے جس نے جو کچھ کیا ہے اس کے معاملہ میں کوئی بھول یا ظلم نہ ہوگا۔"

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر گفتگو کو اصل مسئلہ کی طرف پھیر دیا اور رب العالمین کے اوصاف کا ذکر کر کے مسئلہ کی حقیقت کو اچھی طرح واضح اور مستحکم بنایا۔

﴿قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۝ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ۝ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۴۹-۵۵)

"فرعون نے پوچھا "اگر ایسا ہی ہے تو بتلاؤ تمہارا پروردگار کون ہے اے موسیٰ؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر اس پر (زندگی و عمل کی) راہ کھول دی" فرعون نے کہا، پھر ان کا کیا حال ہونا ہے جو

پچھلے زمانوں میں گذر چکے ہیں؟ موسیٰ نے کہا، اس بات کا علم میرے پروردگار کے پاس نوشتہ میں ہے میرا پروردگار ایسا نہیں کہ کھویا جائے یا بھول میں پڑ جائے، وہ پروردگار جس نے تمہارے لیے زمین بچھونے کی طرح بچھا دی، نقل وحرکت کے لیے اس میں راہیں نکال دیں، آسمان سے پانی برسایا، اس کی آبپاشی سے ہر طرح کی نباتات کے جوڑے پیدا کر دیئے، خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشی بھی چراؤ، اس بات میں عقل والوں کے لیے کیسی کھلی نشانیاں ہیں؟ اس نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا، اسی میں لوٹنا ہے اور پھر اسی سے دوسری مرتبہ اٹھائے جاؤ گے۔"

ہندوستان کے ایک مشہور معاصر عالم نے سورہ طٰہٰ کی آیت ﴿كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰى﴾ میں "ہدایت" کے معنی رہنمائی حواس وعقل تسلیم کرتے ہوئے مفسرین کو بے محل موردِ طعن بنایا ہے کہ انہوں نے قرآن عزیز کی آیت زیر بحث کی روح کو نہ پاتے ہوئے غلطی سے یہاں بھی "ہدیٰ" کے معنی ہدایت دین مذہب کے لیے ہیں، اور گویا صرف انہوں نے ہی سب سے پہلی مرتبہ اس روح کو پہچانا اور اس حقیقت پر آگاہی حاصل کی ہے، حالانکہ چند مفسرین کے علاوہ قدیم اور جدید عام مفسرین اور محققین نے بھی اس مقام پر "ہدیٰ" کے وہی معنی بیان کئے ہیں جن کو اچھوتا اور طبع زاد بتایا گیا ہے۔ [1]

علماء تفسیر کہتے ہیں کہ فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کے ان مکالمات میں حضرت ہارون علیہ السلام دونوں کے درمیان ترجمان ہوتے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دلائل و براہین کو نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ ادا فرماتے تھے۔

بہر حال مختلف مجالس میں مکالمات کا یہ سلسلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان جاری رہا، فرعون، حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کے روشن اور پر از صداقت دلائل سن سن کر اگرچہ پیچ و تاب کھاتا مگر لاجواب ہو جانے کی وجہ سے کوئی صورت نہیں بنتی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام سے رستگاری حاصل کرے، وہ خوب جانتا تھا کہ میری ربوبیت اور الوہیت کی بنیاد اس قدر کمزور ہے کہ دلائل موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کے سامنے تارِ عنکبوت کی طرح تار تار ہو جاتی ہے اور درباری بھی اس کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لیے فرعون کے لیے یہ بات سخت ناقابل برداشت تھی، اور جس قلمرو میں اس کے رعب شاہی اور دبدبۂ حکومت کے ساتھ ساتھ اس کی ربوبیت و الوہیت کا جاہ وجلال بھی مانا جاتا ہو وہاں موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی جرأت حق اندر ہی اندر اس کو سخت خائف اور پریشان کر رہی تھی، اس لیے فرعون نے اب سلسلہ بحث کو ختم کرنے کے لیے دوسرے طریقے اختیار کئے جن میں اپنی طاقت وقہرمانیت کا مظاہرہ، مصری قوم کو موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے خلاف مشتعل کرنا اور "رب العالمین" سے جنگ کا اعلان کر کے اس بحث کا خاتمہ کر دینا شامل تھا، چنانچہ اس نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ﴾ (القصص: ۳۸)

"اور فرعون نے کہا اے جماعت میں تمہارے لیے اپنے سوائے کوئی خدا نہیں جانتا۔"

اور پھر (اپنے مشیر یا وزیر) ہامان کو حکم دیا:

---

[1] ثم هدى الى طريق الانتفاع والارتفاق بما اعطاه و عرفه كيف يتوصل الى بقائه كماله اما اختيارا كما فى الحيوانات او طبعًا كما فى الجماد... الخ (روح المعانی جلد ۱۶ ص ۱۸۳)

﴿فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝﴾ (القصص : ۳۸)

"اے ہامان! اینٹیں پکا اور ایک بہت بلند عمارت بنا شاید اس پر چڑھ کر میں موسیٰ (علیہ السلام) کے خدا کا پتہ لگا سکوں اور میں تو بلاشبہ اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔"

﴿وَ قَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ صُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ مَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ۝﴾ (المومن : ۳٦-۳۷)

"فرعون نے کہا! اے ہامان! میرے لیے ایک بلند عمارت تیار کرتا کہ میں آسمانوں کی بلندیوں اور ان کے ذرائع تک دسترس حاصل کر سکوں اور اس طرح موسیٰ (علیہ السلام) کے خدا کا حال معلوم کر سکوں اور میں تو اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں، اسی طرح فرعون کے لیے اس کی بدعملی کو خوبصورت کر دیا گیا اور وہ راہ حق سے (بدعملی پر اصرار کی وجہ سے) روک دیا گیا۔ اور فرعون کے مکر کا آخری انجام ہلاکت ہے۔"

حضرت شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہٗ موضح القرآن میں ارشاد فرماتے ہیں کہ آیت ﴿مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ﴾ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرعون دہری (ناسک) تھا اور کتب تفسیر و تاریخ میں جو مصر قدیم کے تاریخی حوالہ جات نقل کیے گئے ہیں ان سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ مصری دیوتاؤں کے پرستار تھے اور ان کا سب سے بڑا دیوتا "آمن راع" (سورج دیوتا) تھا اور وہ خدائے واحد کے کسی معنی میں بھی قائل نہ تھے بلکہ تمام کائنات کی تخلیق اور ان کے ہر قسم کے معاملات و حادثات کا تعلق کواکب و سیارات اور ان دیوتاؤں ہی سے متعلق سمجھتے تھے، غالباً فرعون اور اس کی قوم کا عقیدہ ہندوستان کے جین مت کے قریب قریب تھا کیونکہ جینی بھی خدا کے منکر مگر دیوتاؤں کے پرستار ہیں۔

ہامان:

ہامان کے متعلق قرآن عزیز نے کوئی تصریح نہیں کی کہ یہ کسی شخصیت کا نام ہے یا عہدہ اور منصب کا اور اس کا منصب وعدہ فرعون کے دربار میں کیا تھا، اور نہ اس نے اس پر روشنی ڈالی کہ ہامان نے عمارت تیار کرائی یا نہیں اور فرعون نے پھر اس پر چڑھ کر کیا کیا؟ کیونکہ یہ اس کے مقصد کے لیے غیر ضروری تھا، تورات نے بھی اس کے متعلق کوئی اشارہ نہیں کیا بلکہ اس نے فرعون کے عمارت بنانے کے حکم کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا، البتہ مفسرین نے یہ قصہ ضرور نقل کیا ہے کہ جب ہامان نے ایک بہت اونچا مینارہ تیار کرا کے فرعون کو اطلاع دی تو فرعون اس پر چڑھا اور تیر کمان ہاتھ میں لے کر آسمان کی طرف تیر پھینکا، قدرت الٰہی کے فیصلہ کے مطابق وہ تیر خون آلود ہو کر واپس ہوا فرعون نے یہ دیکھ کر غرور اور شیخی کے ساتھ مصریوں سے کہا کہ لو اب میں نے موسیٰ (علیہ السلام) کے خدا کا قصہ تمام کر دیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فرعون نے درباریوں، عام قبطیوں اور ہامان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنی شکست کو چھپانے کے لیے اگرچہ مسطورہ بالا طریقہ اختیار کیا مگر وہ خود بھی سمجھتا تھا کہ یہ ایک دھوکا ہے اور بس، اس سے دلوں کی تسلی نہیں ہو سکتی، اور بہت ممکن ہے کہ بہت سے مصری بھی اس کو سمجھتے ہوں تاہم درباریوں اور خواص و عوام میں ایک بھی ایسا "رجل رشید" نہ تھا جو جرأت و حق گوئی کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کر دیتا اور رشد و ہدایت کی قبولیت کا دروازہ وا کرتا۔

فرعون کے دربار میں "آیات اللہ" کا مظاہرہ:

غرض فرعون کا خدشہ بڑھتا ہی رہا، اس کو حق و باطل کی اس کشمکش میں اپنے لیے سخت خطرہ نظر آ رہا تھا اس لیے اس نے معاملہ کو صرف یہیں ختم نہیں کر دیا بلکہ ضروری سمجھا کہ اپنی سطوت و جبروت اور قہرمانیت، کا اثر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام پر بھی ڈالے اور اس طرح ان کو مرعوب کر کے پیغام حق کے فرض سے ان کو باز رکھے، چنانچہ کہنے لگا "موسیٰ (علیہ السلام)! اگر تو نے میرے سوائے اور کسی کو معبود قرار دیا تو میں تجھ کو قید میں ڈال دوں گا" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "اگرچہ میں تیرے پاس خدائے واحد کی جانب سے واضح نشان لے کر آیا ہوں تب بھی تیرے غلط راستے کو اختیار کر لوں؟" فرعون نے کہا: "اگر واقعی تو اس بارہ میں سچا ہے تو کوئی "نشان" دکھا۔"

﴿قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِىْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ۝ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَىْءٍ مُّبِيْنٍ ۝ قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝﴾ (الشعراء: ۲۹-۳۱)

"فرعون نے کہا اگر تو نے میرے سوائے کسی کو معبود بنایا تو میں تجھے ضرور قید کر دوں گا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا، اگرچہ میں تیرے پاس ظاہر نشان لایا ہوں تب بھی؟ فرعون نے کہا اگر تو سچا ہے تو وہ نشان دکھا۔"

﴿قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۰۶)

"فرعون نے کہا اگر تو اپنے خدا کے پاس کوئی نشانی لایا ہے تو اس بارے میں سچا ہے تو لا وہ نشان دکھا۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے اور بھرے دربار میں فرعون کے سامنے اپنی لاٹھی کو زمین پر ڈالا، اسی وقت اس نے اژدہا کی شکل اختیار کر لی اور یہ حقیقت تھی، نظر کا دھوکا نہ تھا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ہاتھ کو گریبان کے اندر لے جا کر باہر نکالا تو وہ ایک روشن ستارہ کی طرح چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا، یہ دوسری نشانی اور دوسرا معجزہ تھا۔

فرعون کے درباریوں نے جب اس طرح ایک اسرائیلی کے ہاتھوں اپنی قوم اور اپنے بادشاہ کی شکست کو دیکھا تو تلملا اٹھے اور کہنے لگے: بلاشبہ یہ بہت بڑا ماہر جادوگر ہے اور اس نے یہ سب ڈھونگ اس لیے رچایا ہے کہ تم پر غالب آ کر تم کو تمہاری سرزمین (مصر) سے باہر نکال دے، لہٰذا اب ہم کو سوچنا ہے کہ اس کے متعلق کیا ہونا چاہیے، آخر فرعون اور فرعونیوں کے باہمی مشورہ سے یہ طے پایا کہ فی الحال تو اس کو اور ہارون علیہ السلام کو مہلت دو اور اس دوران میں تمام قلمرو سے ماہر جادوگروں کو دارالسلطنت میں جمع کرو اور پھر موسیٰ (علیہ السلام) کا مقابلہ کراؤ، بلاشبہ یہ شکست کھا جائے گا اور اس کے تمام ارادے خاک میں مل جائیں گے، تب فرعون نے حضرت

موسیٰ علیہ السلام سے کہا: موسیٰ (علیہ السلام)! ہم خوب سمجھ گئے کہ تو اس حیلہ سے ہم کو سرزمین مصر سے بے دخل کرنا چاہتا ہے، لہٰذا اب تیرا علاج ہمارے درمیان مقابلہ کے دن کا معاہدہ ہونا چاہیے، اور پھر نہ ہم اس سے ٹلیں گے اور نہ تو وعدہ خلافی کرنا" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کام کے لیے سب سے بہتر وقت "یوم الزینۃ" (جشن کا روز) ہے، اس دن سورج بلند ہونے پر ہم سب کو میدان میں موجود ہونا چاہیے۔

﴿ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۚۖ وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ۠ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۙ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ وَ اَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۙ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝ ﴾ (الاعراف: ۱۰۷۔۱۱۲)

"پس موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی لاٹھی کو ڈالا پھر اچانک وہ "اژدہا" تھی صاف اور ظاہر اور اس نے ہاتھ کو گریبان سے نکالا تو دیکھنے والوں کے لیے چمکتا ہوا روشن تھا، فرعونیوں کی ایک جماعت نے کہا بلاشبہ یہ ماہر جادوگر ہے، اس کا ارادہ ہے کہ تم کو تمہاری سرزمین (مصر) سے نکال دے پس تمہارا کیا مشورہ ہے، انہوں نے کہا اس کو اور اس کے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو مہلت دو اور شہروں میں ایک جماعت کو بھیجو جو ماہر جادوگروں کو اکٹھا کر کے لائے۔"

﴿ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَ هٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ قَالَ مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ۝ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَ مَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝ ﴾ (یونس: ۷۵۔۷۹)

"پھر ہم نے ان رسولوں کے بعد موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو بھیجا، فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف، وہ ہماری نشانیاں اپنے ساتھ رکھتے تھے، مگر فرعون اور اس کے درباریوں نے گھمنڈ کیا، ان کا گروہ مجرموں کا گروہ تھا، پھر جب ہماری جانب سے سچائی ان میں نمودار ہوگئی تو کہنے لگے "یہ اس کے سواء کچھ نہیں ہے کہ جادو ہے۔صریح جادو" موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: "تم سچائی کے حق میں جب وہ نمودار ہوگئی ایسی بات کہتے ہو؟ کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر تو کبھی کامیابی نہیں پا سکتے، انہوں نے جواب میں کہا کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے دیکھا اس سے ہمیں ہٹا دو اور ملک میں تم دونوں بھائیوں کے لیے سرداری ہو جائے؟ ہم تو تمہیں ماننے والے نہیں اور فرعون نے کہا لاؤ میرے پاس ہر قسم کے ماہر ساحر۔"

﴿ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ۝ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَ

بَیْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَ لَاۤ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَ اَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾ (طٰهٰ : ۵۷-۵۹)

"اس نے کہا اے موسیٰ (علیہ السلام)! کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہمیں ہمارے ملک سے نکال باہر کرے؟ اچھا ہم بھی اسی طرح کے جادو کا کرتب لا دکھائیں گے، ہمارے اور اپنے درمیان ایک دن (مقابلہ کا) مقرر کر دے، نہ تو ہم اس سے پھریں نہ تو، دونوں کی جگہ برابر ہوئی، موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا "جشن کا دن تمہارے لیے مقرر ہوا، دن چڑھے لوگ اکٹھے ہو جائیں۔"

غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان "یوم الزینۃ" طے پا گیا، اور فرعون نے اسی وقت اپنے اعیان و ارکان کے نام احکام جاری کر دیئے کہ تمام قلمرو میں جو مشہور اور ماہر جادوگر ہوں ان کو جلد از جلد دار الحکومت روانہ کر دو۔

نجار مصری کہتے ہیں کہ غالباً یوم الزینۃ سے مصریوں کی عید کا وہ دن مراد ہے جو وفاء النیل کے نام سے مشہور ہے، کیونکہ ان کے یہاں تمام عیدوں میں سب سے بڑی عید کا دن یہی تھا۔ [1]

ساحرین مصر:

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی بعثت کا زمانہ مصری تمدن کی جو تاریخ پیش کرتا ہے اس میں یہ بات بہت نمایاں نظر آتی ہے کہ مصری علوم و فنون میں "سحر" کو ایک مستقل علم و فن کی حیثیت حاصل تھی اور اسی بنا پر ساحرین کا رتبہ مصریوں میں بہت بڑا سمجھا جاتا تھا، حتیٰ کہ ان کو شاہی دربار میں بھی بڑا رسوخ حاصل تھا اور جنگ و صلح، پیدائش و وفات کی زائچہ کشی اور اہم سرکاری معاملات میں بھی انہیں کی جانب رجوع کیا جاتا تھا اور ان کے ساحرانہ نتائج کو بڑی وقعت دی جاتی تھی، حتیٰ کہ مذہبی معاملات میں بھی ان کو اہم جگہ دی جاتی تھی، قدیم شاہی مقبروں میں ممی (حنوط شدہ نعشوں) کے ساتھ جو کاغذات و دستاویزات برآمد ہوئی ہیں اور ان حجروں میں جو تصاویر و نقوش پائے جاتے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

قدیم قوموں کی عام گمراہیوں میں سے ایک گمراہی یہ بھی رہی ہے کہ وہ جادو پر مذہبی حیثیت سے اعتقاد رکھتے اور اس کو اپنی مذہبی زندگی میں اثر انداز یقین کرتے تھے، اور اسی اعتقاد کے پیش نظر وہ اس کو سیکھتے اور سکھاتے بھی تھے اور اس میں طرح طرح کی ایجادات و اختراعات کرتے رہتے تھے، چنانچہ بابل (عراق) مصر چین اور ہندوستان کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔

یہی وجہ تھی کہ مصری قوم پر فرعون اور اس کے اعیان و ارکان حکومت کا یہ جادو چل گیا، کہ موسیٰ جادوگر ہے، اور یہ اپنے جادو کی مہارت کے اثر و رسوخ کو کام میں لا کر مصری حکومت پر قابض ہونا اور تم کو اس سے خارج کر دینا چاہتا ہے اور اب اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اپنے قلمرو کے ماہر جادوگروں کو جمع کر کے موسیٰ (علیہ السلام) کو شکست دے دی جائے اور اس کی چال کو پادر ہوا بنا دیا جائے، موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس بات کو اس لیے غنیمت جانا کہ وہ خدائے تعالیٰ کے جس قدر نشانات (معجزات) فرعون اور قوم فرعون کو دکھا چکے تھے انہوں نے ان کو یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ یہ تو جادو اور سحر ہے، لہٰذا اب جبکہ ساحروں اور جادوگروں سے مقابلہ کے بعد بھی خدا کا معجزہ

---

[1] قصص الانبیاء

غالب رہے گا تو ناچار ان کو صداقت اور حق کے سامنے جھکنا پڑے گا، اور اقرار کیے بغیر کوئی چارہ نہیں رہے گا، نیز یہ سوچا کہ اگرچہ "وحی الٰہی" کے یقین اور روشن حجت و برہان کے ذریعہ "آیات اللہ" (معجزات) کی صداقت کا کافی یقین دلایا جا چکا ہے تاہم فرعون اور اعیان سلطنت ہمیشہ ان واقعات کو سحر اور جادو کہہ کر عوام کو اصل حقیقت سے بے خبر رکھنے کی کوشش کرتے رہے یا شدید حسد اور تعصب نے خود ان کو بھی حقیقی روشنی سے محروم رکھا، پس اگر جشن کے روز خواص و عوام کے مجمع میں ساحر اور جادوگر عاجز ہو کر میری صداقت کا اقرار کر لیں تو پھر کسی کو بھی لب کشائی کا موقع نہ رہے گا اور برسر عام حق کا مظاہرہ منصب تبلیغ کے لیے بہترین ذریعہ ثابت ہوگا۔

سحر:

لغت میں "سحر" کے معنی امر خفی اور پوشیدہ چیز کے ہیں، چنانچہ صبح کے اول وقت کو "سحر" اس لیے کہتے ہیں کہ ابھی دن کی روشنی پوری طرح نمودار نہیں ہوئی اور قدرے تاریکی ہے، اور علمی اصطلاح میں ایسے عجیب و غریب امور کا نام ہے جن کے وجود پذیر ہونے کے اسباب نظر سے اوجھل ہوں اور بادی النظر میں محسوس نہ ہوتے ہوں

اعلم ان لفظ السحر فی عرف الشرع مختص بکل امر یخفی سببه ویتخیل علی غیر حقیقة.... الخ [1]

"واضح رہے کہ لفظ "سحر" شریعت کی اصطلاح میں ایسے امر کے لیے مخصوص ہے جس کا سبب پوشیدہ ہو اور وہ اصل حقیقت کے خلاف خیال میں آنے لگے۔

"سحر" کی حقیقت کچھ ہے یا وہ محض نظر کا دھوکا اور بے حقیقت شئے ہے؟ اس کے متعلق جمہور علماء اہل سنت کی یہ رائے ہے کہ سحر واقعی ایک حقیقت ہے اور مضرت رساں اثرات رکھتا ہے، حق تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ اور مصلحت کاملہ کے پیش نظر اس میں اسی طرح مضر اثرات رکھ دیئے ہیں جس طرح زہر میں یا دوسری نقصان رساں ادویہ میں، یہ نہیں ہے کہ "سحر" قدرت الٰہی سے بے نیاز ہو کر "العیاذ باللہ" خود مؤثر الذات ہے کیونکہ یہ عقیدہ تو کفر خالص ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ صاحب احکام القرآن، ابواسحاق رحمۃ اللہ علیہ اسفرائنی شافعی علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ ظاہری اور معتزلہ کہتے ہیں کہ "سحر" کی حقیقت شعبدہ نظر بندی، اور فریب خیال کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے بلاشبہ وہ ایک باطل اور بے حقیقت شئے ہے، چنانچہ ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ رازی فرماتے ہیں۔

"اور جب "سحر" کو کسی قید کے بغیر استعمال کیا جائے تو وہ ایک ایسے امر کا نام ہے جو محض دھوکا اور باطل ہو کہ جس کی اس سے زیادہ نہ کوئی حقیقت ہو اور نہ اس کو ثبات حاصل ہو۔" [2]

اور حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

و قد ذکر الوزیر ابوالمظفر یحیٰی بن محمد بن هبیرة فی کتابه "الاشراف فی مذهب الاشراف" بابا فی السحر فقال اجمعوا علی ان السحر له حقیقة الا ابا حنیفة رحمة الله علیه فانه قال لا حقیقة له عنده. [3]

"اور وزیر ابوالمظفر یحییٰ بن محمد بن ہبیرہ نے اپنی کتاب "الاشراف فی مذہب الاشراف" میں ایک باب سحر کے متعلق بھی

---

[1] تفسیر کبیر ج ۱ ص ۴۲۰ [2] احکام القرآن ج ۱ ص ۴۸ [3] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۴۷

رکھا ہے، اس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ سحر کی بھی حقائق کی طرح ایک حقیقت ہے مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ قطعاً بے حقیقت شئے ہے۔"

قال ابوعبداللہ القرطبی و عندنا ان السحر حق و له حقيقة و يخلق الله عنده مايشاء خلافاً للمعتزلة و ابی اسحٰق الاسفرائينی من الشافعية حيث قالوا انه تمويه او تخييل.... الخ۔ [1]

"ابوعبداللہ قرطبی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سحر حقیقت ہے اور ایک واقعی شئے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے جو چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے، مگر معتزلہ اور شوافع میں سے ابواسحاق اسفرائنی اس قول کے مخالف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ سحر محض فریب نظر اور خیال بندی کا نام ہے۔"

اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

واختلف فی السحر فقيل هو تخييل فقط ولا حقيقة له و هذا اختيار ابی جعفر الاسترابادی من الشافعية ابی بكر الرازی من الحنفية و ابن حزم الظاهری و طائفة قال النووی و الصحيح ان له حقيقة و به قطع الجمهور و عليه عامة العلماء۔ [2]

"اور سحر کے متعلق اختلاف ہے، بعض نے یہ کہا ہے کہ وہ فقط تخییل کا نام ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور یہ ابوجعفر شافعی، ابوبکر رازی حنفی اور ابن حزم ظاہری اور ایک چھوٹی جماعت کا خیال ہے، اور نووی فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ "سحر" حقائق میں سے ایک حقیقت ثابتہ ہے اور جمہور اسی پر یقین رکھتے ہیں اور عام علماء کا یہی مسلک ہے۔"

اور جو علماء سحر کو "حقیقت" تسلیم کرتے ہیں ان کے درمیان پھر یہ اختلاف رائے ہے کہ کیا خدائے تعالیٰ نے "سحر" میں یہ تاثیر بخشی ہے کہ وہ حقائق اور ماہیات میں بھی انقلاب کر دے یا مضرت رساں اشیاء کی طرح صرف نقصان دہ ہے اور یہ ناممکن ہے کہ اس کے اثر سے انسان کی حقیقت گھوڑے میں تبدیل ہو جائے یا گدھا مثلاً انسان ہو جائے، پس ایک چھوٹے سے گروہ کا خیال یہ ہے کہ اس کے اندر انقلاب ماہیت کی تاثیر بھی ودیعت ہے اور جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس میں یہ تاثیر قطعاً ودیعت نہیں اور سحر کے ذریعہ کسی بھی ماہیت کا انقلاب نہیں ہوتا بلکہ اس مرحلہ پر وہ محض نظر بندی اور قوت متخیلہ کی شعبدہ بازی کے سواء اور کچھ نہیں ہوتا، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لكن محل النزاع هل يقع بالسحر انقلاب عين اولا فمن قال انه تخييل فقط منع ذلك و من قال ان له حقيقة اختلفوا هل له تاثير فقط بحيث يغير المزاج فيكون نوعاً من الامراض او ينتهی الی الاحالة بحيث يصير الجماد حيواناً مثلاً و عكسه فالذی عليه الجمهور هو الاول و ذهبت طائفة قليلة الی الثانی.... الخ [3]

"لیکن محل نزاع یہ امر ہے کہ سحر سے ذات کا انقلاب ہو جاتا ہے یا نہیں پس جس شخص نے یہ کہا ہے کہ محض تخییل کا نام ہے وہ تو انقلاب کے منکر ہیں اور جو سحر کو حقیقت مانتے ہیں وہ اس بارہ میں مختلف الرائے ہیں آیا سحر کی تاثیر اسی حد تک ہے کہ مزاج میں اس قسم کے تغیرات پیدا کر دے جس طرح امراض میں ہوا کرتا ہے اور وہ بھی ایک مرض شمار ہو یا اس کی تاثیر اس

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۴۷ [2] فتح الباری ج ۱۰ ص ۱۸۲ [3] فتح الباری ج ۱ ص ۱۸۴، احکام القرآن ج ۱ ص ۵۰

سے زیادہ ہے کہ ایک شے کی حقیقت کو بدل ڈالے مثلاً جماد کو حیوان بنا دے یا اس کا عکس کر دے پس جمہور پہلی بات کے قائل ہیں اور ایک چھوٹی سی جماعت دوسری بات کی۔"

اور اس تمام ایں وآں کے بعد ساحرین فرعون کے اس ساحرانہ مظاہرہ کے متعلق جو جشن کے دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں کیا گیا، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ تصریح کرتے ہیں کہ تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ محض تخییل اور تمویہ کی حد تک تھا اور ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ اور ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ دونوں یہ تفصیل دیتے ہیں کہ ساحرین فرعون کی لاٹھیاں اور چمڑے کی رسیاں سانپ نہیں بن گئی تھیں بلکہ ان کے اندر پارہ بھر دیا گیا تھا اور جس زمین میں یہ مظاہرہ کیا گیا تھا اس کو کھوکھلا کر کے اس کے اندر آگ بھر دی گئی تھی، چنانچہ وقت معین پر نیچے کی گرمی سے پارہ میں حرکت پیدا ہوگئی اور وہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ کی طرح دوڑتی نظر آنے لگیں۔ [1]

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر میں "سحر" پر بحث کرتے ہوئے لغوی معنی کے پیش نظر ان تمام اشیاء کو بھی اقسام سحر میں شمار کرایا ہے جو عام نگاہوں میں تعجب خیز اور حیرت انگیز سمجھی جاتی ہیں، مثلاً مسمریزم، ہپناٹزم، تعویذات، حیرت انگیز نقاشی اور سائنس کی ایجادات اور دنیا کے مختلف عجائبات حتیٰ کہ مقرر کی جادو بیانی کو بھی اس عمومیت میں شامل کر لیا ہے، ایک موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا: ((اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا))۔ [2] "بلاشبہ بعض بیان جادو ہوتے ہیں۔"

پس یہ واضح رہے کہ ان اقسام کا اس "سحر" سے کوئی دور کا بھی علاقہ نہیں ہے جو مذہب اور اخلاق کی نگاہ میں مذموم، گمراہی یا کفر سمجھا جاتا ہے۔

سحر اور مذہب:

فقہائے اسلام نے "سحر" کے متعلق تصریح کی ہے کہ جن اعمال سحر میں شیاطین ارواح خبیثہ، اور غیر اللہ، سے استعانت کی جائے اور ان کو حاجت روا قرار دے کر منتروں کے ذریعہ ان کی تسخیر سے کام لیا جائے تو وہ شرک کے مترادف ہے، اور اس کا عامل کافر ہے۔ اور جن اعمال میں ان کے علاوہ دوسرے طریقے استعمال کیے جائیں اور ان سے دوسروں کو نقصان پہنچایا جائے ان کا مرتکب حرام اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے۔ قرآن عزیز میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں مذکور ہے۔

﴿ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ﴾ (البقرہ: ۱۰۲)

"اور سلیمان (علیہ السلام) نے کفر نہیں کیا لیکن شیاطین نے کفر کیا سکھاتے تھے وہ لوگوں کو سحر۔"

اور حدیث میں ہے:

((ان رسول اللہ ﷺ قال اِجْتَنِبُوا الْمُوْبِقَاتِ الشِّرْكُ بِاللّٰهِ وَالسِّحْرُ))۔ [3]

---

[1] یہ تفصیل ہے ان اقوال کی جو سحر کے متعلق علماء سلف و خلف میں دائر رہے ہیں، ہم نے فریقین کے دلائل اور ان سے متعلق معرکۃ الآراء مباحث کو اس مقام پر قصداً ترک کر دیا ہے اس لئے کہ اس حیثیت سے اس مسئلہ کو چھیڑنا ایسی طوالت کا باعث ہے جو ہم کو کتاب کے مقصد سے دور لے جاتا ہے اور اختصار کے ساتھ بیان کرنا بجائے فائدہ کے نقصان دہ نظر آتا ہے۔

[2] بخاری جلد ۲ باب السحر [3] فتح الباری ج ۱۰ ص ۱۸۳

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مہلک باتوں سے بچو یعنی شرک سے اور جادو سے۔"

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ "حدیث سحر" پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قال النووی عمل السحر حرام و هو من الکبائر بالاجماع و قد عدّه النبی ﷺ من السبع الموبقات و منه ما یکون کفرا و منه لا یکون کفرا بل معصیة کبیرة فان کان فیه قول او فعل یقتضی الکفر فهو کفر و الا فلا و اما تعلمه و تعلیمه فحرام.... الخ [1]

"نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں عمل سحر حرام ہے اور وہ بالاجماع کبائر میں سے ہے اور نبی اکرم ﷺ نے اس کو سات مہلک چیزوں میں سے شمار کیا ہے اور سحر کی بعض صورتیں کفر ہیں اور بعض کفر تو نہیں ہیں مگر سخت معصیت ہیں پس اگر سحر کا کوئی منتر یا کوئی عمل کفر کا مقتضی ہے تو وہ کفر ہے ورنہ نہیں، بہرحال سحر کا سیکھنا اور سکھانا قطعاً حرام ہے۔"

معجزہ اور سحر میں فرق:

علماء اسلام میں یہ بحث ہمیشہ سے معرکتہ الآراء رہی ہے کہ سحر اور معجزہ میں کیا فرق ہے؟ ایک شخص یہ کیسے اندازہ لگائے کہ یہ نبی و پیغمبر کا معجزہ ہے یا ساحر اور جادوگر کا سحر اور جادو؟ اس سلسلہ میں جو اہم علمی دلائل و براہین پیش کئے گئے ہیں اس کے لیے "علم کلام" کی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے، خصوصاً شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب النبوات اور شیخ محمد سفارینی کی شرح عقیدہ سفارینی قابل مطالعہ ہیں، البتہ اس مقام پر ایک سہل الوصول اور آسان دلیل پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نبی اور رسول کا اصل معجزہ اس کی وہ تعلیم ہوتی ہے جو وہ گم گشتگان راہ حق اور بھٹکی ہوئی قوموں کی ہدایت کے لیے نسخہ کیمیاء اور دینی و دنیوی فلاح و کامرانی کے لیے بےنظیر قانون کی شکل میں پیش کرتا ہے یعنی "کتاب اللہ" لیکن جس طرح ارباب علم و حکمت اس کے لائے ہوئے علوم و حکم اور بتائی ہوئی رشد و ہدایت کی صداقت و کمال کو پرکھتے ہیں اسی طرح عام انسانی دنیا کی سرشت و نہاد اس پر قائم ہے کہ وہ سچائی اور صداقت کے لیے بھی بعض ایسی چیزوں کے خواہش مند ہوتے ہیں جو لانے والے کے روحانی کرشموں سے تعلق رکھتی ہوں اور جن کے مقابلہ سے تمام دنیوی طاقتیں عاجز ہو جاتی ہوں کیونکہ ان کا مبلغ علم کسی صداقت کے لیے اسی کو معیار قرار دیتا ہے۔

اس لیے "سنت اللہ" یہ جاری رہی ہے کہ وہ انبیاء و رسل کو دین حق کی تعلیم و پیغام کے ساتھ ایک یا چند "نشانات" (معجزات) بھی عطاء کرتا ہے، اور جب وہ دعوائے نبوت کے ساتھ بغیر اسباب کے ایسا "نشان" دکھاتا ہے جس کا کوئی دنیوی طاقت مقابلہ نہیں کر سکتی تو اس کا نام "معجزہ" ہوتا ہے۔

اور اسی لیے یہ بھی "سنت اللہ" ہے کہ کسی نبی و رسول کو جو معجزہ یا نشان دیا جاتا ہے وہ اسی نوع میں سے ہوتا ہے جس میں اس قوم کو جس کو کہ سب سے پہلے اس پیغمبر نے خطاب کیا ہے "درجہ کمال" حاصل ہو۔ اور وہ اس کے تمام دقائق سے بخوبی آگاہ ہوتا کہ اس کو یہ سمجھنے میں آسانی ہو سکے کہ پیغمبر کا یہ نشان انسانی اور بشری طاقت سے بالاتر قوت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اگر تعصب اور ہٹ دھرمی

---

[1] فتح الباری ج ۱۰ ص ۱۸۳

حائل نہ ہو تو وہ بے ساختہ یہ اقرار کرلے کہ:

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اسی طرح ہر فرد بشر پر خدا کی حجت تمام ہو جائے۔

پس معجزہ دراصل براہ راست خدائے تعالیٰ کا فعل ہے جو بغیر اسباب کے ایک صادق کی صداقت کے لیے وجود میں آتا ہے، اور وہ کسی اصول وقوانین پر مبنی نہیں ہوتا کہ ایک فن کی طرح سیکھا جا سکے اور نبی ہر وقت اس کے کر دکھانے پر قادر ہو، تاوقتیکہ مخالفین صداقت کے سامنے بطور تحدی (چیلنج) اس کو دکھانے کی ضرورت پیش نہ آجائے، سو جب وہ اہم وقت آتا ہے اور "نبی" خدا سے رجوع کرتا ہے تو خدائے تعالیٰ کی جانب سے اس کو کر دکھانے کی قوت عطاء ہو جاتی ہے، بخلاف سحر اور جادو کے کہ وہ ایک "فن" ہے کہ جس کو اس کے اصول وقوانین کی پابندی کے ساتھ ہر فن دان ساحر ہر وقت کام میں لا سکتا ہے، اس کے اسباب اگرچہ عام نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ لیکن اس فن کے تمام واقف کار اس سے واقف ہوتے ہیں اسی لیے وہ دوسرے علوم وفنون کی طرح مدون و مرتب فن ہے جس کو مصریوں، چینیوں اور ہندیوں نے بہت فروغ دیا اور حد کمال کو پہنچایا۔

یہ مسئلہ کی علمی حیثیت ہے کہ جس سے معجزہ اور سحر کی حدود قطعاً جدا اور متمائز ہو جاتی ہیں، رہا حس اور مشاہدہ کا معاملہ تو "معجزہ" اور "سحر" میں یہ فرق ہے کہ ساحر کی عام زندگی خوف ودہشت ایذاء رسانی اور بدعملی سے وابستہ ہوتی ہے اور لوگ اس نظر سے ساحر سے خوف کھاتے ہیں یا اس کے سامنے مرعوب ہو جاتے ہیں، بخلاف نبی اور رسول کے کہ اس کی تمام زندگی صداقت خلوص، مخلوق خدا کی ہمدردی وغمگساری اور تقویٰ وطہارت سے وابستہ ہوتی ہے اور اس کا کردار بے داغ اور صاف اور روشن ہوتا ہے، اور وہ معجزہ کو پیشہ نہیں بناتا بلکہ خاص اہم موقع پر صداقت اور حق کی حمایت میں اس کا مظاہرہ کرتا ہے اور وہ ایسے وقت معجزہ دکھاتا ہے جبکہ دشمن بھی اس کی عصمت وصداقت اور کردار کی پاکیزگی کے پہلے سے معترف ہوتے ہیں مگر اس کی دعوت کو یا شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یا جحود وانکار کے نقطہ نظر سے، اور پھر اس سے معجزہ کے طالب ہوتے ہیں، نیز اگر سحر اور معجزہ کا مقابلہ آن پڑے تو معجزہ غالب رہے گا اور اعلیٰ سے اعلیٰ سحر بھی مغلوب وعاجز، اور اس کا عکس محال اور ناممکن ہے، چنانچہ ساحرین اور انبیاء ورسل کے مقابلہ کی تاریخ اس کی شاہد عدل ہے۔

الحاصل موسیٰ علیہ السلام کو عصاء اور ید بیضاء کے نشانات (معجزہ) اس لیے عطا کیے گئے کہ ان کے زمانے میں مصر سحر اور جادو کا مرکز تھا اور فن سحر شباب پر، اور مصریوں نے تمام دنیا کے مقابلہ میں اس کو اوج کمال تک پہنچا دیا تھا۔

لہٰذا "سنت اللہ" کا تقاضا تھا کہ ایسے زمانہ میں موسیٰ علیہ السلام کو ایسے نشانات (معجزات) عطاء کیے جائیں جو اسی نوع سے متعلق ہوں تاکہ جب انکار پر اصرار حد سے بڑھ جائے اور معاندین ومخالفین اپنے محیر العقول سحر اور جادو کے ذریعہ ان کے مقابلہ پر آجائیں تو خدا کے نشان (معجزات وآیات اللہ) مخالفوں کو یہ باور کرا دیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس جو قوت وطاقت ہے وہ انسانی صنعتوں اور عجوبہ کاریوں سے بلند اور بشری دسترس سے باہر ہے، اور اس طرح عوام وخواص کو ان کی صداقت اور ان کے "مِنَ اللہِ" ہونے کا یقین آجائے اور خواہ زبان اقرار کرے یا نہ کرے لیکن ان کا عجز اور ان کی درماندگی علی رؤس الاشہاد ان کے دلوں کے اقرار کی شہادت دینے لگے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساحروں کا مقابلہ:

بہرحال یوم جشن آ پہنچا، میدان جشن میں تمام شاہانہ کروفر کے ساتھ فرعون تخت نشین ہے اور درباری بھی حسب مراتب قرینے سے بیٹھے ہیں اور لاکھوں انسان حق و باطل کے معرکہ کا نظارہ کرنے کو جمع ہیں، ایک جانب مصر کے مشہور جادوگروں کا گروہ اپنے ساز و سامان سحر سے لیس کھڑا ہے اور دوسری جانب خدا کے رسول حق کے پیغامبر، سچائی اور راستی کے پیکر حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کھڑے ہیں، فرعون بہت مسرور ہے اور اس یقین پر کہ ساحرین مصر ان دونوں کو جلد ہی شکست دے دیں گے ساحروں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے، اگر تم نے موسیٰ علیہ السلام کو شکست دے دی تو نہ صرف انعام و اکرام سے مالا مال کیے جاؤ گے بلکہ میرے دربار میں خاص جگہ پاؤ گے، ساحر بھی اپنی کامیابی کے یقین پر فرعون سے اپنے اعزاز و اکرام کا وعدہ لے رہے ہیں، اور مستقبل کے تصور سے بہت شاداں اور مسرور ہیں۔

﴿وَ جَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۱۳۔۱۱۴)

"اور جادوگر فرعون کے پاس آئے اور کہنے لگے کیا اگر ہم موسیٰ (علیہ السلام) پر غالب آ جائیں تو ہمارے لیے انعام و اکرام ہے؟ فرعون نے کہا ہاں ضرور، اور یہی نہیں بلکہ تم مقربین بارگاہ شاہی بنو گے۔"

﴿فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ وَّ قِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ۝ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝﴾ (الشعراء: ۳۸۔۴۲)

"پھر وعدہ کے دن جادوگر جمع ہو گئے، اور لوگوں سے کہا گیا کہ تم (اس میدان میں جمع ہو گے، شاید ہم جادوگروں کی پیروی کریں اگر وہ غالب رہیں، سو جب جادوگر آ گئے تو انہوں نے فرعون سے کہا کیا ہمارے لیے انعام ہے اگر ہم غالب رہیں؟ فرعون نے کہا ہاں، اور تم اس صورت میں (ہمارے) مقربین میں سے ہو گے۔"

جادوگروں نے جب اس طرف سے اطمینان کر لیا تو اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے مگر قبل اس کے کہ ایک دوسرے کو چیلنج کریں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تبلیغ ادا فرماتے ہوئے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا: تمہاری حالت پر سخت افسوس ہے، تم کیا کر رہے ہو؟ تم ہم کو جادوگر کہہ کر خدا پر جھوٹا الزام نہ لگاؤ، مجھ کو ڈر ہے کہ کہیں وہ تم کو اس بہتان طرازی کی سزا میں عذاب دے کر جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکے، کیونکہ جس کسی نے بھی بہتان باندھا وہ نامراد ہی رہا، لوگوں نے یہ سنا تو آپس میں ردّ و کد شروع کر دی اور سرگوشیاں کرنے لگے اور درباریوں نے یہ حال دیکھا تو جادوگروں کو مخاطب کر کے کہنے لگے یہ دونوں بھائی بلاشبہ جادوگر ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ جادو کے زور سے تم کو تمہارے وطن سے نکال دیں اور تم پر غلبہ کر لیں، تم اپنا کام شروع کرو اور پرے باندھ کر موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ڈٹ جاؤ آج جو بھی غالب آ جائے گا وہی کامیاب ثابت ہو گا۔

﴿ قَالَ لَهُمْ مُّوسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ۝ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَ اَسَرُّوا النَّجْوٰى ۝ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ۝ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ۝ ﴾ (طٰہٰ: ٦١-٦٤)

"موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا افسوس تم پر، دیکھو اللہ پر جھوٹی تہمت نہ لگاؤ، ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی عذاب بھیج کر تمہاری جڑ اکھاڑ دے جس کسی نے جھوٹ بات بنائی وہ ضرور نامراد ہوا بس لوگ آپس میں رَد و کد کرنے لگے اور پوشیدہ سرگوشیاں شروع ہو گئیں، پھر (درباری) بولے یہ دونوں بھائی ضرور جادوگر ہیں، یہ چاہتے ہیں اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال باہر کریں اور پھر تمہارے شرف اور تمہاری عظمت کے مالک ہو جائیں، پس اپنے سارے داؤں جمع کرو اور پرا باندھ کر ڈٹ جاؤ، جو آج بازی لے گیا وہی کامیاب ہوگا۔"

جادوگروں نے آگے بڑھ کر موسیٰ علیہ السلام سے کہا، موسیٰ علیہ السلام! اس قصہ کو چھوڑ اور یہ بتا کہ ابتداء تیری جانب سے ہوگی یا ہماری جانب سے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ ان پر اس تنبیہ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تو فرمایا کہ ابتداء تم ہی کرو، اور اپنے کمال فن کی پوری حسرت نکال لو، چنانچہ ساحروں نے اپنی رسیاں، بان اور لاٹھیاں زمین پر ڈالیں جو سانپ اور اژدھے کی شکل میں دوڑتی نظر آنے لگیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھا تو دل میں خوف و ہراس محسوس کیا کہ کہیں لوگ اس مظاہرہ سے متاثر نہ ہو جائیں اور ساحروں کے سحر کو حقیقت نہ سمجھ لیں، کیونکہ اگر ایسا ہوا تو یہ تاثر اور رعب قبول حق کے لیے سدراہ بن جائے گا، تب خدائے تعالیٰ نے ان کو مطمئن فرمایا اور وحی کے ذریعہ مطلع کیا کہ موسیٰ خوف نہ کھاؤ ہمارا وعدہ ہے کہ تم ہی غالب رہو گے، اپنی لاٹھی کو زمین پر ڈالو، موسیٰ علیہ السلام نے جب لاٹھی کو ڈالا تو اژدھا بن کر اس نے ساحروں کے تمام شعبدوں کو نگل لیا اور تھوڑی سی دیر میں سارا میدان صاف ہو گیا، اور اس طرح ساحر اپنے سحر میں ناکامیاب رہے۔

﴿ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَ اِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ۝ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ۝ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۝ وَ اَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَ لَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ۝ ﴾ (طٰہٰ: ٦٥-٦٩)

"جادوگروں نے کہا "اے موسیٰ (علیہ السلام)! تم پہلے اپنی لاٹھی پھینکو یا پھر ہماری طرف سے پہل ہو" موسیٰ نے کہا نہیں تم ہی پہلے پھینکو، چنانچہ انہوں نے اپنا کرتب دکھایا اور اچانک موسیٰ (علیہ السلام) کو ان کے جادو کی وجہ سے ایسا دکھائی دیا کہ ان کی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ کی طرح دوڑ رہی ہیں، موسیٰ (علیہ السلام) نے دل میں ہراس محسوس کیا (کہ اس منظر سے لوگ متاثر نہ ہو جائیں) ہم نے کہا "اندیشہ نہ کر تو ہی غالب ہوگا، تیرے دائیں ہاتھ میں جو لاٹھی ہے فوراً پھینک دے جادوگروں کی تمام بناوٹیں نگل جائے گی، انہوں نے جو کچھ کیا ہے محض جادوگروں کا فریب ہے، اور جادوگر کسی راہ سے آئے کبھی کامیابی نہیں پا سکتا۔"

﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَ اِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَ جَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَ انْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾﴾ (الاعراف: ۱۱۵-۱۱۹)

"جادوگروں نے کہا اے موسیٰ (علیہ السلام)! یا تم اپنی لاٹھی پھینکو یا پھر ہم پھینکیں، موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا تم ہی پہلے پھینکو، پھر جب جادوگروں نے جادو کی بنائی ہوئی لاٹھیاں اور رسیاں پھینکیں تو لوگوں کی نگاہیں جادو سے ماردیں اور اپنے کرتبوں سے ان میں دہشت پھیلا دی اور بہت بڑا جادو بنالائے اور اس وقت ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) پر وحی کی کہ تم بھی اپنی لاٹھی ڈال دو، جونہی اس نے لاٹھی پھینکی تو اچانک کیا ہوا کہ جو کچھ جھوٹی نمائش جادوگروں کی تھی سب اس نے نگل کر نابود کر دی، پس حق قائم ہو گیا اور وہ جو عمل کر رہے تھے باطل ہو کر رہ گیا پس اس موقعہ پر وہ مغلوب ہو گئے اور ذلیل ہو کر بولے۔"

﴿فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَ يُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾ (یونس: ۸۰-۸۲)

"جب جادوگر آموجود ہوئے تو موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا "تمہیں جو کچھ میدان میں ڈالنا ہے ڈال دو" جب انہوں نے جادو کی رسیاں اور لاٹھیاں ڈال دیں تو موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا تم جو کچھ بنا کر لائے ہو یہ جادو ہے یقیناً اسے اللہ ملیا میٹ کر دے گا، اللہ کا یہ قانون ہے کہ وہ مفسدوں کا کام نہیں سنوارتا، وہ حق کو اپنے احکام کے مطابق ضرور ثابت کر دکھائے گا، اگرچہ مجرموں کو ایسا ہونا پسند نہ آئے۔"

جادوگروں نے "جو کہ اپنے فن کے ماہر و کامل تھے" جب عصاء موسیٰ علیہ السلام کا یہ کرشمہ دیکھا تو وہ حقیقت حال سمجھ گئے اور جس کو اس وقت تک فرعون اور اس کے درباری لوگ پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے رہے تھے وہ اس کو نہ چھپا سکے اور انہوں نے برسر مجلس یہ اقرار کر لیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ عمل جادو سے بالاتر خدا کا معجزہ ہے، اس کا سحر سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور پھر فوراً سجدہ میں گر پڑے اور اعلان کر دیا کہ ہم موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے پروردگار پر ایمان لے آئے کیونکہ وہی "رب العالمین" ہے۔

﴿فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى ﴿۷۰﴾﴾ (طٰہٰ: ۷۰)

"پس سب جادوگر سجدہ میں گر گئے اور کہنے لگے ہم ہارون اور موسیٰ (علیہما السلام) کے رب پر ایمان لے آئے۔"

﴿وَ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾﴾ (الاعراف: ۱۲۰-۱۲۲)

"اور سب جادوگر سجدہ میں گر پڑے، کہنے لگے ہم تو جہانوں کے پروردگار پر ایمان لے آئے جو موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کا پروردگار ہے۔"

فرعون نے جب یہ دیکھا کہ میرا تمام دام فریب تار تار ہو گیا، اور موسیٰ علیہ السلام کو شکست دینے کی جو آخری پناہ تھی وہ بھی منہدم ہو گئی، اب کہیں ایسا نہ ہو کہ مصری عوام بھی ہاتھ سے جائیں اور موسیٰ علیہ السلام اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے تو اس نے مکر و فریب کا دوسرا

طریقہ اختیار کیا اور ساحروں سے کہنے لگا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام تم سب کا استاذ ہے اور تم سب نے آپس میں سازش کر رکھی تھی تب ہی تو میری رعایا ہوتے ہوئے میری اجازت کے بغیر تم نے موسیٰ علیہ السلام کے خدا پر ایمان لانے کا اعلان کر دیا، اچھا! میں تم کو عبرتناک سزا دوں گا تاکہ آئندہ کسی کو ایسی غداری کی جرأت نہ ہو، پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں الٹے سیدھے کٹواؤں گا اور پھر سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔

﴿قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۫ وَ لَتَعْلَمُنَّ اَیُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى ۝﴾ (طٰہٰ:۷۱)

فرعون نے کہا: "تم بغیر میرے حکم کے موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لے آئے؟ ضرور یہ تمہارا سردار ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے، اچھا دیکھو میں کیا کرتا ہوں، میں تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤں گا اور کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا، پھر تمہیں پتہ چلے گا ہم دونوں میں کون سخت عذاب دینے والا ہے، اور کس کا عذاب دیرپا ہے۔"

﴿قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِی الْمَدِیْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَاۤ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (الاعراف:۱۲۳)

"فرعون نے کہا: "مجھ سے اجازت لیے بغیر تم موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لے آئے!! ضرور یہ ایک پوشیدہ تدبیر ہے جو تم نے مل جل کر شہر میں کی ہے تاکہ اس کے باشندوں کو اس سے نکال باہر کرو، اچھا تھوڑی دیر میں تمہیں اس کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔

مگر سچا ایمان جب کسی کو نصیب ہو جاتا ہے خواہ وہ ایک لحہ کا ہی کیوں نہ ہو وہ ایسی بے پناہ روحانی قوت پیدا کر دیتا ہے کہ کائنات کی کوئی زبردست سے زبردست طاقت بھی اس کو مرعوب نہیں کر سکتی، دیکھئے، وہی جادوگر جو فرعون سے تھوڑی دیر پہلے انعام و اکرام اور عزت و جاہ کی آرزوئیں اور التجائیں کر رہے تھے، ایمان لانے کے بعد ایسے نڈر اور بے خوف ہو گئے کہ ان کے سامنے سخت سے سخت مصیبت اور دردناک سے دردناک عذاب بھی ہیچ ہو کر رہ گیا اور کوئی دہشت بھی ان کے ایمان کو متزلزل نہ کر سکی اور انہوں نے فرعون کی موجودگی ہی میں بے دھڑک اسلام کا اعلان کر دیا، اور جب انہوں نے فرعون کی ان جابرانہ دھمکیوں کو سنا تو کہنے لگے:

﴿قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَ الَّذِیْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ۝ اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَ مَاۤ اَكْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَ اللّٰهُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰى ۝﴾ (طٰہٰ:۷۲۔۷۳)

"انہوں نے کہا ہم یہ کبھی نہ کر سکتے کہ سچائی کے جو روشن دلائل ہمارے سامنے آ گئے ہیں اور جس خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اس سے منہ موڑ کر تیرا حکم مان لیں، تُو جو فیصلہ کرنا چاہتا ہے کر گزر، تُو زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ دُنیا کی اس زندگی کا فیصلہ کر دے، ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لا چکے کہ ہماری خطائیں بخش دے خصوصاً جادوگری کی خطاء کہ جس پر تُو نے ہمیں مجبور کیا تھا، ہمارے لیے اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے۔"

﴿قَالُوْا لَا ضَیْرَ ۫ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَاۤ اَنْ كُنَّاۤ اَوَّلَ

الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥١﴾ (الشعراء: ۵۰-۵۱)

"جادوگروں نے کہا (تیرا یہ عذاب ہمارے لیے) کوئی نقصان کی بات نہیں بلاشبہ ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جانے والے ہیں، بیشک ہم اس کے حریص ہیں کہ وہ ہماری خطاؤں کو بخش دے کیونکہ ہم ہو گئے مومنوں میں اول۔"

غرض حق و باطل کی اس کشمکش میں فرعون اور اس کے اعیان و ارکان کو سخت شکست اٹھانی پڑی اور وہ سرعام ذلیل و رسواء ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر خدا کا وعدہ پورا ہوا اور کامیابی کا سہرا انہی کے سر رہا۔

اس صورت حال کو دیکھ کر جادوگروں کے علاوہ اسرائیلی نوجوانوں میں سے بھی ایک مختصر جماعت مسلمان ہو گئی مگر وہ فرعون کے ظلم و ستم کی وجہ سے اعلان نہ کر سکی کیونکہ مسلمانوں کے ساتھ اس کی عام قاہرانہ ستم کیشیوں اور ظلم پرستیوں کے علاوہ اس وقت کی ذلت نے اس کو زیادہ غضبناک بنا دیا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تلقین فرمائی کہ اب مومن ہونے کے بعد تمہارا سہارا صرف خدا پر ہونا چاہیے، جماعت مومنین نے اس پر لبیک کہا اور وہ خدا کے سامنے گڑگڑا کر رحمت و مغفرت کی دعائیں اور ظالموں کے عذاب و معصیت سے محفوظ رہنے کی التجائیں کرنے لگے۔

﴿فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٨٣﴾ وَ قَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿٨٤﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَ نَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٦﴾﴾ (یونس: ۸۳-۸۶)

"پھر موسیٰ (علیہ السلام) پر کوئی ایمان نہیں لایا، مگر صرف ایک گروہ جو اس قوم کے نوجوانوں کا گروہ تھا وہ بھی فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرتا ہوا کہ کہیں کسی مصیبت میں نہ ڈال دے اور اس میں شک نہیں کہ فرعون سرزمین مصر پر متمردانہ قابض اور ظلم و استبداد میں بالکل چھوٹ تھا اور موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا: لوگو! اگر تم فی الحقیقت اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس کی فرمانبرداری کرنا چاہتے ہو تو چاہیے کہ صرف اسی پر بھروسہ کرو اور فرعون کی طاقت سے نہ ڈرو پس انہوں نے کہا: "ہم صرف اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم کو ظالم قوم کی آزمائش میں نہ ڈال اور ہم کو اپنی رحمت سے منکروں سے نجات دے۔"

الحاصل فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی روحانی قوت کا یہ مظاہرہ دیکھ کر بے حد مرعوب ہو گیا اور اگرچہ وہ جادوگروں پر اپنے انتہائی غیظ و غضب کا اظہار کرتا رہا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس وقت کچھ کہنے کی مطلق ہمت نہ پڑی اور درباریوں اور ارکان سلطنت نے جب یہ احتجاج کیا کہ تو موسیٰ علیہ السلام کو قتل کیوں نہیں کرا دیتا، کیا اس کو اور اس کی قوم کو یہ موقع دیا جا رہا ہے کہ وہ مصر میں فساد پھیلائیں اور تجھ کو اور تیرے دیوتاؤں کو ٹھکراتے رہیں؟ تو کہنے لگا کہ تم گھبراتے کیوں ہو؟ میں اسرائیلیوں کی طاقت کو بڑھنے نہ دوں گا اور مقابلہ کے قابل ہی نہ رکھوں گا، ابھی یہ حکم جاری کرتا ہوں کہ ان کی اولاد نرینہ کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا کرو اور صرف لڑکیوں کو چاکری کے لئے زندہ رہنے دو۔

﴿وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَ قَوْمَهٗ لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَ یَذَرَكَ وَ اٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۲۷)

"اور فرعون کی قوم میں سے ایک جماعت نے فرعون سے کہا، کیا تو موسیٰ (علیہ السلام) اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دے گا کہ وہ زمین (مصر) میں فساد کرتے پھریں اور تجھ کو اور تیرے دیوتاؤں کو ٹھکرائیں، فرعون نے کہا، ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی لڑکیوں کو (باندیاں بنانے کے لئے) زندہ رکھیں گے اور ہم ان پر ہر طرح غالب ہیں اور وہ ہمارے ہاتھوں میں بے بس ہیں۔"

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰیٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ قَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْۤا اَبْنَآءَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَ اسْتَحْیُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ وَ مَا كَیْدُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ۝﴾ (المؤمن: ۲۳-۲۵)

"اور بلا شبہ ہم نے فرعون ہامان اور قارون کی طرف موسیٰ (علیہ السلام) کو رسول بنا کر اور واضح نشان دے کر بھیجا، پس انہوں نے کہا کہ یہ تو جادوگر ہے جھوٹا، پھر جب وہ ہمارے پاس سے ان کے پاس حق لے کر آیا تو کہنے لگے کہ جو لوگ اس (موسیٰ علیہ السلام) پر ایمان لے آئے ہیں، ان کے لڑکوں کو مار ڈالو اور ان کی لڑکیوں کو باقی رہنے دو، اور (انجام کار) کافروں کا مکر و فریب باطل و برباد ہو کر رہا۔"

گویا فرعون کا یہ دوسرا اعلان تھا جو بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل سے متعلق کیا گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل:

تاریخ کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ جب کسی قوم پر غلامی کی حالت میں صدیاں گذر جاتی ہیں تو اس کی زبوں حالی اور پستی کے حدود یہیں ختم نہیں ہو جاتے کہ وہ مفلس و بدحال ہوں اور کاہل و پریشان بال، بلکہ ان کے قوائے عملی کی خرابی سے زیادہ ان کے قوائے دماغی بیکار، مضمحل، اور ناکارہ ہو جاتے ہیں، ان میں سے ہمت و شجاعت مفقود ہو جاتی ہے اور وہ پستی پر ہی قناعت کر لیتے ہیں، ناامیدی ان کا شیوہ ہو جاتا ہے اور ذلت و نکبت کو وہ صبر و قناعت سمجھنے لگتے ہیں، اس لئے جب کوئی مصلح یا پیغمبر و رسول اس دماغی و عملی پستی سے نکالنے کے لئے ان کو پکارتا اور ہمت و شجاعت پر آمادہ کرتا ہے تو یہ ان کے لئے سب سے مشکل اور ناممکن العمل پیغام نظر آتا ہے اور کبھی وہ اس راہ کی سختیوں سے گھبرا کر آپس میں دست بگریباں ہونے لگتے، اور کبھی اپنے نجات دہندہ پر شک و شبہ کی نگاہ ڈالنے لگتے ہیں اور اگر اس جد و جہد میں ان کو کوئی فائدہ حاصل ہو جاتا ہے تو وقار اور سنجیدگی سے بھی گذر کر اظہار مسرت کرنے لگتے ہیں، اور اگر اس راہ میں کوئی آزمائش اور مصیبت کا سوال آ پڑتا ہے تو مصلح یا پیغمبر کو الزام دینے لگتے ہیں، کہ ہم کو خواہ مخواہ تو نے اس مصیبت میں پھنسایا، ہم تو اپنی حالت پر ہی صابر و شاکر تھے۔

یہی حال بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تبلیغ حق سے لے کر مصر سے خروج

وقت تک جو حالات پیش آئے وہ اس امر کی زندہ شہادت ہیں۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعون اور اس کے درباریوں کی گفتگو کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے بنی اسرائیل کو جمع کر کے صبر اور توکل علی اللہ کی تلقین کی بنی اسرائیل نے سن کر جواب دیا کہ موسیٰ علیہ السلام! ہم پہلے ہی سے مصیبتوں میں گرفتار تھے اب تیرے آنے پر کچھ امید بندھی تھی مگر تیرے آنے کے بعد بھی وہی مصیبت باقی رہی، یہ تو سخت آفت کا سامنا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دی کہ خدا کا وعدہ سچا ہے، گھبراؤ نہیں تم ہی کامیاب ہوگے اور تمہارے دشمن کو ہلاکت کا منہ دیکھنا پڑے گا، زمین کا مالک فرعون، یا اس کی قوم نہیں ہے بلکہ رب العالمین اور مختار مطلق خدا ہے، پس وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کا مالک بنا دے، اور انجام کار یہ انعام متقیوں کا ہی حصہ ہے۔

﴿قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ قَالُوْۤا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۲۸۔۱۲۹)

"موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا: "اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو، بلاشبہ زمین اللہ کی ملک ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وارث بنا دیتا ہے اور انجام (کی کامیابی) متقیوں کے لیے ہی ہے" انہوں نے جواب دیا: "تیرے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبت میں تھے اور تیرے پیغام لانے کے بعد بھی مصیبت ہی میں گرفتار ہیں" موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "وہ وقت قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو برباد کر دے گا اور تم کو اس زمین کا خلیفہ بنا دے گا اور پھر دیکھے گا کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو۔"

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مسلمانوں سے کہا کہ فرعون کے مظالم کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا، اور بنی اسرائیل اور قبطی مومنوں کو آزادی کے ساتھ مصر سے چلے جانے پر راضی نہیں ہے اس لئے خدا کے فیصلہ تک تم سرزمین مصر ہی میں اپنے گھروں کو مساجد بنا لو اور ان کو قبلہ رخ کر کے خدائے واحد کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ کہ خدا کی وحی کا یہی فیصلہ ہے، اور ساتھ ہی خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں دعاء کی، بارالٰہا! فرعون اور فرعونیوں کو تو نے جو دولت وسطوت عطاء فرمائی ہے اس پر شکریہ ادا کرنے کی بجائے وہ تیرے بندوں پر جبر اور ظلم وستم کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں اور تیری راہ حق کو نہ یہ خود قبول کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو قبول کرنے دیتے ہیں بلکہ جبر وتشدد سے کام لے کر ان کے آڑے آتے ہیں لہٰذا اب تو ان کے مظالم کا ذائقہ چکھا، اور ان کی اس دولت وثروت کو تباہ و ہلاک کر دے جس پر یہ نازاں ہیں، اور جس طرح یہ ایمان کی سچائی کو ٹھکرا رہے ہیں تو بھی ان کو ایمان کی دولت کے بجائے اب ایسا دردناک عذاب دے کہ ان کی داستان دوسروں کے لئے عبرت بن جائے۔

﴿وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَ اَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّ اجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا

يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾ (یونس: ۸۷۔۸۹)

"اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) اور اس کے بھائی ہارون (علیہ السلام) پر وحی کی کہ اپنی قوم کے لئے مصری مکان بناؤ اور ان کو قبلہ رخ تعمیر کرو اور ان میں نماز قائم کرو، اور جو ایمان لائے ہیں انہیں کامیابی کی بشارت دو، اور موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا مانگی "خدایا تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو اس دنیا کی زندگی میں زیب وزینت کی چیزیں اور مال و دولت کی شوکتیں بخشی ہیں، تو خدایا! کیا یہ اس لیے ہے کہ تیری راہ سے یہ لوگوں کو بھٹکائیں، خدایا ان کی دولت زائل کر دے اور ان کے دلوں پر مہر لگا دے کہ اس وقت تک یقین نہ کریں کہ جب تک عذاب دردناک اپنے سامنے نہ دیکھ لیں، اللہ نے فرمایا!" میں نے تم دونوں کی دعاء قبول کی تو اب تم اپنی راہ میں جم کر کھڑے ہو جاؤ اور ان لوگوں کی پیروی نہ کرو جو میرا طریق کار نہیں جانتے۔"

فرعون نے اپنے سرداروں سے اگرچہ اطمینان کا اظہار کر دیا تھا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے روحانی غلبہ کا خیال اس کو اندر ہی اندر گھلائے ڈالتا تھا اور بنی اسرائیل کی اولاد نرینہ کے قتل کے حکم سے بھی اس کو سکون قلب نصیب نہ تھا، آخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو قتل کیے بغیر یہ معاملہ ختم نہیں ہوگا۔ لہٰذا سرداروں اور ندیموں سے ایک روز کہنے لگا کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے یوں ہی چھوڑے رکھا تو مجھے یہ خوف ہے کہ یہ تمہارے دین کو بھی آہستہ آہستہ بدل ڈالے گا اور تمام مصر میں فساد مچا دے گا، اب یہی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ موسیٰ کو قتل کر دیا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ میں ایسے متکبر و مغرور سے کیا ڈرتا ہوں، جو خدا کے یوم حساب سے نہیں ڈرتا، میرا پشت پناہ تو وہ ہے جو میرا بھی پروردگار ہے اور تم سب کا بھی، میں صرف اسی کی پناہ چاہتا ہوں۔

﴿وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَ لْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾ وَ قَالَ مُوْسٰٓى اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۲۷﴾﴾

(المؤمن: ۲۶۔۲۷)

"اور فرعون نے کہا! مجھے موسیٰ (علیہ السلام) کو قتل ہی کر لینے دو اور اس کو چاہیے کہ اپنے رب کو پکارے، میں ڈرتا ہوں کہ وہ تمہارے دین کو بدل ڈالے یا زمین میں فساد برپا کر دے، اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں اپنے اور تمہارے رب کی پناہ چاہتا ہوں ہر اس متکبر سے جو حساب کے دن پر ایمان نہیں لاتا۔"

فرعون اور اس کے سردار جب اس گفتگو میں مصروف تھے تو اس مجلس میں ایک مصری "مرد مومن" بھی تھا، جس نے ابھی تک اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا تھا، اس نے جب یہ سنا تو اپنی قوم کے ان افراد کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے مدافعت کی کوشش شروع کی، اور ان کو سمجھایا کہ تم ایسے شخص کو قتل کرنے چلے ہو جو یہ سچی بات کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے اور جو تمہارے سامنے اپنی صداقت پر بہترین دلائل و نشانات لایا ہے، اور بالفرض اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ سے تم کو کچھ نقصان نہیں پہنچ رہا ہے اور اگر وہ سچا ہے تو پھر اس کی وعیدوں سے ڈرو جو وہ تم کو خدا کی جانب سے سناتا ہے۔

فرعون نے مردِ مومن کا کلام قطع کرتے ہوئے کہا کہ میں تم کو وہی مشورہ دے رہا ہوں جس کو اپنے خیال میں درست سمجھتا ہوں اور تمہاری بھلائی کی بات کہہ رہا ہوں۔

مردِ مومن نے آخری نصیحت کے طور پر پھر کہا: "اے میری قوم! مجھے یہ خوف ہے کہ ہمارا حال کہیں ان پچھلی قوموں کا سا نہ ہو جائے جو قومِ نوح، عاد اور ثمود کے نام سے مشہور ہیں، یا ان کے بعد جو قومیں آئیں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا، بلکہ ان قوموں کی ہلاکت خود اپنے اسی قسم کے اعمال کی بدولت پیش آئی تھی، جو آج تم موسیٰ علیہ السلام کے خلاف سوچ رہے ہو، تم تو آج دنیا کی وجاہت کی سوچ میں پڑے ہو اور میں تمہارے لئے اس دن سے ڈر رہا ہوں جب قیامت کا دن ہوگا اور سب ایک دوسرے کو پکاریں گے مگر اس وقت تمہیں کوئی خدا کے عذاب سے بچانے والا نہ ہوگا۔

اے قوم کے سردارو! تمہارا حال تو یہ ہے کہ اس سرزمین میں جب حضرت یوسف علیہ السلام نے خدا کا پیغام سنایا تھا تب بھی تم یعنی تمہارے باپ دادا اسی شک و تردد میں پڑے رہے اور ان پر ایمان نہ لائے اور جب ان کی وفات ہوگئی تو کہنے لگے کہ اب خدا اپنا کوئی رسول نہیں بھیجے گا، اب یہی معاملہ تم موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کر رہے ہو، خدارا سمجھو اور سیدھی راہ اختیار کرو۔

﴿وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗۤ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَ قَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَ اِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝ يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؗ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ؕ قَالَ فِرْعَوْنُ مَاۤ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰى وَ مَاۤ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝ وَ قَالَ الَّذِيْۤ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ۙ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ وَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ وَ مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ۝ وَ يٰقَوْمِ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ۙ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝ وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۝ ۚ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝﴾ (المؤمن: ۲۸۔۳۵)

"اور بولا ایک مرد ایمان دار فرعون کے لوگوں میں سے جو چھپاتا تھا اپنا ایمان، کیا مارے ڈالتے ہو ایک مرد کو اس بات پر کہ کہتا ہے "میرا رب اللہ ہے اور لایا ہمارے پاس کھلی نشانیاں تمہارے رب کی، اور اگر وہ جھوٹا ہوگا تو اس پر پڑے گا اس کا جھوٹ، اور اگر وہ سچا ہوگا تو تم پر پڑے گا کوئی نہ کوئی وعدہ جو تم سے کرتا ہے، بے شک اللہ راہ نہیں دیتا جو ہو بے لحاظ جھوٹا، اے میری قوم! آج تمہارا راج ہے، غالب ہو رہے ہو ملک میں، پھر کون مدد کرے گا ہماری اللہ کی آفت سے اگر آ گئی ہم

پر! بولا فرعون، میں تو وہی بات سمجھاتا ہوں تم کو جو سوجھی مجھ کو، اور وہی راہ بتاتا ہوں جس میں بھلائی ہے، اور کہا اس ایمان دار نے، اے میری قوم! میں ڈرتا ہوں کہ آئے تم پر دن اگلے فرقوں کا سا، جیسے حال ہوا قوم نوح کا اور عاد اور ثمود کا، اور جو لوگ ان کے پیچھے ہوئے، اور اللہ بے انصافی نہیں چاہتا بندوں پر، اور اے میری قوم! میں ڈرتا ہوں کہ تم پر آئے دن چیخ و پکار کا، جس دن بھاگو گے پیٹھ پھیر کر، کوئی نہیں تم کو اللہ سے بچانے والا، اور جس کو غلطی میں ڈالے اللہ، تو کوئی نہیں اس کو سمجھانے والا، اور تمہارے پاس آ چکا ہے یوسف (علیہ السلام) اس سے پہلے کھلی باتیں لے کر پھر تم رہے دھوکے ہی میں ان چیزوں سے جو وہ تمہارے پاس لے کر آیا، یہاں تک کہ جب مر گیا، لگے کہنے ہرگز نہ بھیجے گا اللہ اس کے بعد کوئی رسول، اسی طرح بھٹکاتا ہے اللہ اس کو جو ہو بے باک شک کرنے والا، وہ جو کہ جھگڑتے ہیں اللہ کی باتوں میں بغیر کسی سند کے جو پہنچی ہو ان کو بڑی بیزاری ہے (اس جھگڑے سے) اللہ کے یہاں اور ایمان داروں کے یہاں، اسی طرح مہر لگا دیتا ہے اللہ ہر دل پر غرور والے سرکش کے۔"

﴿وَ قَالَ الَّذِیْٓ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ ۚ﴿۳۸﴾ یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ ؗ وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾ مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلَا یُجْزٰٓی اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ یُرْزَقُوْنَ فِیْهَا بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۴۰﴾ وَ یٰقَوْمِ مَا لِیْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَی النَّجٰوةِ وَ تَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَی النَّارِ ؕ﴿۴۱﴾ تَدْعُوْنَنِیْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ اُشْرِكَ بِهٖ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ؗ وَّ اَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَی الْعَزِیْزِ الْغَفَّارِ ﴿۴۲﴾ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ لَیْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَا فِی الْاٰخِرَةِ وَ اَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَی اللّٰهِ وَ اَنَّ الْمُسْرِفِیْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۴۳﴾ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ؕ وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۴۴﴾﴾ (المؤمن: ۳۸۔۴۴)

"اور کہا اس ایماندار نے اے قوم! راہ چلو میری، پہنچا دوں تم کو نیکی کی راہ پر اے میری قوم! یہ جو زندگی ہے دنیا کی سو کچھ فائدہ اٹھا لینا ہے اور وہ گھر جو پچھلا ہے وہی ہے جم کر رہنے کا گھر، جس نے کی ہے برائی تو وہی بدلا پائے گا اس کے برابر اور جس نے کی ہے بھلائی مرد ہو یا عورت اور وہ یقین رکھتا ہو سو وہ لوگ جائیں گے بہشت میں روزی پائیں گے وہاں بیشمار، اور اے قوم! مجھ کو کیا ہوا ہے بلاتا ہوں تم کو نجات کی طرف، اور تم بلاتے ہو مجھ کو آگ کی طرف، تم چاہتے ہو مجھ کو کہ منکر ہو جاؤں اللہ سے اور شریک ٹھہراؤں اس کا، اس کو جس کی مجھ کو خبر نہیں، اور میں بلاتا ہوں تم کو اس زبردست گناہ بخشنے والے کی طرف، آپ ہی ظاہر ہے کہ جس کی طرف تم مجھ کو بلاتے ہو اس کا بلاوا کہیں نہیں دنیا میں اور نہ آخرت میں اور یہ کہ ہم کو پھر جانا ہے اللہ کے پاس اور یہ کہ زیادتی والے وہی ہیں دوزخ کے لوگ سو آگے یاد کرو گے جو میں کہتا ہوں تم کو اور میں سونپتا ہوں اپنا معاملہ اللہ کو، بیشک اللہ کی نگاہ میں ہیں سب بندے۔"

جب فرعون اور اس کے سرداروں نے اس مرد مومن کی یہ باتیں سنیں تو ان کا رخ موسیٰ علیہ السلام سے ہٹ کر اس کی طرف ہو گیا

اور فرعونیوں نے چاہا کہ پہلے اس کی خبر لیں، اور اس کو قتل کر دیں، مگر اللہ تعالیٰ نے اس ناپاک ارادہ میں ان کو کامیاب نہ ہونے دیا۔

﴿فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۗ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝﴾ (المؤمن: ۴۵۔۴۶)

"سو اللہ تعالیٰ نے اس کو ان کی تدبیروں کے شر سے بچا لیا اور فرعون کے لوگوں کو برے عذاب نے آ لیا۔ نار جہنم ہے جس پر وہ صبح شام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت آ جائے گی، (تو کہا جائے گا) فرعونیوں کو سخت عذاب میں داخل کرو۔"

تورات میں اگرچہ گذشتہ واقعات کا اکثر حصہ مذکور ہے مگر دو باتوں کا تذکرہ نہیں کیا گیا ایک فرعون کے اس دوسرے حکم کا ذکر نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کی اولاد نرینہ کو قتل کیا جائے اور دوسرے اس واقعہ کا کہ فرعون کی قوم میں سے بھی بعض آدمی ایمان لائے تھے اور ان میں سے ایک مرد مومن نے فرعون اور اپنی قوم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے باز رکھنے کی کوشش کی، ان کو دین کی تبلیغ کی اور سچائی کو قبول کر لینے کی دعوت دی۔

بظاہر اس دوسرے واقعہ کے ترک کر دینے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بنی اسرائیل کو فرعون اور فرعونیوں کے مظالم کی وجہ سے انتہائی رنج و غصہ تھا اور اس نے بغض و کینہ کی شکل اختیار کر لی تھی، لہٰذا اس نے اجازت نہ دی کہ اس قوم کے کسی فرد کے لئے بھی یہ ثابت کریں کہ اس میں سعادت اور حمایت حق کی روح موجود تھی۔

فرعون کا دعوائے ربوبیت والوہیت:

فرعون اور اس کے سرداروں کا موسیٰ علیہ السلام کو شکست دینے میں جب کوئی مکر وفریب اور غیظ وغضب کام نہ آیا اور ارادۂ قتل کے باوجود موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی بھی ہمت نہ پڑی تو اب فرعون نے دل کا بخار نکالنے کا یہ طریقہ نکالا کہ ایک جانب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توہین کے درپے رہتا اور دوسری جانب یہ اعلان کرتا کہ تمہارا "رب اعلیٰ اور معبود" میرے علاوہ کوئی نہیں ہے، موسیٰ علیہ السلام بن دیکھے خدا کو رب بتا رہا ہے اور میں بایں صد ہزار شوکت وسطوت تمہارے سامنے موجود ہوں، چنانچہ مصری قوم پر جو اثر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے "آیات بینات" دیکھ کر ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا اور دنیوی شوکت وسطوت کی مرعوبیت اور عزت وجاہ کی حرص میں دب کر رہ گیا، اور اس طرح وہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی مخالفت میں فرعون کے ہم نوا ہو گئے۔

﴿وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ۝ فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ۝ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝﴾ (الزخرف: ۵۱۔۵۴)

"اور فرعون نے اپنی قوم میں اعلان کیا "اے قوم! کیا میں مصر کے تاج وتخت کا مالک نہیں ہوں، اور میری حکومت کے قدموں کے نیچے یہ نہریں بہہ رہی ہیں، کیا تم (میرے اس جاہ وجلال کو) نہیں دیکھتے (اب بتاؤ) کیا میں بلند وبالا ہوں یا

یہ جس کو نہ عزت نصیب اور جو بات بھی صاف نہ کر سکتا ہو (اگر یہ اپنے خدا کے یہاں عزت والا ہے) تو کیوں اس پر (آسمان سے) سونے کے کنگن نہیں گرتے یا فرشتے ہی اس کے سامنے پرے باندھ کر کھڑے نہیں ہوتے، پس عقل کھو دی فرعون نے اپنی قوم کی سو انہوں نے اسی کی اطاعت کی اور تھے وہ نافرمان بندے۔"

فرعون نے اس جگہ بلند و بالا ہونے کا معیار دو باتوں پر رکھا اور عام طور پر دنیا کو مقصد زندگی سمجھنے والوں کی یہی شان رہی ہے، ایک دولت و ثروت، دوسرے دنیوی جاہ و حشم، اور یہ دونوں فرعون کے پاس موجود تھے، موسیٰ علیہ السلام کے پاس نہ تھے۔

حضرت شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہٗ نے ان دونوں باتوں کو موضح القرآن میں ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

"وہ آپ کنگن پہنتا تھا جواہر کے مکلف، اور جس امیر پر مہربان ہوتا سونے کے کنگن پہناتا تھا اور اس کے سامنے فوج کھڑی ہوتی تھی پرا باندھ کر۔"

اس لئے اس نے انہی باتوں کا ذکر کیا کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کا خدا مجھ سے الگ کوئی اور ہستی ہے، تو وہ موسیٰ علیہ السلام کو سونے کے کنگن آسمان سے کیوں نہیں برساتا اور فرشتے اس کے جلو میں پرا باندھ کر کیوں کھڑے نہیں ہوتے اور چونکہ قوم کی نگاہ میں دینی و دنیوی عزت کا معیار یہی تھا، اس لئے فرعون کا داؤ ان پر چل گیا اور انہوں نے یک زبان ہو کر فرعون کی اطاعت کا دوبارہ اعلان کر دیا، یہ بدبخت یہ نہ سمجھے کہ خدائے تعالیٰ کے یہاں عزت کا معیار "صدق و خلوص" اور خدا کی "وفادارانہ عبودیت" ہے نہ کہ دنیوی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت، البتہ جو شخص اصل عزت کو حاصل کر لیتا ہے تو خدائے تعالیٰ یہ چیزیں بھی اس کے قدموں پر نثار کر دیتا ہے اور صرف دنیوی عظمت پر اترانے والوں کو ابدی ذلت و رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، چنانچہ آخر میں یہی صورت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم بنی اسرائیل اور فرعون اور اس کی قوم کے ساتھ پیش آئی۔

﴿ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّ مَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ۝ ﴾ (الزخرف: ۵۵-۵۶)

"پھر جب ہم کو غصہ آیا تو ہم نے (ان کی بدکرداریوں کا) بدلہ لیا پس ڈبو دیا ان سب کو اور کر دیا گئے گزرے اور آنے والی نسلوں کے واسطے ان کو کہاوت بنا دیا۔"

﴿ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۝ فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَ الْاُوْلٰى ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ ﴾ (النازعات: ۲۲-۲۶)

"پس پیٹھ پھیر کر چل دیا، پھر (قوم کو) جمع کیا، پھر پکارا اور کہنے لگا! "میں ہی تمہارا سب سے بڑا رب ہوں" پس اس کو پچھلے (آخرت کے) اور پہلے (دنیا کے) عذاب نے آ پکڑا بلاشبہ اس واقعہ میں اس شخص کے لئے عبرت ہے جو خوف خدا رکھتا ہو۔"

مصریوں پر قہر خدا:

غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رشد و ہدایت کا فرعون اور اس کے سرداروں پر مطلق اثر نہیں ہوا اور معدودے چند کے سوائے عام مصریوں نے بھی ان ہی کی پیروی کی اور صرف یہی نہیں بلکہ فرعون کے حکم سے بنی اسرائیل کی نرینہ اولاد قتل کی جانے لگی،

موسیٰ علیہ السلام کی توہین و تذلیل ہونے لگی، اور فرعون نے اپنی ربوبیت اور معبودیت کی زور شور سے تبلیغ شروع کر دی تب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ فرعون کو مطلع کر دو کہ اگر تمہارا یہی طور طریق رہا تو عنقریب تم پر خدا کا عذاب نازل ہونے والا ہے، چنانچہ جب انہوں نے اس پر بھی دھیان نہ دیا تو اب یکے بعد دیگرے عذاب الٰہی آنے لگے، یہ دیکھ کر فرعون اور اس کی قوم نے اب یہ وطیرہ اختیار کیا کہ جب عذاب الٰہی کسی ایک شکل میں ظاہر ہوتا تو فرعون اور قوم فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کرنے لگتی کہ اچھا ہم ایمان لے آئیں گے تو اپنے خدا سے دعا کر کہ یہ عذاب جاتا رہے اور جب وہ عذاب جاتا رہتا تو پھر سرکشی و نافرمانی پر اتر آتے، پھر عذاب جب دوسری شکل میں آتا تو کہتے کہ اچھا ہم بنی اسرائیل کو آزاد کر کے تیرے ساتھ روانہ کر دیں گے، دعاء کر کہ یہ عذاب دفع ہو جائے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے ان کو پھر مہلت مل جاتی، اور عذاب دفع ہو جاتا تو پھر اسی طرح مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے، اس طرح خدا کی جانب سے مختلف قسم کے نشانات ظاہر ہوئے اور فرعون اور قوم فرعون کو بار بار مہلت عطا ہوتی رہی لیکن جب انہوں نے اس کو بھی ایک مذاق بنا لیا تب خدا کا آخری عذاب آیا اور فرعون اور اس کے سرکش سردار سب ہی غرق کر دیئے گئے۔

آیات اللہ کی تفصیل:

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہت سے نشانات (معجزات) عطا فرمائے تھے جن کا ذکر بقرہ، اعراف، نمل، قصص، اسراء، طٰہٰ، زخرف، مومن، قمر اور النازعات میں مختلف طریقوں سے کیا گیا ہے، چنانچہ اسراء میں ہے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا۝ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا۝﴾ (بنی اسرائیل: ۱۰۱-۱۰۲)

"اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو نو نشانات واضح عطاء کیے پس تو بنی اسرائیل سے دریافت کر کہ جب یہ نشانات ان کے پاس آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرعون نے یہ کہا! اے موسیٰ! بلاشبہ میں تجھ کو جادو کا مارا ہوا سمجھتا ہوں موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا، تو خوب جانتا ہے کہ ان کو بصیرتیں بنا کر آسمانوں اور زمین کے پروردگار کے سوائے اور کسی نے نہیں اتارا اور (اس لیے) بلاشبہ اے فرعون میں تجھ کو ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔"

اور طٰہٰ، نمل، زخرف اور النازعات میں شمار بتائے بغیر صرف "آیات" کہہ کر ذکر کیا گیا ہے، پھر کسی جگہ "آیات بینات" اور کہیں "آیات مفصلات" اور کسی موقعہ پر "الایۃ الکبریٰ" اور کہیں صرف "ایاتنا" سے تعبیر کیا ہے اور ان تفصیلی اور اجمالی تعبیرات کے علاوہ مسطورۂ بالا تمام سورتوں میں علیحدہ علیحدہ نشانات (معجزات) کا بھی ذکر موجود ہے، اور اگر ان سب کو یکجا جمع کیا جائے تو حسب ذیل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے۔

عصاء، ید بیضا، سنین (قحط) نقص ثمرات (پھلوں کا نقصان) طوفان، جراد (ٹڈی دل) قمل (جوں) ضفادع (مینڈک) دم (خون) فلق بحر (قلزم کا پھٹ کر دو حصہ ہو جانا) من و سلویٰ (حلوا و بٹیر) غمام (بادلوں کا سایہ) انفجار عیون (پتھر سے چشموں کا پھوٹنا) نتق جبل (پہاڑ کا اکھڑ کر سروں پر آ جانا) اور نزول تورات۔

پس مسطورۂ بالا مختلف تعبیرات و تفصیلات کی بناء پر مفسرین[1] کو حیرانی ہے کہ کونسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے "تسع آیات" کی تعیین بھی ہو جائے اور باقی آیات اللہ کی تفصیل بھی صحیح اسلوب پر باقی رہ جائے، چنانچہ قاضی بیضاوی اور بعض دوسرے مفسرین نے یہ تشریح فرمائی کہ سورۂ اسراء میں جن "تسع آیات" کا تذکرہ ہے ان سے وہ نشان (معجزات) مراد نہیں ہیں جو فرعون اور قوم فرعون کے مقابلہ میں بطور سرزنش، عذاب و عبرت کے لئے بھیجے گئے بلکہ اس سے وہ احکام مراد ہیں، جو بنی اسرائیل کو قلزم عبور کر لینے کے بعد دیئے گئے تھے اور اپنی اس تشریح کی تائید میں حضرت صفوان رضی اللہ عنہ بن عسال کی حدیث پیش کی جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک مرتبہ دو یہودیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت کا امتحان لیا جائے اور مشورہ کے بعد آپ سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو جو "تسع آیات" دیئے تھے ان کی تشریح کیجئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ احکام یہ ہیں:

"شرک نہ کرنا، زنا نہ کرنا، ناحق کسی کو قتل نہ کرنا، چوری نہ کرنا، جادو نہ کرنا، حکام رس کے ذریعے جرم سے پاک انسان کو قتل نہ کرانا، سود نہ کھانا، پاک دامن کو تہمت نہ لگانا، میدان جنگ سے نہ بھاگنا، (شعبہ کو شک ہو گیا کہ نواں حکم یہی فرمایا یا کوئی اور) اور اے یہود! تمہارے لئے خصوصیت کے ساتھ یہ کہ سبت کی خلاف ورزی نہ کرنا۔"[2]

مگر ان مفسرین کی یہ تشریح اس لئے صحیح نہیں کہ اسراء میں "تسع آیات" کے ذکر کے ساتھ فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ بھی درج ہے، فرعون ان آیات کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اے موسیٰ (علیہ السلام)! یہ سب جادو کا دھندا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں، اے فرعون! یہ اللہ تعالیٰ کے نشانات ہیں اور تو انکار کر کے ہلاکت میں پڑ رہا ہے پس اس جگہ "احکام" مراد لینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے، کیونکہ ان کا نزول خود ان مفسرین کے نزدیک بھی غرق فرعون کے بعد ہوا ہے، چنانچہ یہی اشکال ترمذی کی حدیث پر بھی وارد ہوتا ہے، نیز یہ بات بھی خدشہ سے خالی نہیں کہ قرآن عزیز کی آیات زیر بحث میں تو "نو آیات" کا ذکر ہے اور صفوان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں دس[3] احکام شمار کرائے ہیں تو یہ گنتی کا تعارض ہے اور پھر احکام عشر کو "تسع آیات" کی تشریح بتانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

ان ہر دو اہم خدشات کے علاوہ اس قول اور حدیث صفوان رضی اللہ عنہ کی تشریح پر جو سخت اشکال لازم آتا ہے وہ یہ ہے کہ سورۂ نمل میں تسع آیات کا ذکر کرتے ہوئے ید بیضاء کو نو میں کا ایک بتایا گیا اور یہ بھی صراحت کی گئی ہے کہ یہ آیات (نشانات) فرعون اور قوم فرعون کی عبرت و بصیرت کے لئے بھیجے گئے تھے۔

﴿وَ اَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۫ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝﴾ (النمل: ١٢)

"اور داخل کر تو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں وہ نکلے گا روشن بغیر کسی مرض کے (یہ ان) نو آیات میں سے (ہے) جو فرعون

---

[1] مفسرین کہتے ہیں کہ جوں اور مینڈک کے عذاب کی صورت یہ تھی کہ برتنے، کھانے، پینے اور رہنے سہنے کی کوئی شئے اور کوئی جگہ ایسی نہ تھی جس کو ان دونوں نے فاسد اور خراب نہ کر دیا ہو، اور زندگی تلخ نہ کر دی ہو اور خون کے عذاب کی شکل یہ تھی کہ قلزم اور کنوؤں کا تمام پانی خون آلود ہو گیا تھا، جس کو کسی حالت میں پیا نہ جا سکتا تھا۔

[2] ترمذی کتاب التفسیر ج ۲ ص ۱۵۹

[3] تورات میں بھی ان احکام کا ذکر موجود ہے "اور اس نے ان لوحوں پر ان عہد کی باتوں کو یعنی موجودہ احکام کو لکھ کر" (خروج باب ۳۴ آیت ۲۸)

اور اس کی قوم کے لئے (بھیجی گئیں) بلاشبہ تھے وہ نافرمان گروہ۔"

پس قرآن عزیز کی اس صراحت کے بعد نہ حدیث نکارت سے خالی رہتی ہے اور نہ مفسرین کا یہ قول صحیح ہوسکتا ہے، اس لئے حافظ حدیث ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس حدیث کے متعلق یہ فرمایا ہے:

فهذا الحديث رواه هكذا الترمذی والنسائی و ابن ماجة و ابن جرير فی تفسيره من طرق عن شعبة بن الحجاج به و قال الترمذی حسن صحيح و هو حديث مشكل و عبدالله بن سلمة فی حفظه شیٔ و قد تكلموا فيه و لعلّه اشتبه عليه التسع الأيات بالعشر الكلمات وصايا فی التوراة لا تعلق لها لقيام الحجة علی فرعون الله اعلم و لهذا قال موسٰی لفرعون لقد علمت ما انزل هٰؤلاء الّا ربّ السمٰوٰت والارض بصائر ای حجة و ادلّة علی صدق ما جئتك به وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا. (تفسیر ابن کثیر جلد ٦ ص ١١٢)

"پس اس حدیث کو اس طرح ترمذی، نسائی، ابن ماجہ نے اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں مختلف طریقوں سے شعبہ بن الحجاج سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ حسن صحیح ہے، مگر اس حدیث میں اشکال ہے اور عبداللہ بن سلمہ راوی کے حفظ میں کچھ خرابی ہے اور محدثین نے اس کے بارے میں کلام کیا ہے اور شاید اس کو اشتباہ ہوگیا کہ اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ دس احکام کو تسع آیات سمجھ کر ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا، حالانکہ وہ دس وصیتیں ہیں جو توراۃ میں بیان کی گئی ہیں، ان کا فرعون پر قیام حجت و دلیل سے مطلق کوئی تعلق نہیں، (واللہ اعلم) اور تسع آیات میں قیام حجت مقصود ہے اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے یہ فرمایا: "تو خوب جانتا ہے کہ ان آیات (معجزات) کو آسمان اور زمین کے پروردگار نے نہیں اتارا مگر عبرت و بصیرت کے لئے یعنی جو حق کا پیغام لے کر آیا ہوں اس کی تصدیق کے لئے حجت و دلیل بنا کر بھیجا ہے، اور میں بلاشبہ اے فرعون! تجھ کو ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔"

بہرحال یہ تشریح قطعاً مخدوش و مجروح ہے، اور بعض مفسرین نے اس کے خلاف تسع آیات کی تعیین میں ان ہی آیات (معجزات) کو شمار کرایا ہے جو عبرت و بصیرت اور مخالفین کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کے لئے عطاء کیے گئے تھے، لیکن یہ اقوال بھی مختلف ہیں اور ان میں کافی انتشار موجود ہے، اس لئے کہ ان میں قبل عبور اور بعد عبور نشانات کو خلط کر دیا گیا ہے، البتہ ان سب اقوال میں قابل ترجیح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول ہے کہ تسع آیات سے مراد حسب ذیل "آیات اللہ" مراد ہیں:

عصاء، ید بیضاء، سنین، نقص ثمرات، طوفان، جراد، قمل، ضفادع، دم، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے علاوہ مجاہد، عکرمہ، شعبی اور قتادہ رضی اللہ عنہم بھی اسی کی تائید فرماتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اس تشریح کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس قدر بھی آیات (معجزات) عطاء کیے گئے، ایک حصہ بحر قلزم کے عبور سے قبل، اور دوسرا حصہ عبور کے بعد سے متعلق ہے، اور پہلے حصہ کا تعلق ان تمام واقعات سے ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان پیش آئے اور معرکہ حق و باطل کا باعث بنے اور یہ نو ہیں ان میں سے عصاء اور ید بیضاء آیات کبریٰ ہیں۔

﴿فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۝﴾ (النازعات: ٢٠)

"پس دکھایا اس (فرعون) کو ایک بڑا نشان (یعنی عصاء کا نشان)"

﴿وَ اَدْخِلْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ﴾ (النمل: ۱۲)

"اور داخل کر تو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں نکلے گا وہ روشن بغیر کسی مرض کے نو نشانات (معجزات) میں سے۔"

باقی سات "آیات عذاب" ہیں جس نے فرعون اور اہل مصر (قبطیوں) کی زندگی تنگ کر دی تھی۔

﴿وَ لَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ۝ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓىٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ وَ قَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰیَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الطُّوْفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ وَ الدَّمَ اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ﴾

(الاعراف: ۱۳۰-۱۳۳)

"اور ہم نے پکڑ لیا فرعون والوں کو قحطوں میں اور میووں کے نقصان میں تا کہ وہ نصیحت مانیں۔ پھر جب پہنچی ان کو بھلائی کہنے لگی یہ ہے ہمارے لائق، اور اگر پہنچتی برائی تو نحوست بتلاتے موسیٰ (علیہ السلام) کی اور اس کے ساتھ والوں کی سن لو، ان کی شومی تو اللہ کے پاس ہے، پر اکثر لوگ نہیں جانتے، اور کہنے لگے جو کچھ تو لائے گا، ہمارے پاس نشانی کہ ہم پر اس کی وجہ سے جادو کرے سو ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہ لائیں گے، پھر ہم نے بھیجا ان پر طوفان اور ٹڈی اور چیچڑی اور مینڈک اور خون، بہت سی نشانیاں جدا جدا دیں۔"

اور "آیات بینات" کے دوسرے حصہ کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل سے متعلق واقعات سے ہے جن میں سے بعض (معجزات) ان کو ہلاکت سے محفوظ رکھنے اور صداقت موسیٰ علیہ السلام کو قوت دینے کے لیے ہیں، مثلاً من و سلویٰ کا نزول، غمام (بادلوں کا سایہ) اور انفجار عیون (پتھر سے بارہ چشموں کا پھوٹ نکلنا) اور بعض بنی اسرائیل کی سرکشی پر تہدید و تخویف کے لئے ہیں مثلاً نتق جبل (طور کے ایک حصہ کا اپنی جگہ سے اُکھڑ کر بنی اسرائیل کے سر پر آ جانا)۔

﴿وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ﴾ (البقرہ: ۵۷)

"اور اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر من (حلواء شیریں) اور سلویٰ (بٹیریں) نازل کیا، پس تم ان پاک چیزوں کو کھاؤ جو ہم نے تم کو رزق بنا کر دی ہیں، اور اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر بادل کا سایہ قائم کر دیا اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تو ہم نے کہا (اے موسیٰ علیہ السلام) تو پتھر پر اپنی لاٹھی مار، پس بہہ پڑے اس سے بارہ چشمے۔"

اور دونوں قسم کے نشانات کے لئے حد فاصل وہ عظیم الشان نشان ہے جو فلق بحر (قلزم کے دو ٹکڑے ہو کر راہ نکل آنا) کے عنوان سے معنون ہے، اور دراصل ظلم و قہر کی ہلاکت اور مظلومانہ زندگی کی نصرت و حمایت کے لیے ایک فیصلہ کن نشان تھا، یا یوں کہ دیجئے کہ واقعات قبل از عبور کے انجام اور بعد از عبور روشن آغاز کے لئے نمایاں حد فاصل کی حیثیت رکھتا تھا، چنانچہ اعراف، اسراء

طٰہٰ، شعراء، قصص، زخرف، دخان اور الذاریات میں اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور یہ تمام نشانات (معجزات) درحقیقت شرطیہ اور تمہید تھے ایک ایسے عظیم الشان اور جلیل المرتبت نشان کے جو اس پوری تاریخ کا حقیقی مقصد اور بنیاد و اساس تھا، اور وہ نزول تورات کا نشان اعظم ہے۔

﴿ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ﴾ (المائدہ: ۴۴)

"ہم نے اتاری تورات جس میں ہدایت اور نور (کا ذخیرہ) ہے۔"

الحاصل حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ اثر زیر بحث مسئلہ کے لئے قول فیصل ہے اسی لئے حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے:

"اور یہ قول صاف ہے، واضح ہے، عمدہ ہے اور قوی ہے۔"[1]

بہرحال فرعون اور اس کی پیہم اور مسلسل سرکشی، ظلم، حق کے ساتھ استہزاء، تمول، اور نافرمانی کے باعث خدائے تعالیٰ کی جانب سے مصریوں پر مختلف ہلاکتیں اور عذاب آتے رہے اور وقفہ کے ساتھ ان "نشانات" کا ظہور ہوتا رہا، جب ایک عذاب آتا تو سب واویلا کرنے لگتے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہتے کہ اگر اس مرتبہ تو نے اپنے خدا سے کہہ کر اس عذاب کو ٹال دیا تو ہم سب ایمان لے آئیں گے اور جب وہ ٹل جاتا تو پھر سرکشی شروع کر دیتے، آخر پھر دوسرا عذاب آ پکڑتا اور پھر وہی صورت پیش آ جاتی۔

اس تفصیلی واقعہ کا ذکر ابھی سورۂ اعراف کی آیات میں گزر چکا ہے۔ ان آیات میں بیان کردہ نشانیوں میں سے قمل[2] (جوں) اور ضفادع (مینڈک) کے متعلق علماء سیر نے لکھا ہے کہ ان دونوں چیزوں کی یہ حالت تھی کہ بنی اسرائیل کے کھانے پینے، پہننے اور برتنے کی کوئی چیز ایسی نہ تھی جن میں یہ موجود نظر نہ آتے ہوں حتیٰ کہ قوم فرعون کی عافیت تنگ ہوگئی اور وہ عاجز ہوگئے، اور خون کے متعلق لکھا ہے کہ دریائے نیل کا پانی لہو کی رنگت کا ہوگیا تھا، اور اس کے ذائقہ نے اس کا پینا دشوار کر دیا تھا اور پانی میں مچھلیاں تک مرگئی تھیں، تورات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۶ ص ۱۱۱۔ اس بحث کے لئے روح المعانی، ابن کثیر، تفسیر کبیر اور البحر المحیط خصوصیت کے ساتھ قابل مراجعت ہیں، ان کے مطالعہ کے بعد مؤلف کے قول فیصل کی اہمیت و لطافت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ﴿ وَ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾۔

[2] قمل سے یہاں کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ہے کہ وہ کیڑا مراد ہے جو اناج میں پیدا ہو کر اس کو خراب کر دیتا ہے (اردو میں اس کو سرسری کہتے ہیں، اور انہی سے ایک روایت ہے کہ اس سے وہ چھوٹی ٹڈی مراد ہے جس کے پر نہیں ہوتے اور وہ بھی غلہ کو گھن لگا دیتی ہے، مجاہد، عکرمہ، قتادہ رحمہم اللہ کی بھی یہی رائے ہے اور ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جوں کی طرح کا ایک کیڑا ہوتا ہے جو اونٹوں میں ہلاکت پیدا کرتا ہے اور راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ چھوٹی مکھی ہے جو انسانی صحت کے لئے بے حد مضرت رساں ہے۔ قمل عربی میں عام طور پر جوں کو کہتے ہیں، تورات میں اس جگہ جوں اور مکھی دونوں کا ذکر ہے لیکن ابن عباس، مجاہد، قتادہ، عکرمہ، ابن جریر رحمہم اللہ اور راغب رحمہ اللہ جیسے ائمہ لغت اس لفظ کا اطلاق مسطورہ بالا مختلف کیڑوں پر کر رہے ہیں، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قمل اپنے معنی میں ان مصادیق کے لئے وسیع ہے، اس لئے ان تمام اطلاقات کی تطبیق کے لئے یہ کیوں نہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں پر یہ عذاب نازل فرمایا کہ انسان پر جوئیں مسلط کر دیں، ان کے کھانے پینے کی چیزوں میں چھوٹی مکھیوں کو پھیلا دیا۔ ان کے جانوروں میں ہلاک کرنے والا کیڑا پیدا کر دیا۔ اور ان کے اناج اور غلہ میں گھن لگا کر خراب کر دینے والی سرسری کی تباہی پھیلا دی، اور ان سب مہلک کیڑوں کو قرآن کے اعجاز نے قمل کی وسیع تعبیر میں بیان فرما دیا ہے۔ (مؤلف)

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ فَسْئَلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا ۝ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل: ۱۰۱-۱۰۲)

"اور بیشک ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو نو ظاہر نشانات دیئے پس (اے محمد ﷺ!) تو بنی اسرائیل سے دریافت کر کہ جب وہ ان کے پاس آیا تو فرعون نے موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا: "اے موسیٰ (علیہ السلام)! میں تجھ کو جادو کا مارا ہوا گمان کرتا ہوں" موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: "تو خوب جانتا ہے کہ آسمان و زمین کے پروردگار نے ان نشانات کو عبرتیں بنا کر اتارا ہے اور اے فرعون میں سمجھتا ہوں کہ تو نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔"

﴿وَ لَقَدْ اَرَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَ اَبٰی ۝﴾ (طٰہٰ: ۵۶)

"اور بیشک ہم نے فرعون کو اپنے سب نشانات (معجزے) دکھائے پھر بھی اس نے جھٹلایا اور انکار ہی کیا۔"

﴿فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ ۝﴾ (النمل: ۱۳-۱۴)

"پھر جب ان کے پاس ہمارے نشانات بصیرت کے لئے آ پہنچے تو وہ کہنے لگے "یہ تو صریح جادو ہے" اور انہوں نے اپنے جی میں یہ یقین رکھتے ہوئے کہ یہ "صحیح ہیں" ظلم اور غرور کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا۔ پس دیکھ (اے مخاطب) مفسدوں کا انجام کیسا ہوا؟"

﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰی بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًی وَّ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْۤ اٰبَآىِٕنَا الْاَوَّلِیْنَ ۝ وَ قَالَ مُوْسٰی رَبِّیْۤ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰی مِنْ عِنْدِهٖ وَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾ (القصص: ۳۶-۳۷)

"پھر جب ان کے پاس ہماری صریح نشانیاں پہنچیں کہنے لگے یہ کچھ نہیں ہیں مگر گھڑا ہوا جادو اور ہم نے اپنے پہلے باپ دادوں میں یہ باتیں نہیں سنیں، اور موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: "میرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون شخص لایا ہے اس کے پاس سے ہدایت کو اور کون ہے جس کے لئے آخرت کا انجام مقرر ہے، بلاشبہ وہ بے انصافوں کو فلاح نہیں دیتا۔"

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡىِٕهٖ فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰیٰتِنَاۤ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَضْحَكُوْنَ ۝ وَ مَا نُرِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ اِلَّا هِیَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ؗ وَ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۝ وَ قَالُوْا یٰۤاَیُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا

عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ۝ ﴾ (الزخرف: ۴۶-۵۰)

"اور بیشک ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف اپنی نشانیاں دے کر بھیجا، پس موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا میں جہانوں کے پروردگار کا رسول ہوں پھر جب وہ ہماری نشانیاں لایا۔ اچانک وہ اس کا مذاق اڑانے لگے، اور ہم نے جو نشان ان کو دکھایا ان میں سے ایک دوسرے سے بڑا ہی تھا اور ہم نے ان کو (دنیوی) عذاب میں گرفتار کیا تاکہ وہ باز آ جائیں اور وہ کہنے لگے، اے جادوگر! تو اپنے پروردگار سے اپنے اس عہد (نبوت) کی بنا پر ہمارے لئے دعاء کر (کہ یہ مصیبت جاتی رہے) تو ہم بلاشبہ ہدایت قبول کر لیں گے، پھر جب ہم نے ان سے عذاب کو دور کر دیا تو پھر وہ بدعہد ہو گئے۔"

﴿ وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۝ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ۝ ﴾ (القمر: ۴۱-۴۲)

"بلاشبہ آل فرعون کے پاس (بدکرداریوں) کے انجام سے ڈرانے والے آئے انہوں نے ہماری سب نشانیوں کو جھٹلایا، پس ہم نے ان کو (اپنے عذاب میں) پکڑ لیا، ایک غالب اور قدرت والے کی پکڑ کی طرح۔"

﴿ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۝ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۝ ﴾ (النازعات: ۲۰-۲۱)

"پھر دکھلائی (موسیٰ علیہ السلام نے) اس کو بڑی نشانی، پس اس (فرعون) نے جھٹلایا اور نافرمانی کی۔"

بنی اسرائیل کا خروج اور فرعون کا تعاقب:

جب معاملہ اس حد کو پہنچ گیا تو خدائے تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ تم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر باپ دادا کی سرزمین کی جانب لے جاؤ۔

مصر سے فلسطین یا ارض کنعان جانے کے دو راستے ہیں، ایک خشکی کا راستہ ہے اور وہ قریب ہے اور دوسرا بحر احمر (قلزم) کا راستہ یعنی اس کو عبور کر کے بیابان سور اور سینا (تیہ) کی راہ ہے اور یہ دور کی راہ ہے، مگر خدائے تعالیٰ کی مصلحت کا تقاضا یہی ہوا کہ خشکی کی راہ چھوڑ کر دور کی راہ اختیار کریں اور قلزم کو پار کر کے جائیں۔

واقعات رونما ہو جانے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ اس راہ حق کو حق تعالیٰ نے اس لئے ترجیح دی کہ خشکی کی راہ سے گزرنے میں فرعون اور اس کی فوج سے جنگ ضروری ہو جاتی، کیونکہ انہوں نے بنی اسرائیل کو قریب ہی آ لیا تھا اور اگر دریا کا معجزہ پیش نہ آتا تو فرعون بنی اسرائیل کو واپس مصر لے جانے میں کامیاب ہو جاتا اور چونکہ صدیوں کی غلامی نے بنی اسرائیل کو بزدل اور پست ہمت بنا دیا تھا اس لئے وہ خوف اور رعب کی وجہ سے کسی طرح فرعون کے ساتھ جنگ پر آمادہ نہ ہوتے، تورات سے بھی اس توجیہ کی تائید نکلتی ہے، اس میں مذکور ہے:

"اور جب فرعون نے ان لوگوں کو جانے کی اجازت دے دی تو خدا ان کو فلستیوں کے ملک کے راستہ سے نہیں لے گیا اگرچہ اِدھر سے نزدیک پڑتا کیونکہ خدا نے کہا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ لڑائی بھڑائی دیکھ کر پچھتانے لگیں اور مصر کو لوٹ جائیں بلکہ خداوند ان کو چکر کھلا کر بحر قلزم کے بیابان کے راستے سے لے گیا۔" (خروج باب ۱۳ آیت ۱۷ و ۱۸)

علاوہ ازیں فرعون اور قوم فرعون کو ان کی نافرمانی اور سرکشی کی پاداش اور عظیم الشان اعجاز کے ذریعہ ظالم و قاہر اقتدار سے مظلوم قوم کی نجات کا عدیم النظیر مظاہرہ کرنا بھی مقصود تھا، اسی لئے یہ راستہ موزوں سمجھا گیا۔

غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات بحر احمر کی راہ ہو لئے اور روانہ ہونے سے پہلے مصری عورتوں کے زیورات اور قیمتی پارچہ جات جو ایک تہوار میں مستعار لئے تھے وہ بھی واپس نہ کر سکے کہ کہیں مصریوں پر اصل حال نہ کھل جائے۔

ادھر پرچہ نویسوں نے فرعون کو اطلاع کی کہ بنی اسرائیل مصر سے فرار ہونے کے لئے شہروں سے نکل گئے، فرعون نے اسی وقت ایک زبردست فوج کو ساتھ لیا اور رعمسیس سے نکل کر ان کا تعاقب کیا، اور صبح ہونے سے پہلے پہلے ان کے سر پر جا پہنچا۔ بنی اسرائیل کی تعداد بقول تورات علاوہ بچوں اور چوپایوں کے چھ لاکھ تھی، مگر پو پھٹنے کے وقت جب انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو فرعون کو سر پر پایا، گھبرا کر کہنے لگے:

"کیا مصر میں قبریں نہ تھیں جو تو ہم کو مرنے کے لئے بیابان میں لے آیا ہے؟ تو نے ہم سے یہ کیا کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا؟ کیا ہم تجھ سے مصر میں یہ بات نہ کہتے تھے کہ ہم کو رہنے دے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں؟ کیونکہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر ہوتا۔" (خروج باب ۱۴ آیات ۱۱، ۱۲)

غرقِ فرعون:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تسلی دی اور فرمایا خوف نہ کرو، خدا کا وعدہ سچا ہے وہ تم کو نجات دے گا اور تم ہی کامیاب ہو گے، اور پھر درگاہِ الٰہی میں دست بدعاء ہوئے، وحی الٰہی نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی لاٹھی کو پانی پر مارو تاکہ پانی پھٹ کر بیچ میں راستہ نکل آئے، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی کیا، جب انہوں نے قلزم پر اپنا عصا مارا تو پانی پھٹ کر دونوں جانب دو پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا اور بیچ میں راستہ نکل آیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم سے تمام بنی اسرائیل اس میں اتر گئے، اور خشک زمین کی طرح اس سے پار ہو گئے فرعون نے یہ دیکھا تو اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: یہ میری کرشمہ سازی ہے کہ بنی اسرائیل کو تم جا پکڑو لہٰذا بڑھے چلو، چنانچہ فرعون اور اس کا تمام لشکر بنی اسرائیل کے پیچھے اسی راستے پر اتر لئے لیکن اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ جب بنی اسرائیل کا ہر فرد دوسرے کنارہ پر سلامتی کے ساتھ پہنچ گیا تو پانی بحکم الٰہی پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا اور فرعون اور اس کا تمام لشکر جو ابھی درمیان ہی میں تھا غرق ہو گیا۔

جب فرعون غرق ہونے لگا اور ملائکہ عذاب سامنے نظر آنے لگے تو پکار کر کہنے لگا: "میں اسی ایک وحدہٗ لاشریک لہٗ ہستی پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں" مگر یہ ایمان چونکہ حقیقی ایمان نہ تھا بلکہ گذشتہ فریب کاریوں کی طرح نجات حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ایک مضطربانہ بات تھی اس لئے خدا کی طرف سے یہ جواب ملا:

﴿ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝﴾ (یونس: ۹۱)

"اب یہ کہہ رہا ہے حالانکہ اس سے پہلے جو اقرار کا وقت تھا اس میں انکار اور خلاف ہی کرتا رہا اور درحقیقت تو مفسدوں میں

سے تھا۔"

یعنی خدا کو خوب معلوم ہے کہ تو "مسلمین" میں سے نہیں بلکہ "مفسدین" میں سے ہے۔

درحقیقت فرعون کی یہ پکار ایسی پکار تھی جو ایمان لانے اور یقین حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ عذاب الٰہی کا مشاہدہ کرنے کے بعد اضطراری اور بے اختیاری کی حالت میں نکلتی ہے، اور مشاہدۂ عذاب کے وقت اس کی یہ صدائے "ایمان و یقین" حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعاء کا نتیجہ تھی جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔

﴿فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا﴾ (یونس: ۸۸-۸۹)

"پس یہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک اپنی ہلاکت اور عذاب کو آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "بلاشبہ تم دونوں کی دعاء قبول کر لی گئی۔"

اس موقعہ پر فرعون کی پکار پر درگاہ الٰہی کی جانب سے یہ بھی جواب دیا گیا:

﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً﴾ (یونس: ۹۲)

"آج کے دن ہم تیرے جسم کو ان لوگوں کے لئے جو تیرے پیچھے آنے والے ہیں نجات دیں گے کہ وہ (عبرت) کا نشان بنے۔"

پس اگر گذشتہ "مصری مقالہ" کا مضمون صحیح ہے کہ منفتاح (ریمسس ثانی) ہی فرعون موسیٰ علیہ السلام تھا تب تو بے شبہ اس کی لاش آج تک محفوظ ہے اور سمندر میں تھوڑی دیر غرق رہنے کی وجہ سے اس کی ناک کو مچھلی نے کھا لیا ہے اور آج وہ مصریات (ایجپٹالوجی) کے مصری عجائب خانہ میں تماشا گاہ خاص و عام ہے۔

اور بالفرض یہ وہ فرعون نہیں ہے تب بھی آیت کا مطلب اپنی جگہ صحیح ہے، اس لئے کہ توراۃ میں تصریح ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنی آنکھوں سے غرق شدہ مصریوں کی نعشوں کو کنارے پر پڑے ہوئے دیکھا تھا:

"اور اسرائیلیوں نے مصریوں کو سمندر کے کنارے مرے ہوئے پڑے دیکھا۔" (خروج باب ۱۴، آیت ۳۱)

بصائر:

قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کی روانگی اور فرعون کے غرق اور بنی اسرائیل کی نجات کے واقعہ کو بہت مختصر بیان کیا ہے اور اس کے صرف ضروری اجزاء ہی کا تذکرہ کیا ہے البتہ اس سے متعلق عبرت و بصیرت اور موعظت کے معاملہ کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ۝ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۷۷-۷۹)

اور (پھر دیکھو) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) پر وحی بھیجی تھی کہ (اب) میرے بندوں کو راتوں رات (مصر سے) نکال لے جا پھر

سمندر میں ان کے گذرنے کے لئے خشکی کی راہ نکال لے، تجھے نہ تو تعاقب کرنے والوں سے اندیشہ ہوگا، نہ اور کسی طرح کا خطرہ پھر (جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر نکل گیا، تو) فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ اس کا پیچھا کیا، پس پانی کا ریلا (جیسا کچھ) ان پر چھانے والا تھا چھا گیا یعنی جو کچھ ان پر گذرنی تھی گذر گئی اور فرعون نے اپنی قوم پر راہ (نجات) گم کر دی انہیں سیدھی راہ نہیں دکھائی۔"

﴿وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰۤی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْۤ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۝ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِی الْمَدَآىِٕنِ حٰشِرِیْنَ ۝ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِیْلُوْنَ ۝ وَ اِنَّهُمْ لَنَا لَغَآىِٕظُوْنَ ۝ وَ اِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ ۝ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ۝ وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِیْمٍ ۝ كَذٰلِكَ ؕ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۝ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِیْنَ ۝ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤی اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۝ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ۝ فَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰۤی اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ ۝ وَ اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِیْنَ ۝ وَ اَنْجَیْنَا مُوْسٰی وَ مَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ۝ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ ۝ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝﴾ (الشعراء: ۵۲-۶۸)

"اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کہ رات کو لے نکل میرے بندوں کو، البتہ تمہارا پیچھا کریں گے، پھر بھیجے فرعون نے شہروں میں نقیب، یہ لوگ جو ہیں سو ایک جماعت ہے تھوڑی سی، اور وہ مقرر ہم سے دل جلے ہوئے ہیں، اور ہم سارے ان سے خطرہ رکھتے ہیں، پھر نکال باہر کیا ہم نے ان کو باغوں اور چشموں سے اور خزانوں اور مکانوں سے اسی طرح اور ہاتھ لگا دیں ہم نے یہ چیزیں بنی اسرائیل کے پھر پیچھے پڑے ان کے سورج نکلنے کے وقت پھر جب مقابل ہوئیں دونوں فوجیں کہنے لگے موسیٰ (علیہ السلام) کے لوگ ہم تو پکڑے گئے، کہا ہرگز نہیں میرے ساتھ ہے میرا رب، وہ مجھ کو راہ بتائے گا، پھر حکم بھیجا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کہ مار اپنے عصاء سے دریا کو پھر دریا پھٹ گیا تو ہو گئی، ہر ایک پھانک جیسے بڑا پہاڑ اور پاس پہنچا دیا ہم نے اسی جگہ دوسروں کو اور بچا دیا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اور جو لوگ تھے اس کے ساتھ سب کو، پھر ڈبو دیا ہم نے ان دوسروں کو، اس چیز میں ایک نشانی ہے، اور نہیں تھے بہت لوگ ان میں ماننے والے، اور تیرا رب ہی ہے زبردست رحم والا۔"

﴿فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ ۝ وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ ۝﴾

(الاعراف: ۱۳۶-۱۳۷)

"بالآخر ہم نے (ان کی بدعملیوں پر) انہیں سزا دی یعنی اس جرم کی پاداش میں کہ ہماری نشانیاں جھٹلائیں اور ان کی طرف سے

غافل رہے، انہیں سمندر میں غرق کر دیا، اور جس قوم کو کمزور و حقیر خیال کرتے تھے اسی کو ملک کے تمام پورب کا اور اس کے مغربی حصوں کا کہ ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالا مال ہے وارث کر دیا، اور اس طرح (اے پیغمبرؐ) تیرے پروردگار کا فرمان پسندیدہ بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوا کہ (ہمت و ثبات کے ساتھ) جمے رہے تھے اور فرعون اور اس کا گروہ (اپنی طاقت و شوکت کے لئے) جو کچھ بنا تا رہا تھا اور جو کچھ (عمارتوں کی) بلندیاں اٹھائی تھیں، وہ سب درہم برہم کر دیں۔"

﴿وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَ جُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّ عَدْوًا ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً ؕ وَ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝﴾ (یونس: ۹۰۔۹۲)

"اور پھر ایسا ہوا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا، یہ دیکھ کر فرعون اور اس کے لشکر نے پیچھا کیا۔ مقصود یہ تھا کہ ظلم و شرارت کریں لیکن جب حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ فرعون سمندر میں غرق ہونے لگا، تو اس وقت پکار اٹھا" میں یقین کرتا ہوں کہ اس ہستی کے سواء کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں، اور میں بھی اسی کے فرماں برداروں میں ہوں!" (ہم نے کہا) "ہاں، اب تو ایمان لایا، حالانکہ پہلے برابر نافرمانی کرتا رہا، اور تو دنیا کے مفسد انسانوں میں سے ایک (بڑا ہی) مفسد تھا" پس آج ہم ایسا کریں گے کہ تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں سے) بچا لیں گے، تا کہ ان لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آنے والے ہیں، (قدرت حق کی) ایک نشانی ہو اور اکثر انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں کی طرف سے یک قلم غافل رہتے ہیں۔"

﴿وَ اسْتَكْبَرَ هُوَ وَ جُنُوْدُهٗ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اِلَیْنَا لَا یُرْجَعُوْنَ ۝ فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیْنَ ۝﴾ (القصص: ۳۹۔۴۰)

"اور برائی کرنے لگے وہ اور اس کے لشکر ملک میں ناحق اور سمجھے کہ ہماری طرف پھر کر نہ آئیں گے، پھر پکڑا ہم نے اس کو اور اس کے لشکروں کو پھر پھینک دیا ہم نے ان کو دریا میں سو دیکھ لے کیسا ہوا انجام گنہگاروں کا۔"

﴿وَ لَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِیْمٌ ۝ اَنْ اَدُّوْۤا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۝ وَّ اَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّیْۤ اٰتِیْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝ وَ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ۝ وَ اِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ ۝ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ۝ فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۝ وَ اتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ۝ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ۝ وَّ زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِیْمٍ ۝ وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِیْهَا فٰكِهِیْنَ ۝ كَذٰلِكَ ۫ وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا

اٰخَرِیْنَ ﴿۲۸﴾ فَمَا بَکَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا کَانُوْا مُنْظَرِیْنَ ﴿۲۹﴾ وَلَقَدْ نَجَّیْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِیْنِ ﴿۳۰﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ ؕ اِنَّهٗ کَانَ عَالِیًا مِّنَ الْمُسْرِفِیْنَ ﴿۳۱﴾ (الدخان : ۱۷۔۳۱)

"اور جانچ چکے ہم ان سے پہلے فرعون کی قوم کو اور آیا ان کے پاس رسول عزت والا کہ حوالہ کرو میرے بندے خدا کے تمہارے پاس آیا ہوں بھیجا ہوا معتبر، اور یہ کہ سرکشی نہ کرو اللہ کے مقابل، میں لایا ہوں تمہارے پاس سند کھلی ہوئی اور میں پناہ لے چکا ہوں اپنے رب اور تمہارے رب کی اس بات سے کہ تم مجھ کو سنگسار کرو، اور اگر تم نہیں یقین کرتے مجھ پر تو مجھ سے پرے ہو جاؤ، پھر دعاء کی اپنے رب سے کہ یہ لوگ گنہگار ہیں، پھر لے نکال رات میں میرے بندوں کو، البتہ تمہارا پیچھا کریں گے اور چھوڑ جا دریا کو تھما ہوا، البتہ وہ لشکر ڈوبنے والے ہیں، بہت سے چھوڑ گئے باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور گھر عمدہ، اور آرام کا سامان جس میں باتیں بنایا کرتے تھے، یونہی ہوا اور وہ سب ہاتھ لگا دیا ہم نے ایک دوسری قوم کے پھر نہ رویا ان پر آسمان اور زمین اور نہ ملی ان کو ڈھیل اور ہم نے بچا نکالا بنی اسرائیل کو ذلت کی مصیبت سے جو فرعون کی طرف سے تھی، بیشک وہ تھا چڑھ رہا حد سے بڑھ جانے والا۔"

﴿ فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا ﴿۱۰۳﴾ وَّ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اسْکُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِکُمْ لَفِیْفًا ﴿۱۰۴﴾ ﴾ (بنی اسرائیل : ۱۰۳۔۱۰۴)

"پھر چاہا، بنی اسرائیل کو چین نہ دے اس زمین میں پھر ڈبو دیا ہم نے اس کو اور اس کے ساتھ والوں کو سب کو اور کہا ہم نے اس کے پیچھے آباد رہو تم زمین میں پھر جب آئے گا وعدہ آخرت کا لے آئیں گے ہم تم کو سمیٹ کر۔"

﴿ وَ فِیْ مُوْسٰۤی اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰی فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۸﴾ فَتَوَلّٰی بِرُکْنِهٖ وَ قَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ وَ هُوَ مُلِیْمٌ ﴿۴۰﴾ ﴾ (الذاریات : ۳۸۔۴۰)

"اور نشانی ہے موسیٰ (علیہ السلام) کے حال میں، جب بھیجا ہم نے اس کو فرعون کے پاس دے کر کھلی سند، پھر اس نے منہ موڑ لیا اپنے زور پر، اور بولا یہ جادوگر ہے یا دیوانہ، پھر پکڑا ہم نے اس کو اور اس کے لشکروں کو پھر پھینک دیا ان کو دریا میں اور اس پر لگا الزام۔"

البتہ تورات نے بیان کردہ واقعات کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تفصیلات بیان کی ہیں اور بنی اسرائیل کے کوچ اور پڑاؤ کے اکثر مقامات کے نام بھی بتائے ہیں جو دنیا کے لیے نامعلوم ہیں۔

تورات کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ فرعون اور اس کی قوم پر جب خدا کی بھیجی ہوئی آفات کا سلسلہ جاری ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق یکے بعد دیگرے "نشانات" کا ظہور ہونے لگا تو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بلا کر کہا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لے جا مگر ان کے چوپائے اور پالتو جانور یہیں چھوڑنے ہوں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس شرط کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ایک جانور بھی تو روکنے کا حق نہیں رکھتا، تب فرعون غضبناک ہو کر کہنے لگا کہ اب بنی اسرائیل نہ جا سکیں گے اور تو اب میرے سامنے کبھی نہ آنا ورنہ میرے ہاتھ سے مارا جائے گا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تو نے ٹھیک کہا اب میں کبھی تیرے

سامنے نہ آؤں گا، میرے خدا کا یہی فیصلہ ہے اور اس نے مجھ کو بتا دیا ہے کہ تجھ پر اور تیری قوم پر ایسی سخت آفت آئے گی کہ تیرا اور کسی مصری کا پہلوٹھا زندہ نہیں رہے گا۔

موسیٰ علیہ السلام فرعون سے یہ گفتگو کر کے دربار سے باہر نکل آئے اور پھر بنی اسرائیل سے یہ فرمایا کہ خداوند کا ارشاد ہے کہ فرعون کا دل سخت ہو گیا ہے، وہ اب تم کو یہاں سے اس وقت تک نہ جانے دے گا جب تک مزید نشان نہ دیکھ لے کہ جس سے تمام مصریوں میں کہرام مچ جائے مگر تم کو تیاری کر لینی چاہیے کہ مصر سے نکلنے کا وقت آ پہنچا اور خدائے تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ بنی اسرائیل کو نکلنے سے پہلے قربانی اور عید فسح کا بھی حکم دیا اور اس کا طریقہ اور شرائط بھی بتا دیں، موسیٰ علیہ السلام نے ان سے یہ بھی کہا کہ اپنی عورتوں سے کہو کہ وہ مصری عورتوں کے پاس جائیں اور ان سے عید کے لیے سونے اور چاندی کے زیور اور قیمتی پارچہ جات مستعار مانگ لائیں اور مصری عورتوں نے آخر ان کو زیورات دے دیئے پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک رات فرعون سے لے کر معمولی مصری کا پہلوٹھا مر گیا اور تمام گھرانوں میں کہرام مچ گیا یہ دیکھ کر مصری فرعون کے پاس دوڑے آئے اور اس کو مجبور کیا کہ اسی وقت تمام بنی اسرائیل کو مصر سے نکال دے تاکہ یہ نحوست یہاں سے دور ہو، ہم پر یہ سب آفتیں انہی کی بدولت آتی رہتی ہیں۔

تب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اسی وقت تم سب یہاں سے نکل جاؤ اور اپنے جانوروں اور مویشیوں اور سب سامان کو ساتھ لے جاؤ، جب بنی اسرائیل رعمسیس (جشن کے شہر) سے نکلے تو بچوں اور جانوروں کے علاوہ وہ سب چھ لاکھ تھے اور جب وہ نکلے تو مصریوں کے زیورات کو بھی واپس نہ کر سکے اور مصریوں نے بھی مطالبہ نہ کیا۔

جب بنی اسرائیل نے جنگل کی راہ لی تو اب فرعون اور اس کے سرداروں کو اپنے فیصلہ پر سخت افسوس ہوا، اور انہوں نے آپس میں کہا کہ ہم نے مفت میں ایسے اچھے چاکر اور غلام ہاتھ سے کھو دیئے اور فرعون نے حکم دیا کہ فوراً سرداروں، مصری نوجوانوں اور فوج کو تیاری کا حکم دو اور وہ کروفر کے ساتھ رتھوں میں سوار ہو کر نکل کھڑے ہوئے اور بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔

بنی اسرائیل رعمسیس سے سکات اور وہاں سے ایتام اور پھر مڑ کر مجدال اور بحر احمر کے درمیان فی ہیخروت کے پاس بعل صفون کے سامنے خیمہ زن ہو چکے تھے، بنی اسرائیل کے اس پورے سفر میں خدا ان کے ساتھ رہا اور وہ نورانی ستون کی تجلّی کے ساتھ رات میں بھی ان کی راہنمائی کرتا اور دن میں بھی آگے آگے چلتا، غرض صبح کی پو پھٹ رہی تھی کہ فرعون نے سمندر کے کنارے بنی اسرائیل کو آ لیا، انہوں نے پیچھے پھر کر دیکھا اور فرعون کو لاؤ لشکر کے ساتھ اپنے قریب پایا تو بد دل اور خائف ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جھگڑا کرنے لگے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو بہت کچھ تسلی و تشفی دی اور بتایا کہ تمہارے دشمن ہلاک ہوں گے اور تم سلامتی و عافیت کے ساتھ نجات پاؤ گے، اور پھر دربار خداوندی میں مناجات کرنے لگے:

"اور خداوند نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تو کیوں مجھ سے فریاد کر رہا ہے، بنی اسرائیل سے کہو کہ وہ آگے بڑھیں اور تو اپنی لاٹھی اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اسے دو حصے کر، اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے.... پھر موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ خشک زمین پر چل کر نکل گئے۔

...... اور خداوند نے سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہ و بالا کر دیا اور پانی پلٹ کر آیا اور اس نے رتھوں اور سواروں اور

فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا غرق کر دیا، اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوڑا، پھر بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور پانی ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ دیواروں کی طرح رہا۔

......اور اسرائیلیوں نے وہ بڑی قدرت جو خداوند نے مصریوں پر ظاہر کی دیکھی، اور وہ لوگ خداوند سے ڈرے اور خداوند پر اور اس کے بندے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔ ❶

تورات کی ان تفصیلات میں اگرچہ بہت زیادہ رطب و یابس اور دور از کار باتیں بھی ضمناً آ گئی ہیں، مگر وہ اور قرآن عزیز دونوں اس بارہ میں ہم آہنگ ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قہرمانیت کے مظالم سے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو ایک عظیم الشان نشان (معجزہ) کے ذریعہ نجات دی، قرآن عزیز کہتا ہے کہ یہ معجزہ اس طرح ظاہر ہوا کہ خدا کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام نے قلزم پر لاٹھی ماری اور دریا کا پانی، بیچ میں خشکی دے کر دونوں جانب پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا۔

﴿فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴾(الشعراء: ٦٣)

"بس (دریا) پھٹ گیا ہر ایک جانب ایک بڑے پہاڑ کی مانند ہو گئی۔"

﴿وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴾(البقرہ: ٥٠)

"اور جب ہم نے ٹکڑے کر دیا تمہارے لیے سمندر پس نجات دی ہم نے تم کو اور غرق کر دیا فرعون کے لوگوں کو اور تم دیکھ رہے تھے۔"

اور تورات بھی اسی کی تائید کرتی ہے، چنانچہ اس میں مذکور ہے:

"تو اپنی لاٹھی اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اسے دو حصے کر........

اور پانی ان کے دائیں بائیں دیوار کی طرح رہا"۔

البتہ تورات میں یہ اضافہ اور ہے کہ "رات بھر تند پوربی ہوا چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا" سو اول تو تورات کی تحریف اور مختلف سنین کے مختلف تراجم کے پیش نظر تاریخی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے قرآن عزیز کے بیان ہی کو قابل اعتماد سمجھا جائے گا، کیونکہ وہ باتفاق دوست و دشمن ہر قسم کی تحریف و تبدیلی اور اضافہ و ترمیم سے محفوظ ہے۔

﴿لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴾(حم السجدہ: ٤٢)

"اس پر باطل کا کسی جانب سے گذر نہیں نہ سامنے سے اور نہ پیچھے سے وہ اتارا ہوا ہے ایسی ہستی کی جانب سے جو حکمت والا خوبیوں والا ہے۔"

علاوہ ازیں اس اضافہ کی تطبیق کی بہترین صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ بڑھا کر عصاء چلانے سے اوّل دریا کے دو حصے ہو گئے اور دونوں جانب پانی کھڑا ہو گیا اور پھر لاکھوں انسانوں نے جب اس کے درمیان سے گذرنا شروع کیا تو زمین کی نمی اور تری کو خشک کرنے کے لیے برابر پوربی تند ہوا چلتی رہی تاکہ بچہ سے بوڑھے تک اور انسان سے حیوان تک کسی کو بھی گذرنے میں زحمت و تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔

❶ خروج باب ١٤ آیت ١٥۔٣١

بدقسمتی سے مسلمانوں میں بعض ایسے افراد بھی ہیں جو "علم" کے نام سے مذہب کے ہر مسئلہ کو "مادیات" ہی تک محدود دیکھنا چاہتے ہیں اور اس لیے وہ خدا کے دیئے ہوئے ان نشانات (معجزات) کا بھی انکار کرتے ہیں جو انبیاء و رسل علیہم السلام کی صداقت کی تائید اور دلیل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں ان کے انکار کے وہی معنی ہیں جو گذشتہ صفحات پر معجزہ کی بحث میں زیر بحث آ چکے ہیں یعنی وہ خدا کے کسی فعل کو بھی کسی حالت میں اس محسوس اور مادی دنیا کے اسباب و علل سے مستثنیٰ مان لینے کو آمادہ نہیں ہیں کیونکہ ان کے الحاد و زندقہ کی بنیاد دراصل مغربی الحاد و زندقہ پر قائم ہے، اور ان کا دل و دماغ اس ہی سے مرعوب اور متاثر ہے جس کا لازمی نتیجہ میٹریلزم (Materlalism) پر اعتقاد و اعتماد کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

پس منجملہ دوسرے مقامات کے انہوں نے اس مقام پر بھی یہ کوشش کی ہے کہ کسی طرح "غرق فرعون" کا یہ واقعہ روحانی معجزہ سے نکل کر مادی اسباب و علل کے تحت میں آ جائے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے لیے سرگرم عمل ہستی سید احمد خان (سرسید) (مرحوم) بھی علوم عربیہ اور علوم دینیہ سے ناواقفیت کے باوجود مسطورۂ بالا عقیدہ کی ترویج میں پیش پیش ہیں، غالباً اس طرح وہ یورپ کی موجودہ زندگی کے ساتھ اسلام کو مطابق کرنا چاہتے تھے مگر مادیت کا یہ چولا چونکہ اس کے قد پر راست نہ آیا اس لیے انہوں نے چولے کی ترمیم کے بجائے اسلام کے نقشہ اور قد و قامت میں ترمیم شروع کر دی مگر اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

بے شبہ اسلام ایک ایسا روحانی مذہب ہے جو روحانیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ دنیوی زندگی میں بھی انسان کے عروج اور فلاح و بہبود کا کفیل ہے اور اس لیے ہر زمانے کے علوم و فنون کی ترقی اس کی آغوش میں پلتی اور اس میں جذب ہوتی رہی ہے اور علم و حکمت ہمیشہ اس کے سایہ عاطفت میں نشو و نما پاتے رہے لیکن "مادی علوم" کی حدود مادیات و مشاہدات اور محسوسات سے آگے کسی حال میں متجاوز نہیں ہو سکتیں اور آج کی سائنس اور کل کا فلسفہ دونوں اس کا اقرار کرتے ہیں کہ ہماری حدود محسوسات سے پرے نہیں ہیں، یعنی محسوسات و مادیات کی دیوار کے پیچھے کیا ہے؟ وہ اس سے لاعلمی تو ظاہر کرتے ہیں، مگر ان کا انکار نہیں کرتے۔

اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ گذشتہ اور موجودہ زمانہ میں جب کبھی علوم "نظریوں" اور "تھیوریز" سے آگے بڑھ کر محسوس اور مشاہدہ کی حد تک پہنچے ہیں تو ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ وہ اسلام کے اصول سے ٹکراتا ہو، یا اسلام میں اس کا انکار پایا جاتا ہو تب ایسی صورت میں جب تک علمی نظریوں اور تھیوریوں میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی اور علمی تحقیقات ایک جگہ چھوڑتی اور دوسری جگہ بناتی رہتی ہیں تو اسلام کو ان کے مطابق کرنے کی سعی عبث ہے کیونکہ مشاہدہ کی حد پر پہنچنے کے بعد بے شبہ ان کا فیصلہ قرآن کے فیصلہ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔

البتہ اسلام یا مذہب حق چند ایسے امور کا بھی اقرار کرتا ہے جو ان مادیات کی دنیا سے پرے کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں: مثلاً آخرت، حشر و نشر، جنت، جہنم، ملائکہ، وحی، نبوت اور معجزہ، مگر اس شرط کے ساتھ کہ ان میں سے کوئی امر بھی خلاف عقل یعنی عقل کی نگاہ میں ناممکن اور محال نہیں ہے، تاہم عقل کے لیے اس کی کنہ و حقیقت کا ادراک صرف اسی قدر ہو سکتا ہے جس قدر کہ مذہب نے اپنے علم یقین (وحی الٰہی) کے ذریعے اس کو بتا دیا ہے اور ان باتوں کے سمجھنے کے لیے وحی کے سوائے عقل کے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

بہر حال سید احمد خان صاحب نے تفسیر احمدی میں اس مقام کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ غرق فرعون اور نجات بنی اسرائیل کا یہ

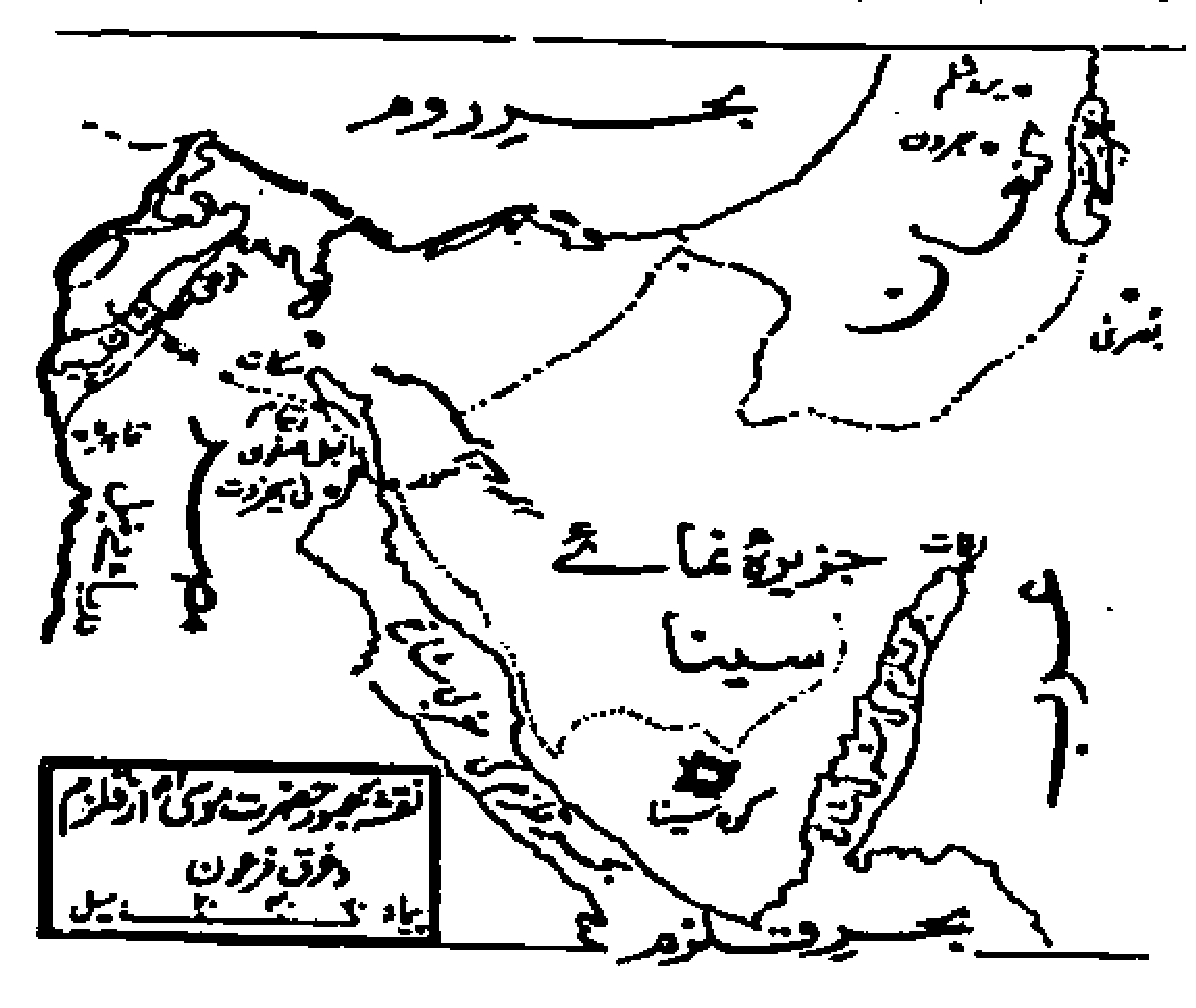
واقعہ معجزہ نہ تھا بلکہ عام دنیوی سلسلہ اسباب وعلل کے ماتحت بحر کے "مدوجزر" (جوار بھاٹا) سے تعلق رکھتا ہے، یعنی صورت حال یہ پیش آئی کہ جس وقت بنی اسرائیل نے قلزم کو عبور کیا تھا اس وقت اس کا پانی سمٹا ہوا تھا اور پیچھے کو ہٹ کر اس نے "جزر" اختیار کر رکھا تھا، فرعون نے جب بنی اسرائیل کو اس آسانی سے پار ہوتے دیکھا تو اس نے بھی اپنے لشکر کو داخل ہو جانے کا حکم دے دیا، مگر بنی اسرائیل پار ہو چکے تھے اور فرعونی لشکر ابھی دریا کی خشکی پر چل ہی رہا تھا کہ اس کے "مد" اور آگے بڑھنے کا وقت آ پہنچا اور فرعون اور اس کے لشکر کو اتنی بھی مہلت نہ ملی کہ وہ آگے بڑھ سکے یا پیچھے ہٹ سکے، اور سب غرق ہو گئے۔

سید صاحب نے اپنے اس مزعومہ خیال کے مطابق بنی اسرائیل کے عبور کے متعلق ایک نقشہ بھی دیا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بنی اسرائیل نے قلزم کے شمالی دہانہ پر جا کر اس کو عبور کیا ہے۔

مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قرآن عزیز کی تصریحات اس کا قطعی انکار کرتی ہیں، اور سید صاحب کی بات کسی طرح بنائے نہیں بنتی۔ اس بات کا فیصلہ تو قطعی ناممکن ہے کہ خاص وہ مقام متعین کیا جا سکے جس سے بنی اسرائیل گذرے اور دریا کو عبور کر گئے کیونکہ اس سلسلے میں گزشتہ تاریخ کا پرانا ذخیرہ تورات ہے مگر اس کے بیان کردہ مقامات موجودہ نسل کے لیے نامعلوم اسماء کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔

البتہ قرآن اور تورات کی مشترک تصریحات ونصوص سے یہ قطعی متعین کیا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل نے "بحر قلزم" کے کسی کنارے اور دہانے سے عبور کیا یا درمیانی کسی حصہ سے؟

اس کے لیے ایک مرتبہ نقشہ میں اس حصہ پر نظر ڈالیے جہاں بحر احمر (قلزم یا ریڈ سی) Red Sea واقع ہے، دراصل یہ بحر عرب کی ایک شاخ ہے جس کے مشرق میں سرزمین عرب واقع ہے، اور مغرب میں مصر، شمال میں اس کی دو شاخیں ہو گئی ہیں، ایک شاخ (خلیج عقبہ) جزیرہ نمائے سینا کے مشرق میں اور دوسری (خلیج سویز) اس کے مغرب میں واقع ہے، یہ دوسری شاخ پہلی سے بڑی ہے اور شمال میں بڑی دور تک چلی گئی ہے بنی اسرائیل اسی کے درمیان سے گذرے ہیں۔ اس شاخ کے شمالی دہانہ کے سامنے ایک اور سمندر واقع ہے جس کا نام بحر روم (Mediterranean Sea) ہے۔



اور بحر روم اور بحر احمر کے اس شمالی دہانہ کے درمیان تھوڑا سا خشکی کا حصہ ہے، یہی وہ راستہ تھا جہاں سے مصر سے فلسطین اور کنعان جانے والے کو "بحر احمر" عبور کرنا نہیں پڑتا تھا، اور اس زمانہ میں یہ راہ قریب کی راہ سمجھی جاتی تھی اور بنی اسرائیل نے بحکم الٰہی یہ راہ اختیار نہیں کی تھی، اب اسی خشک زمین کو کھود کر بحر احمر (ریڈ سی) کو بحر روم سے ملا دیا گیا ہے اور اس ٹکڑے کا نام نہر سوئیز ہے اور "ریڈ سی" کے شمالی دہانہ پر سوئیز کے نام سے ایک شہر آباد ہے، جو مصر کی بندرگاہ شمار ہوتا ہے۔

اب اس کے بعد قرآن عزیز کی سورۂ بقرہ اور سورۂ شعراء کی ان آیات پر پھر ایک مرتبہ غور کرنا چاہیے جو اس سلسلہ کی تصریحات پیش کرتی ہیں، ان آیات میں دو باتوں کا صاف صاف تذکرہ موجود ہے، ایک "فلق یا فرق بحر" یعنی دریا کا پھٹنا یا اس کو پھاڑ دینا، اور دوسرے دونوں جانب پانی کا پہاڑ کی طرح کھڑا ہو جانا اور درمیان میں راستہ پیدا ہو جانا ﴿فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴾۔

عربی لغت میں "فرق" کے معنی دو ٹکڑے کر کے جدا کر دینے کے آتے ہیں خصوصاً "بحر" کی نسبت کے ساتھ چنانچہ کتب لغت میں ہے "فرق البحر ای فلقہ" سر کی مانگ کو بھی "فرق" اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ سر کے بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے بیچ میں نکالی جاتی ہے، اور "فلق" کے متعلق اس طرح مذکور ہے "فلق الشئ، شقه و الفلق، انشق یعنی اس نے فلاں شئے کو ٹکڑے کر دیا اور وہ ٹکڑے ہوگئی" اسی لیے "فالق" اس دراز کو کہتے ہیں جو پتھر کے درمیان ہو جاتی ہے، اسی طرح "طود" کے معنی بڑے پہاڑ کے ہیں "الطود۔ الجبل العظیم" پس ان لغوی تصریحات کے بعد ان ہر دو آیات کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہوا کہ دریا کا پانی یقیناً دو ٹکڑے ہوگیا اور وہ دونوں جانب دو ٹکڑے ہوئے پہاڑ کی طرح بن گیا، اور درمیان میں راستہ پیدا ہوگیا، اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ بنی اسرائیل نے دریا کے ایسے حصہ سے عبور کیا ہو جو دہانہ اور کنارہ کے سامنے کا حصہ نہ ہو بلکہ پانی کا ایسا حصہ جو درمیان سے پھٹ کر دو حصے بن سکتا ہو، دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیجئے کہ قرآن عزیز صاف صاف اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ بنی اسرائیل خشکی کی راہ سے قلزم کے دہانہ یا کنارے سے نہیں گذرے تھے بلکہ دریا کے کسی درمیانی حصہ کو عبور کر کے میدان سینا میں پہنچے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ "مدوجزر" (جوار بھاٹا) طولانی حصہ میں دہانہ کی جانب ہوا کرتا ہے، عرض میں اس طرح کبھی بھی نہیں ہوتا کہ پانی دونوں جانب سمٹ جائے اور بیچ میں خشکی کی راہ پیدا ہو جائے، لہٰذا خدائے تعالیٰ کے اس عظیم الشان "نشان" (معجزہ) کا انکار کرتے ہوئے اس کو روزمرہ کے مادی اسباب کے نیچے لانے کی سعی کرنا قرآنی تصریحات کے بالکل خلاف اور اس کی تحریف کے مترادف ہے۔

نیز تورات نے بنی اسرائیل کے اس عبور کے واقعہ میں "بحر احمر" کے جن مشرقی اور مغربی کنارہ کے مقامات کا ذکر کیا ہے اور اس عبور کے متعلق جو تصریحات بیان کی ہیں ان سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ عبور دہانہ پر سے نہیں تھا بلکہ شمال مغرب کے درمیانی حصہ سے ہوا تھا جیسا کہ نقشہ سے واضح ہوتا ہے۔

بعض مغرب زدہ "ملحدوں" نے اس مقام پر جب کسی طرح انکار معجزہ کی بات بنتی نہ دیکھی تو تورات کے فقرہ کا سہارا لیا:

"اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا، اور پانی دو حصے ہوگیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے۔"

وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ خشک زمین دریا کے بیچ میں نکل آئی تھی تو بھی یہ معجزہ نہ تھا بلکہ رات بھر خشک

ہوا کے چلنے سے دونوں جانب پانی بستہ برف کی طرح ہو گیا تھا اور بیچ میں خشک راستہ بن گیا تھا مگر جب فرعون کی باری آئی تو آفتاب کی تمازت نے بستہ برف کو پگھلا دیا اور پانی اصل حالت پر آ گیا اور مصری غرق ہو گئے۔

تو اس کے متعلق نجار مصری نے خوب کہا ہے کہ اگر بالفرض ان کی اس باطل تاویل کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی یہ "معجزہ" ہوا، اس لیے کہ سمندروں کے وجود سے لے کر آج تک کسی جگہ یہ ثابت نہیں ہے کہ اس طرح ہوا چل کر ان کے درمیان میں خشک راہ بنا دیتی ہو، علم تاریخ اور طبیعات دونوں اس قسم کے واقعہ سے یکسر خالی ہے۔

پس "عام مادی علل و اسباب سے جدا، اگر ہوا کا یہ عمل صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی نجات اور فرعون اور اس کے لشکر کے غرق ہی کے لیے مخصوص تھا اور مخصوص رہا تو پھر یہ "معجزہ" نہیں تو اور کیا ہے؟"

بہرحال قرآن عزیز صراحت کرتا ہے کہ بحر قلزم میں غرق فرعون اور نجات موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کی تائید میں ایک عظیم الشان معجزہ تھا اور اگر کائنات کی کوئی شہادت بھی اس واقعہ کے اعجاز میں موجود نہ ہوتی تب بھی ہمارے لیے "وحی الٰہی" کا یہ فیصلہ ایک ناطق فیصلہ ہے اور مومن کا ایمان دور از کار تاویلات سے جدا اصل حقیقت ہی کے ساتھ وابستہ ہے، اور ہمارا یقین ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کے لیے یہ ایسا عظیم "معجزہ" تھا جس نے تمام مادی قہرمانیت اور سامان استبدادیت کو ایک لمحہ میں شکست دے کر مظلوم قوم کو ظالم قوم کے پنجہ سے رستگاری دلائی۔ [1] وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ.

﴿وَ اَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ۞ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۞ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۞ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۞﴾ (الشعراء: ٦٥-٦٨)

"اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) اور اس کے تمام ساتھیوں کو نجات دی، پھر دوسروں کو (یعنی ان کے دشمنوں کو) غرق کر دیا، بلاشبہ اس واقعہ میں (خدا کا زبردست) نشان (معجزہ) ہے اور اکثر ان کے ایمان نہیں لاتے اور اقرار نہیں کرتے اور بلاشبہ تیرا رب ہی (سب پر) غالب رحمت والا ہے۔"

فرعون، قوم فرعون اور عذاب قیامت:

فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ حق و باطل کے معرکوں میں ایک عظیم الشان معرکہ ہے، اور ایک جانب غرور و نخوت، جبر و ظلم اور قہرمانیت و انانیت کی ذلت و رسوائی ہے تو دوسری جانب مظلومیت، خدا پرستی اور صبر و استقامت

---

[1] نجار کہتے ہیں کہ غرق فرعون اور عبور بنی اسرائیل کی جگہ آج متعین و منضبط نہیں ہے کہ ٹھیک ٹھیک اس جگہ کو بتایا جا سکے، البتہ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ یہ جگہ وہ ہے جو آج "برکہ فرعون" (فرعون کے پانی میں بیٹھ جانے کی جگہ) کے نام سے مشہور ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ یہ بحر احمر کی بندرگاہ سویز سے بہت دور ہے، مثلاً اگر جہاز شام کے وقت سویز سے روانہ ہو تو آدھی رات کے بعد اس مقام پر پہنچے گا، لہٰذا یہ مقام وہ جگہ ہرگز نہیں ہے بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ اس زمانہ میں "قلزم" کی خلیج جو خلیج سویز کے نام سے مشہور ہے بحر روم کے قریب تک پھیلتی چلی گئی تھی اور اب سے بہت نزدیک تھی، لہٰذا بنی اسرائیل کے عبور کی جگہ وہ ہو سکتی ہے جو آج "عیون موسیٰ" کے نام سے مشہور ہے اور جو شمال مشرق میں واقع ہے، اس وقت میرے پاس محمد رفعت کا اطلس (اٹلس) موجود ہے، اس میں عبور بنی اسرائیل کے لئے جو خط کھینچ کر دکھلائے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ یہ عبور سویز اور بحیرہ مرہ کے درمیان ہوا ہے، اور عیون موسیٰ بھی یہیں شمال مشرق میں واقع ہے۔ (قصص الانبیاء ص ۳۴۱-۳۴۲)

کی فتح وکامرانی کا عجیب وغریب مرقع، اس لیے خدائے تعالیٰ نے فرعون اور قوم فرعون کی ہلاکت دنیوی کے بعد عبرت وبصیرت کے لیے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اس قسم کے لوگوں کے لیے آخرت اور سرمدی وابدی زندگی میں کس قدر سخت عذاب اور خدا کی پھٹکار کے کیسے عبرتناک سامان مہیا ہیں تاکہ سلیم اور صالح طبائع اور نیک نہاد ونیک سرشت ہستیاں ان کا مطالعہ کریں اور ان اعمال زشت سے خود کو بھی بچائیں اور دوسروں کو بھی بچنے کی ترغیب دیں۔

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡىِٕهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ۝ یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ۝ وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ۝﴾ (ھود: ۹۶-۹۹)

"اور (یہ بھی ہو چکا ہے کہ) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیوں اور واضح سند کے ساتھ بھیجا تھا، فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف، مگر وہ فرعون کی بات پر چلے، اور فرعون کی بات راست بازی کی بات نہ تھی، قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا (جس طرح دنیا میں گمراہی کے لیے ہوا) اور انہیں دوزخ میں پہنچائے گا تو دیکھو کیا ہی پہنچنے کی بری جگہ ہے جہاں وہ پہنچ کر رہے! اور اس دنیا میں بھی لعنت ان کے پیچھے لگی (کہ ان کا ذکر کبھی پسندیدگی کے ساتھ نہیں کیا جاتا) اور قیامت میں بھی (کہ عذاب آخرت کے مستحق ہوئے) تو دیکھو کیا ہی برا صلہ ہے جو ان کے حصہ میں آیا۔"

﴿وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ ۚ وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ لَا یُنْصَرُوْنَ ۝ وَ اَتْبَعْنٰهُمْ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً ۚ وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ ۝﴾ (القصص: ۴۱-۴۲)

"اور کیا ہم نے ان کو پیشوا کہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور قیامت کے دن ان کو مدد نہ ملے گی، اور پیچھے رکھ دی ہم نے ان پر اس دنیا میں پھٹکار اور قیامت کے دن ان پر برائی ہے۔"

﴿وَ حَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا ۚ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝﴾ (المؤمن: ۴۵-۴۶)

"اور اُلٹ پڑا فرعون والوں پر بری طرح کا عذاب، وہ آگ ہے کہ دکھلا دیتے ہیں ان کو صبح اور شام، اور جس دن قائم ہوگی قیامت، حکم ہوگا داخل کرو فرعون والوں کو سخت سے سخت عذاب میں۔"

﴿اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِیْمِ ۝ كَالْمُهْلِ ۚ یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ ۝ كَغَلْیِ الْحَمِیْمِ ۝ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰی سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ۝ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِیْمِ ۝ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ ۝ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ۝﴾ (الدخان: ۴۳-۵۰)

"بلاشبہ سیہنڈ کا درخت خوراک ہے گنہگار کی جیسے پگھلا ہوا تانبا کھولتا ہے پیٹوں میں، جیسے کھولتا پانی، پکڑو اس کو اور دھکیل کر

لے جاؤ دوزخ میں، پھر ڈالو اس کے سر پر پانی کا عذاب، اس کو چکھ! تو ہی ہے بڑا عزت والا سردار، یہ وہی ہے جس کے متعلق تم دھوکے میں پڑے تھے۔"

عبور قلزم کے بعد بنی اسرائیل کا پہلا مطالبہ:

تورات میں ہے کہ جب بنی اسرائیل سلامتی کے ساتھ بحر قلزم کو پار کر گئے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے فرعون اور اس کی فوج کو غرق ہوتے اور پھر ان کی نعشوں کو ساحل پر تیرتے دیکھ لیا تو بتقاضائے فطرت بے حد مسرت اور خوشی کا اظہار کیا، اور عورتوں نے خصوصیت کے ساتھ دف پر خوشی کے گیت گائے اور شادمانی و خوش کامی کا ثبوت دیا، جب یہ سب کچھ ہو چکا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو جمع کر کے فرمایا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اپنی قوم سے کہو کہ "وہ میں ہوں جس نے تم کو اس زبردست فتنہ سے نجات دی سو میرا شکر ادا کرو اور میری ہی بندگی کرو۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اب اپنی قوم کو ساتھ لے کر بیابان شور سے ہوتے ہوئے سین یا سینا کی راہ لی، سینا کے بت کدوں میں پرستاران صنم بتوں کی پوجا میں مشغول تھے بنی اسرائیل نے یہ منظر دیکھا تو کہنے لگے: "موسیٰ! ہم کو بھی ایسے ہی معبود بنا دے تاکہ ہم بھی اسی طرح ان کی پرستش کریں۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کی زبانی یہ مشرکانہ مطالبہ سنا تو بہت زیادہ ناراض ہوئے اور بنی اسرائیل کو ڈانٹا، عار دلائی اور ملامت کی کہ بدبختو! خدائے واحد کی پرستش چھوڑ کر بتوں کی پوجا پر مائل ہو اور خدا کی ان تمام نعمتوں کو فراموش کر بیٹھے جن کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر چکے ہو۔

قومی پستی کا مظاہرہ:

دنیا کی تاریخ میں ہمارے سامنے ایک قوم کا نقشہ حیات اس طرح نظر آتا ہے کہ وہ تقریباً ساڑھے چار سو برس سے مصر کے قاہر و جابر بادشاہوں اور مصری قوم کے ہاتھوں میں غلام اور مظلوم چلی آتی ہے اور غالب قوم کے سخت سے سخت مصائب و مظالم کا شکار بن رہی ہے کہ اچانک اسی مردہ قوم میں سے بجلی کی کڑک اور آفتاب کی چمک کی طرح ایک برگزیدہ ہستی سامنے آتی ہے اور اس کی صدائے حق اور اعلانِ ہدایت سے تمام قلمرو باطل لرزہ براندام ہو جاتی، اور ایوانِ ظلم و کفر میں بھونچال آ جاتا ہے، وہ دنیا کی ایک زبردست متمدن طاقت کے مقابلہ میں یہ اعلان کرتی ہے کہ میں خدائے واحد کا رسول اور ایلچی ہوں اور تجھ کو ہدایت کی پیروی اور مظلوم قوم کی آزادی کا پیغام سنانے آیا ہوں، فرعونی طاقت اپنے تمام مادی اسباب کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتی ہے، مگر ہر مرتبہ شکست کا منہ دیکھتی ہے اور آخری بازی میں حق کی کامیابی اور باطل کی ہلاکت کا ایسا حیرت زدہ نقشہ سامنے آتا ہے کہ مادی طاقت قلزم میں غرق ہو جاتی اور غلام و مظلوم قوم اور دنیوی اسباب و وسائل سے محروم قوم آزادی کے گیت گاتی نظر آتی ہے۔

یہ ہے وہ عجیب و غریب فطرت اور حیران کن طبیعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی قوم "بنی اسرائیل" جو ان تمام معرکہ ہائے حق و باطل کو آنکھوں سے دیکھنے اور حق کی کامیابی کے ساتھ اپنی نجات پا جانے کے شکریہ میں آج موسیٰ علیہ السلام سے پہلا مطالبہ یہ کرتی ہے کہ ہم کو بھی ایسے ہی معبود (بت) بنا دے جیسا کہ یہ پجاری بت خانہ میں بیٹھے پوج رہے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اگرچہ بنی اسرائیل نبیوں کی اولاد تھے اور ابھی تک ان میں وہ اثرات ایک حد تک باقی بھی تھے جو ان کو

باپ دادا سے ورثہ میں ملے تھے، تاہم صدیوں سے مصری بت پرستوں میں بودوباند کرنے اوران کے حاکمانہ اقتدار میں غلام رہنے کی وجہ سے ان میں صنم پرستی کا جذبہ کافی سرایت کر چکا تھا، اور وہی جذبہ تھا جو آج پجاریوں کو دیکھ کر ان میں اُبھر آیا اور وہ موسیٰ علیہ السلام سے ایسا ناپاک مطالبہ کر بیٹھے۔

﴿وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۳۸۔۱۴۰)

"اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار کر دیا پھران کا گذر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے بتوں کے سامنے دھ لگائے بیٹھی تھی تو کہنے لگے: (موسیٰ! جیسے ان کے معبود بت) ہیں ایسے ہی ہمارے لیے بھی بنا دے" موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "افسوس تم پر بلاشبہ تم جاہل قوم ہو، لاریب ان لوگوں کا طریقہ تو ہلاکت کا طریقہ ہے اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں باطل ہے (اور یہ بھی) کہا کہ باوجود اس کے کہ تم کو خدا نے تمام کائنات پر فضیلت دی ہے، پھر بھی میں تمہارے لیے خدائے واحد کے سوا اور معبود تلاش کروں۔"

بنی اسرائیل کے دیگر مطالبات اور آیات بینات کا ظہور:

بنی اسرائیل نے بحر قلزم کو پار کر کے جس سرزمین پر قدم رکھا یہ عرب کی سرزمین تھی جو قلزم کے مشرق میں واقع ہے، یہ لق و دق بے آب و گیاہ میدان سے شروع ہوتی ہے جو تورات کی زبان میں بیابان شور، سین، وادئ سینا (تیہ) کے نام سے مشہور ہے اور طور تک اس کا دامن وسیع ہے، یہاں شدید گرمی پڑتی ہے۔ دور دور تک سبزہ اور پانی کا پتہ نہیں، اس لیے بنی اسرائیل گھبرا اٹھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کرنے لگے کہ ہم پانی کہاں سے پئیں، ہم تو پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے، یہاں تو پینے کے لیے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درگاہِ الٰہی میں التجاء کی اور وحی الٰہی نے ان کو حکم دیا کہ اپنا عصاء زمین پر مارو، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تعمیل ارشاد کی تو فوراً بارہ سوت اُبل پڑے اور بنی اسرائیل کے بارہ اسباط (قبائل) کے لیے جدا جدا چشمے جاری ہو گئے، بنی اسرائیل کو جب اس طرف سے اطمینان ہو گیا تو اب کہنے لگے کہ پانی کا تو انتظام ہو گیا، لیکن زندگی کے لیے صرف یہی تو کافی نہیں ہے، ہم کو بھوک لگی ہے اب کھائیں کہاں سے؟ یہاں تو کوئی صورت نظر نہیں آتی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر رب العالمین کی بارگاہ میں دعاء کی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ موسیٰ (علیہ السلام)! تمہاری دعاء قبول ہوئی پریشان نہ ہو، ہم غیب سے سب انتظام کیے دیتے ہیں، اور پھر ایسا ہوا کہ جب رات بیت گئی اور صبح ہوئی تو بنی اسرائیل نے دیکھا کہ زمین اور درختوں پر جگہ جگہ سفید اولے کے دانے کی طرح شبنم کی صورت میں آسمان سے کوئی چیز برس کر گری ہوئی ہے، کھایا تو نہایت شیریں حلوے کی مانند تھی، یہ "من" تھا اور دن میں تیز ہوا چلی اور تھوڑی دیر میں بٹیروں کے غول کے غول آ کر زمین پر اترے اور پھیل گئے، بنی اسرائیل نے بآسانی ان کو ہاتھوں سے پکڑ لیا اور بھون کر کھانے لگے، یہ "سلویٰ" تھا اس طرح روزانہ بغیر زحمت و تکلیف کے ان کو یہ دونوں نعمتیں مہیا ہو جاتیں، لیکن خدائے تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت بنی اسرائیل کو یہ تنبیہ کر دی تھی کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق "من و سلویٰ" کو کام میں لائیں

اور دوسرے دن کے لئے ذخیرہ نہ کریں ہم ان کو روزانہ یہ نعمت عطا کرتے رہیں گے۔[1]

کھانے اور پینے کی ضروریات کی فراہمی سے جب اطمینان ہو گیا تو اب بنی اسرائیل نے تیسرا مطالبہ یہ کیا کہ گرمی کی شدت اور سایہ دار درختوں اور مکانوں کی راحت میسر نہ ہونے کی وجہ سے ہم بہت پریشان ہیں، ایسا نہ ہو کہ یہ تپش اور تمازت ہماری زندگی کا خاتمہ ہی کر دے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تشفی دی اور بارگاہِ قدس میں عرض کیا کہ جب تو نے ان پر بڑے بڑے انعامات اور فضل و کرم کی بارش کی ہے تو اس سخت تکلیف سے بھی ان کو نجات عطاء فرما، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سنی گئی اور آسمان پر بادلوں کے پرے کے پرے بنی اسرائیل پر سایہ فگن ہو گئے اور بنی اسرائیل جہاں بھی سفر کرتے ہوئے جاتے بادلوں کا یہ سائبان ان کے سروں پر سایہ فگن رہتا۔

سدی کی ایک روایت میں ان ہر سہ "آیات اللہ" کا تذکرہ یکجا اس طرح مذکور ہے: "جب بنی اسرائیل "تیہ" کے میدان میں پہنچے تو کہنے لگے "موسیٰ (علیہ السلام)! اس لق و دق میدان میں ہمارا کیا حشر ہوگا، کہاں سے کھائیں گے، کہاں سے پئیں گے اور کہاں سے سایہ حاصل کریں گے تب اللہ تعالیٰ نے ان کے کھانے کے لیے "من و سلویٰ" اتارا پینے کے لیے "بارہ چشمے" جاری کر دیئے، اور سایہ کے لیے بادل سایہ فگن ہو گئے۔[2]

﴿ وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ ﴾ (البقرہ: ۶۰)

"اور پھر" وہ واقعہ بھی یاد کرو، جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا تھا اور ہم نے حکم دیا تھا، اپنی لاٹھی کے سے پہاڑ کی چٹان پر ضرب لگاؤ، (تم دیکھو گے کہ پانی تمہارے لیے موجود ہے، موسیٰ علیہ السلام نے اس حکم کی تعمیل کی) چنانچہ بارہ چشمے پھوٹ نکلے، اور تمام لوگوں نے اپنے اپنے پانی لینے کی جگہ معلوم کر لی (اس وقت تم سے کہا گیا تھا، اس بے آب و گیاہ بیابان میں تمہارے لیے زندگی کی تمام ضرورتیں مہیا ہو گئی ہیں پس) کھاؤ پیو، خدا کی بخشائش سے فائدہ اٹھاؤ اور ایسا نہ کرو کہ ملک میں فتنہ و فساد پھیلاؤ (یعنی ضروریات معیشت کے لیے لڑائی جھگڑا کرو، یا ہر طرف لوٹ مار مچاتے پھرو)۔"

﴿ وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ ﴾ (البقرہ: ۵۷)

"اور (پھر جب ایسا ہوا تھا کہ صحراءِ سینا کی بے آب و گیاہ سرزمین میں دھوپ کی شدت اور غذا کے نہ ملنے سے تم ہلاک ہو جانے والے تھے) تو ہم نے تمہارے سروں پر ابر کا سایہ پھیلا دیا، اور من و سلویٰ کی غذا فراہم کر دی (تم سے کہا گیا) خدا نے تمہاری غذا کے لیے جو اچھی چیزیں مہیا کر دی ہیں، انہیں بفراغت کھاؤ اور کسی طرح کی تنگی و قلت محسوس نہ کرو (لیکن اس پر بھی تم اپنی بدعملیوں سے باز نہ آئے غور کرو) تم نے اپنی ناشکریوں سے ہمارا کیا بگاڑا؟ خود اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔"

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۹۵-۹۶ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۹۷

﴿وَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ ۝ وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْهِمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْهِمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۵۹۔۱۶۰)

"اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ایک گروہ (ضرور) ایسا ہے جو لوگوں کو سچائی کی راہ چلتا اور سچائی کے ساتھ (ان کے معاملات میں انصاف بھی کرتا ہے) اور ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ خاندانوں کے بارہ گروہوں میں منقسم کر دیا، اور جب لوگوں نے موسیٰ (علیہ السلام) سے پینے کے لیے پانی مانگا تو ہم نے وحی کی کہ اپنی لاٹھی (ایک خاص) چٹان پر مارو، چنانچہ بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر گروہ نے اپنی اپنی جگہ پانی کی معلوم کر لی اور ہم نے بنی اسرائیل پر ابر کا سایہ کر دیا تھا، اور ان کی غذا کے لیے من وسلویٰ اتارا تھا ہم نے کہا تھا یہ پسندیدہ غذا کھاؤ جو ہم نے عطا کی ہے اور فتنہ وفساد میں نہ پڑو انہوں نے نافرمانی کر کے ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑا خود اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کرتے رہے۔"

﴿یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ قَدْ اَنْجَیْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَ وٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَیْمَنَ وَ نَزَّلْنَا عَلَیْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ۝ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ لَا تَطْغَوْا فِیْهِ فَیَحِلَّ عَلَیْكُمْ غَضَبِیْ ۚ وَ مَنْ یَّحْلِلْ عَلَیْهِ غَضَبِیْ فَقَدْ هَوٰى ۝ وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۸۰۔۸۲)

"اے بنی اسرائیل! میں نے تمہارے دشمن سے تمہیں نجات بخشی، تم سے (برکتوں اور کامرانیوں کا) وعدہ کیا جو کوہ طور کے داہنی جانب ظہور میں آیا تھا، تمہارے لیے (صحرائے سینا میں) من وسلویٰ مہیا کر دیا تمہیں کہا گیا یہ پاک غذا مہیا کر دی گئی ہے شوق سے کھاؤ (مگر اس بارہ میں سرکشی نہ کرو) کرو گے تو میرا غضب نازل ہو جائے گا اور جس پر میرا غضب نازل ہوا تو بس وہ (ہلاکت میں گرا) اور میں نے کہا جو کوئی توبہ کرے، ایمان لائے، نیک عمل ہو تو میں یقیناً اس کے لیے بڑا ہی بخشش والا ہوں۔"

عبدالوہاب نجار نے قصص الانبیاء میں لکھا ہے کہ پانی کے وہ چشمے جن کا ذکر بنی اسرائیل کے واقعات میں آیا ہے بحر احمر کے مشرقی بیابان میں سوئیز سے زیادہ دور نہیں ہیں اور اب بھی "عیون موسیٰ" (موسیٰ علیہ السلام کے چشمے) کے نام سے مشہور ہیں، ان چشموں کا پانی اب بہت کچھ سوکھ گیا ہے اور بعض کے تو آثار بھی قریب قریب معدوم ہو گئے ہیں اور کہیں کہیں ان چشموں پر اب کھجور کے باغات نظر آتے ہیں۔

قرآن عزیز کے ذکر کردہ واقعات سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عصاء مار کر پانی کے حاصل کرنے کا واقعہ صرف ایک ہی مرتبہ پیش نہیں آیا بلکہ "تیہ کے میدان میں" مختلف مقامات پر متعدد مرتبہ پیش آیا ہے۔

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طفیل بنی اسرائیل پر خدائے تعالیٰ کے احسانات کی مسلسل بارش ہوتی رہی اور سینکڑوں برس

کی غلامی سے ان کے عزائم کی پستی، اخلاقی کمزوری اور ہمت و شجاعت کے فقدان نے ان پر جو ایک مستقل مایوسی اور ناامیدی طاری کر دی تھی ان "خدائی نشانات" نے بڑی حد تک ان کی ڈھارس بندھائے رکھی، مگر عجیب الفطرت قوم پر اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا اور انہوں نے اپنی "بوالعجبی" کا ایک نیا مظاہرہ پیش کر دیا ایک دن سب جمع ہو کر کہنے لگے موسیٰ (علیہ السلام)! ہم روز روز ایک غذا کھاتے رہنے سے گھبرا گئے ہیں، ہم کو اس "من و سلویٰ" کی ضرورت نہیں ہے، اپنے خدا سے دعا کر کے وہ ہمارے لیے زمین سے باقلاء، کھیرا، ککڑی، مسور، لہسن، پیاز جیسی چیزیں اُگائے تاکہ ہم خوب کھائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا، اور فرمانے لگے "تم بھی کس قدر احمق ہو کہ ایک عمدہ اور بہترین غذا کو چھوڑ کر معمولی اور گھٹیا قسم کی چیزوں کے طلبگار بنے ہو اور اس طرح خدا کی نعمتوں کی ناسپاسی اور اس کے احسانات کی ناشکری کر کے کفرانِ نعمت کرتے ہو؟ پس اگر واقعی تم کو یہ نعمتیں نہیں بھاتیں اور جن چیزوں کا تم نام لے رہے ہو ان ہی کے لیے اصرار کرتے ہو تو درگاہِ الٰہی سے ان کو نشانات کی طرح طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے جاؤ کسی بستی اور شہر میں چلے جاؤ وہاں ہر جگہ تم کو یہ چیزیں وافر مل جائیں گی۔

﴿وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآىِٕهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ﴾ (البقرہ: ۶۱)

"اور جب تم نے کہا موسیٰ (علیہ السلام)! ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے پس اپنے پروردگار سے ہمارے لیے دعا کر کہ وہ زمین سے ہمارے لیے باقلا، ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز جیسی چیزیں اُگائے، موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: "کیا تم بہتر اور عمدہ چیز کے بدلے گھٹیا چیز کے خواہش مند ہو، کسی شہر میں جا کر قیام کرو، بلاشبہ وہاں یہ سب کچھ مل جائے گا جس کے تم طلب گار ہو۔"

طور پر اعتکاف:

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خدا کا وعدہ تھا کہ جب بنی اسرائیل مصری حکومت کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے تو تم کو "شریعت" دی جائے گی، اب وہ وقت آ گیا کہ خدا کا وعدہ پورا ہو، اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام وحی الٰہی کے اشارہ سے طور پر پہنچے اور وہاں عبادت الٰہی کے لیے اعتکاف کیا، اس اعتکاف کی مدت ایک مہینہ تھی مگر بعد میں دس دن اور بڑھا کر چلہ پورا کر دیا۔

دیلمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک ماہ کا اعتکاف ختم ہو گیا تو انہوں نے خدائے تعالیٰ سے ہم کلامی کی تیاری شروع کی، چونکہ مسلسل ایک ماہ روزہ ہی میں بسر کیے تھے اس لیے منہ میں بو محسوس کرتے تھے، لہٰذا انہوں نے یہ پسند نہیں کیا کہ رب العالمین سے اس حالت میں ہم کلام ہوں اور انہوں نے ایک خوشبودار بوٹی کو چبایا اور کھا لیا، فوراً وحی الٰہی نے ٹوکا موسیٰ! تم نے ہمکلامی سے پہلے روزہ کیوں افطار کر لیا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی وجہ بیان کر دی، تب حکم ہوا کہ موسیٰ (علیہ السلام) اس مدت کو دس دن بڑھا کر چالیس دن کر دو، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارے یہاں

ایک روزہ دار کے منہ کی بو بھی مشک کی خوشبو سے زیادہ محبوب ہے، اور اس طرح پر "چلہ" پورا ہوا۔ [1]
مگر قرآن کریم نے صرف اسی قدر ذکر کیا ہے کہ یہ مدت اوّل تیس دن تھی اور پھر بڑھا کر چالیس دن کر دی گئی، وجہ بیان نہیں کی۔ [2]

﴿وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ﴾ (الاعراف: ۱۴۲)

"اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے تیس راتوں کا وعدہ کیا تھا پھر دس راتیں بڑھا کر اسے پورا (چلہ) کر دیا، اس طرح پروردگار کے حضور آنے کی مقررہ میعاد چالیس راتوں کی پوری میعاد ہو گئی۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور پر چلہ کشی کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین بنا گئے کہ وہ بنی اسرائیل کو راہِ حق پر قائم رکھیں اور ہر معاملہ میں ان کی نگرانی کریں۔

﴿وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۴۲)

"اور موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے بھائی ہارون (علیہ السلام) سے کہا! تو میرے پیچھے میری قوم میں میرا نائب رہنا اور ان کی اصلاح کا خیال رکھنا اور مفسدوں کی راہ پر نہ چلنا۔"

تجلی ذات؟:

جب "چلہ" پورا ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ہم کلامی کا شرف بخشا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غایت کیف و انبساط میں عرض کیا: "خدایا! جب تو نے مجھ کو لذت و کیف سماع سے نوازا ہے تو پھر لذت مشاہدہ و دیدار سے کیوں محروم رہوں؟ اس سے بھی سرفراز فرما وہاں سے جواب ملا موسیٰ (علیہ السلام)! تم مشاہدۂ ذات کی تاب نہ لا سکو گے، اچھا دیکھو ہم اپنی ذات کی تجلی کا ظہور اس پہاڑ پر کریں گے، اگر یہ اس تجلی کو برداشت کر لے تو پھر تم یہ سوال کرنا اس کے بعد طور پر حضرت حق کی تجلی نے ظہور کیا تو پہاڑ کا وہ حصہ ریزہ ریزہ ہو گیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس نظارہ کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے اور گر پڑے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہوش آیا تو انہوں نے خدائے برتر کی حمد و ثناء کی اور اپنے سوال سے رجوع کیا اور کہا کہ میں اقرار کرتا ہوں اور ایمان لاتا ہوں کہ تیرے جمال کی تجلی و عرفان اور نمودِ حق میں کوئی کمی نہیں، نقصان صرف میری اپنی ہستی کے عجز و بیچارگی کا ہے۔

﴿وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۴۳)

---

[1] روح المعانی جلد ۹ ص ۳۸۔ لیکن دیلمی، محققین اسماء الرجال کی نظر میں قابل اعتماد نہیں ہے۔ (مؤلف)
[2] روحانی ریاضیات کے لئے صوفیائے کرام کی "چلہ کشی" غالباً اسی واقعہ سے اخذ کی گئی ہے تجربہ بتاتا ہے کہ کسی کام پر استقامت حاصل کرنے کے لئے عموماً یہ مدت مفید ثابت ہوتی ہے۔

"اور جب موسیٰ (علیہ السلام) آئے تا کہ ہمارے مقررہ وقت میں حاضری دے اور اس کے پروردگار نے اس سے کلام کیا تو پکار اٹھا "پروردگار! مجھے اپنا جمال دکھا کہ تیری طرف نظر کر سکوں" حکم ہوا تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا، مگر ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھ! اگر یہ (تجلی حق کی تاب لے آیا اور) اپنی جگہ ٹکا رہا تو تو بھی مجھے دیکھ سکے گا پھر جب اس کے پروردگار نے تجلی کی تو اس تجلی نے پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ (علیہ السلام) غش کھا کر گر پڑا جب موسیٰ ہوش میں آیا تو بولا "خدایا! تیرے لیے ہر طرح کی تقدیس ہو، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلے یقین کرنے والوں میں ہوں"۔

نزول تورات:

اس راز و نیاز کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کی گئی، اور حضرت حق نے ان کو حکم کیا کہ اس پر مضبوطی سے قائم رہو اور اپنی قوم سے کہنا کہ وہ بھی ان احکام پر اس طرح عمل کریں کہ جو عمل نیک جس قدر زیادہ قرب الٰہی کا سبب بنے اس کو دوسرے اعمال پر ترجیح دیں، میں نے اس کتاب میں تمہارے دینی و دنیوی فلاح کی تمام تفصیلات بیان کر دی ہیں، اور حلال و حرام، اور محاسن معائب غرض تمام اوامر و نواہی کو کھول کر بیان کر دیا ہے اور یہی میری شریعت ہے۔

﴿قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَ بِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّ اْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۗ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۴۴-۱۴۵)

"(اللہ تعالیٰ نے) کہا اے موسیٰ (علیہ السلام)! بیشک میں نے لوگوں پر تجھ کو اپنی پیغمبری اور ہمکلامی سے برتری دی ہے اور چن لیا ہے، پس جو میں نے تجھ کو (تورات کو) دیا ہے اس کو لے اور شکر گذار بن اور ہم نے اس کے لیے (تورات کی) تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور (احکام میں سے) ہر شئے کی تفصیل لکھ دی ہے، پس اس کو قوت کے ساتھ پکڑ اور اپنی قوم کو حکم کر کہ وہ ان میں سے اچھی کو اختیار کریں، عنقریب میں تم کو نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا"۔

اس مقام پر دو باتیں قابل توجہ ہیں:

① علماء اسلام کہتے ہیں کہ طور کے اس واقعہ میں جن احکام کا نزول ہوا وہ تورات ہے اور علماء نصاریٰ کی موجودہ جماعت کہتی ہے کہ اس سے مراد وہ دس احکام ہیں جو مذہب موسوی میں "شریعت یا احکام عہد" کے نام سے موسوم ہیں، یعنی خدا کے سوا کسی کو نہ پوجو، زنا نہ کرو، چوری نہ کرو وغیرہ۔ ❶ اور بعض معاصر مفسرین نے بھی اس آیت کا مصداق "احکام عہد" ہی کو ٹھہرایا ہے لیکن دوسرا قول قرآن عزیز اور تورات دونوں کی شہادت سے غلط ہے، اور قول اول ہی صحیح اور درست ہے، اس لیے کہ قرآن عزیز نے سورۂ بقرہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چلہ کا ذکر کرتے ہوئے جب نزول احکام کا تذکرہ کیا ہے تو اس کو کتاب اور فرقان کہا ہے اور یہ دونوں صفات قرآن عزیز میں تورات کے لیے بولی گئی ہیں نہ کہ "احکام عہد" کے لیے۔

❶ خروج باب ۳۴ آیت ۲۸

﴿وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَ اِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝﴾

(البقرہ: ۵۱-۵۳)

"اور جب عہد کیا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے چالیس راتوں کا پھر بنالیا تم نے اس کے پیچھے گوسالہ، اور تم اس بارہ میں ظالم تھے، پھر ہم نے اس کے بعد تم کو معاف کر دیا تاکہ تم شکر گزار بنو اور جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب اور حق و باطل میں فرق کرنے والی (فرقان) چیز عطاء کی تاکہ تم راہ پاؤ۔"

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ۝﴾(القصص: ۴۳)

"اور بیشک ہم نے پہلی قوموں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی جو لوگوں کے لیے بصیرتیں مہیا کرنے والی اور ہدایت اور رحمت ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔"

اور اگرچہ تورات (موجودہ بائیبل) کے سفر خروج، استثناء اور کتاب یسوع میں موسیٰ علیہ السلام کے "چلہ" کے بعد احکام عہد یا "شریعت" کا لفظ پایا جاتا ہے لیکن مولانا رحمت اللہ کیرانوی نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب اظہار الحق میں فارسی، عربی اور اُردو قدیم تراجم کے حوالہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ تورات کے ان نسخوں میں ان ہر دو الفاظ کی جگہ "تورات" لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالحق رحمہ اللہ نے بھی تفسیر حقانی میں اُردو و فارسی بائبل مطبوعہ ۱۸۴۵ء و ۱۸۳۹ء سے حسب ذیل حوالے نقل کیے ہیں۔

(۱) وبرآں سنگہا تمامی کلمات ایں تورات را بخط روشن بنویس۔ (استثناء باب ۲۷ آیت ۲۸)

(۲) بنی اسرائیل نے بموجب حکم موسیٰ علیہ السلام کے ایک مذبح بنایا اور اس کے پتھروں پر توریت کو لکھ دیا۔ (یسوع۔ باب ۸ آیت ۱۵-۱۸۴۵ء)

ان حوالوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر جو الواح چلہ کے بعد دی گئیں وہ تورات تھیں "احکام عہد" کی الواح نہیں تھیں، اور انگریزی نسخہ کے ترجمہ لا (Law) اور عربی و اُردو نسخوں میں "شریعت" کو بھی صحیح مان لیا جائے تو یہ لفظ بھی اپنے معنی کی وسعت میں تورات پر صادق آتا ہے، اور تورات، شریعت اور قانون سب کا مصداق ایک ہی چیز ہے اور قدیم عیسائی دنیا میں یہی معنی سمجھے جاتے رہے ہیں۔ اور "احکام عہد" اسی کا ایک جز ہیں، اور اس کو مستقل قرار دینا بہت بعد کی پیداوار ہے۔

④ مسطورہ بالا آیات میں مذکور ہے:

﴿سَاُورِیْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِیْنَ ۝﴾(الاعراف: ۱۴۵)

"عنقریب میں تم کو نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا۔"

تو اس "دار" سے مراد کون سا مقام ہے؟ کہنے والوں نے قیاس اور تخمین سے مختلف جوابات دیئے ہیں: (ا) اس "دار" سے عاد و ثمود کے

کھنڈر مراد ہیں (ب) مصر مراد ہے کہ بنی اسرائیل دوبارہ اس میں داخل ہوں گے۔ (ج) قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس سے شام کی مقدس سرزمین مراد ہے جہاں اس زمانہ عمالقہ کے جابر بادشاہوں کی حکومت تھی اور جہاں بنی اسرائیل کو داخل ہونا تھا۔ نجار [1] نے اسی کو ترجیح دی ہے اور میرے نزدیک یہی صحیح ہے، رہا یہ امر کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے بوڑھے ان بستیوں میں داخل نہیں ہو سکے۔ اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتقال ارض مقدس میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہو گیا تھا اور اسی طرح بنی اسرائیل کے بوڑھوں پر بھی آنے والی تفصیل کے مطابق اس کا داخلہ حرام کر دیا گیا تھا، تو آیت کی یا تو یہ مراد ہے کہ بنی اسرائیل کے نوجوانوں کا داخلہ جن کی اکثریت تھی سب کا داخلہ ہے اور اس طرح کا استعمال شائع ذائع ہے اور یا یہ مراد ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یوشع بن نون اور کالب بن یوفنہ اور چند بنی اسرائیل کے بہادروں کو ارض مقدس میں اس لیے بھیجا تھا کہ وہ وہاں کے مفصل حالات معلوم کر کے آئیں کہ ہم کس طرح دشمن کو شکست دے کر پاک سرزمین میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اور انہوں نے آ کر تمام حالات بنی اسرائیل اور موسیٰ علیہ السلام کے سامنے بیان کیے تھے تو گویا ان معدودے چند افراد کا ارض مقدس میں داخل ہو کر اس کو دیکھ آنا اور پھر سب کو وہاں کے حالات سے آگاہ کرنا، آیت میں اسی معاملہ کی جانب اشارہ ہے قتادہ کے قول کے مقابلہ میں پہلا قول اس لیے مرجوح ہے کہ اس واقعہ کے بعد بنی اسرائیل کبھی قومی اور جماعتی حیثیت سے مصر میں داخل نہیں ہوئے اور دوسرا قول اس لیے قابل اعتبار نہیں ہے کہ اگرچہ ثمود کے آثار وادی سینا کے قریب ضرور تھے مگر عاد کے آثار و کھنڈرات تو عرب کے مغربی حصہ میں واقع تھے جو وادی سینا سے مہینوں کی راہ تھی تو ایسی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ بنی اسرائیل کو صرف ان محو شدہ آثار و کھنڈرات کو دکھانے کے لیے بھیجا جاتا اور اس کے لیے خدا کا وعدہ اس شان کے ساتھ بیان ہوتا؟ مگر ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے جہنم مراد ہے اور کافروں کی تہدید کے لیے کہا گیا ہے۔ [2]

بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی گئی اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا کہ "ہمارا قانون" یہ ہے کہ جب کوئی قوم ہدایت پہنچنے اور اس کی صداقت پر دلائل اور روشن حجت آ جانے کے باوجود بھی سمجھ سے کام نہیں لیتی اور گمراہی اور باپ دادا کی بری ریت رسم ہی پر قائم رہتی اور اس پر اصرار کرتی ہے تو پھر ہم بھی اس کو اس گمراہی میں چھوڑ دیتے ہیں اور ہمارے پیغام حق میں ان کے لیے کوئی حصہ باقی نہیں رہتا اس لیے کہ انہوں نے قبول حق کی استعداد اپنی متمردانہ سرکشی کی بدولت زائل کر دی، قرآن عزیز نے اسی حقیقت کو اس انداز میں بیان کیا ہے:

﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَكَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ وَ اِنْ یَّرَوْا كُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ۚ وَ اِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ ۝ وَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ لِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۴۶-۱۴۷)

"جو لوگ ناحق خدا کی زمین میں سرکشی کرتے ہیں، ہم اپنی نشانیوں سے ان کی نگاہیں پھرا دیں گے، وہ دنیا بھر کی نشانیاں

[1] روح المعانی ج ۵ ص ۵۳ [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ سورۂ اعراف

دیکھ لیں، پھر بھی ایمان نہ لائیں، اگر وہ دیکھیں ہدایت کی سیدھی راہ سامنے ہے تو بھی اس پر نہ چلیں، اگر دیکھیں گمراہی کی ٹیڑھی راہ سامنے ہے تو فوراً چل پڑیں، ان کی ایسی حالت اس لیے ہو جاتی ہے کہ ہماری نشانیاں جھٹلاتے ہیں اور ان کی طرف سے غافل رہتے ہیں اور جن لوگوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائیں اور آخرت کے پیش آنے سے منکر ہوئے تو ان کے سارے کام اکارت ہو گئے، وہ جو کچھ بدلہ پائیں گے وہ اس کے سواء کچھ نہ ہوگا کہ ان ہی کے کرتوتوں کا پھل ہوگا جو دنیا میں کرتے رہے۔"

گئوسالہ پرستی کا واقعہ:

اسی اثناء میں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا جس کو حیرت زا بھی کہہ سکتے ہیں اور افسوسناک بھی، اور جس سے بنی اسرائیل کی ذہنیت اور اخلاقی پستی بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتی ہے یعنی جبل طور یا حورب کے پہاڑ پر تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پروردگار عالم سے راز و نیاز میں مصروف، اور بنی اسرائیل کے لیے آئین الٰہی (تورات) حاصل کرنے میں مشغول تھے، اور نیچے وادی سینا میں بنی اسرائیل نے سامری کی قیادت، میں خود ہی اپنا معبود (گئوسالہ) منتخب کر کے اس کی سمادھ لگالی اور پرستش شروع کر دی۔

جمہور مفسرین کی تفسیر کے مطابق واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور پر تورات لینے کے لیے تشریف لے جانے لگے تو بنی اسرائیل سے یہ فرمایا کہ میرے اعتکاف کی مدت ایک ماہ ہے، مدت پوری ہونے پر فوراً تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ ہارون علیہ السلام تمہارے پاس موجود ہیں یہ تمہارے احوال کے نگران رہیں گے، مگر طور پر جا کر وہ مدت تیس کی بجائے چالیس دن ہوگئی، اس تاخیر سے ایک شخص (سامری) نے فائدہ اٹھایا اس نے جب یہ دیکھا کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاخیر سے مضطرب ہو رہے ہیں تو اس نے کہا اگر تم اپنے وہ تمام زیورات میرے پاس لے آؤ جو تم نے مصریوں سے مستعار لیے تھے اور پھر واپس نہ کر سکے تو میں تمہارے فائدہ کی ایک بات کر دوں۔

سامری گو ظاہر میں مسلمان تھا مگر اس کے دل میں کفر و شرک کی نجاست بھری ہوئی تھی، پس جب بنی اسرائیل نے تمام زیورات لا کر اس کے حوالے کر دیے تو اس نے ان کو بھٹی میں ڈال کر گلا دیا اور اس سے گئوسالہ (بچھڑا) کا جسم تیار کیا اور پھر اپنے پاس سے ایک مشت خاک اس کے اندر ڈال دی، اس ترکیب سے گئوسالہ میں آثار حیات پیدا ہو گئے اور وہ بچھڑے کی آواز "بھائیں بھائیں" بولنے لگا۔ اب سامری نے بنی اسرائیل سے کہا کہ موسیٰ (علیہ السلام) سے غلطی اور بھول ہوگئی کہ وہ خدا کی تلاش میں طور پر گیا، تمہارا معبود تو یہ موجود ہے۔

صفحات گذشتہ میں یہ اچھی طرح واضح ہو چکا ہے کہ صدیوں تک مصر کی غلامی نے بنی اسرائیل میں مشرکانہ رسوم و عقائد کو پھیلا دیا تھا اور وہ اس رنگ میں کافی حد تک رنگے جا چکے تھے، اور گئوسالہ پرستی مصر کا قدیم عقیدہ تھا، اور ان کے مذہب میں اس کو بہت اہمیت حاصل تھی، اسی لیے ان کے ایک بڑے دیوتا (حورس) کا منہ گائے کی شکل کا تھا، اور وہ عقیدہ رکھتے تھے کہ کرۂ زمین گائے کے سر پر قائم ہے۔ [1]

[1] معلوم ہوتا ہے کہ تمام بت پرست اقوام میں گائے کی تقدیس اور گوسالہ پرستی مشترک عقیدہ کی حیثیت رکھتی ہے، اسی لئے ہندوستان، عراق، ایران، چین اور جاپان کے بت پرستوں میں اس کی اہمیت یکساں نظر آتی ہے۔

سامری نے جب بنی اسرائیل کو ترغیب دی کہ وہ اس کے بنائے ہوئے گئوسالہ کو اپنا معبود سمجھیں اور اس کی پوجا کریں تو انہوں نے بآسانی اس کو قبول کر لیا۔

حضرت ہارون علیہ السلام نے یہ دیکھا تو بنی اسرائیل کو سمجھایا کہ ایسا نہ کرو یہ تو گمراہی کا راستہ ہے۔ مگر انہوں نے ہارون علیہ السلام کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہنے لگے کہ جب تک موسیٰ علیہ السلام نہ آ جائیں ہم اس سے باز آنے والے نہیں۔

یہاں جب یہ نوبت پہنچی تو اللہ تعالیٰ کی مصلحت کا تقاضا ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس واقعہ سے مطلع کر دے اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا موسیٰ علیہ السلام تم نے قوم کو چھوڑ کر یہاں آنے میں اس قدر جلدی کیوں کی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: "خدایا! اس لیے کہ تیرے پاس جلد حاضر ہو کر قوم کے لیے ہدایت حاصل کروں" اللہ تعالیٰ نے اس وقت ان کو بتایا کہ جس کی ہدایت کے لیے تم اس قدر مضطرب ہو وہ اس گمراہی میں مبتلا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سنا تو ان کو سخت رنج ہوا اور غصہ و ندامت کے ساتھ قوم کی طرف واپس ہوئے اور قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا یہ تم نے کیا کیا؟ مجھ سے ایسی کونسی تاخیر ہو گئی تھی جو تم نے یہ آفت برپا کی؟ یہ فرماتے جاتے تھے اور غیظ و غضب میں کانپ رہے تھے حتیٰ کہ ہاتھ سے تورات کی الواح بھی گر گئیں۔

بنی اسرائیل نے کہا کہ ہمارا کوئی قصور نہیں، مصریوں کے زیورات کا جو بوجھ ہم ساتھ لیے پھر رہے تھے وہ سامری نے ہم سے مانگ کر یہ سوانگ بنا لیا اور ہم کو گمراہ کر دیا۔

"شرک" منصب نبوت کے لیے ایک ناقابل برداشت شئے ہے اس لیے اور نیز اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت گرم مزاج تھے، انہوں نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کی گردن پکڑ لی، اور ڈاڑھی کی جانب ہاتھ بڑھایا تو حضرت ہارون علیہ السلام نے فرمایا "برادر! میری مطلق خطا نہیں ہے؟ میں نے ان کو ہر چند سمجھایا مگر انہوں نے کسی طرح نہیں مانا اور کہنے لگے کہ جب تک موسیٰ علیہ السلام نہ آ جائے ہم تیری بات سننے والے نہیں بلکہ انہوں نے مجھ کو کمزور پا کر میرے قتل کا ارادہ کر لیا تھا، جب میں نے یہ حالت دیکھی تو خیال کیا کہ اب اگر ان سے لڑائی کی جائے اور مومنین کاملین اور ان کے درمیان جنگ برپا ہو تو کہیں مجھ پر یہ الزام نہ لگایا جائے کہ میرے پیچھے قوم میں تفرقہ ڈال دیا، اس لیے میں خاموشی کے ساتھ تیرا منتظر رہا۔ پیارے بھائی! تو میرے سر کے بال نہ نوچ اور نہ ڈاڑھی پر ہاتھ چلا اور اس طرح دوسروں کو ہنسنے کا موقعہ نہ دے۔

ہارون علیہ السلام کی یہ معقول دلیل سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ ان کی جانب سے فرو ہو گیا اور اب سامری کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا: سامری! تو نے یہ کیا سوانگ بنایا ہے؟ سامری نے جواب دیا کہ میں نے ایسی بات دیکھی جو ان اسرائیلیوں میں سے کسی نے نہیں دیکھی تھی یعنی غرق فرعون کے وقت جبرئیل علیہ السلام گھوڑے پر سوار اسرائیلیوں اور فرعونیوں کے درمیان حائل تھے، میں نے دیکھا کہ ان کے گھوڑے کے سم کی خاک میں اثر حیات پیدا ہو جاتا ہے، اور خشک زمین پر سبزہ اُگ آتا ہے تو میں نے جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدموں کی خاک سے ایک مٹھی بھر لی اور اس خاک کو اس بچھڑے میں ڈال دیا اور اس میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے اور یہ "بھاں بھاں" کرنے لگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اچھا اب تیرے لئے دنیا میں یہ سزا تجویز کی گئی ہے کہ تو پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرے اور جب کوئی انسان تیرے قریب آئے تو اس سے بھاگتے ہوئے یہ کہے کہ دیکھنا مجھ کو ہاتھ نہ لگانا، یہ تو دنیوی عذاب ہے اور قیامت میں

ایسے نافرمانوں اور گمراہوں کے لئے جو عذاب مقرر ہے وہ تیرے لئے وعدۂ الٰہی کی صورت میں پورا ہونے والا ہے۔

اے سامری! یہ بھی دیکھ کہ تو نے جس گوسالہ کو معبود بنایا تھا اور اس کی سادھ لگا کر بیٹھا تھا ہم ابھی اس کو آگ میں ڈال کر خاک کیے دیتے ہیں اور اس خاک کو دریا میں پھینکے دیتے ہیں کہ تجھ کو اور تیرے ان بے وقوف مقتدیوں کو معلوم ہو جائے کہ تمہارے معبود کی قدر و قیمت اور طاقت و قوت کا یہ حال ہے کہ وہ دوسروں پر عنایت و کرم تو کیا کرتا، خود اپنی ذات کو ہلاکت و تباہی سے نہ بچا سکا۔ بدبختو! یہ معمولی بات بھی نہ سمجھ سکے کہ تمہارا معبود صرف وہی ایک خدا ہے جس کا نہ کوئی ساجھی ہے نہ شریک اور وہ ہر شئے کا عالم و دانا ہے۔

﴿وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَیِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝۹۲ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَا ۗ وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝۹۳﴾

(البقرہ: ۹۲-۹۳)

"اور پھر دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) سچائی کی روشن دلیلوں کے ساتھ تمہارے پاس آیا، لیکن جب چالیس دن کے لئے تم سے الگ ہو گیا تو تم بچھڑے کے پیچھے پڑ گئے اور ایسا کرتے ہوئے یقیناً تم (شیوۂ ایمان میں ثابت قدم نہ تھے) ایمان سے منحرف ہو گئے تھے، اور پھر جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے (دین الٰہی پر قائم رہنے کا) تم سے عہد لیا تھا، اور کوہ طور کی چوٹیاں تم پر بلند کر دی تھیں (تو تم نے اس کے بعد کیا کیا؟ تمہیں حکم دیا گیا کہ) جو کتاب تمہیں دی گئی ہے، اس پر مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ اور اس کے حکموں پر کاربند رہو، تم نے (زبان سے) کہا، سنا اور دل سے کہا نہیں مانتے، اور پھر ایسا ہوا کہ تمہارے کفر کی وجہ سے تمہارے دلوں میں گوسالہ پرستی رچ گئی، اے پیغمبر! ان سے کہو (دعوت حق سے بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے) تم اپنے جس ایمان کا دعویٰ کرتے ہو، اگر وہ یہی ایمان ہے تو افسوس اس ایمان پر! کیا ہی بری راہ ہے جس پر تمہارا ایمان تمہیں لے جا رہا ہے۔"

﴿وَ اتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِیِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ یَرَوْا اَنَّهٗ لَا یُكَلِّمُهُمْ وَ لَا یَهْدِیْهِمْ سَبِیْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَ كَانُوْا ظٰلِمِیْنَ ۝۱۴۸ وَ لَمَّا سُقِطَ فِیْۤ اَیْدِیْهِمْ وَ رَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ یَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَ یَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝۱۴۹ وَ لَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْۢ بَعْدِیْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗۤ اِلَیْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَ كَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ ۖ٘ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ وَ لَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝۱۵۰ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ لِاَخِیْ وَ اَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ ۖ٘ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝۱۵۱ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ ذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ

الدُّنْيَا ۭ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَ الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَ اٰمَنُوْۤا ۡ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵۳﴾ وَ لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۚۖ وَ فِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ (الاعراف: ۱۴۸-۱۵۴)

"پھر ایسا ہوا کہ موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم نے اس کے (پہاڑ پر) چلے جانے کے بعد اپنے زیور کی چیزوں سے (یعنی زیور کی چیزیں گلا کر) ایک بچھڑے کا دھڑ بنایا جس سے گائے کی سی آواز نکلتی تھی اور اسے (پرستش کے لئے) اختیار کر لیا (افسوس ان کی عقلوں پر) کیا انہوں نے اتنی موٹی سی بات بھی نہ سمجھی کہ نہ تو وہ ان سے بات کرتا ہے، نہ کسی طرح کی رہنمائی کر سکتا ہے؟ وہ اسے لے بیٹھے اور وہ (اپنے اوپر) ظلم کرنے والے تھے، پھر جب ایسا ہوا کہ (افسوس وندامت سے) ہاتھ ملنے لگے، اور انہوں نے دیکھ لیا کہ (راہ حق سے) قطعاً بھٹک گئے ہیں تو کہنے لگے" اگر ہمارے پروردگار نے ہم پر رحم نہیں کیا اور نہ بخشا تو ہمارے لئے تباہی کے سواء کچھ نہیں ہے" اور جب موسیٰ (علیہ السلام) خشمناک اور افسوس کرتا ہوا اپنی قوم میں لوٹا تو اس نے کہا "افسوس تم پر! کس برے طریقہ پر تم نے میرے پیچھے میری جانشینی کی تم اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں ذرا بھی صبر نہ کر سکے" اس نے (جوش میں آ کر) تختیاں پھینک دیں اور ہارون (علیہ السلام) کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا؛ ہارون (علیہ السلام) نے کہا "اے میرے ماں جائے بھائی! (میں کیا کروں) لوگوں نے مجھے بے حقیقت سمجھا، اور قریب تھا کہ قتل کر ڈالیں، پس میرے ساتھ ایسا نہ کر کہ دشمن ہنسیں، اور نہ مجھے (ان) ظالموں کے ساتھ شمار کر، موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا "پروردگار! میرا قصور بخش دے (کہ جوش میں آ گیا) اور میرے بھائی کا بھی (کہ گمراہوں کو سختی کے ساتھ نہ روک سکا) اور ہمیں اپنی رحمت کے سایہ میں داخل کر! تجھ سے بڑھ کر کون ہے جو رحم کرنے والا ہو۔ خدا نے فرمایا" جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی، ان کے حصے میں ان کے پروردگار کا غضب آئے گا، اور دنیا کی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی پائیں گے، ہم افتراء پردازوں کو (ان کی بدعملی کا) اسی طرح بدلہ دیتے ہیں، ہاں! جن لوگوں نے برائیوں کے ارتکاب کے بعد (متنبہ ہو کر) توبہ کر لی، اور ایمان لے آئے تو بلاشبہ تمہارا پروردگار توبہ کے بعد بخش دینے والا، رحمت والا ہے۔ اور جب موسیٰ (علیہ السلام) کی خشمناکی فرو ہوئی، تو اس نے تختیاں اٹھا لیں، ان کی کتابت میں (یعنی ان حکموں میں جو ان پر لکھے ہوئے تھے) ان لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے جو اپنے پروردگار کا ڈر رکھتے ہیں۔"

﴿ وَ مَاۤ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۸۳﴾ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰۤى اَثَرِيْ وَ عَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿۸۴﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾ فَرَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ۬ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۬ؕ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا مَاۤ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَ لٰكِنَّا حُمِّلْنَاۤ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿۸۷﴾ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ

خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا وَّ لَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾ وَ لَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَ اَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَ لَا بِرَاْسِيْ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ لَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۶﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ وَ اِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ وَ انْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾ اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾ (طٰہٰ: ۸۳-۹۸)

"اور (جب موسیٰ علیہ السلام طور پر حاضر ہوا تو ہم نے پوچھا) "اے موسیٰ! کس بات نے تجھے جلدی پر اُبھارا اور تو قوم کو پیچھے چھوڑ کر چلا آیا" موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کیا: "وہ مجھ سے دور نہیں، میرے نقش قدم پر ہیں، اور اے پروردگار! میں نے تیرے حضور آنے میں جلدی کی کہ تو خوش ہو" فرمایا، مگر ہم نے تیرے پیچھے تیری قوم کی (استقامت کی) آزمائش کی اور سامری نے اسے گمراہ کر دیا، پس موسیٰ (علیہ السلام) خشمناک اور افسوس کرتا ہوا قوم کی طرف لوٹا، اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! (یہ تم نے کیا کیا؟) کیا تم سے تمہارے پروردگار نے ایک بڑی بھلائی کا وعدہ نہیں کیا تھا؟ پھر کیا ایسا ہوا کہ تم پر بڑی مدت گذر گئی (اور تم اسے یاد نہ رکھ سکے؟) یا یہ بات ہے کہ تم نے چاہا، تمہارے پروردگار کا غضب تم پر نازل ہو، اس لئے تم نے مجھ سے ٹھہرائی ہوئی بات توڑ ڈالی؟" انہوں نے کہا: "ہم نے خود اپنی خواہش سے عہد شکنی نہیں کی، بلکہ (ایک دوسرا ہی معاملہ پیش آیا، مصری) قوم کی زیب و زینت کی چیزوں کا ہم پر بوجھ پڑا تھا (یعنی بھاری بھاری زیوروں کا جو مصر میں پہنے جاتے تھے ہم اس بوجھ کے رکھنے کے خواہش مند نہ تھے) وہ ہم نے پھینک دیا" (بس ہمارا اتنا ہی قصور ہے) چنانچہ اس طرح (جب سونا فراہم ہو گیا تو) سامری نے اسے آگ میں ڈالا، اور ان کے لئے ایک (سنہرا بچھڑا بنا کر) نکال لایا، محض ایک دھڑ جس سے گائے کی سی آواز نکلتی تھی، لوگ یہ دیکھ کر بول اٹھے، یہ ہے ہمارا معبود اور موسیٰ (علیہ السلام) کا بھی، مگر وہ بھول میں پڑ گیا (افسوس ان کی سمجھ پر) کیا انہیں یہ (موٹی سی) بات بھی دکھائی نہ دی کہ بچھڑا (آواز تو نکالتا ہے مگر) ان کی بات کا جواب نہیں دے سکتا اور نہ انہیں فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان؟ اور ہارون (علیہ السلام) نے اس سے پہلے انہیں (صاف صاف) جتا دیا تھا "بھائیو! یہ اس کے سواء کچھ نہیں ہے کہ تمہاری (استقامت کی) آزمائش ہو رہی ہے، تمہارا پروردگار تو خدائے رحمٰن ہے، دیکھو! میری پیروی کرو اور میرے کہے سے باہر نہ ہو" مگر انہوں نے جواب دیا تھا، جب تک موسیٰ (علیہ السلام) ہمارے پاس واپس نہ آ جائے ہم اس کی پرستش پر جمے ہی رہیں گے، بہرحال موسیٰ (علیہ السلام) نے (اب

ہارون علیہ السلام سے) کہا: "اے ہارون! جب تو نے دیکھا یہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں تو کیا بات ہوئی کہ انہیں روکا نہیں؟ کیا تو نے پسند کیا کہ میرے حکم سے باہر ہو جائے؟" ہارون بولا "اے میرے عزیز بھائی! میری ڈاڑھی اور سر کے بال نہ نوچ (میں نے اگر سختی میں کمی کی، تو صرف اس خیال سے کہ) میں ڈرا، کہیں تم یہ نہ کہو، تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میرے حکم کی راہ نہ دیکھی" تب موسیٰ (علیہ السلام) نے (سامری سے کہا) کہا "سامری! یہ تیرا کیا حال ہوا؟" کہا "میں نے وہ بات دیکھ لی تھی جو اوروں نے نہیں دیکھی تو میں نے فرشتہ کے نقش قدم (کی مٹی) سے ایک مٹھی بھر لی پھر اس کو (ڈھلے ہوئے بچھڑے میں) ڈال دیا، میرے جی نے ایسی ہی بات مجھے سمجھائی" موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اگر ایسا ہے تو پھر جا، زندگی میں تیرے لئے یہ ہونا ہے کہ کہے میں اچھوت ہوں، اور (آخرت میں عذاب کا) ایک وعدہ ہے جو کبھی ٹلنے والا نہیں اور دیکھ تیرے (گھڑے ہوئے) معبود کا اب کیا حال ہوتا ہے جس کی پوجا پر جم کر بیٹھ رہا تھا، ہم اسے جلا کر راکھ کر دیں گے اور راکھ سمندر میں اڑا کر بہا دیں گے، معبود تو تمہارا بس اللہ ہی ہے اس کے سواء کوئی نہیں وہی ہے جو ہر چیز پر اپنے علم سے چھایا ہوا ہے۔"

آیات مسطورۂ بالا میں حسب ذیل آیت کی تفسیر کے متعلق مفسرین کے درمیان کلام ہے:

﴿قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ۝ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ۝﴾ (طٰہٰ: ۹۵-۹۶)

"موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: "پس اے سامری! تیرا یہ کیا معاملہ ہے" سامری نے کہا "میں نے اس چیز کو دیکھا جس چیز کو انہوں نے نہیں دیکھا، پس میں نے "رسول" کے نشان سے ایک مٹھی بھر لی پھر اس کو ڈال دیا اور میرے جی نے یہی سمجھا دیا۔"

دراصل اس آیت میں چند باتیں زیر بحث ہیں اور ان ہی کے فیصلہ پر کل واقعہ کی تفسیر کا مدار ہے۔

① سامری نے وہ کیا شئے دیکھی جو دوسروں نے یعنی بنی اسرائیل نے نہیں دیکھی؟

② ﴿فَقَبَضْتُ قَبْضَةً﴾ سے کیا مراد ہے؟۔

③ ﴿اَثَرِ الرَّسُوْلِ﴾ میں "رسول" سے مراد "حضرت موسیٰ علیہ السلام" ہیں یا جبریل علیہ السلام فرشتہ؟

④ ﴿فَنَبَذْتُهَا﴾ سے کیا مراد ہے؟

واقعہ کی گذشتہ تفصیلات سے اگرچہ "جمہور" کی رائے معلوم ہو چکی ہے، تاہم مختصر طور پر اس کو حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی پھر سن لیجئے۔

"جس وقت بنی اسرائیل پھٹے دریا میں پیٹھے (گھسے) پیچھے فرعون ساتھ فوج کے پیٹھا (داخل ہوا) جبرئیل بیچ میں ہو گئے کہ ان کو ان تک نہ پہنچنے دیں، سامری نے پہچانا کہ یہ جبرئیل ہیں، ان کے پاؤں کے نیچے سے مٹھی بھر مٹی اٹھا لی وہی اب اس سونے کے بچھڑے میں ڈال دی، سونا تھا کافروں کا مال لیا ہوا فریب سے اس میں مٹی پڑی برکت کی، حق و باطل مل کر ایک "کرشمہ" پیدا ہوا کہ رونق جاندار کی اور آواز اس میں ہو گئی، ایسی چیزوں سے بچنا چاہیے اسی سے بت پرستی بڑھتی ہے۔

اس تفسیر کے متعلق صاحب روح المعانی ارشاد فرماتے ہیں:

آیت کی یہ تفسیر وہ ہے جو صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور جلیل القدر مفسرین سے منقول ہے۔ ❶

اس تفسیر کے خلاف دوسری تفسیر مشہور معتزلی ابو مسلم اصفہانی کی ہے: وہ کہتے ہیں آیت کا مطلب یہ ہے کہ سامری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ جواب دیا کہ مجھ کو بنی اسرائیل کے خلاف یہ بات سوجھی کہ آپ حق پر نہیں ہیں اور ساتھ ہی میں نے آپ کا کچھ اتباع کر لیا تھا، اور پیروی اختیار کر لی تھی، مگر دل اس پر نہ جما اور آخر کار میں نے اس اتباع اور پیروی کو بھی ترک کر دیا اور اسی طریق کار کو میرے نفس نے بہتر جانا، گویا ابو مسلم کے نزدیک آیت ﴿بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ سامری بنی اسرائیل کے عقیدے کے خلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حق پر نہیں سمجھتا تھا اور ﴿فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ﴾ میں رسول سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور ﴿اَثَرِ الرَّسُوْلِ﴾ سے مراد پیروی اور اتباع ہے، اور ﴿قَبْضَةً﴾ سے تھوڑی سی پیروی اور ﴿فَنَبَذْتُهَا﴾ سے ترک اتباع مراد ہے، ابو مسلم نے اپنی اس تفسیر کے ثبوت میں لغت عرب سے کچھ استشہادات بھی پیش کیے ہیں اور جمہور کی تفصیل پر کچھ اشکالات بھی وارد کیے ہیں، جس کا جواب سید محمود آلوسی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ دیا ہے۔

بایں ہمہ ابو مسلم کی اس تفسیر کو امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں قوی، راجح اور صحیح تسلیم کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"یہ واضح رہے کہ ابو مسلم نے جو تفسیر بیان کی ہے اس میں مفسرین کی مخالفت تو ضرور پائی جاتی ہے لیکن حسب ذیل چند وجوہ کے پیش نظر تحقیق سے قریب تر اسی کی تفسیر ہے۔ ❷

چنانچہ علماء عصر میں سے مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی ترجمان القرآن میں اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔

زیر بحث آیت سے متعلق قرآن عزیز کے سیاق و سباق کے مطالعہ اور اس سلسلہ میں صحیح احادیث نبوی ﷺ کی تفتیش و تحقیق کے بعد حق اور راجح بات یہ ہے کہ اس مسئلہ میں نبی معصوم ﷺ سے کوئی ایسی تصریح منقول نہیں ہے کہ جس کے بعد ایک جانب کو قطعیت حاصل ہو جائے اور دوسری جانب باطل قرار پائے اور غالباً اسی وجہ سے مشہور محدث و مفسر حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس سلسلہ کی تمام روایات کو سامنے رکھنے کے بعد اگرچہ جمہور کی تائید کی ہے، اور ابو مسلم کی تائید نہیں کی بلکہ اس کی تفسیر کو نقل بھی نہیں کیا تاہم جمہور کی تفسیر کو وہ حیثیت نہیں دی جو صاحب روح المعانی نے ذکر فرمائی ہے یعنی یہ کہ جمہور کی تفسیر نصوص حدیثی سے ثابت ہے اور اس لئے دوسرا احتمال بے شبہ الحاد و زندقہ ہے، چنانچہ انہوں نے آیت کی تفسیر کرنے کے بعد صرف یہ فرمایا:

هٰذا هو المشهور عند كثير من المفسرين او اكثرهم. (جلد ۳ سورہ طٰہ)

"یہ وہ تفسیر ہے جو بہت سے مفسرین بلکہ اکثر مفسرین کی نسبت سے مشہور ہے۔"

اور اسی طرح ان کے مشہور معاصر مفسر ابن حیان اندلسی نے البحر المحیط میں ابو مسلم کی تفسیر کو اگرچہ قیل ❸ کہہ کر نقل کیا ہے مگر اس کے خلاف ایک جملہ بھی نہیں لکھا اور سکوت فرمایا:

پس ان جلیل القدر مفسرین کے اس طرز تحریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اگرچہ جمہور کی تفسیر ہی کو صحیح یا راجح سمجھتے ہیں، مگر دوسرے احتمال کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ نصوص قطعیہ کے خلاف ہے اور ایسا احتمال ہے جس کی پشت پر الحاد و زندقہ کی کارفرمائی ہے۔

---

❶ روح المعانی ج ۱۶ ص ۲۲۹ ❷ تفسیر کبیر ج ۶ ص ۷۰

❸ کوئی قول کمزور سمجھا جاتا ہے تو اس کو قیل کہہ کر بیان کیا جاتا ہے۔

البتہ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس آیت کا سیاق و سباق اور قبول عدم قبول حق کے متعلق اس سلسلہ کی تمام آیات قرآن کا اسلوب بیان دونوں ابو مسلم کی تفسیر کا قطعاً انکار کرتے اور اس کو تاویل محض ظاہر کرتے ہیں، اس لئے آیت زیر بحث کے جملہ ﴿بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ﴾ میں بصارت سے بصارت عینی کی جگہ بصیرت قلبی مراد لینا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مخاطب ہوتے ہوئے بھی ﴿الرَّسُوْلِ﴾ کہہ کر ان کو غائب کے قائم مقام بنانا اور ﴿قَبَضْتُ قَبْضَةً﴾ کے معنی مٹھی بھر لینا کی بجائے "تھوڑا سا اتباع کر لینا" بیان کرنا اور جملہ ﴿نَبَذْتُهَا﴾ سے ترک اتباع مراد لینا، یہ سب علیحدہ علیحدہ جملہ کے اعتبار سے اگرچہ محاورات عرب میں قابل تسلیم ہیں لیکن پورے نظم کلام کے پیش نظر ابو مسلم کی تفسیر لچر تاویل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، اور سیاق و سباق شہادت دے رہے ہیں کہ اس جگہ وہی معنی راجح ہیں جو جمہور کا مختار ہیں۔

کیا یہاں یہ اصولی سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اگر سامری کو صرف یہ بتانا تھا کہ میں دل سے آپ کا معتقد نہیں تھا، مگر مصلحتاً کچھ دنوں کے لئے آپ کی پیروی کر رہا تھا اور اب اس کو بھی ترک کر دیا تو اس صاف اور سادہ بات کے لئے قرآن عزیز کو ایسے "ذومعنی اور مبہم اظہار بیان کی کس لئے ضرورت پیش آئی کہ بقول مولانا آزاد مفسرین کو یہ موقع مل گیا کہ انہوں نے یہودیوں میں مشہور روایت کو ٹھیک ٹھیک آیت زیر بحث پر چسپاں کر دیا پس جمہور کی تفسیر یہود کی روایت نہیں ہے بلکہ خود قرآن کا بولتا ہوا بیان ہے اور صاف اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوال پر سامری کا جواب ضرور کسی ایسے واقعہ سے تعلق رکھتا ہے جو حیرت انگیز بھی تھا اور کج فطرت انسانوں کی گمراہی کے لئے اس کو آلہ کار بھی بنایا جا سکتا تھا۔

رہا یہ سوال کہ یہ عجیب و غریب معاملہ ایک باطل پرست کے ہاتھ سے کس طرح ظہور پذیر ہوا تو اس کے متعلق سب سے بہتر جواب شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی وہ تعبیر ہے جو موضح القرآن سے گذشتہ سطور میں نقل کی گئی یعنی جب ایک باطل کو کسی دوسرے حق کے ساتھ ملایا جائے تو اس کے امتزاج سے ایک کرشمہ پیدا ہو جاتا ہے جو اس ترکیب کا خاصہ اور اس کا حقیقی مزاج کہلاتا ہے مثلاً آپ گلاب کے عطر کو چرکین کے کچھ اجزاء کے ساتھ مخلوط کیجئے تو گلاب کی نفیس اور لطیف خوشبو چرکین کی قابل نفرت بدبو کے ساتھ مل کر ایک ایسی کیفیت پیدا کر دے گی جس سے بے شبہ نفس چرکین کی بو سے بھی زیادہ دل و دماغ پر برا اثر پڑے گا اور یہ حالت ہو جائے گی کہ ایک سلیم المزاج انسان چرکین کے ڈھیر پر کھڑا ہونا منظور کر سکتا ہے لیکن اس مخلوط بو کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتا، اسی لئے اسلام نے حق و باطل کے ایسے امتزاج کو حرام قرار دیا ہے کہ اس سے سخت گمراہی پھیلتی ہے۔

بہرحال جمہور کی تفسیر ہی صحیح اور قرآن عزیز کے اسلوب بیان کے مطابق ہے۔

سامری کون تھا؟

سامری کے اس انوکھے فریب نے ایک محقق کے لئے یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ یہ شخص اسرائیلی تھا یا کون؟ اور یہ کہ سامری اس کا نام ہے یا لقب؟

نجار کہتے ہیں، اس موقعہ پر جرائد میں عیسائیوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ سامری "سامرہ" کی جانب منسوب ہے اور سامرہ شہر اس وقت تک آباد نہیں ہوا تھا، لہٰذا قرآن کے اس واقعہ میں سامری کے ذکر کے کیا معنی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ "سامری" سامرہ شہر کی جانب منسوب نہیں ہے اور نہ منسوب ہو سکتا ہے اس لئے کہ یہ شہر موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں موجود نہ تھا۔ بلکہ بہت زمانہ کے بعد

عالم وجود میں آیا ہے بلکہ یہ "شامر" کی جانب منسوب ہے اور یہ عبرانی لفظ ہے یہ جب عربی میں منتقل ہوا تو "ش" "س" کے ساتھ تبدیل ہو گیا۔خود عبرانی بولنے والی دو شاخیں سبط افرائیم اور سبط یہوذا میں سے افرائیمی "س" بولتے ہیں اور یہوذا "ش" چنانچہ یہ لفظ عبرانی میں "شومیر" بولا جاتا ہے اور شمر کے معنی حرس (حفاظت) کے ہیں لہٰذا "شومیر" یا شامر یا سامر کے معنی "حارس" (محافظ) کے ہیں اور اسی کی نسبت سے "سامری" بولا جاتا ہے۔

نجار نے عبرانی تورات سے (اس معنی کی استشہاد میں ایک حوالہ بھی دیا ہے کہ جب خدا نے قابیل سے پوچھا کہ تیرا بھائی ہابیل کہاں ہے؟ سومیراحی الوخی ✿ (کیا میں اپنے بھائی کا محافظ ہوں)۔ ✿

اور علامہ آزاد فرماتے ہیں:

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سامری کون تھا؟ یہ اس کا نام تھا یا قومیت؟ قیاس کہتا ہے کہ یہاں سامری سے مقصود سمیری قوم کا فرد ہے، کیونکہ جس قوم کو ہم نے سمیری کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے، عربی میں اس کا نام قدیم سے سامری آ رہا ہے اور اب بھی عراق میں ان کا بقایا اسی نام سے پکارا جاتا ہے، یہاں قرآن کا "سامری" کہہ کے اسے پکارنا صاف کہہ رہا ہے کہ یہ نام نہیں ہے، اس کی قومیت کی طرف اشارہ ہے، یعنی وہ شخص اسرائیلی نہ تھا، سامری تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ساڑھے تین ہزار برس پہلے دجلہ وفرات کے دوآبے میں دو مختلف قومیں آباد ہو رہی تھیں اور ایک عظیم الشان تمدن کی بنیادیں اٹھا رہی تھیں، ان میں سے ایک قوم جو جنوب سے آئی تھی، عرب تھی، دوسری جس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ شمال سے اتری، سمیری تھی، اسی قوم کے نام سے تاریخ قدیم کا شہر سامرہ آباد ہوا تھا جس کا محل اب "تل العبید" میں دریافت ہوا ہے اور وہاں سے پانچ ہزار برس پیشتر کے بنے ہوئے زیور اور سنہری ظروف برآمد ہوئے ہیں۔

سمیری قوم کی اصل کیا تھی؟ اس بارہ میں اس وقت تک کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ہے لیکن نینوا میں اشوری پال (متوفی ٦٦٦ قبل مسیح) جو کتب خانہ نکلا ہے اس میں تختیوں کا ایک مجموعہ لغت کی کتاب کا بھی ہے جس میں اکادی اور سمیری زبان کے ہم معنی الفاظ جمع کیے گئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سمیری زبان کے اصوات، صامی حروف کے اصوات سے چنداں مختلف نہیں تھے، یہ بہت ممکن ہے کہ وہ بھی دراصل ان ہی قبائل کے مجموعہ سے کوئی بعید کا تعلق رکھتے ہوں جن کے لئے ہم نے تورات کی اصطلاح صامی اختیار کر لی ہے...... بہرحال سمیری قبائل کا اصلی وطن عراق تھا، مگر یہ دور دور تک پھیل گئے تھے، مصر کے ان سے تعلقات کا سراغ ایک ہزار سال قبل مسیح تک روشنی میں آ چکا ہے، پس معلوم ہوتا ہے اسی قوم کا ایک فرد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی معتقد ہو گیا اور جب بنی اسرائیل نکلے، تو یہ بھی ان کے ساتھ نکل آیا، اسی کو قرآن نے "السامری" کے لفظ سے یاد کیا ہے، گائے، بیل اور بچھڑے کی تقدیس کا خیال سمیریوں میں بھی تھا اور مصریوں میں بھی... الخ۔ ✿ ان ہر دو بیانات کے مطالعہ کے بعد یہ بآسانی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا آزاد کی تشریح نجار کی تشریح کے مقابلہ میں زیادہ قرین صواب اور راجح ہے اور نجار کی تشریح تاویل بعید کی حیثیت رکھتی ہے سامری کے معنی اگر نگہبان کے آتے ہیں تو اس کا نام بھی سامری کیوں ہوا؟ اس کا جواب اس تاویل میں نہیں ملتا اور عیسائیوں کے سوال کا جواب جس تاریخی تحقیق کے ساتھ آزاد صاحب کے مضمون میں ملتا ہے وہی صحیح ہے۔

✿ تکوین اصحاح ۴ آیت ۶ ✿ قصص الانبیاء ۳۶۶ ✿ ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۶۴۔۴۶۵

الحاصل حضرت موسیٰ علیہ السلام جب ان معاملات سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے خدائے تعالیٰ کی جناب میں رجوع کیا کہ اب ان کے اس ارتداد اور بے دینی کی سزا تیرے نزدیک کیا ہے؟ وہاں سے جواب ملا کہ جن لوگوں نے یہ شرک کیا ان کو اپنی جان سے ہاتھ دھولینا پڑے گا۔ نسائی میں روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تمہاری توبہ کی صرف ایک صورت مقرر کی گئی ہے، وہ یہ کہ مجرموں کو اپنی جان کو اس طرح ختم کرانا چاہئے کہ جو شخص رشتہ میں جس سے زیادہ قریب ہے وہ اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے یعنی باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو اور بھائی بھائی کو، آخر بنی اسرائیل کو اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ تورات میں ہے کہ اس طرح تین ہزار بنی اسرائیل قتل ہوئے اور بعض اسلامی روایات میں اس سے بھی زیادہ تعداد مذکور ہے، جب نوبت یہاں تک پہنچی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام درگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوئے اور عرض کیا یا بارِ الٰہا! اب ان پر رحم فرما اور ان کی خطاؤں کو بخش دے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے قاتل اور مقتول دونوں کو بخش دیا اور جو زندہ ہیں قصوروار ہیں ان کی بھی خطا معاف کر دی، تم ان کو سمجھا دو کہ آئندہ شرک کے قریب بھی نہ جائیں۔

﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰی بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَیْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝﴾ (البقرہ: ۵۴)

"اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا: "اے قوم! بلاشبہ تم نے گوسالہ بنانے میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا ہے پس اپنے خالق کی طرف رجوع کرو اور اپنی جانوں کو قربان کرو، تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے حق میں یہی بہتر ہے، پھر وہ تم پر رجوع بہ رحمت ہوگا بلاشبہ وہ بڑا رجوع برحمت ہونے والا، رحم کرنے والا ہے۔"

اس واقعہ کے متعلق قرآن عزیز اور تورات میں بہت سخت اختلاف ہے، تورات کا بیان ہے کہ گئوسالہ ہارون علیہ السلام نے بنایا تھا۔ اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی، تو وہ ہارون علیہ السلام کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اُٹھ ہمارے لئے دیوتا بنا دے جو ہمارے آگے آگے چلے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰ علیہ السلام کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا، کیا ہو گیا، ہارون علیہ السلام نے ان سے کہا تمہاری بیویوں اور لڑکوں لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں ہیں ان کو اُتار کر میرے پاس لے آؤ، چنانچہ سب لوگ ان کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار اتار کر ان کو ہارون علیہ السلام کے پاس لے آئے اور اس نے ان کو ان کے ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی، تب وہ کہنے لگے اے اسرائیل! یہی وہ تیرا دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا۔ یہ دیکھ کر ہارون علیہ السلام نے اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی اور اس نے اعلان کر دیا کہ کل خداوند کے لئے عید ہے۔ [1]

تورات کی تحریف و مسخ کی شہادت اس سے زیادہ اور کیا ہو گی کہ جو کتاب اسی باب خروج میں ہارون علیہ السلام کو خدا کا پیغمبر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وزیر ظاہر کرتی ہے وہی تورات اس جگہ ہارون علیہ السلام کو "العیاذ باللہ" نہ صرف مشرک اور بت پرست ثابت کر رہی ہے بلکہ شرک کا معلم اور بت پرستی کا راہنما بتا رہی ہے۔

[1] خروج باب ۳۲۔ آیت ۹۔۵

تورات کے مطالعہ سے بآسانی آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اہل کتاب کی بوالعجبیوں اور کتاب اللہ میں تحریفات کی داستانوں میں سب سے زیادہ قابل نفرت داستان یہ ہے کہ وہ خدا کے جن برگزیدہ انسانوں کو نبی اور پیغمبر کہتے جاتے ہیں ان ہی پر شرک وکفر اور بداخلاقیوں کی تہمت لگانے میں بھی نہیں جھجکتے، چنانچہ اس مقام پر بھی سامری کے مشرکانہ عمل کو حضرت ہارون علیہ السلام کے سر لگا دیا قرآن عزیز اس خرافات کی پُرزور تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام کا دامن اس قسم کی ناپاکی سے قطعاً پاک ہے، گئوسالہ بنانا اور گئوسالہ پرستی کی ترغیب دینا سامری کا کام تھا نہ کہ حضرت ہارون علیہ السلام جیسے برگزیدہ نبی کا، انہوں نے تو سختی کے ساتھ بنی اسرائیل کو اس ناپاک حرکت سے باز رکھنے کی سعی کی مگر وہ بدبخت کسی طرح نہ مانے۔

﴿وَ لَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَ اَطِيْعُوْۤا اَمْرِيْ ۞ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۞﴾ (طٰہٰ: ۹۰-۹۱)

"اور بیشک ہارون (علیہ السلام) نے پہلے ہی ان (بنی اسرائیل) سے کہا "اے قوم! بلاشبہ تم فتنہ میں ڈال دیئے گئے (اس بچھڑے کے بنانے سے) اور بیشک تمہارا پروردگار بڑا رحم والا ہے پس (اب بھی سمجھو اور) میری پیروی کرو اور میرے حکم کو مانو انہوں نے (بنی اسرائیل نے) کہا ہم اس کو سمادھ ہرگز نہ چھوڑیں گے تا آنکہ موسیٰ (علیہ السلام) لوٹ کر ہمارے پاس نہ آ جائے۔"

ستر سرداروں کا انتخاب:

جب بنی اسرائیل کا یہ جرم معاف کر دیا گیا تو اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ میرے پاس جو یہ الواح (تختیاں) ہیں، یہ کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت اور دینی و دنیوی زندگی کی فلاح کے لئے مجھ کو عطا فرمائی ہے، یہ تورات ہے، اب تمہارا فرض ہے کہ اس پر ایمان لاؤ اور اس کے احکام کی تعمیل کرو۔

بنی اسرائیل بہرحال بنی اسرائیل تھے، کہنے لگے موسیٰ علیہ السلام! ہم کیسے یقین کریں کہ یہ خدا کی کتاب ہے؟ صرف تیرے کہنے سے تو ہم نہیں مانیں گے، ہم تو جب اس پر ایمان لائیں گے کہ خدا کو بے حجاب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، اور وہ ہم سے یہ کہے کہ یہ تورات میری کتاب ہے، تم اس پر ایمان لاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو سمجھایا یہ بے وقوفی کا سوال ہے، آنکھوں سے خدا کو کس نے دیکھا ہے جو تم دیکھو گے، یہ نہیں ہو سکتا، مگر بنی اسرائیل کا اصرار بدستور قائم رہا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ دیکھا تو کچھ سوچ کر ارشاد فرمایا کہ یہ تو ناممکن ہے کہ تم سب لوگوں کی تعداد میں میرے ساتھ حوریب (طور) پر اس کی تصدیق کے لئے جاؤ مناسب یہ ہے کہ تم میں سے چند سردار چن کر ساتھ لئے جاتا ہوں، وہ اگر واپس آ کر تصدیق کر دیں تو پھر تم بھی تسلیم کر لینا، اور چونکہ تم ابھی گئوسالہ پرستی کا ایک بہت بڑا گناہ کر چکے ہو اس لئے اظہار ندامت اور خدا سے آئندہ نیکی کے عہد کے لئے بھی یہ موقع مناسب ہے۔ قوم اس پر راضی ہو گئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تمام اسباط سے ستر سرداروں کو چن کر ساتھ لیا اور طور پر جا پہنچے، طور پر ایک سپید بادل کی طرح (نور) نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گھیر لیا اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی شروع ہو گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ تو بنی اسرائیل کے حالات کا دانا بینا ہے، میں ان کی ضد پر ستر آدمی انتخاب کر لایا ہوں، کیا اچھا ہو کہ وہ بھی اس "حجاب نور" سے میری اور

تیری ہمکلامی کو سن لیں اور قوم کے پاس جا کر تصدیق کرنے کے قابل ہو جائیں؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء منظور فرمالی اور ان کو "حجاب نور" میں لے لیا گیا اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اللہ رب العالمین کی ہمکلامی کو سنا۔ پھر جب پردۂ نور ہٹ گیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان سرداروں کے درمیان مواجہہ ہوا تو سرداروں نے وہی اپنا پہلا اصرار قائم رکھا کہ جب تک بے حجاب خدا کو نہ دیکھ لیں ہم ایمان لانے والے نہیں، اس احمقانہ اصرار اور ضد پر غیرتِ الٰہی نے ان کو یہ سزا دی کہ ایک ہیبت ناک چمک، کڑک اور زلزلہ، نے ان کو آ لیا اور جلا کر خاک کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ دیکھا تو درگاہِ الٰہی میں عاجزی کے ساتھ دعاء مانگی، الٰہی! یہ بے وقوف اگر بے وقوفی کر بیٹھے تو کیا تو ہم سب کو ہلاک کر دے گا، اے خدا اپنی رحمت سے تو ان کو معاف کر دے، حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء کو سنا اور ان سب کو دوبارہ حیات تازہ بخشی اور پھر جب وہ زندگی کا لباس پہن رہے تھے تو ایک دوسرے کی تازہ زندگی کو آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

﴿وَ اخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ۝ وَ اكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْۤ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ ؗ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۵۵۔۱۵۷)

"اور اس غرض سے کہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے وقت میں حاضر ہوں موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی چنے، پھر جب لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آ لیا تو موسیٰ (علیہ السلام) نے ہماری جناب میں عرض کیا "پروردگار!" اگر تو چاہتا تو ان سب کو اب سے پہلے ہی ہلاک کر ڈالتا، اور خود میری زندگی بھی ختم کر دیتا (مگر تو نے اپنے فضل و رحمت سے ہمیں مہلت دی) پھر کیا ایک ایسی بات کے لئے جو ہم میں سے چند بے وقوف آدمی کر بیٹھے ہیں تو ہم سب کو ہلاک کر دے گا؟ یہ اس کے سواء کیا ہے کہ تیری طرف سے ایک آزمائش ہے تو جسے چاہے اس میں بھٹکا دے، جسے چاہے راہ دکھا دے، خدایا! تو ہمارا والی ہے، ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر، تجھ سے بہتر بخشنے والا کوئی نہیں! اور (خدایا) اس دنیا کی زندگی میں بھی ہمارے لئے اچھائی لکھ دے، اور آخرت کی زندگی میں بھی ہمارے لئے اچھائی کر، ہم تیری طرف لوٹ آئے! خدا نے فرمایا میرے عذاب کا حال یہ ہے کہ جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں، اور رحمت کا حال یہ ہے کہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے، پس

میں ان کے لئے رحمت لکھ دوں گا جو برائیوں سے بچیں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور ان کے لئے، جو میری نشانیوں پر ایمان لائیں گے، جو الرسول کی پیروی کریں گے کہ نبی یا امی ہوگا اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے وہ انہیں نیکی کا حکم دے گا، برائی سے روکے گا، پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا، گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا، اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے دبے ہوں گے، ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے تو جو لوگ اس پر ایمان لائے اس کے مخالفوں کے لئے روک ہوئے (راہ حق میں) اس کی مدد کی، اور اس روشنی کے پیچھے ہو لیے جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے، سو وہی ہیں جو کامیابی پانے والے ہیں۔"

﴿وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝﴾ (البقرہ: ۵۵-۵۶)

"اور جب تم نے کہا اے موسیٰ (علیہ السلام)! ہم تجھ پر اس وقت تک ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو بے حجاب اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، پس آنکھوں دیکھتے تم کو بجلی کی کڑک نے آ پکڑا، پھر ہم نے تم کو موت کے بعد زندہ کیا تاکہ تم شکر گزار رہو۔"

حیات بعد الموت:

قرآن عزیز نے حیات بعد الممات کا عام قانون تو یہ بتایا ہے کہ اس دنیوی موت کے بعد پھر عالم آخرت ہی کے لئے دوبارہ زندگی ملے گی لیکن قانون خاص یہ ہے کہ کبھی کبھی حکمت و مصلحت کے پیش نظر خدائے تعالیٰ اس دنیا ہی میں مردہ کو زندگی بخش دیا کرتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی معجزانہ زندگی میں خود قرآنی شہادت کے مطابق اس حقیقت کا متعدد مرتبہ ظہور ہو چکا ہے۔

قرآن عزیز جب حیات بعد الممات کا ذکر کرتا ہے تو اس کا قرینہ یہ ہے کہ وہ اس زندگی کو "بعث" سے تعبیر کرتا ہے جس کو اُردو میں جی اٹھنا کہتے ہیں۔

سورۂ بقرہ کی اس آیت میں بھی قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کے نمائندوں کی موت و ہلاکت اور اس کے بعد ان کے "بعث" اٹھنے کا ذکر کیا ہے اور ﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ کہہ کر اس واقعہ کی اصلی حقیقت کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے کہ بے شبہ صورت یہ پیش آئی کہ ان کے نامعقول اور گستاخانہ اصرار پر "رجفہ" کے عذاب نے ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عاجزانہ دعاء پر خدا کی وسعت رحمت نے ترس کھایا اور ان سوختہ جان انسانوں کو دوبارہ زندگی بخش دی گئی تاکہ یہ شکر گذار ہوں اور آئندہ اس قسم کی بے جا ضد کو کام میں نہ لائیں اور خدا کے سچے فرمانبردار بن جائیں۔

اس تفصیل کے بعد یہ بآسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ جن معاصر مفسرین نے آیت کی تفسیر اس حیات بعد الممات سے بچنے کے لئے رکیک تاویلات کے ساتھ کی ہے وہ صحیح نہیں ہے اور انہوں نے بغیر کسی سند اور دلیل کے قرآن عزیز کے صاف اور صریح اسلوب کو تفسیر بالرائے پر قربان کر دیا ہے۔

رحمت عام کا اعلان:

سورۂ اعراف کی یہ آیت ﴿ قَالَ عَذَابِیٓ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ﴾ مہمات قرآنی میں سے ہے، اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ خدا کی جانب سے جو عذاب آتا ہے وہ خاص حالات کے ماتحت ہوتا ہے ورنہ عذاب خدائے تعالیٰ کی صفت نہیں ہے بلکہ "رحمت" اس کی ازلی ابدی صفت ہے اس لئے اس کی صفت رحمت ہر شئے کے لئے عام ہے اور کائنات میں ایک شئے بھی ایسی نہیں ہے جو اس کی صفت رحمت سے خالی ہو بلکہ یوں کہئے کہ جس کو تم "عذاب" کہہ رہے ہو وہ تمہارے اعمال و کردار کی نسبت سے "عذاب" ہے، ورنہ کارخانۂ ہستی کے پورے نقشہ کے لحاظ سے اگر تم غور کرو گے تو اس کو بھی رحمت ہی پاؤ گے، چنانچہ سورۂ انعام میں اسی لئے فرمایا:

﴿ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ "اللہ نے رحمت کو اپنی ذات پر مقرر کرلیا۔"

اور اسی رحمت عام کا مظہر اتم اور پرتو اکمل وہ ذات گرامی ہے جس کا ذکر مبارک سورۂ اعراف کی اس آیت میں اس طرح کیا جارہا ہے کہ اس کی آمد سے قبل ہی کتب سابقہ میں اس کی آمد کی بشارت دے دی گئی تھی اور اس کی صفات اور اس کے اخلاق کا بھی تذکرہ کردیا گیا تھا اور اسی لئے دوسری جگہ اس کو رحمت العالمین کے لقب سے پکارا گیا۔ [1]

بنی اسرائیل اور جبل طور:

بہرحال جب یہ ستر سردار دوبارہ زندگی پاکر قوم کی جانب واپس ہوئے تو انہوں نے قوم سے تمام قصہ کہہ سنایا اور بتایا کہ موسیٰ علیہ السلام جو کچھ کہتے ہیں وہ حق ہے اور بے شبہ وہ خدا کے فرستادہ ہیں۔

اب فطرت سلیم کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ سب خدائے تعالیٰ کا شکر بجالاتے اور اس کے فضل و کرم کی فراوانی کے پیش نظر فرمانبرداری اور عبودیت کے ساتھ اس کے سامنے سر تسلیم خم کردیتے مگر ہوا یہ کہ انہوں نے اپنی کجروی کو باقی رکھا اور اپنے نمائندوں کی تصدیق کے باوجود تورات کو قبول کرنے میں معاندانہ پس و پیش شروع کردی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ارشادات پر کان نہ دھرا۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھا تو بارگاہ الٰہی میں رجوع کرتے ہوئے قوم کی بے راہ روی کا گلہ کیا۔ درگاہ الٰہی سے حکم ہوا کہ ان نافرمانوں کے لئے میں تجھ کو ایک حجت (معجزہ) اور عطا کرتا ہوں اور وہ یہ کہ جس پہاڑ (طور) پر تو مجھ سے ہمکلام ہوتا رہتا ہے اور جس پر تیری قوم کے منتخب سرداروں نے حق کا مشاہدہ کیا ہے اسی پہاڑ کو حکم دیتا ہوں کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت کرے اور سائبان کی طرح بنی اسرائیل کے سروں پر چھا جائے اور زبان حال سے یہ اعلان کرے کہ موسیٰ علیہ السلام خدا کا سچا پیغمبر ہے اور تورات بے شبہ خدا کی سچی کتاب ہے اور اگر یہ دونوں حق و صداقت کا مظہر نہ ہوتے تو یہ عظیم الشان "نشان" تم نہ دیکھتے جس کا ظہور قدرت الٰہی کے سواء اور کسی طرح ناممکن ہے۔

چنانچہ جوں ہی خدائے تعالیٰ کا یہ تکوینی فیصلہ ہوا طور ان کے سروں پر مثل سائبان نظر آنے لگا، اور زبان حال سے کہنے لگا کہ اے بنی اسرائیل! اگر تم میں عقل و ہوش باقی ہے اور حق و باطل کی تمیز موجود ہے تو گوش حق نیوش سے سنو کہ میں خدا کا نشان بن کر تم

---

[1] اس آیت کی مفصل تفسیر ذکر رسول ﷺ کے موقع پر کی جائے گی۔ (مؤلف)

کو یقین دلاتا ہوں اور شہادت دیتا ہوں کہ موسیٰ علیہ السلام نے بارہا میری پیٹھ پر خدائے تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی کا شرف حاصل کیا ہے اور تمہارے رشد و ہدایت کا قانون (تورات) بھی اسی کو میری پیٹھ ہی پر عطاء ہوا ہے اور اے سرمستان بادۂ غفلت و سرکشی! میری یہ ہیبت جو تمہارے لئے حیران کن بن رہی ہے، اس امر کی شہادت ہے کہ جب انسان کے سینہ میں دل کی نرمی، سختی سے بدل جاتی ہے تو پھر وہ پتھر کا ٹکڑا بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت بن جاتا ہے اور رشد و ہدایت اس میں کسی جانب سے بھی سرایت نہیں کر پاتی، دیکھو! میں پتھر کے ٹکڑوں کا مجموعہ (پہاڑ) ہوں لیکن خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیے کس طرح عبودیت کا مظاہرہ کر رہا ہوں مگر تم ہو کہ انانیت اور خودی کے گھمنڈ میں کسی حالت میں بھی "نہیں" کو "ہاں" سے بدل دینے کے لئے تیار نہیں، سچ ہے۔

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ (البقرہ: ۷۴)

"پھر تمہارے دل سخت ہو گئے سو وہ ہو گئے جیسے پتھر یا ان سے بھی سخت۔"

بنی اسرائیل نے جب یہ "نشان" دیکھا تو اب اسے وقتی خوف و دہشت کا ثمرہ سمجھئے یا علی رؤس الاشہاد خدا کے عظیم الشان "نشان" کے مشاہدہ کا نتیجہ یقین کیجئے کہ بنی اسرائیل تورات کی جانب متوجہ ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اس کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا تب خدائے تعالیٰ کا فرمان ذی شان ہوا کہ اے بنی اسرائیل! ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس کو مضبوطی کے ساتھ لو اور جو احکام اس (تورات) میں درج ہیں ان کی تعمیل کرو تا کہ تم پرہیزگار اور متقی بن سکو۔

مگر افسوس کہ بنی اسرائیل کا یہ عہد و میثاق ہنگامی ثابت ہوا اور زیادہ عرصہ تک وہ اس پر کاربند نہ رہ سکے اور حسب عادت پھر خلاف ورزی شروع کر دی، قرآن عزیز نے ان واقعات کو نہایت مختصر مگر صاف اور واضح نظم الفاظ کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝﴾

(البقرہ: ۶۳-۶۴)

"اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے سر پر طور کو اونچا کیا (اور کہا) جو ہم نے تم کو دیا ہے اس کو قوت سے پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد کرو تا کہ تم پرہیزگار بنو، پھر اس کے بعد تم نے (اس تورات سے) پیٹھ پھیر لی، پس اگر تم پر خدا کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو بلاشبہ تم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاتے۔"

﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۷۱)

"اور جب ہم نے ان کے (بنی اسرائیل) کے سروں پر پہاڑ بلند کر دیا گویا کہ وہ سائبان ہے اور انہوں نے یقین کر لیا کہ وہ ان پر گرنے والا ہے (تو ہم نے کہا) جو ہم نے تم کو دیا ہے اس کو قوت سے پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد کرو تا کہ تم پرہیزگار بنو۔"

ان آیات میں تصریح ہے کہ بنی اسرائیل نے جب تورات کو قبول کرنے میں پس و پیش کیا بلکہ انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سروں پر طور کو بلند کر دیا اور اس طرح آیۃ اللہ کا مظاہرہ کر کے ان کو قبول تورات پر آمادہ کیا پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ آیات کے ظاہر کو تاویلات میں گھسیٹا جائے جیسا کہ بعض معاصر مفسرین نے کیا ہے۔

کسی پہاڑ کا جڑ سے اُکھڑ کر فضاء میں معلق ہو جانا، عقلاً محال ہے اور نہ قانون قدرت کے منافی، البتہ انوکھا اور حیرت زدہ واقعہ ضرور ہے اور اس لئے "آیۃ اللہ" کہلانے کا مستحق، مگر تاویل کرنے والے کہتے ہیں کہ "رفع" کے معنی صرف بلندی کے آتے ہیں نہ کہ سر پر بلند ہونے کے، اور اسی طرح "نتق" کے معنی جس طرح "جڑ سے اُکھڑنے کے آتے ہیں" اسی طرح زلزلہ میں آنے اور "خوفناک حرکت کرنے" کے بھی آتے ہیں، لہٰذا سورۂ اعراف کی آیت کے معنی یہ ہوئے۔

"اور جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو زلزلہ میں ڈالا تھا، گویا ایک سائبان ہے جو ہل رہا ہے اور وہ (دہشت کی شدت میں) سمجھے تھے کہ بس ان کے سروں پر آ گرا۔" الخ ❶

مگر ان حضرات نے اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیا کہ "رفع" اور "نتق" کے اگر متعدد معانی آتے ہیں تو عربیت کے قاعدہ سے اس مقام پر جو قرینہ پایا جاتا ہے اسی کے مطابق معنی متعین ہوں گے خصوصاً جب کہ قرآن عزیز کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے تو بے شبہ کسی لفظ کے متعدد معانی میں سے صرف وہی معنی مراد ہوں گے جو دوسری آیت کے ذریعہ متعین ہوتے ہیں۔

پس بقرہ کی آیت ﴿رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ﴾ میں "رفع" اور "فوق" کو جب اعراف کی آیت ﴿نَتَقْنَا الْجَبَلَ﴾ میں "نتق" کے ساتھ ملائیں گے تو قرآن عزیز کی ان آیات کا صاف اور سادہ مطلب یہی بنے گا کہ طور کو اس کی جگہ سے اکھاڑ کر بنی اسرائیل کے سروں پر اس طرح کر دیا گیا گویا ایک سائبان ہے جو عنقریب ان پر گرنے والا ہے۔ نیز "فوق" کا رفع کے ساتھ لانا بھی اس تفسیر کی صحت کے لئے موثق شہادت ہے جو جمہور نے بیان فرمائی ہے، اس کے برعکس معاصر مفسرین سے نقل کردہ معنی صاف بول رہے ہیں کہ وہ منطوق قرآنی کے خلاف کھینچ تان بنائے گئے ہیں۔

اس مقام پر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ ان ہر دو آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر "تورات" کے قبول کرانے میں جبر و کراہ سے کام لیا گیا ہے، حالانکہ دین میں جبر و اکراہ درست نہیں ہے مگر قرآن عزیز کے سیاق و سباق کو پیش نظر رکھ کر واقعہ کی صورت جس طرح ہم نے نقل کی ہے یہ اعتراض اس شکل میں پیدا ہی نہیں ہوتا، البتہ اگر جمہور مفسرین اور جدید مفسرین کی تفسیر سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے تو اس کا بہترین جواب مفتی عبدہ نے اپنی تفسیر میں دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دراصل یہ جبر و اکراہ کا معاملہ نہیں تھا بلکہ آیۃ اللہ کا یہ آخری مظاہرہ تھا جو ان کی رشد و ہدایت کی تقویت و تائید میں کیا گیا اور اس لئے یہ واقعہ عہد و میثاق کے بعد پیش آیا جیسا کہ سیاق کلام سے ظاہر ہے۔

کثرت معجزات:

یہاں یہ بات بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ گزشتہ اوراق میں یہ بخوبی روشن ہو چکا ہے کہ صدیوں غلامی کی زندگی بسر کرنے

❶ ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۱

اور پست خدمات میں مشغول رہنے کی وجہ سے بنی اسرائیل کے ملکات فاضلہ کو گھن لگ گیا تھا اور مصریوں میں رہ کر مظاہر پرستی اور اصنام پرستی نے ان کے عقل وحواس کو اس درجہ معطل کر دیا تھا کہ وہ قدم قدم پر توحید الٰہی اور احکام الٰہی میں کسی "کرشمہ" کے منتظر رہتے، اس کے بغیر ان کے دل میں یقین واذعان کے لئے کوئی جگہ نہ بنتی تھی، پس ان کی ہدایت و رشد کے لئے دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں، ایک یہ کہ ان کو فقط افہام وتفہیم کے مختلف طریقوں ہی سے قبول حق پر آمادہ کیا جاتا اور انبیاء سابقین کی امتوں کی طرح صرف کسی خاص اور اہم موقعہ پر "آیۃ اللہ" (معجزہ) کا مظاہرہ پیش آتا اور دوسری صورت یہ تھی کہ ان کی صدیوں کی تباہ شدہ اس حالت کی اصلاح کے لئے روحانی طاقت کا جلد جلد مظاہرہ کیا جائے، اور حق وصداقت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ خدائے تعالیٰ کے تکوینی نشانات "معجزات" ان کی استعداد قبول وتسلیم کو بار بار تقویت پہنچائیں، پس اس قوم کی پست ذہنیت اور تباہ حالی کے پیش نظر مصلحت خداوندی نے ان کی اصلاح وتربیت کے لئے یہی دوسری صورت اختیار فرمائی۔ ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ "اللہ تعالیٰ عالم و دانا حکمت والا ہے"۔

بہرحال اس واقعہ کا ذکر تورات میں بھی موجود ہے، اور اس میں طور کے متعلق وہی کہا گیا ہے جو ہمارے جدید مفسرین نے آیت کی تاویل کی صورت میں بیان کیا ہے۔

جب تیسرا دن آیا تو صبح ہوتے ہی بادل گرجنے اور بجلی چمکنے لگی اور پہاڑ پر کالی گھٹا چھا گئی اور قرنا کی آواز بہت بلند ہوئی اور سب لوگ ڈیروں میں کانپ گئے، اور موسیٰ علیہ السلام لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملائے اور وہ پہاڑ سے نیچے آ کھڑے ہوئے اور کوہ سینا اوپر سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اس پر اترا اور دھواں تنور کے دھوئیں کی طرح اوپر کو اٹھ رہا تھا اور وہ سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا..... چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نیچے اتر کر لوگوں کے پاس گیا اور یہ باتیں ان کو بتائیں۔ [1]

ارض مقدس کا وعدہ اور بنی اسرائیل:

سینا کے جس میدان میں اس وقت بنی اسرائیل موجود تھے یہ سرزمین فلسطین سے قریب تھا، اور ان کے باپ دادا حضرت ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام سے خدا کا وعدہ تھا کہ تمہاری اولاد کو پھر اس سرزمین کا مالک بنائیں گے اور وہ یہاں پھولے پھلے گی، لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت خدا کا حکم ہوا کہ اپنی قوم سے کہو کہ ارض مقدس میں داخل ہوں اور وہاں کے جابر و ظالم حکمرانوں کو نکال کر عدل و انصاف کی زندگی بسر کریں، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ فتح تمہاری ہوگی اور تمہارے ظالم دشمن ناکام ہوں گے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے پہلے کہ بنی اسرائیل کو ارض مقدس میں داخل ہونے کے لئے آمادہ کریں "بارہ آدمیوں کو تفتیش حال کے لئے بھیجا، وہ فلسطین کے قریبی شہر اریحا میں داخل ہوئے اور تمام حالات کو بغور دیکھا، جب واپس آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتایا کہ وہ بہت جسیم اور تن وتوش کے زبردست ہیں اور بہت قوی ہیکل ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جس طرح تم نے مجھ سے ان کے متعلق کہا ہے قوم کے سامنے نہ کہنا۔ اس لئے کہ عرصہ دراز کی غلامی نے ان کے حوصلے پست کر دیئے ہیں، اور ان میں شجاعت، خودداری اور علو ہمت کی جگہ بزدلی، ذلت اور پستی ہمت نے لے لی ہے، مگر آخر یہ بھی اسی قوم کے افراد تھے، نہ مانے اور خاموشی کے ساتھ قوم کے سامنے دشمن کی طاقت کا خوب بڑھا چڑھا کر ذکر کیا،

[1] خروج باب ۱۹ آیات ۱۵۔۱۶

البتہ صرف دو شخص یوشع بن نون اور کالب بن یفنہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی اور انہوں نے بنی اسرائیل سے ایسی کوئی بات نہ کہی کہ جس سے ان کی ہمت پست ہو۔

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تم اس بستی (اریحاء) میں داخل ہو اور دشمن کا مقابلہ کر کے اس پر قابض ہو جاؤ خدا تمہارے ساتھ ہے۔

﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝﴾ (المائدہ: ۲۰۔۲۱)

"اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا "اے قوم! تم پر جو خدا کا احسان رہا ہے اس کو یاد کرو کہ اس نے تم میں نبی اور پیغمبر بنائے اور تم کو بادشاہ اور حکمران بنایا اور وہ کچھ دیا جو جہانوں میں کسی کو نہیں دیا۔ اے قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کر دیا ہے اور پشت پھیر کر نہ لوٹو (کہ نتیجہ یہ نکلے) کہ تم خسارہ اور نقصان اٹھانے والے بن کر لوٹو۔"

بنی اسرائیل نے یہ سن کر جواب دیا کہ موسیٰ علیہ السلام! وہاں تو بڑے ظالم لوگ بستے ہیں، ہم تو اس وقت تک اس بستی میں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں، افسوس بدبختوں نے یہ نہ سوچا کہ جب تک ہمت و شجاعت کے ساتھ تم ان کو یہاں سے نہ نکالو گے تو یہ ظالم خود کیسے نکل جائیں گے۔

یوشع اور کالب نے جب یہ دیکھا تو قوم کو ہمت دلائی اور کہا شہر کے پھاٹک سے گذر جانا کچھ مشکل نہیں ہے، چلو اور ان کا مقابلہ کرو ہم کو پورا یقین ہے کہ تم ہی غالب رہو گے۔

﴿قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ۬ وَ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (المائدہ: ۲۳)

"ان ڈرنے والوں میں سے دو ایسے آدمیوں نے جن پر خدا نے اپنا فضل و انعام کیا یہ کہا "تم ان جابروں پر دروازہ کی جانب سے داخل ہو جاؤ پس جس وقت تم داخل ہو جاؤ گے تم بلاشبہ غالب رہو گے اور (یہ بھی کہا) اللہ پر ہی بھروسہ رکھو اگر تم ایمان والے ہو۔"

لیکن بنی اسرائیل پر اس بات کا بھی مطلق اثر نہ ہوا اور وہ بدستور اپنے انکار پر قائم رہے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے زیادہ زور دیا تو اپنے انکار پر اصرار کرتے ہوئے کہنے لگے:

﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝﴾ (المائدہ: ۲٤)

"انہوں نے کہا" اے موسیٰ (علیہ السلام)! ہم کبھی اس شہر میں اس وقت تک داخل نہیں ہوں گے جب تک وہ اس میں موجود ہیں، پس تو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور ان سے لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں (یعنی تماشا دیکھیں گے)۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ ذلیل اور بے ہودہ جواب سنا تو بہت افسردہ خاطر ہوئے اور انتہائی رنج و ملال کے ساتھ درگاہِ الٰہی میں عرض کیا: "بارالہا! میں اپنے اور ہارون علیہ السلام کے سواء کسی پر قابو نہیں رکھتا سو ہم دونوں حاضر ہیں، اب تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان جدائی کر دے، یہ تو سخت نااہل ہیں" اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی موسیٰ! تم غمگین نہ ہو، ان کی نافرمانی کا تم پر کوئی بار نہیں، اب ہم نے ان کے لئے یہ سزا مقرر کر دی ہے کہ یہ چالیس سال اسی میدان میں بھٹکتے پھیریں گے، اور ان کو ارض مقدس میں جانا نصیب نہ ہوگا، ہم نے ان پر ارض مقدس کو حرام کر دیا ہے۔

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۚ یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ۝﴾

(المائدہ: ۲۵-۲۶)

"(موسیٰ علیہ السلام نے) کہا" اے پروردگار! میں اپنے اور اپنے بھائی کے ماسواء کسی کا مالک نہیں ہوں، لہٰذا تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان تفریق کر دے (اللہ تعالیٰ) نے کہا" بلاشبہ ان پر ارض مقدس کا داخلہ چالیس سال تک حرام کر دیا گیا، اس مدت میں یہ اسی میدان میں بھٹکتے پھریں گے، پس تو نافرمان قوم پر غم نہ کھا اور افسوس نہ کر۔"

وادی سینا کو "تیہ" اس لئے کہتے ہیں قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کے لئے کہا: ﴿یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ﴾ (یہ اس زمین میں بھٹکتے پھریں گے) جب کوئی شخص راہ سے بھٹک جائے تو عربی میں کہتے ہیں" تاہ فلان"۔

تورات میں اس واقعہ کی تفصیلات اگرچہ اس انداز میں مذکور نہیں ہیں تاہم "گنتی باب ۱۴" میں بنی اسرائیل کے ارض مقدس میں داخلہ سے انکار، اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ناراضی اور پھر چالیس سال تک ان پر ارض مقدس کے داخلہ کا حرام ہو جانا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس مدت کے اندر اندر بنی اسرائیل کے وہ تمام افراد مر جائیں گے جنہوں نے خدا کے حکم کے خلاف ارض مقدس کے داخلہ سے انکار کیا ہے اور ان کے بعد نئی نسل کو داخلہ کی اجازت ہوگی جو کالب اور یوشع کی سرکردگی میں دشمنوں کو پامال کر کے پاک زمین میں داخل ہوں گے نیز یہ کہ حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی اس وقت انتقال ہو چکا ہوگا۔

"پھر خداوند نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو خطاب کر کے فرمایا میں کب تک اس خبیث گروہ کے مقابل جو میری شکایت کرتا ہے صبر کروں؟ بنی اسرائیل جو میرے برخلاف شکایتیں کرتے ہیں میں نے ان کی شکایتیں سنیں، ان سے کہہ، خداوند کہتا ہے: مجھے اپنی حیات کی قسم جیسا تم نے مجھے سنا کے کہا ہے میں تم سے ویسا ہی کروں گا، تمہاری لاشیں اور ان سب کی جو تم میں شمار کیے گئے ان کے کل جمع کے مطابق بیس برس والے سے لے کر اوپر والے تک جنہوں نے میری شکایتیں کیں اس بیابان میں گریں گی، تم بیشک اس زمین تک نہ پہنچو گے جس کی بابت میں نے قسم کھائی ہے کہ تمہیں وہاں بساؤں گا سوا لفینہ

کے بیٹے کالب اور نون کے بیٹے یشوع اور تمہارے لڑکوں کو جن کے حق میں تم کہتے ہو کہ وہ لٹ جائیں گے، میں ان کو داخل کروں گا، اس زمین کی قدر کو جسے تم نے ذلیل جانا اور پہچانیں گے، پرتم جو ہو تمہاری لاشیں اس بیابان ہی میں گریں گی اور تمہارے لڑکے اس دشت میں چالیس برس تک بھٹکتے پھریں گے اور تمہاری برگشتگی کے اٹھانے والے ہوں گے جب تک کہ تمہاری لاشیں اس دشت میں نیست و نابود نہ ہوں، ان دنوں کے شمار کے مطابق جن میں تم اس زمین کی جاسوسی کرتے تھے جو چالیس دن ہیں دن پیچھے ایک سال ہوگا سوتم چالیس برس تک اپنے گناہ کو اٹھائے رہو گے، تب تم میری عہد شکنی کو جان لو گے۔" ❶

اس جگہ یہ شبہ پیدا نہ کرنا چاہیے کہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو بھی اسی میدان میں رہنا پڑا اور وہ بھی ارض مقدس میں نہ داخل ہو سکے اس لئے کہ جب بنی اسرائیل کے اس پورے قافلہ پر ارض مقدس کو حرام کر دیا گیا تو اب ضروری تھا کہ ان کے رشد و ہدایت کے لیے خدا کا پیغمبر ان میں موجود رہے تا کہ کچھ یہ بوڑھے بھی راہ حق پر قائم رہیں اور نئی نسل میں وہ استعداد پیدا ہو جس کے ذریعہ وہ ارض مقدس میں داخل ہو کر خدا کے حکم کو پورا کریں۔

ذبح بقرہ کا واقعہ:

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ بنی اسرائیل میں ایک قتل ہو گیا مگر قاتل کا پتہ نہ لگا، آخر شبہ نے تہمت کی شکل اختیار کر لی اور اختلاف باہمی کی خوفناک صورت پیدا ہو گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب یہ واقعہ پیش ہوا تو انہوں نے خدائے تعالیٰ کی جانب رجوع کیا اور عرض کیا کہ اس واقعہ نے قوم میں سخت اختلاف رونما کر دیا ہے، تو خود علیم و حکیم ہے میری مدد فرما۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ ان سے کہو کہ پہلے ایک گائے ذبح کریں، اور اس کے بعد گائے کے ایک حصہ کو مقتول کے جسم سے مس کریں، پس اگر وہ ایسا کریں گے تو ہم اس کو زندگی بخش دیں گے اور یہ معاملہ واضح ہو جائے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے جب "ذبح بقرہ" کے متعلق فرمایا تو انہوں نے اپنی کج بحثی اور حیلہ جوئی کی خصلت کے مطابق بحث شروع کر دی۔

موسیٰ علیہ السلام! کیا تو ہم سے مذاق کرتا ہے "یعنی مقتول کے واقعہ سے ذبح بقرہ کا کیا تعلق"؟ اچھا اگر واقعی یہ خدا کا حکم ہے تو وہ گائے کیسی ہو؟ اس کا رنگ کیسا ہو؟ اس کی کچھ اور تفصیلی صفات معلوم ہونی چاہئیں، کیونکہ ابھی تک اس کے تعین کے متعلق ہم مشتبہ حالت میں ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب وحی الٰہی کی معرفت ان کے تمام سوالات کے جواب دے دیے اور حیلہ جوئی کا ان کے لیے کوئی موقعہ باقی نہیں رہا تب وہ تعمیل حکم پر آمادہ ہوئے اور وحی الٰہی کے مطابق معاملہ کا سرانجام کیا، خدا کے حکم سے وہ مقتول زندہ ہو گیا اور اس نے تمام واقعہ من وعن بیان کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب اس حیرت انگیز "خدائی نشان" نے حقیقت کو واشگاف کر دیا تو قاتل کو بھی اقرار کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہ رہا اور اس طرح نہ صرف قاتل ہی کا پتہ چل گیا بلکہ مختلف اسباط اور خاندانوں میں اختلاف پیدا ہو کر جو سخت خانہ جنگی اور خون ریزی کی صورت رونما ہو چلی تھی اس کا بھی خوش اسلوبی کے ساتھ خاتمہ ہو گیا۔

---

❶ گنتی باب ۱۴ آیات ۲۶ ـ ۲۵

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اس تاریخی واقعہ کو یاد دلا کر دو باتوں کی جانب توجہ دلائی ہے، ایک منکرین معاد کو یہ بتایا ہے کہ جس قوم کے اسلاف میں یہ واقعہ ہو گذرا ہے وہ آج تک اس تاریخی واقعہ کی شاہد ہیں، لہٰذا جس طرح خدا نے اس وقت مردہ کو زندہ کر کے اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا تھا تم سمجھ لو وہ قیامت کے دن بھی اسی طرح مردے کو زندگی عطاء فرمائے گا۔ ﴿كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى﴾ [1] دوسرے بنی اسرائیل کو بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو (یعنی تمہارے اسلاف کو) اتنی کثرت کے ساتھ اپنے نشان (معجزات) دکھائے ہیں کہ اگر دوسری قوم کے سامنے یہ مظاہرے کیے جاتے تو وہ ہمیشہ کے لیے خدائے تعالیٰ کی فرماں بردار بن جاتی اور اس کے دل میں ایک لمحہ کے لیے بھی نافرمانی کا خطرہ نہ گزرتا لیکن تم اور تمہارے اسلاف پر یا تو اثر ہی نہ ہوا اور اگر ہوا بھی تو ناپائیدار اور غیر مؤثر ثابت ہوا اور آج بھی اگر تم نبی اکرم ﷺ کا انکار اور ان کی مخالفت کر رہے ہو تو یہ تمہاری جبلت اور قدیم عصبیت و جہالت ہی کا اثر ہے۔

قرآن عزیز نے ہم کو اس واقعہ کے متعلق صرف اسی قدر بتایا ہے اور اس سے زیادہ کوئی تفصیل نہیں دی۔

﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَ اِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَ مَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ (البقرہ: ۶۷-۷۳)

"اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا "بلاشبہ تم کو خدا یہ حکم دیتا ہے کہ تم گائے ذبح کرو" وہ کہنے لگے: "کیا تو ہمارے ساتھ مذاق کرتا ہے؟" موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: "میں اللہ سے پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ جاہلوں میں شمار ہوں" (یعنی یہ مذاق نہیں ہے) انہوں نے کہا: "تو اپنے پروردگار سے یہ دریافت کر کہ اس کی حقیقت کیا ہے"؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "اللہ تعالیٰ کہتا ہے وہ ایسی گائے ہو کہ نہ تو بڑھیا ہو اور نہ بچھیا بلکہ درمیانی عمر کی جوان ہو، پس اب جو تم سے کہا گیا ہے اس کی تعمیل کرو" وہ کہنے لگے: "اپنے خدا سے پوچھ کہ اس کا رنگ کیسا ہو"؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ "وہ گہرے زرد رنگ کی ہو کہ دیکھنے والے کو خوش رنگ معلوم ہو" کہنے لگے "ہم پر (ابھی تک) گائے کی کیفیت مشتبہ ہے اگر خدا کو منظور ہے تو ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے "وہ ایسی گائے ہو کہ نہ محنت ماری ہو کہ زمین میں ہل چلاتی ہو اور نہ

---

[1] اور اسی طرح اللہ تعالیٰ مردہ کو زندہ کر دیا کرتا ہے۔

کھیت کو سیراب کرتی ہو۔ وہ بے داغ ہو جس پر کسی قسم کا دھبہ نہ ہو" کہنے لگے "اب تو صحیح بات لایا" پس انہوں نے اس کو حاصل کر کے ذبح کیا، اور قریب تھا کہ نہ کرتے اور "یہ جب ہوا کہ تم نے ایک جان کو قتل کر دیا۔ پھر آپس میں اختلاف کرنے لگے، اور اللہ ظاہر کرنے والا ہے اس بات کو جس کو تم چھپاتے ہو" پس ہم نے کہا "اس مقتول کو گائے کے بعض حصے کے ساتھ مس کرو (مارو) اللہ تعالیٰ اسی طرح مردوں کو زندہ کر دیتا ہے، اور تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو"۔

صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرماتے ہی "ذبح بقرہ" کی تعمیل کر دیتے تو ان کے لیے گائے کے معاملہ میں کسی قسم کی مطلق قید و بند نہ ہوتی اور وہ کوئی سی گائے بھی ذبح کر دیتے تو تعمیل پوری ہو جاتی مگر انہوں نے بیہودہ سوالات کر کے اپنے اوپر پابندیاں لگوائیں، چنانچہ پیغمبر خدا کے ساتھ اس قسم کی بیہودہ باتوں اور کج بحثیوں کی قرآن عزیز نے سخت مذمت کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس کا آخر نتیجہ کفر اور ترک ایمان پر جا کر ختم ہوتا ہے، لہٰذا امت مسلمہ کو چاہیے کہ وہ اس قسم کی باتوں سے بچے۔

﴿اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝﴾ (البقرہ: ۱۰۸)

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے پیغمبر (ﷺ) سے اس قسم کے سوال کرو جس طرح پہلے زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوالات کیے گئے تھے اور جو شخص ایمان کے عوض کفر اختیار کرتا ہے وہ بلاشبہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔"

اس موقعہ پر یہ سوال ضرور سامنے آ جاتا ہے کہ آخر "ذبح بقرہ" اور مقتول کے زندہ کر دینے کے درمیان کیا مناسبت ہے جو احیاء مقتول کے لیے یہ خاص صورت اختیار کی گئی سو خدا کی حکمتوں اور مصلحتوں تک پہنچنا تو انسانی مقدرت سے باہر ہے تاہم عقل و شعور کی جو روشنی اس نے انسان کو بخشی ہے وہ اس طرف راہنمائی کرتی ہے کہ اگر بنی اسرائیل کی اس تاریخ پر نظر کی جائے جو گذشتہ صفحات میں سپرد قلم ہو چکی ہے تو یہ بات بخوبی روشن ہو جاتی ہے کہ مصر کے بود و ماند نے ان کے اندر بت پرستی خصوصاً گائے کی عظمت و تقدیس اور گوسالہ پرستی کا جذبہ بہت زیادہ پیدا کر دیا تھا جو جگہ جگہ ابھر آتا اور ان پر اثر انداز ہونے لگتا تھا، چنانچہ گوسالہ پرستی کے واقعہ کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے "تورات کی تعمیل" کے لیے فرمایا تو اس وقت بھی انہوں نے کافی حیلہ جوئی سے کام لیا تھا اور اگر "رفع طور" کا نشان ان پر ظاہر نہ ہوتا تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب پر اتر آتے تو کچھ تعجب نہ تھا، خدائے تعالیٰ نے اس موقعہ پر ارشاد فرمایا ہے کہ اس تعنت اور حیلہ سازی کی خصلت کا باعث وہی گئو سالہ پرستی ہے، ابھی تک ان کے دلوں سے بت پرستی اور گئو سالہ کی تقدیس کا عقیدہ دور نہیں ہوا بلکہ ان کی حالت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تقدیس ان کے دلوں میں رچ گئی ہے۔

﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا ۗ وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (البقرہ: ۹۳)

"اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے سروں پر طور بلند کر دیا (اور کہا) جو ہم نے تم کو دیا ہے اس کو مضبوطی سے پکڑ و اور اس پر کان دھرو۔ انہوں نے کہا "ہم نے سنا (اور عمل سے بتایا کہ) ہم نے نافرمانی کی" اور اصل بات یہ ہے کہ ان کے دلوں میں کفر کی وجہ سے گوسالہ رچ گیا ہے (اے مخاطب) کہہ دے اگر تم اپنے قول کے مطابق مومن ہو تو تمہارے ایمان نے یہ فیصلہ ہی برا کیا ہے۔"

﴿وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝﴾ (البقرہ: ۹۳)

"اور بے شبہ موسیٰ (علیہ السلام) تمہارے پاس واضح دلائل لے کر آئے۔ پھر تم نے اس کے بعد گؤسالہ بنالیا اور تم خود اپنے لیے ظالم ہو۔"

پس اس موقع پر خدا کی مصلحت نے یہ فیصلہ کیا کہ بنی اسرائیل کی اس گمراہی کو کسی ایسے عمل سے دور کرے جس کا مشاہدہ خود ان کی آنکھیں کر رہی ہوں لہٰذا ان کو مشاہدہ کرایا کہ جس کی تقدیس تمہارے دل میں اس قدر پیوست ہوگئی ہے کہ بار بار نمایاں ہوتی ہے، اس (گائے) کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کو فنا کے گھاٹ اتار دیا اور وہ تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکی اور کہیں یہ خیال نہ کر بیٹھنا کہ یہ گائے کی تقدیس ہی کا اثر تھا کہ اس کے پارۂ گوشت کے مس کرنے سے مردہ زندہ ہوگیا اس لیے کہ اگر موت و حیات کا یہ معاملہ گائے کی تقدیس سے متعلق تھا، تو جس پارۂ گوشت نے مردہ کو زندہ کر دیا وہ خود زندگی حاصل کر کے کیوں دوبارہ جیتی جاگتی گائے نہ بن گیا، کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ گائے جس کو تم نے ذبح کیا تھا اسی طرح بے جان پڑی ہے اور اس کے پارہائے جسم تمہارے درمیان زینت دسترخوان ہو چکے ہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ موت و حیات کا یہ معاملہ صرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور جس "گؤسالہ" کی محبت تمہارے دلوں میں رچ گئی ہے وہ تم سے بھی ادنیٰ ایک جان دار ہے جو صرف تمہاری خدمت اور ضرورت کے لیے بنایا گیا ہے نہ کہ تمہارے لیے "دیوتا" اور "دیوی"...... خدائے تعالیٰ ہی کی ذات واحد ہے کہ جس کو چاہے موت دے اور جس کو چاہے حیات بخشے، چنانچہ تم نے ایک ہی واقعہ میں دونوں حقیقتوں کا مشاہدہ کر لیا کہ اس نے گائے کی زندگی کو فنا سے بدل دیا اور انسان کے مردہ جسم کو حیات تازہ بخش دی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

قرآن عزیز نے غالباً اسی حکمت کے پیش نظر "ذبح بقرہ" کے واقعہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، پہلے حصہ میں بنی اسرائیل کی گؤسالہ پرستی کے واقعہ کی تائید میں بقرہ کا یہ واقعہ بیان کیا گیا کہ جب ایک خاص مقصد کے لیے بنی اسرائیل سے گائے ذبح کرنے کو کہا گیا تھا تو یہی گؤسالہ پرستی کی محبت ان کے آڑے آئی تھی اور مصریوں کے عقیدۂ تقدیس بقرہ (گائے کی تقدیس) کے اتباع میں انہوں نے بیسیوں حیلے اور بہانے تراشے اور یہ کوشش کی کہ کسی طرح ان کو گائے ذبح نہ کرنی پڑے، لیکن جب سوالات کی پیچیدگی میں آ کر پھنس گئے تو مجبوراً تعمیل کرنی پڑی۔

قرآن عزیز نے جب اس واقعہ سنایا تو قدرتی طور پر سامعین کو شوق پیدا ہونا چاہیے تھا کہ وہ یہ معلوم کریں کہ ذبح بقرہ کا وہ واقعہ کیوں اور کس طرح پیش آیا جس کے بارے میں بنی اسرائیل اس قدر حیلے تراش رہے تھے تو دوسرے حصہ میں قرآن عزیز نے اس پیدا شدہ فطری سوال کا جواب اس طرح دیا کہ اس واقعہ کے نمایاں پہلو کو بیان کر دیا جس کا بنی اسرائیل کی اس ردّ و کد کے ساتھ

حقیقی تعلق تھا، اس لیے اس حصہ بیان کو دوبارہ لفظ "اذ" سے شروع کیا۔

قرآن عزیز کی ان آیات کی یہ وہ تفسیر ہے جو قرآن کے جملوں کے اندر محدود ہو کر کی گئی ہے، اور جس میں ذبح بقرہ کے واقعہ سے متعلق آیات میں تقدیم و تاخیر کی بحثوں میں جانے کی مطلق ضرورت پیش نہیں آتی اور نہ واقعہ کو اچنبھا سمجھ کر باطل اور رکیک تاویلات کی پناہ لینے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

بلاشبہ یہ واقعہ خدائے تعالیٰ کے ان مسلسل نشانوں میں سے ایک "نشان" تھا جو یہود کی سخت اور تند جبلت اور متمردانہ خصلت کے مقابلہ میں تائید حق کے لیے حکمت الٰہی کے پیش نظر ظہور میں آیا اور جو نشان ہونے کے علاوہ اپنے اندر متعدد اہم مصالح رکھتا تھا اور اس حقیقت ثابتہ کے لیے خود قرآن عزیز کا سیاق و سباق تائید کرتا ہے، چنانچہ اس واقعہ کے متصل ہی ارشاد ہے ﴿كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى﴾ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کر دے گا، اور اسی کے سیاق میں ارشاد فرمایا ﴿وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ﴾ تاکہ دکھائے تم کو اپنی قدرت کے "نشان"۔

گویا "ذبح بقرہ" کا واقعہ نقل کرنے سے قبل بنی اسرائیل کو بار بار خدائی نشان مشاہدہ کرانے کا ذکر اور پھر قصہ کے متصل ہی آخرت میں "احیاء موتٰی" کا اس واقعہ سے استشہاد اور پھر اس واقعہ کو بھی "آیات اللہ" میں سے ایک آیت (نشان) بتانا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ کسی تاویل اور دور از کار باتوں کی پناہ لیے بغیر ان آیات کی صاف اور سادہ تفسیر وہی ہے جو سطور بالا میں بیان کی گئی۔

لہٰذا ان آیات کی وہ تفاسیر جو جدید معاصرین نے بیان کی ہیں اور جن میں تمام آیات متعلقہ کو کبھی دو جدا واقعات کہہ کر اور کبھی ایک واقعہ تسلیم کر کے مختلف رکیک اور لچر تاویلات سے کام لیا گیا ہے نا قابل تسلیم ہیں" اور قرآن عزیز کے منطوق کے خلاف۔

مثلاً کہا جاتا ہے کہ ذبح بقرہ کا یہ طریقہ دراصل خود بنی اسرائیل کی قدیم رسوم میں سے تھا جس کا ذکر اب تک تورات میں موجود ہے یعنی جب کسی جگہ ایسا مقتول پایا جاتا کہ اس کے قاتل کا پتہ نہ ملتا تو باہمی جنگ و جدال سے بچانے کے لیے یہ طریقہ مروج تھا کہ وہ ایک ایسی گائے کو حاصل کرتے جو نہ کاشت کے کام میں آئی ہو اور نہ سیرابی کی خدمت کر چکی ہو اور اس کو ایسی وادی میں لے جاتے جہاں کاشت کبھی نہ ہوئی ہو اور پانی کا نالہ بہہ رہا ہو، اور جس پر قاتل ہونے کا شبہ ہوتا تو اس کے محلہ، خاندان یا بستی کے لوگوں کو جمع کیا جاتا اور پھر کاہن آگے بڑھتا اور بہتے ہوئے پانی پر گائے کو کھڑا کر کے اس کی گردن مارتا اور جب اس کا خون پانی میں مل جاتا تو فوراً مشتبہ گروہ کے لوگ اٹھ کر اس خون آلود پانی سے ہاتھ دھوتے جاتے اور پکار پکار کر یہ کہتے جاتے کہ "نہ ہمارے ہاتھوں نے اس کو قتل کیا ہے اور نہ ہمیں قاتل کا پتہ معلوم ہے" پھر ان پر کوئی شبہ باقی نہ رہتا اور خانہ جنگی نہ ہونے پاتی، اور اگر مشتبہ گروہ کا ایک سردار بھی ہاتھ دھونے اور اس رسم میں شریک ہونے سے انکار کر دیتا تو پھر مقتول کا خون بہا اس خاندان یا محلہ پر ڈال دیا جاتا تھا جس کا وہ سردار ہے۔ [1]

اس تفسیر میں قرآن عزیز کے سیاق و سباق کے لحاظ سے جو نقائص ہیں وہ معمولی فہم و عقل سے بھی معلوم ہو سکتے ہیں لیکن ان کے علاوہ سب سے زیادہ قابل اعتراض یہ امر ہے کہ اگر بنی اسرائیل میں یہ دستور قدیم سے رائج تھا تو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی رسم کے مطابق خدائے تعالیٰ کا فیصلہ سنایا تو بنی اسرائیل نے اس کو اجنبی نگاہ سے کیوں دیکھا اور یہ کیوں کہا ﴿اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا﴾

---

[1] استثناء باب ۲۱ آیات ۹۔۲

اے موسیٰ علیہ السلام! کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے کہ گائے ذبح کرنے کو کہتا ہے، اور اگر ازراہِ تعنت ان کا سوال تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام یہی جواب دیتے کہ اس میں حیرت و تعجب کا کون سا موقعہ ہے جبکہ تم خود جانتے ہو کہ قضیہ کے فیصلہ کا یہ پرانا طریقہ ہے۔

اس سلسلہ میں گائے حاصل کرنے سے متعلق کتب تفاسیر میں عجیب وغریب قصے مذکور ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام قصص "اسرائیلیات" سے منقول ہیں، یعنی یہ وہ قصے ہیں جو یہود کی نقل و روایت سے شہرت پا گئے اور تفسیروں میں بھی درج کر دیئے گئے ہیں مگر محققین نے ان کو چھان کر تفسیر قرآن سے بالکل جدا کر دیا ہے، چنانچہ حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ جیسے جلیل القدر مفسر نے ان قصص کے متعلق یہ فیصلہ دیا ہے:

"اور یہ سلسلہ بیانات جو عبیدہ، ابوالعالیہ اور سدی اور دوسروں سے مروی ہے ان سب کے آپس میں اختلاف ہے، اور صاف بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی کتابوں سے ماخوذ ہیں اور اگرچہ ان کا نقل کرنا درجہ جواز میں آ سکتا ہے مگر ہم نہ ان کی تصدیق کرتے ہیں اور نہ تکذیب، اور اسی بنا پر ان روایات پر قطعاً کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا، مگر وہ روایات جو ہمارے نزدیک (قرآن وحدیث کی روشنی میں) حق ہوں۔ واللہ اعلم"

اور خاص اس واقعہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

گائے کا وہ کون سا حصہ تھا جو مردہ جسم پر مس کیا گیا سو وہ کوئی بھی حصہ ہو واقعہ میں جس قدر مذکور ہے معجزہ ہونے کے لیے وہ بھی کافی ہے، اور اگر اس حصہ کا تعین بھی ہمارے دینی دنیوی حالات کے اعتبار سے ضروری ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور واضح فرما دیتے۔ مگر اس نے اس کو مبہم ہی رکھا ہے اگرچہ اصل حقیقت کے لحاظ سے وہ بہرحال متعین ہے اور نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس کے تعین کے متعلق کوئی صحیح روایت ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے بھی یہی مناسب ہے کہ ہم بھی اس کو اسی طرح مبہم رہنے دیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کو مبہم رکھا ہے۔ [1]

علاوہ ازیں مسلم کی حدیث میں صرف اسی قدر مذکور ہے کہ "اگر بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام سے رد و کد نہ کرتے تو گائے کے معاملہ میں ان پر پابندیاں عائد نہ ہوتیں" پس اگر اس معاملہ سے متعلق اور تفاصیل بھی ہوتیں تو نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم ان کا بھی ذکر ضرور فرماتے۔

غرض یہ واقعہ حق تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک "عظیم نشان" ہے، البتہ قرآن عزیز نے جو تفصیل بیان کی ہے صرف اسی قدر قابل تسلیم ہے، باقی سب قصص و حکایات ہیں۔ اور لاطائل داستانیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات سے متعلق ان مباحث کا خطاب ان ہی مفسرین کے ساتھ ہے جو اصولاً معجزات انبیاء کے قائل ہیں مگر ان مقامات میں تاویل کی گنجائش سمجھ کر ایسی تاویلات کرتے ہیں جن کی بدولت یہ واقعات "معجزہ" کی حد سے باہر ہو جائیں، باقی جو ملاحدہ اسلام کے مسلمہ عقیدہ "معجزہ" کے ہی قائل نہیں ہیں اور اس لیے قرآن عزیز کے ایسے تمام واقعات کو باطل تاویلات کی نذر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں تو ان کے لیے سب سے پہلے نفس معجزہ کے امکان پر گفتگو ہونا چاہیے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے کہ ان عظیم الشان "آیات اللہ" کے مشاہدہ اور ان پر خدائے تعالیٰ کے

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۱۲

بے غایت فضل و کرم کے باوجود ان بدبختوں پر کوئی اثر نہ ہوا اور یہ اسی طرح کج روی اور زیغ پر قائم رہے، قبول حق کے لیے ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے، بلکہ پیہم تمرد و سرکشی نے ان کی نیک استعداد کو فنا کر کے پتھر سے بھی زیادہ سخت بنا دیا، اس لیے کہ پتھر میں سختی ہوتے ہوئے بھی اس سے مخلوق خدا کو بہت سے فائدے ہیں، مگر ان کی زندگی کا تو بجز خسارہ اور نقصان کے اور کچھ حاصل نہیں رہا۔

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (البقرہ:۷٤)

"اس (مشاہدہ) کے بعد ان کے دل سخت ہو گئے پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا (دل نہیں) پتھر ہیں یا (یوں سمجھو) کہ پتھر سے بھی زیادہ سخت (یہ بات واضح ہے) کہ بعض پتھروں سے پانی نکل کر نہریں بہتی ہیں اور بعض چیخ کر پھٹتے ہیں تو ان سے سوت جاری ہو جاتے ہیں اور بعض خدا کے خوف سے (بھونچال وغیرہ حالتوں میں) نیچے لڑھک آتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ تمہاری کرتوتوں سے غافل نہیں ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے قلوب کی سختی اور قبول حق میں بے اثری کا یہ عالم ہے کہ اگر محاورہ اور بول چال کے مطابق یوں کہہ دیا جائے کہ ان کا دل پتھر کا ٹکڑا بن گیا ہے تب بھی ان کی شدت و صلابت کی صحیح تصویر سامنے نہیں آ سکتی، اس لیے کہ پتھر اگر چہ سخت ہے مگر ناکارہ نہیں ہے، کیا تم نے پہاڑوں کا مشاہدہ نہیں کیا اور نہیں دیکھا کہ ان ہی سخت پتھروں سے ندیاں اور دریا بہہ رہے ہیں اور کہیں ان ہی سے شیریں اور خنک پانی کے سوت جاری ہیں اور اگر بھونچال آ جائے یا خدا کی مشیت کا کوئی اور فیصلہ ہو جائے تو پہاڑوں کی یہی دیو پیکر چٹانیں روئی کے گالوں کی طرح ٹوٹ کر اور اڑ کر سرنگوں ہو جاتی اور خدائے تعالیٰ کے خوف و خشیت کا زبان حال سے اقرار کرتی نظر آتی ہیں مگر ان میں بنی اسرائیل پر نہ آیات اللہ کا اثر ہوتا ہے نہ پیغمبر کی شیریں اور دل نشیں پند و نصائح کا اور نہ نافرمانی کرتے وقت خدا کا خوف ان کے دلوں پر طاری ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قارون:

بنی اسرائیل میں ایک بہت بڑا متمول شخص تھا، قرآن عزیز نے اس کا نام قارون بتایا ہے، اس کے خزانے زر و جواہر سے پُر تھے، اور قوی ہیکل مزدوروں کی جماعت بمشکل اس کے خزانوں کی کنجیاں اٹھا سکتی تھی، اس تمول اور سرمایہ داری نے اس کو بے حد مغرور بنا دیا تھا اور وہ دولت کے نشہ میں اس قدر چور تھا کہ اپنے عزیزوں، قرابت داروں اور قوم کے افراد کو حقیر اور ذلیل سمجھتا اور ان سے حقارت کے ساتھ پیش آتا تھا۔

مفسرین کہتے ہیں کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد بھائی تھا اور اس کا نسب اس طرح نقل فرماتے ہیں:

قارون بن یصہر بن قاہت۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسب یہ ہے: موسیٰ بن عمران بن قاہت۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی منقول ہے۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ قارون قیام مصر کے زمانہ میں فرعون کا درباری ملازم رہا تھا اور دولت کا یہ بے انتہا انبار اس نے وہیں جمع کیا تھا، اور سامری منافق تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین میں اعتقاد نہیں رکھتا تھا۔ [1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم نے ایک مرتبہ اس کو نصیحت کی کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو بے شمار دولت و ثروت بخشی ہے اور عزت وحشمت عطاء فرمائی ہے لہٰذا اس کا شکر ادا کر اور مالی حقوق "زکوٰۃ وصدقات" دے کر غرباء، فقراء اور مساکین کی مدد کر، خدا کو بھول جانا اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنا اخلاق وشرافت دونوں لحاظ سے سخت ناشکری اور سرکشی ہے، اس کی دی ہوئی عزت کا صلہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ تو کمزوروں اور ضعیفوں کو حقیر و ذلیل سمجھنے لگے اور نخوت و پندار میں غریبوں اور عزیزوں کے ساتھ نفرت سے پیش آئے۔

قارون کے جذبہ انانیت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ نصیحت پسند نہ آئی اور اس نے مغرورانہ انداز میں کہا: موسیٰ علیہ السلام! میری یہ دولت و ثروت تیرے خدا کی عطاء کردہ نہیں ہے، یہ تو میرے عقلی تجربوں اور علمی کاوشوں کا نتیجہ ہے ﴿إِنَّمَآ أُوتِيتُهُۥ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِىٓ﴾ میں تیری نصیحت مان کر اپنی دولت کو اس طرح برباد نہیں کر سکتا۔

مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام برابر اپنے فرض تبلیغ کو انجام دیتے اور قارون کو راہ ہدایت دکھاتے رہے، قارون نے جب یہ دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتے تو ان کو زچ کرنے اور اپنی دولت وحشمت کے مظاہرہ سے مرعوب کرنے کے لیے ایک دن بڑے کروفر کے ساتھ نکلا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے مجمع میں پیغام الٰہی سنا رہے تھے کہ قارون ایک بڑی جماعت اور خاص شان وشوکت اور خزانوں کی نمائش کے ساتھ سامنے سے گزرا اشارہ یہ تھا کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا تو میں بھی ایک کثیر جتھ رکھتا ہوں اور زرو جواہر کا بھی مالک ہوں لہٰذا ان دونوں ہتھیاروں کے ذریعہ موسیٰ علیہ السلام کو شکست دے کر رہوں گا۔

بنی اسرائیل نے جب قارون کی اس دنیوی ثروت وعظمت کو دیکھا تو ان میں سے کچھ آدمیوں کے دلوں میں انسانی کمزوری نے یہ جذبہ پیدا کیا کہ وہ بے چین ہو کر یہ دعا کرنے لگے: "اے کاش یہ دولت و ثروت اور عظمت وشوکت ہم کو بھی نصیب ہوتی" مگر بنی اسرائیل کے ارباب بصیرت نے فوراً مداخلت کی اور ان سے کہنے لگے "خبردار! اس دنیوی زیب وزینت پر نہ جانا اور اس کے لالچ میں گرفتار نہ ہو بیٹھنا، تم عنقریب دیکھو گے کہ اس دولت و ثروت کا انجام بد کیسا ہونے والا ہے"؟

آخر کار جب قارون نے کبر ونخوت کے خوب خوب مظاہرے کر لیے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے مسلمانوں کی تحقیر وتذلیل میں کافی سے زیادہ زور صرف کر لیا تو اب غیرت حق حرکت میں آئی اور پاداش عمل کے فطری قانون نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور قارون اور اس کی دولت پر خدا کا یہ اٹل فیصلہ ناطق کر دیا ﴿فَخَسَفْنَا بِهِۦ وَبِدَارِهِ ٱلْأَرْضَ﴾ "ہم نے قارون اور اس کے سرمایہ کدہ کو زمین کے اندر دھنسا دیا" اور بنی اسرائیل کے آنکھوں دیکھتے نہ غرور باقی رہا اور نہ سامان غرور سب کو زمین نے نگل کر عبرت کا سامان مہیا کر دیا، قرآن عزیز نے متعدد مقامات پر اس واقعہ کو مفصل اور مجمل بیان کیا ہے۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱ ص ۳۰۹

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۙ۝ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ قَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝﴾ (المؤمن: ۲۳۔۲۴)

"اور بے شبہ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیاں اور ظاہر و زبردست حجت (تورات) دے کر فرعون، ہامان اور قارون کے پاس بھیجا تھا پس ان سب نے یہ کہا کہ یہ تو جادوگر ہے بڑا جھوٹا۔"

﴿وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَ مَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ۝ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝﴾

(العنکبوت: ۳۹۔۴۰)

"اور بلا شبہ ان کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) کھلی نشانیاں لے کر آیا پھر انہوں نے زمین میں کبر و غرور اختیار کیا، اور وہ ہم سے جیت جانے والے نہیں تھے، پھر سب کو پکڑا ہم نے اپنے اپنے گناہ پر، پھر کسی پر ہم نے ہوا سے پتھراؤ کیا، اور کسی کو چیخ نے آ دبایا، اور کسی کو زمین میں دھنسا دیا، اور کسی کو ہم نے غرق کر دیا، اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود آپ اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے۔"

قارون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق صحیح حالات صرف اسی قدر ہیں، باقی روایات "اسرائیلیات" سے ماخوذ ہیں، اس لیے نا قابل اعتماد ہیں، اسی لیے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

و قد ذکر ھٰھنا اسرائیلیات اضربنا عنها صفحًا. (ابن کثیر سورہ القصص)

"اور اس مقام پر بہت سی اسرائیلیات بیان کی گئی ہیں ہم نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔"

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ﴿ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ﴾ میں علم سے مراد علم کیمیاء ہے اور وہ قارون کی دولت کو اس کی کیمیاء دانی کا رہین منت بتاتے ہیں، محققین نے اس کی تردید فرمائی ہے، اور یہ واضح کیا ہے کہ اس کا مقصد "علم" سے اپنی عقل و دانش کے ذریعہ حصول مال ہے اور کیمیا کی باتیں سب دور از کار ہیں۔

علماء تفسیر اس میں متردد ہیں کہ قارون کا واقعہ کب پیش آیا؟ مصر میں قبل غرق فرعون یا "تیہ" میں بعد غرق فرعون، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر قبل غرق کا ہے تو آیت میں "دار" اپنے حقیقی معنی میں ہے اور اگر میدان تیہ کا واقعہ ہے تو "دار" سے خیمہ و خرگاہ مراد ہے، ہمارے نزدیک یہ واقعہ میدان تیہ کا ہے اس لیے کہ قرآن عزیز نے اس کو غرق فرعون سے متعلق واقعات کے بعد بیان کیا ہے:

﴿اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۪ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ۗ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ۝ وَ ابْتَغِ فِيْمَاۤ اٰتٰىكَ

اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَ لَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا وَ اَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ وَ لَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۷۷﴾ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ ؕ اَوَ لَمْ یَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَ لَا یُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۷۸﴾ فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ﴿۷۹﴾ وَ قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ۚ وَ لَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ ۫ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ یَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِیْنَ ﴿۸۱﴾ وَ اَصْبَحَ الَّذِیْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ یَقُوْلُوْنَ وَیْكَاَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ یَقْدِرُ ۚ لَوْ لَاۤ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَیْكَاَنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۸۳﴾ (القصص : ۷۶-۸۳)

"بیشک قارون، موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم ہی میں سے تھا، پس اس نے ان پر سرکشی کی اور ہم نے اس کو اس قدر خزانے دیئے تھے کہ اس کی کنجیوں کے بوجھ سے طاقتور آدمی تھک جاتے تھے جب اس کی قوم نے کہا تو شیخی نہ مار اللہ شیخی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے اور جو کچھ تجھ کو خدا نے دیا ہے اس میں آخرت کو تلاش کر، اس کو نہ بھول کہ دنیا میں اس نے تجھ کو کیا کچھ دے رکھا ہے، اور جس طرح خدا نے تیرے ساتھ بھلائی کی ہے تو بھی اسی طرح بھلائی کر، اور فساد کے درپے نہ ہو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ قارون کہنے لگا یہ مال تو مجھ کو میرے ایک ہنر سے ملا ہے جو مجھ کو آتا ہے، کیا وہ اس سے بے خبر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے اس سے کہیں زیادہ مال دار اور طاقتور قوموں کو ہلاک کر دیا۔ اور نہ سوال کیا جائے مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارہ میں (یعنی ان کی عقلیں ماری گئی ہیں تب ہی تو گناہ میں مبتلا ہیں پھر سوال سے کیا فائدہ) پھر نکلا ایک دن قوم کے سامنے بن سنور کر خدم وحشم کے ساتھ تو جو لوگ دنیا کے طالب تھے انہوں نے اس کو دیکھ کر کہا "اے کاش ہمیں بھی یہ سب کچھ ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے بلاشبہ یہ بڑے نصیب والا ہے، اور جن لوگوں کو اللہ نے بصیرت وعلم عطاء کیا تھا انہوں نے کہا تمہیں ہلاکی ہو جو اللہ پر ایمان لایا اور نیک عمل کیے اس کے لیے اللہ کا ثواب اس دولت سے بہتر ہے اور اس کو نہیں پاتے مگر صبر کرنے والے، پھر ہم نے قارون اور اس کے محل کو زمین میں دھنسا دیا، پس اس کے لیے کوئی جماعت مددگار ثابت نہیں ہوئی، جو خدا کے عذاب سے اس کو بچائے اور وہ بے یار و مددگار ہی رہ گیا اور جنھوں نے کل اس کی شان و شوکت دیکھ کر اس جیسا ہو جانے کی تمنا کی تھی وہ یہ دیکھ کر آج یہ کہنے لگے ارے خرابی یہ تو اللہ تعالیٰ کھول دیتا ہے روزی جس کو چاہے اپنے بندوں میں اور تنگ کر دیتا ہے، اگر احسان نہ کرتا اللہ ہم پر تو ہم کو بھی دھنسا دیتا ارے خرابی یہ تو چھٹکارا نہیں پاتے منکر یہ آخرت کا گھر ہم نے ان لوگوں کے لیے بنایا ہے جو (خدا کی) زمین میں شیخی نہیں مارتے اور نہ

فساد کے خواہش مند ہوتے ہیں اور انجام کی بھلائی متقیوں کے لیے ہے۔"

تورات نے بھی اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے،[1] مگر اس کے بیان اور قرآن عزیز کی تصریحات کو پڑھنے کے بعد ایک انصاف پسند انسان کو یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قرآن عزیز جب کسی تاریخی واقعہ کو نقل کرتا ہے تو اس کے صرف ان ہی اجزاء کو بیان کرتا ہے جو غرض اور مقصد "نصیحت و عبرت" کے لیے ضروری ہوں اور زائد از حاجت تفصیلات کو نظر انداز کرتا جاتا ہے لیکن تورات میں اکثر بے ضرورت تفاصیل بیان ہوتی ہیں اور بعض جگہ تو بے محل طوالت بلکہ تضاد بیان تک پایا جاتا ہے جن کو ہم حسب موقعہ بیان کرتے جاتے ہیں چنانچہ اس مقام پر بھی بعض غیر ضروری حصوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ایذاء بنی اسرائیل:

گذشتہ واقعات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قول اور عمل دونوں طریقوں سے سخت اذیتیں پہنچائیں حتیٰ کہ بہتان طرازی اور تہمت تراشی سے بھی باز نہیں رہے۔

بت پرستی کی فرمائش، گوسالہ پرستی میں انہماک، قبول تورات سے انکار، ارض مقدس میں داخلہ سے انکار، من و سلویٰ پر ناسپاسی، غرض ہر ادائے فرض میں ضد اور ہٹ اور ہر ایک معاملہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جاہلانہ رَدّ و کد کا ایک طویل سلسلہ ہے جو ان کی زندگی کا جز نظر آتا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ضبط و صبر کے ساتھ ایک اولوالعزم رسول کی طرح ان کو برداشت کرتے اور رشد و ہدایت کے پیغام میں منہمک نظر آتے ہیں۔

قرآن عزیز کی تصریحات کے علاوہ تاریخی حیثیت سے اگر بنی اسرائیل کی ان خصوصیات کا مطالعہ مقصود ہو تو تورات کے حسب ذیل ابواب قابل مراجعت ہیں:

خروج باب ۱۲ آیات ۱۲۔۱۱، باب ۱۶ آیات ۳۔۲، گنتی باب ۱۴۔ آیات ۳۔۱، باب ۱۶ آیات ۱۴۔۱۳، باب ۷ آیات ۱۳۔۱۲۔ استثناء باب ۹ آیات ۲۴۔۲۳۔

لیکن قرآن عزیز نے ان واقعات کے علاوہ جن کا ذکر صفحات گذشتہ میں تفصیل سے آچکا ہے، سورۂ احزاب اور سورۂ صف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کی ایذاء رسانی پر مذمت کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ۞﴾ (الاحزاب: ۶۹)

﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ؕ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۞﴾ (الصف: ۵)

"اے ایمان والو! تم ان بنی اسرائیل کی طرح نہ بنو جنہوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو ایذاء پہنچائی، پھر اللہ نے ان کو اس بات

[1] تورات گنتی باب ۱۶ آیات ۳۴۔۳۰

سے بری کر دیا جو وہ اس کے متعلق کہتے تھے اور موسیٰ اللہ کے نزدیک صاحب وجاہت ہے۔ اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا اے قوم! تو کس لیے مجھ کو ایذاء پہنچاتی ہے جبکہ تجھ کو یہ معلوم ہے کہ میں تمہاری جانب خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں، پھر جب وہ کجی پر اڑ بیٹھے تو اللہ نے بھی ان کے دلوں پر کجی کو مسلط کر دیا۔ اور اللہ نافرمان قوم کو راہ یاب نہیں کیا کرتا۔"

اس لیے علماء تفسیر نے ان ہر دو مقام پر بحث کی ہے کہ یہاں جس ایذاء کا تذکرہ کیا گیا ہے کیا اس سے وہی حالات مراد ہیں جو بنی اسرائیل کی سرکشی اور تعنت کے سلسلہ میں بیان ہو چکے ہیں اور جن کا پورا سلسلہ یقیناً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اذیت کا باعث تھا، یا ان کے علاوہ کسی اور خاص واقعہ کی جانب اشارہ ہے، چنانچہ بعض مفسرین نے تو یہ فرمایا کہ اس سے وہی ایذاء مراد ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے تعنت اور ضد کی وجہ سے پہنچتی رہی تھی اور بعض مفسرین نے ان ہر دو آیات کا مصداق گذشتہ واقعات سے جدا واقعہ کو بتایا ہے، اور وہ فرماتے ہیں کہ بعض صحیح احادیث میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے درمیان ایسے واقعات کا تذکرہ پایا جاتا ہے جن کا تفصیلی ذکر قرآن عزیز میں موجود نہیں ہے لہٰذا ان کے واقعات میں سے کوئی ایک مخصوص واقعہ یا وہ سب واقعات ان آیات کے مصداق ہیں اور وہی ان کے لیے شان نزول کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان واقعات میں سے ایک واقعہ بخاری اور مسلم میں مذکور ہے اور وہ یہ کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر شرم و حیاء کا بہت غلبہ تھا حتیٰ کہ وہ اپنے برہنہ بدن کے کسی حصہ پر بھی نگاہ نہیں پڑنے دیتے تھے۔ اس کے برعکس بنی اسرائیل مجمع عام میں برہنہ ہو کر غسل کرنے کے عادی تھے، اس لیے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تنگ کرتے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے کبھی کہتے کہ ان کے خاص حصہ جسم پر برص کے داغ ہیں کبھی کہتے کہ ان کو ادرۃ (فوطوں کا متورم ہو کر بڑھ جانا) کا مرض ہے یا کوئی اور اسی قسم کا خراب مرض ہے تب ہی تو چھپ کر علیحدہ نہاتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام سنتے اور خاموش رہتے، آخر اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی ہوئی کہ ان کو اس تہمت سے پاک اور بری کرے، چنانچہ ایک روز وہ علیحدہ آڑ میں نہانے کی تیاری کر رہے تھے، کپڑے اتار کر پتھر پر رکھ دیئے، پتھر خدا کے حکم سے اپنی جگہ سے سرکا اور جہاں مجمع میں بنی اسرائیل برہنہ نہا رہے تھے، وہاں چل کر پہنچ گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام گھبراہٹ اور غصہ میں اس کے پیچھے یہ کہتے ہوئے دوڑے "ثوبی حجر، ثوبی حجر" (اے پتھر! میرے کپڑے، اے پتھر! میرے کپڑے) پتھر جب مجمع کے سامنے ٹھہر گیا تو سب نے دیکھ لیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بیان کردہ ہر قسم کے عیب سے پاک و صاف ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اس اچانک واقعہ کا ایسا اثر پڑا کہ غصہ میں جھنجھلا کر پتھر پر لاٹھی کے چند وار کر دیئے جس سے اس پر نشان پڑ گئے۔

• بخاری اور مسلم نے اس کو متعدد طریقوں سے روایت کیا ہے، ان میں سے ایک طریقہ میں اس واقعہ کو سورۂ احزاب کی اس آیت کا شان نزول قرار دیا ہے جس میں بنی اسرائیل کی ایذاء اور خدائے تعالیٰ کی جانب سے موسیٰ علیہ السلام کی براءت کا ذکر ہے۔

اور اسی آیت کے شان نزول میں ابن ابی حاتم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت نقل کی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام پہاڑ (ہور) پر گئے مگر حضرت ہارون علیہ السلام کا وہیں انتقال ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام تنہا واپس ہوئے۔ بنی اسرائیل نے یہ دیکھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تہمت رکھی کہ اس نے ہارون علیہ السلام کو قتل کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس تہمت سے بہت دکھ پہنچا تب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ ہارون علیہ السلام کی نعش کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کریں۔

فرشتوں نے فضاء میں حضرت ہارون علیہ السلام کی نعش بنی اسرائیل کے مجمع میں پیش کی، اور انہوں نے یہ دیکھ کر اطمینان حاصل کیا کہ واقعی ہارون علیہ السلام پر قتل کا کوئی نشان نہیں ہے۔

تیسری روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور سدی سے کتب تفاسیر میں منقول ہے کہ جب قارون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت بہت ناگوار گذرنے لگی تو ایک دن اس نے ایک پیشہ ور عورت کو کچھ روپے دے کر اس پر آمادہ کر لیا کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پند و نصیحت میں مصروف ہوں اس وقت تو ان پر الزام لگانا کہ یہ شخص مجھ سے تعلق رکھتا ہے، چنانچہ دوسرے دن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام وعظ فرما رہے تھے تو اس عورت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر الزام لگایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ سن کر سجدہ میں گر پڑے اور پھر سر اٹھا کر عورت کی جانب مخاطب ہوئے کہ تو نے جو کچھ ابھی کہا تھا کیا خدا کی قسم کھا کر کہہ سکتی ہے کہ یہ سچ ہے؟ یہ سن کر عورت پر رعشہ طاری ہو گیا اور اس نے کہا بخدا سچ بات یہ ہے کہ قارون نے مجھ کو روپیہ دے کر اس الزام پر آمادہ کیا تھا ورنہ تو آپ اس سے بری اور پاک ہیں، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قارون کے لیے بد دعا کی اور وہ خدا کے حکم سے مع ساز و سامان زمین میں دھنسا دیا گیا۔

محاکمہ:

اس بحث میں صحیح مسلک یہ ہے کہ جب قرآن عزیز نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متعلق ایذاء کے واقعہ کو مجمل بیان کیا ہے اور اس کی کوئی تعیین نہیں کی تو ہمارے لیے بھی یہی مناسب ہے کہ اس کی تفصیل اور تعیین کیے بغیر، نفس واقعہ پر ایمان لائیں اور کسی خاص واقعہ سے متعلق نہ کریں اور جس حکمت و مصلحت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس کو مجمل رکھنا مناسب سمجھا، ہم بھی اسی پر اکتفاء کریں۔ اور اگر تفصیل اور تعیین کی جانب توجہ دینا ضروری ہے تو پھر یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ان ہر دو آیات کا مصداق وہ تمام واقعات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایذاء رسانی سے متعلق قرآن عزیز اور صحیح احادیث میں منقول ہیں، اور اس امر کا لحاظ کرتے ہوئے کہ زیر بحث ایذاء کا معاملہ اس نوعیت کا ہے کہ جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وجاہت پر اثر پڑتا تھا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے اس کا دفاع کر کے ان کے قولی ہفوات سے ان کو بری اور پاک ثابت کر دیا تو ان ہر دو آیات کے مصداق کی تعیین میں وہ تینوں روایات قابل ترجیح ہیں جو کتب احادیث سے نقل کی جا چکی ہیں، اور وہ سب ان آیات کا مصداق ہیں۔

رہا یہ امر کہ شان نزول کے لیے کسی ایک واقعہ کا مخصوص ہونا ضروری ہے تو بقول حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ یہ درست نہیں ہے بلکہ شان نزول کی اصل حقیقت یہ ہے کہ زمانہ نبوت میں پیش آنے والے وہ تمام واقعات جو کسی آیت کا مصداق بن سکتے ہوں۔ اس آیت کے لیے یکساں طور پر شان نزول کہے جا سکتے ہیں۔

اس مقام کی تفسیر میں نجار نے قصص الانبیاء میں ایک طویل بحث کی ہے اور ان کے درمیان اور مصر کی مجلس علماء کے درمیان جو بحث و تمحیص ہوئی ہے اس کو بھی نقل کیا ہے مگر ہم چونکہ دونوں خیالات کے پوری طرح ہم نوا نہیں ہیں اور مفسرین قدیم میں ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اور ابن حیان کے رجحانات کے مؤید ہیں اس لیے اس بحث کو نظر انداز کرتے ہیں۔

حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات:

گذشتہ واقعات میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے ارض مقدس میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا تو اللہ

تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ ان کو یہ اطلاع کر دی تھی کہ چالیس سال تک اب تم کو اسی سرزمین میں بھٹکنا پڑے گا اور سرزمین مقدس میں ان افراد میں سے کوئی بھی داخل نہ ہو سکے گا، جنہوں نے داخل ہونے سے اس وقت انکار کر دیا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ان کو یہ بھی بتایا کہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام بھی تمہارے پاس ہی رہیں گے کیونکہ ان کی اور آنے والی نسل کی رشد و ہدایت کے لیے ان دونوں کا یہاں موجود رہنا ضروری ہے، چنانچہ جب بنی اسرائیل "تیہ" کے میدان میں گھومتے اور پھرتے پھراتے پہاڑ کی اس چوٹی کے قریب پہنچے جو "ہور" کے نام سے مشہور تھی تو حضرت ہارون علیہ السلام کو پیغام اجل آ پہنچا وہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا کے حکم سے "ہور" پر چڑھ گئے اور وہیں کچھ روز عبادت الٰہی میں مصروف رہے اور جب حضرت ہارون علیہ السلام کا وہاں انتقال ہو گیا تب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی تجہیز و تکفین کے بعد نیچے اترے اور بنی اسرائیل کو ہارون علیہ السلام کی وفات سے مطلع کیا۔ تورات میں اس واقعہ کو اس طرح ادا کیا ہے:

"اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت قادس سے روانہ ہو کر کوہ ہور پہنچی اور خداوند نے کوہ ہور پر ادوم کی سرحد سے ملا ہوا تھا، موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے کہا ہارون اپنے لوگوں میں جا ملے گا کیونکہ وہ اس ملک میں جو میں نے بنی اسرائیل کو دیا ہے جانے نہیں پائے گا اس لیے کہ مریبہ کے چشمہ پر تم نے میرے کلام کے خلاف عمل کیا لہٰذا تو ہارون اور اس کے بیٹے الیعزر کو اپنے ساتھ لے کر کوہ ہور کے اوپر آ جا اور ہارون کے لباس کو اتار کر اس کے بیٹے الیعزر کو پہنا دینا کیونکہ ہارون وہیں وفات پا کر اپنے لوگوں میں جا ملے گا۔ اور موسیٰ (علیہ السلام) نے خداوند کے حکم کے مطابق عمل کیا اور ساری جماعت کی آنکھوں کے سامنے کوہ ہور پر چڑھ گئے اور موسیٰ (علیہ السلام) نے ہارون (علیہ السلام) کے لباس کو اتارا اس کے بیٹے الیعزر کو پہنا دیا اور ہارون نے وہیں پہاڑ کی چوٹی پر رحلت کی تب موسیٰ اور الیعزر پہاڑ پر سے اتر آئے جب جماعت نے دیکھا کہ ہارون نے وفات پائی تو اسرائیل کے سارے گھرانے کے لوگ ہارون (علیہ السلام) پر تیس دن تک ماتم کرتے رہے۔" [1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات زندگی میں ایک اہم واقعہ اس ملاقات کا ہے جو ان کے اور ایک صاحب باطن کے درمیان ہوئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے عالم تکوینیات کے بعض رموز و اسرار معلوم کیے۔ اس ملاقات کا ذکر تفصیل کے ساتھ سورۂ کہف میں کیا گیا ہے، اور بخاری میں اس واقعہ سے متعلق بعض مزید تفصیلات مذکور ہیں، بخاری میں سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کیا کہ نوف بکالی کہتا ہے کہ موسیٰ صاحب خضر، موسیٰ صاحب بنی اسرائیل نہیں ہیں، یہ ایک دوسرے موسیٰ ہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "دشمن خدا جھوٹ کہتا ہے" مجھ سے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ ارشاد فرماتے تھے کہ ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو خطاب فرما رہے تھے کہ کسی شخص نے دریافت کیا، اس زمانہ میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا مجھے خدا نے سب سے زیادہ علم عطا فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ بات پسند نہ آئی اور ان پر عتاب ہوا کہ تمہارا منصب تو یہ تھا کہ اس کو علم الٰہی کے سپرد کرتے اور

---

[1] گنتی باب ۲۰ آیات ۲۲۔۲۹

کہتے "واللہ اعلم" اور پھر وحی نازل فرمائی کہ جہاں دو سمندر ملتے ہیں (مجمع البحرین) وہاں ہمارا ایک بندہ ہے جو بعض امور میں تجھ سے بھی زیادہ عالم ودانا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا "پروردگار! تیرے اس بندے تک رسائی کا کیا طریقہ ہے" اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مچھلی کو اپنے توشہ دان میں رکھ لو، پس جس مقام پر وہ مچھلی گم ہو جائے اسی جگہ وہ شخص ملے گا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مچھلی کو توشہ دان میں رکھا اور اپنے خلیفہ یوشع بن نون کو ساتھ لے کر "مرد صالح" کی تلاش میں روانہ ہوگئے، جب چلتے چلتے ایک مقام پر پہنچے تو دونوں ایک پتھر پر سر رکھ کر سو گئے مچھلی میں زندگی پیدا ہوئی اور وہ زنبیل سے نکل کر سمندر میں چلی گئی مچھلی پانی کے جس حصہ میں بہتی ہوئی گئی اور جہاں تک گئی وہاں تک پانی برف کی طرح جم کر ایک چھوٹی سی پگڈنڈی کی طرح ہو گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمندر میں ایک لکیر یا خط کھنچا ہوا ہے۔

یہ واقعہ یوشع نے دیکھ لیا تھا کیوں کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے بیدار ہو گئے تھے مگر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے تو ان سے ذکر کرنا بھول گئے اور پھر دونوں نے اپنا سفر شروع کر دیا اور اس دن اور رات میں آگے ہی بڑھتے گئے، جب دوسرا دن ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اب تھکان زیادہ محسوس ہونے لگا وہ مچھلی لاؤ تاکہ بھوک رفع کریں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی منزل مقصود تک پہنچنے میں کوئی تھکان نہیں ہوا تھا مگر منزل سے آگے غلطی سے نکل گئے تو اب تھکان بھی محسوس ہونے لگا" یوشع نے کہا، آپ کو معلوم رہے کہ جب ہم (صخرہ) پتھر کی چٹان پر تھے تو وہیں مچھلی کا یہ تعجب خیز واقعہ پیش آیا کہ اس میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ مکتل (زنبیل) میں سے نکل کر سمندر میں چلی گئی اور اس کی رفتار پر سمندر میں راستہ بنتا چلا گیا، میں آپ سے یہ واقعہ کہنا بالکل بھول گیا، یہ بھی شیطان کا ایک چرکا تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سمندر کا وہ خط مچھلی کے لیے "سرب" (راستہ) تھا، اور موسیٰ علیہ السلام ویوشع کے لیے "عجب" (تعجب خیز بات)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جس مقام کی ہم کو تلاش ہے وہ وہی مقام تھا اور یہ کہہ کر دونوں پھر ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہوئے اسی راہ پر لوٹے اور اس "صخرہ" (پتھر کی چٹان) تک جا پہنچے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اس جگہ عمدہ لباس پہنے ہوئے ایک شخص بیٹھا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو سلام کیا، اس شخص نے کہا کہ تمہاری اس سرزمین میں "سلام" کہاں؟ (یعنی اس سرزمین میں تو مسلمان نہیں رہتے) یہ خضر تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ میرا نام موسیٰ ہے۔

خضر علیہ السلام نے کہا: موسیٰ بنی اسرائیل؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہاں! میں تم سے وہ علم حاصل کرنے آیا ہوں جو خدا نے تم ہی کو بخشا ہے خضر علیہ السلام نے کہا: "تم میرے ساتھ رہ کر ان معاملات پر صبر نہ کر سکو گے، موسیٰ! خدائے تعالیٰ نے مجھ کو تکوینی رموز و اسرار کا وہ علم عطاء کیا ہے جو تم کو نہیں دیا گیا اور اس نے تم کو (تشریعی علوم کا) وہ علم عطاء فرمایا ہے جو مجھ کو عطاء نہیں ہوا" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "انشاء اللہ آپ مجھ کو صابر وضابط پائیں گے اور میں آپ کے ارشاد کی قطعاً خلاف ورزی نہیں کروں گا؟" حضرت خضر نے کہا: "تو پھر شرط یہ ہے کہ جب آپ میرے ساتھ رہیں تو کسی معاملہ کے متعلق بھی جس کو آپ کی نگاہیں دیکھ رہی ہوں مجھ سے کوئی سوال نہ کریں، میں خود آپ کو ان کی حقیقت بتا دوں گا" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے منظور کر لیا، اور دونوں ایک جانب کو روانہ ہو گئے، جب سمندر کے کنارے پہنچے تو سامنے سے ایک کشتی نظر آئی حضرت خضر علیہ السلام نے ملاحوں سے کرایہ پوچھا، وہ خضر علیہ السلام کو پہچانتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے کرایہ لینے سے انکار کر دیا اور اصرار کر کے دونوں کو کشتی پر سوار کر لیا اور کشتی روانہ ہو گئی، ابھی چلے ہوئے زیادہ

عرصہ نہیں ہوا تھا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کے سامنے والے حصہ کا ایک تختہ اکھاڑ کر کشتی میں سوراخ کر دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ضبط نہ ہو سکا، خضر علیہ السلام سے کہنے لگے کہ کشتی والوں نے تو یہ احسان کیا کہ آپ کو اور مجھ کو مفت سوار کر لیا اور آپ نے اس کا یہ بدلہ دیا کہ کشتی میں سوراخ کر دیا کہ سب کشتی والے کشتی سمیت ڈوب جائیں، یہ تو بہت نازیبا بات ہوئی؟ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میری باتوں پر صبر نہ کر سکیں گے؟ آخر وہی ہوا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ "مجھے وہ بات بالکل فراموش ہو گئی، اس لیے آپ بھول چوک پر مؤاخذہ نہ کریں اور میرے معاملہ میں سخت گیری سے کام نہ لیں" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "یہ پہلا سوال واقعی موسیٰ علیہ السلام کی بھول کی وجہ سے تھا" اسی اثناء میں ایک چڑیا کشتی کے کنارے آ کر بیٹھی اور پانی میں چونچ ڈال کر ایک قطرہ پانی پی لیا، حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ بلاشائبہ تشبیہ علم الٰہی کے مقابلہ میں میرا اور تمہارا علم ایسا ہی بے حقیقت ہے جیسا کہ سمندر کے سامنے یہ قطرہ۔

کشتی کنارے لگی اور دونوں اتر کر ایک جانب روانہ ہو گئے، سمندر کے کنارے ہی کنارے جا رہے تھے کہ ایک میدان میں کچھ بچے کھیل رہے تھے، حضرت خضر علیہ السلام آگے بڑھے اور ان میں سے ایک بچہ کو قتل کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پھر یارائے صبر نہ رہا۔ فرمانے لگے "ناحق ایک معصوم جان کو آپ نے مار ڈالا، یہ تو بہت ہی برا کیا؟ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: میں تو شروع ہی میں کہہ چکا تھا کہ آپ میرے ساتھ رہ کر صبر و ضبط سے کام نہ لے سکیں گے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "چونکہ یہ بات پہلی بات سے بھی زیادہ سخت تھی اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام صبر و ضبط نہ کرنے میں معذور تھے" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "خیر اس مرتبہ اور نظر انداز کر دیجیے، اس کے بعد بھی اگر مجھ سے صبر نہ ہو سکا تو پھر عذر کا کوئی موقع نہیں رہے گا، اور اس کے بعد آپ مجھ سے علیحدہ ہو جائیے گا،

غرض پھر دونوں روانہ ہو گئے، اور چلتے چلتے ایک ایسی بستی میں پہنچے جہاں کے باشندے خوش عیش اور مہمان داری کے ہر طرح قابل تھے، مگر دونوں کو مسافرانہ درخواست پر بھی ان کو مہمان بنانے سے انکار کر دیا تھا، یہ ابھی بستی ہی میں سے گزر رہے تھے کہ خضر علیہ السلام ایک ایسے مکان کی جانب بڑھے جس کی دیوار کچھ جھکی ہوئی تھی اور اس کے گر جانے کا اندیشہ تھا، حضرت خضر علیہ السلام نے اس کو ہاتھ کا سہارا دیا اور دیوار کو سیدھا کر دیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر خضر علیہ السلام کو ٹوکا اور فرمانے لگے کہ "ہم اس بستی میں مسافرانہ وارد ہوئے، مگر اس کے بسنے والوں نے نہ مہمان داری کی اور نہ ٹکنے کو جگہ دی، آپ نے یہ کیا کیا کہ اس کے ایک باشندے کی دیوار کو بغیر اجرت درست کر دیا، اگر کرنا ہی تھا تو بھوک پیاس کو دور کرنے کے لیے کچھ اُجرت ہی طے کر لیتے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا اب میری اور تمہاری جدائی کا وقت آ گیا ﴿هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَ بَيْنِكَ﴾ اور پھر انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان تینوں معاملات کے حقائق کو سمجھایا اور بتایا کہ یہ سب منجانب اللہ وہ باتیں تھیں جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔

یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہمارا جی تو یہ چاہتا تھا کہ موسیٰ تھوڑا صبر اور کرتے اور ہم کو اللہ تعالیٰ کے اسرار اور تکوینی علوم کی مزید معلومات ہو سکتیں۔"

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی مفارقت ہونے لگی تو خضر علیہ السلام نے ان واقعات کی جو حقیقت بیان کی قرآن عزیز نے سورۂ کہف میں اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے اس طرح ظاہر کیا ہے:

﴿قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَ بَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا۝ اَمَّا السَّفِيْنَةُ

فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ۝ وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَاۤ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۝ فَاَرَدْنَاۤ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ۝ وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَ كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖۗ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ؕ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝

(الکھف : ۷۸۔۸۲)

"پس اب مجھ میں اور تم میں جدائی کا وقت آ گیا، ہاں جن باتوں پر تم سے صبر نہ ہو سکا، ان کی حقیقت تمہیں بتلائے دیتا ہوں۔ سب سے پہلے کشتی کا معاملہ لو، وہ چند مسکینوں کی تھی جو سمندر میں محنت مزدوری کرتے ہیں، وہ جس طرف بڑھ رہے تھے، وہاں ایک بادشاہ ہے (ظالم) جس کسی کی (اچھی) کشتی پاتا ہے زبردستی لے لیتا ہے، میں نے چاہا اس کی کشتی میں عیب نکال دوں (تا کہ عیبی سمجھ کر اس کو چھوڑ دے) رہا لڑکے کا معاملہ، تو اس کے ماں باپ مومن ہیں۔ میں یہ دیکھ کر ڈرا کہ یہ انہیں سرکشی اور کفر کر کے اذیت پہنچائے گا، بس میں نے چاہا کہ ان کا پروردگار اس لڑکے سے بہتر انہیں لڑکا دے گا، دینداری میں بھی اور محبت میں بھی، اور وہ جو دیوار درست کر دی گئی تو وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی ہے جس کے نیچے ان کا خزانہ گڑا ہوا ہے، ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا، پس تمہارے پروردگار نے چاہا دونوں لڑکے اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ محفوظ پا کر نکال لیں، یہ ان لڑکوں کے حال پر پروردگار کی ایک مہربانی تھی جو اس طرح ظہور میں آئی، اور یاد رکھو میں نے جو کچھ کیا اپنے اختیار سے نہیں کیا (اللہ کے حکم سے کیا) یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے۔"

قرآن عزیز نے اس واقعہ کے شروع میں خضر علیہ السلام کے اس "علم" کے متعلق کہا ہے ﴿وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ "اور ہم نے اس کو اپنے پاس سے علم عطا کیا" اور قصہ کے آخر میں خضر علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا ﴿وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ؕ﴾ "میں نے اس سلسلہ واقعات کو اپنی جانب سے نہیں کیا" تو ان دونوں جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خضر علیہ السلام کو بعض اشیاء کے حقائق کا وہ علم عطا فرمایا تھا جو تکوینی رموز و اسرار اور باطنی حقائق سے متعلق ہے، اور یہ ایک ایسا مظاہرہ تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے اہل حق پر یہ واضح کر دیا کہ اگر عالم ہست و بود کے تمام حقائق سے اسی طرح پردہ اٹھا دیا جائے جس طرح بعض حقائق کو خضر علیہ السلام کے لیے بے نقاب کر دیا گیا تھا تو اس عالم کے تمام احکام ہی بدل جائیں اور عمل کی آزمائشوں کا یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جائے مگر دنیا اعمال کی آزمائش گاہ ہے، اس لیے "تکوینی حقائق" پر پردہ پڑا رہنا ضروری ہے، تا کہ حق و باطل کی پہچان کے لیے جو "ترازو" قدرت الٰہی نے مقرر کر دیا ہے وہ برابر اپنا کام انجام دیتا رہے۔

سورۂ کہف کی ان آیات کے مطالعہ سے یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ اولوالعزم پیغمبر اور جلیل المرتبت رسول تھے اور تشریعی علوم و احکام کی تبلیغ ان کا منصب تھا اس لیے وہ ان تکوینی اسرار کے مظاہرے کو برداشت نہ کر سکے اور باوجود وعدۂ صبر کے تشریعی منکرات کو دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور حضرت خضر علیہ السلام کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مخاطب بناتے رہے

اور آخر کار جدائی کی نوبت آ گئی۔

بخاری کی مسطورۂ بالا حدیث میں سورۂ کہف کے ذکر کردہ واقعات سے چند باتیں زیادہ ہیں جو اصل کی تمہید یا مزید تشریح کے طور پر بیان ہوئی ہیں اور اسی حدیث ہی نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس "عبد صالح" کو خضر کہتے ہیں۔

اس مقام پر چند باتیں قابل بحث ہیں: ① خضر نام ہے یا لقب؟ ② خضر فقط عبد صالح (ولی) ہیں یا نبی یا رسول؟ ③ ان کو حیات ابدی حاصل ہے، یا وفات پا چکے ہیں؟۔

مفسرین کے یہاں ان تینوں سوالات کے جوابات میں بہت سے اقوال منقول ہیں، چنانچہ پہلے سوال کے جواب میں بعض کہتے ہیں کہ خضر نام ہے اور اکثر کا قول ہے کہ یہ لقب ہے، اور پھر نام کے متعلق بھی مختلف اقوال ہیں مثلاً:

① بلیا بن ملکان ② ایلیا بن ملکان ③ خضرون، معمر، الیاس، الیسع وغیرہ۔

دوسرے سوال کے جواب میں بعض کا قول ہے کہ وہ فقط "عبد صالح" تھے اور بعض کہتے ہیں کہ "رسول" تھے، مگر جمہور کا قول یہ ہے کہ نہ وہ رسول تھے اور نہ فقط عبد صالح بلکہ "نبی" تھے۔

اور تیسرے سوال کے جواب میں بعض علماء کا خیال ہے کہ ان کو حیات ابدی حاصل ہے اور وہ اب تک زندہ ہیں اور اس سلسلہ میں کچھ حکایات و روایات بھی بیان کرتے ہیں اور جلیل القدر محققین فرماتے ہیں کہ ان کے لیے حیات ابدی کا ثبوت نہ قرآن سے ثابت ہے، اور نہ احادیث سے لہٰذا وہ بھی انسانی دنیا کی طرح اپنی طبعی موت سے وفات پا چکے ہیں۔

قول فیصل:

ان ہر سہ مسائل میں قول فیصل یہ ہے کہ پہلی بات کے متعلق قرآن عزیز میں کوئی تذکرہ نہیں نہ حضرت خضر علیہ السلام کا نام مذکور ہے اور نہ لقب بلکہ ﴿عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ﴾ کہہ کر ان کا واقعہ نقل کیا ہے، البتہ بخاری و مسلم کی صحیح احادیث میں خضر کہہ کر ان کا ذکر کیا گیا ہے، پس اگر تاریخی روایات سے ہم ان کے نام اور لقب کا پتہ لگا سکتے تو بآسانی یہ کہہ سکتے کہ فلاں نام ہے اور فلاں لقب، مگر اس بارے میں تاریخی اقوال اس درجہ مضطرب ہیں کہ ان سے کسی نتیجہ پر پہنچنا ناممکن ہے، لہٰذا ہمارے سامنے ان کی شخصیت کا تعارف صرف اسی قدر ہوتا ہے کہ ان کو خضر کہا جاتا ہے اور یہ کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاصر ہیں، اس سے زیادہ ان کے نام یا لقب یا نسب کی تمام بحثیں بے دلیل، محض تخمینی اقوال کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اور دوسری بات کے متعلق راجح قول یہ ہے کہ وہ "نبی" تھے اس لیے کہ قرآن عزیز نے جس انداز میں ان کے شرف کا ذکر کیا ہے وہ مقام نبوت ہی پر صادق آتا ہے اور مقام ولایت اس سے بہت فروتر ہے، مثلاً جب خضر علیہ السلام نے لڑکے کے قتل کی وجہ بیان کی تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:

﴿رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ﴾ (الکہف:۸۲)

"یہ میں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا، تیرے رب کی رحمت کی بدولت ہوا"۔

ظاہر ہے کہ کسی ولی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ الہام کے ذریعے کسی شخص کو قتل کر ڈالے اس لیے کہ "الہام" میں مغالطہ کا امکان ہے

اور اولیاء اللہ کے بہت سے مکاشفات میں اسی لیے کثرت سے تضاد پایا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر وہ شرعی حجت تسلیم نہیں کیا گیا۔

لہٰذا امور تکوینیہ میں سے ایک ایسا تکوینی امر جو ظاہر سطح میں نہایت قبیح اور بہت بڑا جرم ہے صرف وحی الٰہی کے ذریعہ ہی انجام پا سکتا تھا، اس آیت کے علاوہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے درمیان گفتگو کے واقعہ کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے کہ وہ نبی تھے تب ہی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر حضرت خضر علیہ السلام کی معیت اور ان کے علم تکوینی کے مشاہدہ کے لیے اصرار کرتے، اور تب ہی حضرت خضر علیہ السلام جرأت کے ساتھ اپنے علم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان موازنہ کرتے نظر آتے ہیں۔

تاہم مجموعہ کمالات نبوت و رسالت کے اعتبار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقام حضرت خضر علیہ السلام کے مقام سے بہت بلند ہے کیونکہ وہ خدا کے نبی بھی ہیں اور جلیل القدر رسول بھی، صاحب شریعت بھی ہیں اور صاحب کتاب بھی، اور رسولوں میں بھی اولوالعزم رسول ہیں۔ پس حضرت خضر علیہ السلام کا وہ جزئی علم جو علم تکوین کے اسرار سے تعلق رکھتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جامع علم تشریعی پر فائق نہیں ہو سکتا۔

اور تیسری بات کے متعلق صحیح رائے علماء محققین ہی کی ہے جو اس امر کے قائل ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام کو حیات ابدی حاصل نہیں ہے اور وہ اپنی طبعی عمر کے بعد وفات پا چکے، اس لیے کہ قرآن عزیز میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو بھی حیات ابدی عطاء نہیں فرمائی، اور اس کے لیے اس دنیا میں "موت" ایک امر حق ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۳۴)

"اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تجھ سے پہلے بھی کسی بشر کو حیات ابدی عطاء نہیں کی۔"

نیز قرآن عزیز میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم نے ہر ایک نبی سے یہ عہد و میثاق لیا ہے کہ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوگی تو تم میں سے جو بھی اس وقت موجود ہو اس کا فرض ہوگا کہ وہ اس رسول پر ایمان بھی لائے اور اس کی مدد بھی کرے، چنانچہ تمام انبیاء و رسل نے اس کا اقرار کیا اور ان کے اور خدا کے درمیان شہادت و میثاق محکم و مضبوط ہوا۔

﴿وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۖ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۖ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۖ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝﴾ (ال عمران: ۸۱)

"اور جب اللہ نے نبیوں سے میثاق و عہد لیا کہ میں نے جو کچھ تم کو کتابیں اور علم دیا ہے پھر آئے تمہارے پاس رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہ سچا بتائے تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے، فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا؟ بولے ہم نے اقرار کیا، فرمایا تم اب گواہ رہو، اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔"

پس اگر حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کا فرض تھا کہ وہ علی الاعلان حاضر خدمت ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے تمام غزوات میں آپ کی اعانت و امداد کرتے، مگر کسی صحیح روایت سے ان باتوں میں سے کسی ایک بات کا بھی ثبوت نہیں ملتا، حالانکہ

غزوۂ بدر وحنین وغیرہ میں جبرئیل امین اور ملائکہ کی اعانت وامداد تک کی تصریحات موجود ہیں۔

قرآن عزیز کی ان آیات کے علاوہ صحیحین (بخاری ومسلم) کی حسب ذیل روایت بھی اس عقیدہ کی تردید کرتی ہے کہ خضر علیہ السلام اب تک زندہ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک شب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ اس رات کو تم نے دیکھا؟ یہ واضح رہے کہ آج جو شخص بھی بقید حیات ہے ایک صدی گزرنے پر ان میں سے ایک بھی زمین پر زندہ باقی نہیں رہے گا۔ [1]

اس صحیح حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق بھی حضرت خضر علیہ السلام کی حیات ابدی کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکلتی، اور نہ ان کا استثناء کسی روایت سے ثابت ہوتا ہے، حالانکہ یہ روایت صحیحین کے علاوہ مختلف طریقوں سے دوسری کتب حدیث میں بھی منقول ہے۔

اسی لیے مشہور محدث حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ایک بھی صحیح روایت ایسی منقول نہیں ہے جس سے حضرت خضر علیہ السلام کے زندہ ہونے کا ثبوت ملتا ہو، بلکہ اس کے برعکس آیات قرآنی اور صحیح روایات ان کی موت کی تائید کرتی ہیں۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن جوزی، امام بخاری، قاضی ابویعلی حنبلی، ابوطاہر بن الغباری، علی بن موسیٰ الرضاء، ابوالفضل مرسی، ابوطاہر بن العبادی، ابوالفضل بن ناصر، قاضی ابوبکر العربی، ابوبکر محمد بن الحسن رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر محدثین ومفسرین ان کی موت ہی کے قائل ہیں۔

لہٰذا حیات خضر علیہ السلام کے متعلق جن علماء نے اجماع نقل کیا ہے وہ قطعاً بے سند ہے بلکہ مشہور مفسر ابن حیان اندلسی نے دعوائے اجماع کے خلاف یہ دعویٰ کیا ہے کہ جمہور کا مسلک یہی ہے کہ خضر علیہ السلام زندہ نہیں ہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے کرائی جن کا نام خضر علیہ السلام تھا، ان کو بعض اسرار کونیہ کا وہ علم عطاء ہوا تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہیں دیا گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان حضرت خضر علیہ السلام سے کہیں زیادہ ہے، حضرت خضر علیہ السلام کا تذکرہ حسن انداز سے قرآن عزیز نے کیا ہے اس سے یہی راجح نظر آتا ہے کہ وہ نبی تھے، تاہم بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ کو قرآن عزیز نے جس طرح مجمل رکھا ہے ہم صرف اسی پر یقین رکھیں اور اس سے آگے اپنی تحقیق کو دخل نہ دیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے اور چونکہ ان کی حیات ابدی کے لیے کوئی شرعی اور تاریخی دلیل موجود نہیں ہے اس لیے بے شبہ وہ بھی اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر واصل الی اللہ ہوئے۔

حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق اور بھی بہت سی عجیب وغریب روایات تفسیر وتاریخ کی کتابوں میں منقول ہیں، محققین کی نگاہ میں سب موضوع اور بے اصل ہیں، اور اسرائیلیات سے ماخوذ، اس لیے ناقابل اعتماد ہیں۔ [2]

"مجمع البحرین" دو دریاؤں کے سنگم کو کہتے ہیں، یہاں کون سے دو دریا اور ان کا سنگم مراد ہے؟ اس کے متعلق مفسرین اور

---

[1] بخاری ومسلم کتاب الفضائل۔

[2] اس علمی بحث کے لئے البدایہ والنہایہ جلد ۱۔ البحر المحیط جلد ۲۔ روح المعانی جلد ۶۔ عینی شرح بخاری جلد ۷۔ فتح الباری جلد ۶۔ اور اصابہ جلد اوّل قابل مراجعت ہیں۔

ارباب سیرت سے مختلف اقوال منقول ہیں مگر ان میں سے کوئی قول بھی "قول فیصل" کی حیثیت نہیں رکھتا، البتہ جن حضرات نے اس سے بحر روم اور بحر قلزم اور ان دونوں کا سنگم مراد لیا ہے وہ قرین قیاس ہے اور یہ ممکن ہے کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اس وقت ان دونوں میں ایسا خط اتصال موجود ہو جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے درمیان یہ واقعہ پیش آیا ہے، اس لیے کہ خروج مصر اور میدان تیہ کے قیام کے دوران میں بظاہر انہی ہر دو سمندروں سے یہ واقعہ متعلق ہو سکتا ہے، اور حضرت استاذ علامہ سید محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں کہ یہ مقام وہ ہے جو آج کل عقبہ کے نام سے مشہور ہے۔ ❶

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات:

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان تمام صبر آزما حالات میں جن کا ذکر گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت میں مصروف اور ایک اولوالعزم پیغمبر کی طرح ہر قسم کی ایذاء رسانی و مخالفت کے باوجود صبر کے ساتھ ان کی اصلاح میں مشغول و منہمک تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہنے کا وقت آ پہنچا۔ بخاری و مسلم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا واقعہ اس طرح مذکور ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آیا تو موت کا فرشتہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا "اَجِبْ رَبَّکَ" اپنے پروردگار کی جانب سے پیغام اجل کو قبول فرمائیے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے طمانچہ رسید کر دیا جس سے اس کی آنکھ پھوٹ گئی، تب اس نے دربار الٰہی میں جا کر شکایت کی کہ تیرا بندہ موت نہیں چاہتا اور یہ کہ اس نے میرے طمانچہ رسید کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی آنکھ پھر درست ہو گئی، اور اس کو حکم ملا کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس دوبارہ جاؤ اور کہو کہ اللہ کا یہ ارشاد ہے کہ کسی بیل کی کمر پر تم اپنا ہاتھ رکھ دو جس قدر بال تمہاری مٹھی میں آ جائیں گے ہم ہر ایک بال کے عوض تمہاری عمر میں ایک سال کا اضافہ کر دیں گے، فرشتہ نے دوبارہ حاضر ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدائے تعالیٰ کا پیغام سنایا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریافت کیا کہ بارالٰہا! اس کے بعد کیا انجام ہو گا؟ حضرت حق سے جواب ملا کہ آخر کار پھر "موت" ہے، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اگر طویل سے طویل زندگی کا آخری نتیجہ موت ہی ہے تو پھر وہ شے آج ہی کیوں نہ آ جائے اور دعاء کی کہ الٰہ العالمین اس آخری وقت میں ارض مقدس سے قریب کر دے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں اس جگہ ہوتا تو تم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر کا نشان دکھاتا کہ وہ سرخ ٹیلہ (کثیب احمر) کے قریب اس جگہ دفن ہیں۔

ضیاء مقدسی کہتے ہیں کہ اریحاء میں سرخ ٹیلہ کے قریب ایک قبر ہے جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر بتایا جاتا ہے، دوسرے تاریخی اقوال کے مقابلہ میں یہ قول صحیح ہے، اس لیے کہ میدان تیہ کے سب سے قریب وادی مقدس کا علاقہ اریحاء کی بستی ہے اور اس جگہ وہ کثیب احمر (سرخ ٹیلہ) واقع ہے جس کا ذکر حدیث میں آیا ہے۔ ❷

بخاری و مسلم کی اس روایت میں فرشتہ کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جو معاملہ منقول ہے ابن قتیبہ کے نزدیک وہ مادی حقیقت کے ساتھ وابستہ نہیں ہے بلکہ تخیلی و تمثیلی ہے۔ ❸

---

❶ فیض الباری جلد ۱۔ ❷ فتح الباری ج ۶ ص ۳۴۳۔ ❸ فتح الباری ج ۶ ص ۳۴۳

ہمارے نزدیک اس واقعہ میں انسانی موت وحیات کے مسئلہ کو ایسے انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ جس سے اس سلسلہ کی تمام ضروری اور اہم کڑیاں نمایاں ہو سکیں یعنی یہ ظاہر ہو جائے کہ انسان اگر نبوت ورسالت جیسے عظیم الشان منصب پر بھی فائز ہو تب بھی بربناء بشریت وہ "موت" کو غیر مرغوب شئے سمجھتا ہے مگر جب خدا اس پر موت کی حقیقت کو منکشف کر دیتا ہے تو اس کے مقرب بندوں کے لیے وہ سب سے زیادہ محبوب شے بن جاتی ہے، نیز یہ واضح ہو جائے کہ موت کسی کے نزدیک محبوب شے ہو یا نامرغوب مگر وہ انجام کار ایک نہ مٹنے والا حکم ہے جس سے کسی حالت میں بھی مفر نہیں، اس لیے تمنا یہ نہ ہونی چاہیے کہ زندگی میں اضافہ ہو بلکہ یہ آرزو رہنی چاہیے کہ زندگی کا جو لمحہ بھی میسر آئے وہ پاکی اور بلندی اخلاق کے ساتھ پورا ہو، تاکہ خدائے تعالیٰ کی آغوش رحمت پا سکے اور "موت" حقیقی اور ابدی زندگی بن جائے۔

تو اب حدیث کے الفاظ کی تعبیر اس طرح کرنی چاہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں جب موت کا فرشتہ حاضر ہوا تو بشری شکل وصورت میں تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو اس حالت میں اسی طرح نہ پہچان سکے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام عذاب کے فرشتوں کو ابتداءً نہ پہچان سکے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ ناگوار گذرا کہ ایک اجنبی شخص بغیر اجازت کیوں ان کے خلوت کدہ میں گھس آیا اور اس کو موت کا پیغام دینے کا کیا حق ہے اور طیش میں آ کر منہ پر طمانچہ مار دیا، فرشتہ بشکل انسان تھا لہٰذا بشری اثرات نے کام کیا اور آنکھ مجروح ہو گئی، مگر جس طرح عذاب کے فرشتوں نے آہستہ آہستہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کو اپنی اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا، موت کے فرشتہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگاہ نہ کیا اور فوراً غائب ہو گیا اور درگاہِ الٰہی میں جا پہنچا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو پھر ملکوتی ہیئت پر واپس کر دیا، اور اس طرح وہ اس عیب سے بری ہو گیا جو بشری شکل وصورت میں آنکھ مجروح ہو جانے سے پیدا ہو گیا تھا۔

فرشتہ موت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیالات سے آشناء ہوئے بغیر خود ہی یہ سمجھ لیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام موت کے نام سے خفا ہو گئے اور وہ موت نہیں چاہتے اور دربار الٰہی میں جا کر یہ شکایت کر دی کہ تیرا بندہ موت نہیں چاہتا۔ خدائے تعالیٰ نے فرشتہ کی غلط فہمی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جلالت شان دونوں کے اظہار کے لیے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ دوبارہ جاؤ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جا کر ہمارا پیغام سناؤ، اِدھر فرشتہ پیغام حاصل کر رہا تھا اور اُدھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اجنبی شخص کے غائب ہو جانے پر فوراً یہ محسوس کر لیا کہ درحقیقت یہ معاملہ انسانی معاملات سے جدا دوسرے عالم کا ہے، چنانچہ جب فرشتۂ اجل نے دوبارہ حاضر ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیغام الٰہی سنایا تو ان کا لہجہ اور طرز گفتگو بالکل دوسرا ہو گیا اور انجام کار وہ رفیق اعلیٰ سے جا ملے اور قربت موت کی جو چند گھڑیاں تھیں وہ موت سے قبل اسی طرح سامان عبرت وموعظت بنیں۔

صحیحین کی حدیث کے مفہوم ومطلب سے متعلق یہ ایسی تعبیر ہے کہ جس سے وہ تمام سوالات واشکالات حل ہو جاتے ہیں جو اس سلسلہ میں علماء کے درمیان زیر بحث آئے ہیں۔

تورات اور کتب تاریخ میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس سال کی ہوئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے درمیان تقریباً ڈھائی سو سال کا عرصہ ہے۔ [1]

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۱

تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا ذکر متعدد مقامات پر کیا گیا ہے، ان میں سے ایک جگہ مذکور ہے:

"اور موسیٰ موآب کے میدانوں میں سے بنو کے پہاڑوں پر پسگہ چوٹی پر جو یریحو کے مقابل ہے چڑھ گیا اور خداوند نے ساری زمین جلعاد سے لے کر دان تک اس کو دکھلائی اور نفتالی کا سارا ملک پچھلے سمندر تک اور جنوب کا ملک اور وادی اریحو (اریحا) جو خرمانوں کا شہر ہے اس کی وادی کا میدان صغر تک اس کو دکھایا اور خداوند نے اس سے کہا یہی وہ ملک ہے جس کی بابت میں نے ابراہام اور اضحاق اور یعقوب سے قسم کھا کر کہا تھا کہ اسے میں تمہاری نسل کو دوں گا سو میں نے ایسا کیا کہ تو اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے، پھر تو اس پار وہاں جانے نہ پائے گا، پس خداوند کے بندے موسیٰ (علیہ السلام) نے خداوند کے کہے موافق وہیں موآب کے ملک میں وفات پائی اور اس میں اسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغفور کے مقابل دفن کیا، پھر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں، اور موسیٰ اپنی وفات کے وقت ایک سو بیس برس کا تھا، اور نہ تو اس کی آنکھ دھندلانے پائی اور نہ اس کی طبعی قوت کم ہوئی۔" [1]

بنی اسرائیل کا قومی مزاج اور خدا کی جانب سے تذکیر نعمت:

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے تفصیلی واقعات کا مطالعہ کرنے سے جو بات سب سے پہلے نگاہ کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے اندر ایک عجیب طرح کا تلون پایا جاتا ہے، اور سرکشی، احسان فراموشی، فساد انگیزی اور بغض و حسد، ان کے قومی مزاج کا مایہ خمیر معلوم ہوتا ہے، غالباً ان کے قومی مزاج کا یہ فساد صدیوں کی غلامی کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ تمام عیوب میں غلامی ہی ایک ایسا عیب ہے جو اخلاق کی پستی، دناءت اور بغض و عناد جیسے ناپاک رذائل انسان کے اندر پیدا کر دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی قوم کو راہ راست پر لانے یا صراط مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے انبیاء و رسل کو سخت سے سخت نامساعد حالات اور دشوار گذار مراحل پیش آئیں گے، چنانچہ پیش آتے رہے اور چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پہلے پیغمبر ہیں کہ جن کی پیغمبرانہ مساعی کے ذریعہ بنی اسرائیل نے غلامی سے نجات پائی اور آزادی حیات سے بہرہ مند ہونے کا موقع میسر آیا تو سب سے زیادہ انہی کو بنی اسرائیل کے فاسد قومی مزاج سے دو چار ہونا اور اس کی اصلاح کے لیے سخت سے سخت مصائب کو برداشت کرنا پڑا۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھی ایسی قوم کی اصلاح اور رشد و ہدایت کے لیے نزول قانون (توراۃ) کے علاوہ بڑی کثرت سے آیات اللہ (معجزات و نشانات) کا مظاہرہ کیا گیا، تاکہ اس طرح ان کے تلون اور آشفتہ مزاجی میں اعتدال پیدا ہو کر قبول حق اور استقامت حق کی استعداد و صلاحیت پیدا ہو سکے۔

یہی وہ آیات اللہ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن عزیز کے اندر سورۂ بقرہ، اعراف اور ابراہیم میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور بتایا ہے کہ معاصر قوموں میں ہمارے فضل و کرم اور عطا و احسان کا مرکز یہی قوم (بنی اسرائیل) رہی ہے مگر افسوس کہ ان تمام انعام و اکرام اور عفو و رحمت کی فراوانی کے باوجود ان کی سرکشی اور بغاوت اور تلون رہ رہ کر ابھرتا، اور دب دب کر نمایاں ہوتا رہا اور آخر کار انہوں نے خدا کی "ابدی لعنت و غضب" کو سرمایہ نازش بنا کر ہمیشہ کے لیے دنیا و آخرت کی عزت سے محرومی کا داغ لگا لیا۔

---

[1] استثناء باب ۳۴ آیات ۷-۱

چنانچہ آیات

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ ...... الاية﴾(البقرہ: ۴۰۔۴۷۔۱۲۲)

﴿وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ...... الاية﴾(البقرہ: ۴۹)

﴿وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝﴾(البقرہ: ۵۳)

﴿وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ......... الاية﴾(البقرہ: ۶۱)

﴿وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ ...... الاية﴾(البقرہ: ۶۰)

﴿وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ ..... الاية﴾(الاعراف: ۱۴۱)

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ .... الاية﴾ (ابراهیم: ۶)

میں ان ہی واقعات کا تذکرہ ہے اور نگاہ عبرت بین کے لیے سامان صد ہزار عبرت وموعظت ہے۔

البتہ بنی اسرائیل کی قومی زندگی کا جو نقشہ قرآن عزیز نے پیش کیا ہے اور جس کی زبردست تائید خود تورات سے بھی ہوتی ہے اس کو سامنے رکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے ایسی قوم کو کس لیے ان نعمتوں اور فضیلتوں کے لیے منتخب کر لیا تھا، اور عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ نے کیوں نہ شروع ہی سے ایسی ضدی قوم کو نظر انداز کر دیا، اور کیوں نہ ان افضال وانعامات کا رخ کسی دوسری قوم کی جانب مبذول فرمایا، سواس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر آپ اس زمانہ کی تاریخ کا مطالعہ فرمائیں اور علم الاجتماع (Sociology) اور علم الاقوام والامم (Anthro Polohgy) کے اصول پر مطالعہ فرمائیں تو آپ دیکھیں گے جب سے تاریخ انسانی کا کائنات میں وجود ہوا ہے اس وقت سے یہ بات صاف اور واضح ہے کہ اقوام عالم کے تمدن ومعاشرت اور ان کی سیاست و مذہب پر سامی (Semetic) اقوام کا تسلط اور غلبہ نظر آتا ہے چنانچہ تاریخی حقائق کی تہہ تک پہنچنے کے بعد دنیا کی کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی جو سامی اقوام کے ان اثرات سے متاثر نہ ہوئی ہو،[1] تو جس دور کی حالت قرآن عزیز بیان کر رہا ہے اس دور میں اس زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے دور ونزدیک جو سامی اقوام آباد تھیں تاریخ نے ان کو عمالیقی، قبطی، کنعانی، عناقی، سمیری وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے جن کا تمدن شام، فلسطین، شرق اردن، مصر اور عراق میں چمک رہا تھا، مگر ان تمام اقوام میں شرک وکفر، بغاوت وسرکشی اور ظلم و طغیان کا جو ہیبت ناک مظاہرہ بپا تھا اس کے سامنے بنی اسرائیل بسا غنیمت نظر آتے تھے اور ان کی استعداد وصلاحیت معاصر اقوام کے مقابلہ میں قدرے قابل اطمینان تھی، قبطی قوم کا حال فرعون مصر اور مصریوں کے وقائع میں ابھی آپ مطالعہ کر چکے ہیں اور کنعانی وعمالیقی قوم کے حالات عنقریب نظر سے گذریں گے اور سمیری قوم کا اندازہ اس کے ایک سردار "سامری" کے حالات سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

یہ تھے وہ کوائف وحالات جن کی بناء پر رشد وہدایت کے لیے بنی اسرائیل کو منتخب کیا گیا اور تاریخ اس کا ثبوت بہم پہنچاتی

---

[1] یہ تاریخی مسئلہ کافی تفصیل کا محتاج ہے اس جگہ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔

ہے کہ اس قوم کی عام بدبختی کے باوجود اسی کی ایک قلیل جماعت کے ذریعہ خدا کی رشد و ہدایت کا پیغام عرصہ دراز تک کائنات انسانی تک پہنچتا رہا اور ہزاروں برس کے بعد اسرائیلیوں سے یہ نعمت سلب کر کے بنی اسماعیل کے حوالہ کی گئی۔

غرض بنی اسرائیل کا یہ انتخاب ان کے تقدس و طہارت کے پیش نظر نہ تھا بلکہ ان کو ان سے بھی زیادہ فساد و سرکشی پھیلانے والی طاقتوں کی سرکوبی کا ذریعہ بنانا تھا لہٰذا ان کو احکام الٰہی کا مطیع بنانے اور ان کو راہ راست پر لانے کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا اور اس طرح ان کی نوجوان نسل سے خدا نے اپنی یہ خدمت لی۔

تورات نے بھی ایک جگہ اس حقیقت کو ان بہترین الفاظ کے ساتھ آشکارا کیا ہے:

"سن لے اے اسرائیل! آج تجھے یردن پار اس لیے جانا ہے کہ تو ایسی قوموں پر جو تجھ سے بڑی اور زور آور ہیں اور ایسے بڑے شہروں پر جن کی فصیلیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں قبضہ کرے، وہاں عناقیم کی اولاد میں جو بڑے بڑے اور قد آور لوگ ہیں، تجھے ان کا حال معلوم ہے اور تو نے ان کی بابت یہ کہتے سنا ہے کہ بنی عناق کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟ پس آج کے دن جان لے کہ خداوند تیرا خدا تیرے آگے آگے بھسم کرنے والی آگ کی طرح پار جا رہا ہے اور ان کو فنا کر دے گا اور وہ ان کو تیرے آگے پست کرے گا، ایسا کہ تو ان کو نکال کر جلد ہلاک کر دے گا، جیسا خداوند نے تجھ سے کہا ہے۔ اور جب خداوند تیرا خدا ان کو تیرے آگے سے نکال چکے تو تو اپنے دل میں یہ نہ کہنا کہ میری "صداقت" کے سبب سے خداوند مجھے اس ملک پر قبضہ کرنے کو یہاں لایا کیوں کہ فی الواقع ان کی "شرارت" کے سبب سے خداوند ان قوموں کو تیرے آگے سے نکالتا ہے، تو اپنی صداقت یا اپنے دل کی راستی کے سبب سے اس ملک پر قبضہ کرنے کو نہیں جا رہا ہے یہ بلکہ خداوند تیرا خدا ان قوموں کی شرارت کے باعث ان کو تیرے آگے سے خارج کرتا ہے تاکہ یوں وہ اس وعدہ کو جس کی قسم اس نے تیرے باپ دادا ابراہام اور اضحاق اور یعقوب سے کھائی پورا کرے، غرض تو سمجھ لے کہ خداوند تیرا خدا تیری صداقت کے سبب سے یہ اچھا ملک تجھے قبضہ کرنے کے لیے نہیں دے رہا ہے، کیونکہ تو ایک "گردن کش قوم" ہے، اس بات کو یاد رکھ اور کبھی نہ بھول کہ تو نے خداوند اپنے خدا کو بیابان میں کس کس طرح غصہ دلایا بلکہ جب سے تم ملک مصر سے نکلے ہو تب سے اس جگہ پہنچنے تک تم برابر خداوند سے "بغاوت" ہی کرتے رہے۔" [1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ثناء و منقبت قرآن میں:

قرآن عزیز اور احادیث نبوی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مناقب و فضائل اور بنی اسرائیل کے واقعات کے سلسلہ میں ان کی جلالت و عظمت کا جس طرح اظہار کیا گیا ہے اس سے یہ نمایاں ہوتا ہے کہ ختم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مجدد انبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اولوالعزم رسول اور پیغمبر ہیں اور انبیاء و رسل میں عظیم المرتبت اور بڑی قدر و منزلت کے مالک دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دیجئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بچپن کی زندگی سے وفات تک کے حالات ایسے عجیب و غریب طریقے سے گذرے ہیں کہ ان کے مطالعہ سے بے ساختہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جلالت قدر کا اقرار و اعتراف کرنا اور یہ تسلیم کرنا

---

[1] استثناء باب ۹ آیات ۱۔۷

ہے کہ فرعون، قوم فرعون اور بنی اسرائیل کے ہاتھوں جو تکالیف حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اٹھائیں اور ان کی اصلاح حال کے لیے جس قسم کی ایذائیں اور مصیبتیں برداشت کیں، ان کی نظیر (باستثناء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم و حضرت ابراہیم علیہ السلام اور) کسی نبی و رسول کی زندگی مبارک میں نہیں ملتی۔

قرآن عزیز نے جگہ جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات سے اسی لیے استشہاد کیا ہے کہ امتوں اور قوموں کی سہل انگاری، حق سے اغماض بلکہ تمرد و سرکشی، مخالفت و عناد، پیغمبر کی توہین و ایذاء رسانی، اور پیغمبر کا صبر و ضبط اور گمراہ امت و قوم کی اصلاح اور ان کی رشد و ہدایت کے لیے پیہم سعی اور جدوجہد کا اس قدر کثیر مواد موعظت و بصیرت کے لیے کہیں نہیں پایا جاتا، جس قدر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے واقعات میں فراہم ہے۔

پس اگرچہ قرآن عزیز کی ان تمام آیات سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جلالت قدر اور اولوالعزم پیغمبر ہونے کا اظہار ہوتا ہے "جو ان کے واقعات کو بیان کرتی ہیں" مگر حسب ذیل آیات میں خصوصیت کے ساتھ ان کی ثناء و منقبت کا اعلان کیا گیا ہے اور ان کے ضمن میں حضرت ہارون علیہ السلام کا بھی، چنانچہ سورۂ مریم میں ارشاد ہے:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ۝﴾ (مریم: ۵۱۔۵۳)

"اور یاد کر قرآن میں موسیٰ (علیہ السلام) کو بے شبہ وہ تھے مخلص اور تھے رسول، نبی، اور ہم نے ان کو طور ایمن کی جانب سے پکارا اور ان کو قریب کر کے ان سے سرگوشیاں کیں اور ہم نے اپنی رحمت سے ان کے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو نبی بنایا۔"

اور سورۂ اعراف میں ہے:

﴿قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ۡ﴾ (الاعراف: ۱۴۴)

"(اللہ تعالیٰ) نے کہا: اے موسیٰ! بے شبہ میں نے تم کو لوگوں پر بزرگی عطاء کی اور تم کو چن لیا اپنی رسالت دے کر اور ہم کلامی کا شرف بخش کر۔"

بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مجھ کو موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو اس لیے کہ قیامت کے دن لوگوں پر دہشت سے غشی طاری ہو جائے گی تو سب سے پہلا شخص جس کو ہوش آئے گا میں ہوں گا، تو میں یہ دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام عرش کا پایہ پکڑے کھڑے ہیں، اب میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کو مجھ سے پہلے افاقہ ہو گیا یا وہ طور پر بے ہوش کیے جانے کے بدلے میں آج کی مدہوشی سے بری کر دیئے گئے۔"

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد "کہ مجھ کو موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو، از راہ تواضع اور انکسار ہے ورنہ تو دوسری جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خود یہ ارشاد مبارک ہے:

((انا سید ولد آدم ولا فخر))

"بغیر فخر و مباہات کے کہتا ہوں کہ میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں۔"

اور آپ ﷺ کا خاتم النبیین ہونا خود اس کی روشن دلیل ہے، رہا قیامت کا یہ واقعہ سو یہ ایک جزئی فضیلت ہے اور منبع فضل وکمال کے مجمع کمالات کی برتری وتفوق پر اس سے اثر نہیں پڑتا، بہرحال اس روایت کی روح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جلالت قدر اور عظمت کا اظہار ہے اور بس۔ سورۂ نساء میں ہے:

﴿ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝ ﴾ (النساء: ١٦٤)

"اور کچھ رسول ہیں کہ جن کا ذکر ہم نے تم سے پہلے کر دیا ہے اور کچھ رسول ہیں جن کا ذکر ہم نے تم کو نہیں سنایا اور اسی طرح اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام ہوتا ہے۔"

اور سورۂ صافات میں ہے:

﴿ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰي مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ۝ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰي مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ (الصّٰفّٰت: ١١٤-١٢٢)

"اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) پر احسان کیا اور ان دونوں کو اور ان کی قوم کو بڑی مصیبت سے نجات دی، اور ہم نے ان کی مدد کی کہ وہ (فرعون) اور قوم (فرعون) پر غالب رہے اور ہم نے ان دونوں کو روشن کتاب دی اور دونوں کو راہ مستقیم کی ہدایت بخشی اور باقی رکھا ان کے متعلق پچھلے لوگوں میں کہ سلام ہو موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) پر، بے شک ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں نیکوکاروں کو، بیشک وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے ہیں۔"

اور سورۂ احزاب میں ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ۭ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ۝ ﴾ (الاحزاب: ٦٩)

"اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جنہوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو ایذاء پہنچائی، پس اللہ نے ان کو اس بات سے بری کر دیا، جس کو ان کی زبانیں کہہ رہی تھیں، اور موسیٰ اللہ کے نزدیک وجیہہ ہیں۔"

نیز بخاری و مسلم میں اسریٰ اور معراج کی روایات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نبی اکرم ﷺ کے مکالمات منقول ہیں ان سے ان کی عظمت وشان کا نمایاں اظہار ہوتا ہے۔

بخاری و مسلم میں ایک اور روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے کچھ تقسیم فرمایا تو ایک شخص (منافق) کہنے لگا کہ اس تقسیم میں خدا کی خوشنودی کا لحاظ نہیں رکھا گیا، کسی مسلمان نے اس مقولہ کو نبی اکرم ﷺ کے سامنے نقل کر دیا تو آپ کا چہرۂ مبارک غضب وغصہ کی وجہ سے سرخ ہو گیا اور ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر رحم

فرمائے کہ ان کو تو اس سے بھی کہیں زیادہ اذیت پہنچائی گئی اور انہوں نے ان تمام اذیتوں کے مقابلہ میں صبر و ضبط ہی سے کام لیا۔ یعنی منافق کے اس ایذاء رساں قول کے مقابلہ میں بھی اولوالعزم رسولوں کی طرح صبر و ضبط ہی سے کام لیتا ہوں۔

غرض یہ اور اسی قسم کے بے شمار فضائل ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اولوالعزم رسول ہونے پر دلالت کرتے اور ہمارے لیے ذخیرۂ رشد و ہدایت مہیا کرتے ہیں۔

ایک لطیف تاریخی نکتہ:

یہود (بنی اسرائیل) کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا اس حقیقت سے نا آشنا نہیں ہے کہ عرصہ دراز قبل از مسیح علیہ السلام (یہود) حجاز میں آ کر بس گئے تھے، اور تیماء، وادی قریٰ، فدک، خیبر اور مدینہ (یثرب) میں انہوں نے مکانوں، مذہبی صومعوں، جائیدادوں، مذہبی درس گاہوں اور فوجی چھاؤنیوں اور قلعوں کے ذریعہ اپنا مستقل تمدن قائم کر لیا تھا اور بقول عرب مؤرخین بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع اور بنی حارث بڑے بڑے یہود قبائل نے ان مقامات کو اپنا مستقل موطن بنا لیا تھا اور وہ یہیں رہ پڑے تھے۔

اس حقیقت کے پیش نظر دو اہم تاریخی سوال پیدا ہوتے ہیں جو حل طلب ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کون سا ناگزیر واقعہ پیش آیا کہ جس کی وجہ سے یہود کو وہ سرزمین چھوڑنی پڑی جس کو فلسطین کہتے ہیں اور جس کے متعلق یہود کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ "ارض مقدس" ہے اور وہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں؟ دوسرے یہ کہ اگر کسی ناگزیر حالت میں ان کو اپنی یہ محبوب سرزمین چھوڑنی ہی پڑی تھی تو پھر وہ کون سا سبب تھا جس نے ان کو مجبور کیا کہ وہ قریب کے سرسبز و شاداب اور پر کیف علاقوں کو چھوڑ کر ایسے علاقہ میں آ کر آباد ہوئے جہاں گھاس پات اور زندگی کے لیے سامان خورد و نوش بھی وسعت کے ساتھ مہیا نہیں تھے، حالانکہ مصر ان کی سرزمین سے قریب تھا، عراق ان کا قدیم دارالہجرۃ اور نزدیک تھا اور شام ان کے شمال میں متصل ہی آباد تھا اور یہ سب مقامات بے حد سرسبز و شاداب اور متمدن ساز و سامان کا مرکز تھے۔

پہلے سوال کا جواب تو تاریخ یہ دیتی ہے کہ فلسطین کی محبوب، مقدس، اور پیاری سرزمین سے یہود کو سنہ ۷۰ قبل عیسوی طیطس رومی (Titus) کے زمانہ میں جبراً نکلنا پڑا، اس بادشاہ نے فلسطین پر فوج کشی کر کے بلاد فلسطین کو تہ و بالا کر ڈالا۔ بیت المقدس کو برباد کر دیا، اس "ہیکل" کو جس پر یہود کو ناز تھا اور جس کی مضبوطی اور پر شوکت تعمیر کی وہ مثالیں دیا کرتے تھے اور جس کے ساز و سامان اور مکلل و مذہب ظروف پر وہ فخر کیا کرتے تھے "ظالم" نے اس کو کھود کر پھینک دیا تھا اور اس کے تمام بیش قیمت ساز و سامان کو لوٹ لیا تھا۔

اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ "یہود" توراۃ میں پڑھ چکے، اور اپنے پیغمبروں کی زبانی سن چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ ایک زمانہ میں اپنے اس "عہد" کو "بنی اسرائیل" کے بھائیوں "بنی اسمٰعیل" میں پھر تازہ کرے گا، اور ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ "یثرب (مدینہ) میں آئے گا، اور یہ اس کا دارالہجرۃ بنے گا، اور اس کی دعوت الٰہی کا مرکز قرار پائے گا، اور یہ کہ "بت پرستوں" کے مقابلہ میں اس کی مجاہدانہ زندگی کامیاب ہوگی، اور ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب و موسیٰ علیہم السلام کے اعلان حق کو دوبارہ اسی کے ہاتھوں سربلندی نصیب ہوگی اس لیے جب وہ اس "بت پرست بادشاہ" کے ہاتھوں عاجز و درماندہ ہوئے تو انہوں نے اپنی سربلندی کی آخری پناہ "حجاز" کی اس سرزمین یثرب (مدینہ) ہی کو سمجھا اور اس راہ پر اپنا موطن بنا لیا جو اس نبی کے ظہور کے شہر اور فلسطین کے درمیان تھی اور اس طرح وہ نبی منتظر کے انتظار اور اپنے کھوئے ہوئے وقار کے واپسی کے لیے زندگی بسر کرنے لگے۔

چنانچہ "یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں" صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ اس نبی کا ظہور سلع پہاڑ کے قریب ہوگا، اور یہ ظاہر ہے کہ "مدینہ" کی آبادی ایسی جگہ واقع ہے، جس کے مشرق میں جبل اُحد ہے اور مغرب میں جبل سلع اور درمیان میں "وادی مدینہ" ہے۔

"اے سمندر پر گزرنے والو اور اس میں بسنے والو! اے جزیرہ اور ان کے باشندو! خداوند کے لیے نیا گیت گاؤ، زمین پر سر تا سر اسی کی ستائش کرو، بیابان اور اس کی بستیاں قیدار کے آباد گاؤں اپنی آواز بلند کریں، سلع کے بسنے والے گیت گائیں، پہاڑوں کی چوٹیوں سے للکاریں، وہ خداوند کا جلال ظاہر کریں، اور جزیروں میں اس کی ثناء خوانی کریں، خداوند بہادروں کی مانند نکلے گا، وہ جنگی مرد کی مانند اپنی غیرت دکھائے گا، وہ نعرہ مارے گا، ہاں وہ للکارے گا، وہ اپنے دشمنوں پر غالب آئے گا۔ میں بہت مدت سے چپ رہا۔ میں خاموش ہو رہا اور ضبط کرتا رہا..... جو کھودی ہوئی مورتوں پر بھروسہ کرتے اور ڈھالے ہوئے بتوں سے کہتے ہیں، تم ہمارے معبود ہو وہ پیچھے ہٹیں گے اور وہ بہت شرمندہ ہوں گے۔" [1]

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسواء کوئی نبی اور پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے "بت پرستوں" سے جہاد کیا ہو اور انجام کار ان کو نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا ہو، پھر یہ بنی قیدار کون ہیں؟ سلع کس جگہ واقع ہے؟ جزیروں اور پہاڑوں کا بار بار تذکرہ کیوں ہے؟ اور بنی اسرائیل کے گیت کے علاوہ "نیا گیت" کونسا ہے؟ یہ تمام باتیں پکار کر کہہ رہی ہیں کہ یہ ایسی "شریعت" اور ایسے "نبی" کی بشارت کا ذکر ہے جو جزیرۂ عرب میں حجاز کے خطہ سے تعلق رکھتا ہے، تو کیا پھر یہی وہ بات نہیں ہے جس کو قرآن عزیز نے زندہ تاریخی شہادت کے طور پر یہود کو مخاطب کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا ہے:۔

﴿وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ (البقرہ:۸۹)

"اور جب کہ ان کے پاس اللہ کی جانب سے کتاب (قرآن) آئی جو اس کتاب (توراۃ) کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس ہے اور یہ (یہود) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے کافروں کے مقابلہ میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے، پھر جب ان کے پاس جانی پہچانی بات (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آ پہنچی تو اس کا انکار کرنے لگے، سو اللہ کی لعنت ہو انکار کرنے والوں پر۔"

یعنی جب ان اہل کتاب (یہود) کی یثرب کے بت پرستوں سے جنگ ہوا کرتی تھی، اور اہل کتاب کو شکست ہو جاتی تو وہ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ خدا نبی منتظر کو جلد بھیج کہ ہم اس کے ساتھ مل کر بت پرستی کا قلع قمع کریں اور تیرے وعدہ کے مطابق حق کو کامیابی حاصل ہو لیکن جب وہ پیغمبر برحق تشریف لے آئے اور مبعوث ہو گئے تو وہ اس حسد میں اس کا انکار کرنے لگے کہ یہ اسماعیلی کیوں ہے، اسرائیلی کیوں نہیں؟۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بعض علماء یہود اس وسوسہ میں گرفتار تھے کہ اگرچہ اس پیغمبر کی بعثت اور ظہور کا مقام کوہ سلع کے قریب بتایا گیا ہے مگر اس کا ظہور بنی اسرائیل ہی میں سے ہونا چاہیے، اور اسی لیے وہ یہاں آ کر بس گئے تھے کہ خدا کا وہ وعدہ ہم ہی میں سے پورا ہو لیکن انہوں نے یہ فراموش کر دیا تھا کہ اسی توراۃ میں اسی نبی منتظر کے لیے یہ بھی کہا گیا ہے کہ "میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔" [2] اور یہ نہیں کہا کہ ان ہی (بنی اسرائیل) میں سے برپا کروں گا، لیکن ان کے جمہور علماء اور ان کے پیرو عوام اس حقیقت سے آشنا نہ تھے کہ یہ نعمت اب ان کے بھائیوں بنی اسماعیل میں منتقل ہو کر ہم کو مستفیض کرنے والی ہے،

---

[1] یسعیاہ باب ۴۲۔ آیات ۱۰۔۱۷۔ ماخوذ از قصص الانبیاء للنجار [2] استثناء باب ۱۸۔ آیت ۱۷

اسی جانب قرآن نے اشارہ کیا ہے:

﴿يَعْرِفُونَهٗ كَمَا يَعْرِفُونَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ (البقرہ: ۱۴۶)

"یہ محمد (ﷺ) کو اسی طرح (سچا نبی) جانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کے بیٹا ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔"

الحاصل، یہ وجہ تھی کہ صدیوں پہلے بنی اسرائیل جب جبراً وقہراً فلسطین کی سرزمین سے نکالے گئے تو انہوں نے مصر، شام اور عراق کے سرسبز وشاداب اور متمدن ممالک کو چھوڑ کر حجاز کی سرزمین کو ترجیح دی اور یثرب (مدینہ) اور اطراف یثرب میں آ کر بس گئے اور اسی کو اپنا وطن ومسکن بنالیا، مگر افسوس کہ اس کے ظہور پر حسد وبغض نے ان کو دولت ایمان سے محروم رکھا۔

جدید تاریخی حقائق کے پیش نظر اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ سوال وجواب کی مسطورۂ بالا پوری بحث اس لیے بیکار ہے کہ سرزمین حجاز (مدینہ) میں جو یہود آباد تھے وہ عربی نژاد تھے، یہودی النسل نہیں تھے اس لیے کہ یہود بنی اسرائیل کے خصوصی امتیازات میں سے ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ دنیا کے کسی گوشہ میں بھی جا کر بسے ہوں اپنے اسرائیلی ناموں کو نہیں چھوڑتے بخلاف یہود حجاز کے کہ ان کے اجداد کے نام قریظہ، نضیر، قینقاع عربی نام ہیں اور اسرائیلی ناموں سے بالکل ممتاز ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس جدید نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ سرزمین حجاز میں آباد یہود صرف عرب نژاد ہی تھے اور ان میں یہودی النسل قبائل قطعاً موجود نہ تھے تو یہ قطعاً غلط اور واقعات تاریخی کے خلاف ہے اس لیے کہ ان قبائل میں بعض وہ قبائل بھی ہیں، جن کا ارض فلسطین سے ہجرت کر کے حجاز میں آباد ہو جانا تاریخ کے اوراق میں آج تک محفوظ ہے اور اگر اس کے معنی یہ ہیں کہ قبائل عرب کے ساتھ ساتھ یہودی النسل قبائل بھی یہاں آباد تھے اور ان ہی کی بدولت قبائل عرب میں یہودیت کا بیج بویا گیا تھا تو مسطورۂ بالا سوال پھر پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا جواب تاریخی حیثیت سے وہی دیا جاسکتا ہے جو گذشتہ سطور میں دیا جا چکا ہے۔

بصیرتیں اور عبرتیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل، فرعون اور قوم فرعون کی یہ طویل تاریخی داستان ایک قصہ اور حکایت نہیں ہے بلکہ حق و باطل کے معرکے، ظلم وعدل کی جنگ، آزادی غلامی کی کشمکش، مجبور وپست کی سربلندی، اور جابر وسربلند کی پستی وہلاکت، حق کی کامرانی اور باطل کی ذلت ورسوائی، صبر وابتلاء اور شکر واحسان کے مظاہر، غرض ناسپاسی وناشکری کے بدنتائج کی ایسی پرعظمت اور نتائج سے لبریز حقائق کی ایسی پُرمغز داستان ہے جس کی آغوش میں بے شمار عبرتیں اوران گنت بصیرتیں پنہاں ہیں اور ہر صاحب ذوق کو اس کے مبلغ علم اور دقت نظر کے مطابق دعوت نظر وفکر دیتی ہیں، ان میں سے "مشتے نمونہ از خروارے" یہ چند بصائر خصوصیت کے ساتھ قابل غور اور لائق فکر ہیں۔

① اگر انسان کو کوئی مصیبت اور ابتلاء پیش آ جائے تو ازبس ضروری ہے کہ "صبر ورضاء" کے ساتھ اس کو انگیز کرے۔ اگر ایسا کرے گا تو بلاشبہ اس کو خیر عظیم حاصل ہوگی اور وہ یقیناً فائز المرام اور کامیاب ہوگا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی پوری داستان اس کی زندہ شہادت ہے۔

② جو شخص اپنے معاملات میں خدا پر بھروسہ اور اعتماد رکھتا اور اسی کو خلوص دل کے ساتھ اپنا پشتیبان سمجھتا ہے تو خدائے تعالیٰ ضرور اس کی مشکلات کو آسان کر دیتا اور اس کے مصائب کو نجات اور کامرانی کے ساتھ بدل دیتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قبطی کو قتل کر دینا، مصریوں کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے لیے آپس میں مشورہ کرنا، پھر دشمنوں ہی میں سے ایک ہمدرد شخص کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصریوں کی سازش پر مطلع کرنا، اور اس طرح ان کا مدین جانا، وحی الٰہی سے مشرف ہونا، اور رسالت کے جلیل القدر

منصب سے سرفراز ہونا اس کی روشن شہادتیں ہیں۔

③ جس کا معاملہ حق کے ساتھ عشق تک پہنچ جاتا ہے اس کے لیے باطل کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ہیچ اور بے وجود ہو کر رہ جاتی ہے، غور کیجیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان مادی طاقت کے پیش نظر کیا نسبت ہے، ایک بیچارہ اور مجبور اور دوسرا باصد ہزار قہرمانی کبر و غرور سے معمور، مگر جب فرعون نے برسر دربار حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا:

﴿ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا ۝ ﴾ "اے موسیٰ! بالیقین میں تجھے جادو مارا سمجھتا ہوں۔"

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی بے دھڑک جواب دیا:

﴿ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝ ﴾ (بنی اسرائیل: ۱۰۲)

"تو بلاشبہ جانتا ہے کہ ان (آیات) کو آسمانوں اور زمینوں کے پروردگار نے صرف بصیرتیں بنا کر نازل کیا ہے، اور اے فرعون! میں تجھ کو بلاشبہ ہلاک شدہ سمجھتا ہوں۔"

یعنی خدائے تعالیٰ کے ان کھلے نشانوں کے باوجود نافرمانی کا انجام ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

④ اگر کوئی خدا کا بندہ حق کی نصرت و حمایت کے لیے سرفروشانہ کھڑا ہو جاتا ہے تو خدا دشمنوں اور باطل پرستوں ہی میں سے اس کے معین و مددگار پیدا کر دیتا ہے۔

تمہارے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی مثال موجود ہے کہ جب فرعون اور اس کے سرداروں نے ان کے قتل کا فیصلہ کر لیا تو ان ہی میں سے ایک مرد حق پیدا ہو گیا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے پوری مدافعت کی، اسی طرح قبطی کے قتل کے بعد جب ان کے قتل کا فیصلہ کیا گیا تو ایک باخدا قبطی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کی اطلاع کی اور ان کو مصر سے نکل جانے کا نیک مشورہ دیا، جو آئندہ چل کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عظیم الشان کامرانیوں کا باعث بنا۔

⑤ اگر ایک بار بھی کوئی لذت ایمانی سے لطف اندوز ہو جائے اور صدق دلی کے ساتھ اس کو قبول کر لے تو یہ نشہ اس کو ایسا مست بنا دیتا ہے کہ اس کے ہر ریشہ جان سے وہی صدائے حق نکلنے لگتی ہے، کیا یہ اعجاز نہیں ہے کہ جو "ساحر" چند منٹ پہلے فرعون کی زبردست طاقت سے مرعوب اور اس کے حکم کی تعمیل کو حرز جان بنائے ہوئے تھے، اور جو اپنے کرشموں کی کامیابی پر انعام و اکرام کا معاملہ طے کر رہے تھے وہی چند منٹ کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دست مبارک پر دولت ایمان کے نشہ سے سرشار ہو گئے تو فرعون کی سخت سے سخت دھمکیوں اور جابرانہ عذاب و عقاب کو ایک کھیل سے زیادہ نہ سمجھتے ہوئے بے باکانہ انداز میں یہ کہتے نظر آتے ہیں:

﴿ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَ الَّذِیْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ۝ ﴾ (طٰہٰ: ۷۲)

"انہوں نے کہا ہم کبھی یہ نہیں کر سکتے کہ جو روشن دلیلیں ہمارے سامنے آ گئی ہیں، اور جس خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اس

سے منہ موڑ کر تیرا حکم مان لیں، تو جو فیصلہ کر چکا ہے اس کو کر گذر، تو زیادہ سے زیادہ جو ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ دنیا کی اس زندگی کا فیصلہ کر دے۔"

⑥ صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے خواہ اس پھل کے حاصل ہونے میں کتنی ہی تلخیاں برداشت کرنی پڑیں، مگر جب بھی وہ پھل لگے گا میٹھا ہی ہوگا، بنی اسرائیل مصر میں کتنے عرصہ تک بیچارگی، غلامی اور پریشان حالی میں بسر کرتے اور نرینہ اولاد کے قتل اور لڑکیوں کی باندیاں بننے کی ذلت و رسوائی کو برداشت کرتے رہے مگر آخر وہ وقت آ ہی گیا جبکہ ان کو صبر کا میٹھا پھل حاصل ہوا اور فرعون کی تباہی اور ان کی باعزت رستگاری نے ان کے لیے ہر قسم کی کامرانیوں کی راہیں کھول دیں۔

﴿ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ۭ ﴾ (الاعراف: ۱۳۷)

"اور بنی اسرائیل پر تیرے رب کا کلمہ نیک پورا ہو کر رہا بسبب اس بات کے کہ انہوں نے صبر سے کام لیا۔"

⑦ غلامی اور محکومانہ زندگی کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہمت و عزم کی روح پست ہو کر رہ جاتی ہے اور انسان اس ناپاک زندگی کے ذلت آمیز امن و سکون کو نعمت سمجھنے اور حقیر راحتوں کو سب سے بڑی عظمت تصور کرنے لگتا ہے، اور جدوجہد کی زندگی سے پریشان و حیران نظر آتا ہے، اس کی زندہ شہادت بھی ان بنی اسرائیل کی زندگی کا وہ نقشہ ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آیات و بینات دکھانے، عزم و ہمت کی تلقین کرنے اور خدا کے وعدہ کامرانی کو باور کرانے کے باوجود ان میں زندگی اور پامردی کے آثار نظر نہیں آتے اور وہ قدم قدم پر شکووں اور حیرانیوں کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔

ارض مقدس میں داخلہ اور وعدہ نصرت کے باوجود بت پرست دشمنوں کے مقابلہ سے انکار کے وقت جو یہ تاریخی جملے انہوں نے کہے وہ اس حقیقت کے لیے شاہد عدل ہیں:

﴿ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ ﴾

"اے موسیٰ (علیہ السلام)! تو اور تیرا رب دونوں جا کر ان سے لڑو، بلاشبہ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں یعنی تماشا دیکھتے ہیں۔"

⑧ وراثت زمین یا وراثت ملک اسی قوم کا حصہ ہے جو بے سروسامانی سے بے خوف ہو کر اور عزم و ہمت کا ثبوت دے کر ہر قسم کی مشکلات اور موانع کا مقابلہ کرتی اور "صبر" اور "خدا کی مدد پر بھروسہ" کرتے ہوئے میدان جدوجہد میں ثابت قدم رہتی ہے۔

⑨ باطل کی طاقت کتنی ہی زبردست اور پرازشوکت و صولت کیوں نہ ہو انجام کار اس کو نامرادی کا منہ دیکھنا پڑے گا اور آخری انجام میں کامرانی و کامیابی کا سہرا ان ہی کے لیے ہے جو نیکوکار اور باہمت ہیں ﴿ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾۔

⑩ یہ "عادۃ اللہ" ہے کہ جابر و ظالم قومیں جن قوموں کو ذلیل اور حقیر سمجھتی ہیں، ایک دن آتا ہے کہ وہی ضعیف اور کمزور قومیں خدا کی زمین کی وراثت بنتی اور حکومت و اقتدار کی مالک ہو جاتی ہیں اور ظالم قوموں کا اقتدار خاک میں مل جاتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی مکمل داستان اس کے لیے روشن ثبوت ہے۔

﴿ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝ ﴾ (القصص: ۵-۶)

"اور ہم چاہتے تھے کہ جو لوگ ملک میں کمزور کر دیئے گئے ہیں ان پر احسان کریں اور ان کو پیشواء بنائیں اور انہیں ملک کا

وارث کریں اور ملک میں ان کو طاقت وقدرت دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر کو وہ چیز دکھا دیں جس سے وہ ڈرتے تھے۔"

⑪ طاقت وحکومت اور دولت وثروت میں سرشار جماعتوں کا ہمیشہ سے یہ شعار رہا ہے کہ سب سے پہلے وہی "دعوت حق" کے مقابلہ میں نبرد آزما ہوتی ہیں مگر قوموں کی تاریخ یہ بھی بتلاتی ہے کہ ہمیشہ حق کے مقابلہ میں ان کو شکست ہوتی رہی ہے اور انجام کاران کو ناکامی ونامرادی کا منہ دیکھنا پڑا ہے، اس کے لیے نہ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ تنہا شاہد ہے بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت حق اور مخالف طاقتوں کی مخالفت کا انجام تاریخی شہادت بن کر حقیقت بیں انسانوں کے لیے درس عبرت دیتا رہا ہے۔

⑫ جو ہستی یا جو جماعت دیدہ دانستہ حق کو حق جانتے ہوئے بھی سرکشی کرے اور خدا کی دی ہوئی نشانیوں کی منکر ونافرمان بنے تو اس کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ ان سے قبول حق کی استعداد فنا کر دیتا ہے کیونکہ یہ ان کی پیہم سرکشی کا قدرتی ثمرہ ہے۔

﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾

"عنقریب میں اپنی نشانیوں سے ان کی نگاہیں پھیر دوں گا جو ناحق خدا کی زمین میں سرکشی کرتے ہیں۔"

اس آیت کا اور اس قسم کی دوسری آیات کا یہی مطلب ہے جو سطور بالا میں ذکر کیا گیا، یہ مطلب نہیں ہے کہ خدائے تعالیٰ کسی کو بے عقلی اور گمراہی پر مجبور کرتا ہے۔

⑬ یہ بہت بڑی گمراہی ہے کہ انسان کو جب حق کی بدولت کامرانی وکامیابی حاصل ہو جائے تو خدا کے شکر وسپاس اور عبودیت ونیاز کی جگہ مخالفین حق کی طرح غفلت وسرکشی میں مبتلاء ہو جائے، افسوس کہ بنی اسرائیل کی داستان کا وہ حصہ "جو فرعون سے نجات پا کر قلزم عبور کرنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے" اسی گمراہی سے معمور ہے۔

⑭ دین کے بارہ میں ایک بہت بڑی گمراہی یہ ہے کہ "انسان صداقت وسچائی کے ساتھ اس پر عمل پیرا نہ ہو اور خواہش نفس کو امام بنا کر احکام الٰہی میں مرضی کے مطابق حیلہ سازیاں تراشے اور خود فریبی میں مبتلاء ہو کر یہ سمجھ بیٹھے کہ من مانی بھی ہو گئی اور دین کا اتباع بھی ہو گیا۔ برائی کو برائی سمجھ کر اس میں مبتلاء ہونا اس درجہ شنیع نہیں ہے جتنا کہ برائی کو بھلائی کا رنگ دے کر اور منہیات میں حیلہ سازی کر کے اس کا جواز پیدا کرنا مذموم ومکروہ ہے، حق تعالیٰ کی جانب سے اکثر وبیشتر قوموں پر عذاب اسی قابل نفرت عمل کی وجہ سے ہوتا رہا ہے۔

یہود نے بھی "سبت کے متعلق" یہی طریقہ اختیار کیا تھا اور عذاب الٰہی کے مستحق ٹھہرے تھے، سبت کے دن بنی اسرائیل کو شکار کی ممانعت تھی اور پورا دن عبادت کے لیے مخصوص تھا، انہوں نے کچھ عرصہ تو اس حکم پر صبر کیا لیکن زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے، اور حیلہ یہ اختیار کیا کہ سبت سے پہلی رات میں دریا کے کنارہ پر گڑھے کھود کر پانی کا بہاؤ اس طرف کر دیتے اور صبح ہوتے مچھلیاں خود بخود ان گڑھوں میں آ جاتیں اور بنی اسرائیل شام کو ان کو قبضہ میں کر لیتے، اور جب خدا کے نیک بندے اس حیلہ پر اعتراض کرتے تو بڑے فخر سے کہتے کہ ہم نے سبت کے احترام کو کب شکست کیا ہے جو تم معترض ہوتے ہو، مگر خدا کے عذاب نے جب ان کو آ لیا تب ان کو معلوم ہوا کہ دین میں حیلہ سازی کس قدر خوفناک جرم ہے۔

⑮ کوئی حق کو قبول کرے یا نہ کرے حق کے داعی کا فرض ہے کہ وہ موعظت حق سے باز نہ رہے، چنانچہ سبت کی بے حرمتی پر ان ہی میں سے بعض اہل حق نے ان کو سمجھایا تو بعض نے یہ بھی کہا کہ یہ ماننے والے نہیں ہیں ان کا سمجھانا بیکار ہے مگر پختہ کار داعیان حق نے جواب دیا:

﴿مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴾

"قیامت میں خدا کے سامنے ہم معذرت تو کر سکیں گے کہ ہم حق تبلیغ برابر ادا کرتے رہے، اور ہم کو غیب کا کیا علم، کیا عجب ہے کہ پرہیزگار بن جائیں؟"

⑯ کسی قوم پر جابر و ظالم حکمران کا مسلط ہونا اس حکمران کی عند اللہ مقبولیت و سرفرازی کی دلیل نہیں ہے بلکہ وہ خدا کا ایک عذاب ہے جو محکوم قوم کی بدعملیوں کے پاداش عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، مگر محکوم قوم کی ذہنیت پر جابر طاقت کا اس قدر غلبہ چھا جاتا ہے کہ وہ اس کی قہرمانیت کو ظالم حکمران پر خدا کی رحمت اور اس کے اعمال کا انعام سمجھنے لگتی ہے، چنانچہ فرعون اور بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ "جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دلانے کے لیے ان کو ابھارا اور انہوں نے قدم قدم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اپنی شکایتوں اور مصر میں غلامانہ خوش حال زندگی بسر کرنے کی دوبارہ تمناؤں کا اظہار کیا ہے" اس کے لیے شاہد عدل ہے، قرآن عزیز نے اس حقیقت کو اس معجزانہ انداز میں بیان کیا ہے:

﴿وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ﴾ (الاعراف: ۱۶۷)

"اور جب ایسا ہوا کہ تیرے پروردگار نے اعلان کر دیا تھا (اگر بنی اسرائیل بدعملی اور سرکشی سے باز نہ آئے تو) وہ قیامت کے دن تک ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرے گا جو انہیں ذلیل کرنے والے عذاب میں مبتلا رکھیں گے۔"

⑰ جب فرعون اور اس کی قوم کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدائے تعالیٰ سے دعا کی، خدایا! اب ان بدکرداروں کو ان کی سرکشی اور بدعملی کی سزا دے کہ یہ کسی طرح راہ راست پر نہیں آتے، مگر جب بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء کی استجابت کا وقت آتا اور خدا کے عذاب کی علامتیں شروع ہوتیں تب فوراً فرعون اور اس کی قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہتی: اگر اس مرتبہ یہ عذاب ہم پر سے دفع ہو گیا تو ہم ضرور تیری بات مان لیں گے اور جب وہ دفع ہو جاتا تو پھر بدستور تمرد اور سرکشی کرنے لگتے، اس طرح ایک عرصہ تک ان کو مہلت ملتی رہی اور جب کسی طرح کج روی سے باز نہ آئے تو آخر کار عذاب الٰہی نے اچانک ان کو آ لیا اور ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیا، اسی طرح سبت کی بے حرمتی کرنے والوں کو مہلت ملتی رہی۔ مگر جب وہ کسی طرح باز نہ آئے تو خدا کے عذاب نے ان کا خاتمہ کر دیا۔

یہ اور امم ماضیہ کے اسی قسم کے دوسرے واقعات اس امر کی دلیل ہیں کہ جب کوئی قوم یا کوئی جماعت بدکرداری اور سرکشی میں مبتلا ہوتی ہے تو خدا کا قانون یہ ہے کہ ان کو فوراً ہی گرفت میں نہیں لیا جاتا بلکہ بتدریج مہلت ملتی رہتی ہے کہ اب باز آ جائے، اب سمجھ جائے اور اصلاح حال کر لے، لیکن جب وہ آمادہ اصلاح نہیں ہوتی اور ان کی سرکشی اور بدعملی ایک خاص حد تک پہنچ جاتی ہے تو پھر خدا کی گرفت کا سخت پنجہ ان کو پکڑ لیتا ہے اور وہ بے یار و مددگار فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔

⑱ کسی ہستی کے لیے بھی "وہ نبی یا رسول ہی کیوں نہ ہو" یہ مناسب نہیں کہ وہ یہ دعویٰ کرے کہ مجھ سے بڑا عالم کائنات میں کوئی نہیں بلکہ اس کو خدا کے علم کے سپرد کر دینا بہتر ہے کیونکہ ﴿وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴾ اس کا ارشاد عالی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جلیل القدر رسول و پیغمبر اور جامع صفات و کمالات نبوت ہونے کے بعد جب یہ فرمایا کہ میں سب سے بڑا عالم ہوں تو خدا نے ان کو تنبیہ کی اور خضر علیہ السلام سے ملاقات کرا کے یہ بتایا کہ ان صفات کمال کے باوجود علم الٰہی اسرار اس قدر بے غایت و بے نہایت ہیں کہ ان میں سے چند امور کو اس نے ایک بزرگ ہستی پر ظاہر کر دیا تو موسیٰ علیہ السلام ان تکوینی اسرار کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

⑲ پیروان ملت اسلامیہ کے لیے "غلامی" بہت بڑی لعنت اور خدا کا بہت بڑا غضب ہے اور اس پر قانع ہو جانا گویا عذاب الٰہی اور لعنت خداوندی پر قناعت کر لینے کے مترادف ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت حق دیتے ہوئے پہلا مطالبہ یہ کیا کہ بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے آزاد کر دے تا کہ وہ میرے ساتھ ہو کر آزادانہ توحید الٰہی کے پرستار رہ سکیں اور ان کی مذہبی زندگی کے کسی شعبہ میں بھی جابرانہ اور کافرانہ اقتدار حائل نہ رہ سکے۔

﴿وَ قَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٤﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿١٠٥﴾﴾ (الاعراف: ۱۰۴۔۱۰۵)

"اور موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا! اے فرعون! میں جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا ایلچی ہوں، میرے لیے کسی طرح زیبا نہیں کہ اللہ پر حق اور سچ کے علاوہ کچھ اور کہوں، بلاشبہ میں تمہارے لیے تمہارے پروردگار کے پاس سے دلیل اور اشارہ لایا ہوں، پس تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔"

﴿فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿١٧﴾﴾ (الشعراء: ۱۶۔۱۷)

"پھر وہ دونوں فرعون کے پاس آئے پس انہوں نے کہا: ہم بلاشبہ جہانوں کے پروردگار کے پیغمبر اور ایلچی ہیں، یہ پیغام لے کر آئے ہیں کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور غلامی سے ان کو چھٹکارا دے۔"

سورۂ شعراء کی یہ آیت تو اس مسئلہ کی اہمیت کو اس درجہ رفیع ظاہر کر رہی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبر کی بعثت کی غرض و غایت ہی یہ تھی کہ انبیاء علیہم السلام کے مشہور خانوادہ بنی اسرائیل کو فرعون کے جابرانہ اور کافرانہ اقتدار کی غلامی سے آزاد کرائیں اور نجات دلائیں۔

نیز سورۂ اعراف کی آیات کو اگر غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی یہی حقیقت نمایاں ہے، اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں اول اپنی رسالت کا اعلان کرتے ہیں اور پھر خدا کی جانب سے رشد و ہدایت کی دعوت دیتے اور آیات بینات کی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے اپنی بعثت کا مآل اور نتیجہ یہی بیان فرماتے ہیں:

﴿فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿١٠٥﴾﴾

"پس بنی اسرائیل کو (اپنی غلامی سے نجات دے کر میرے ساتھ کر دے)۔"

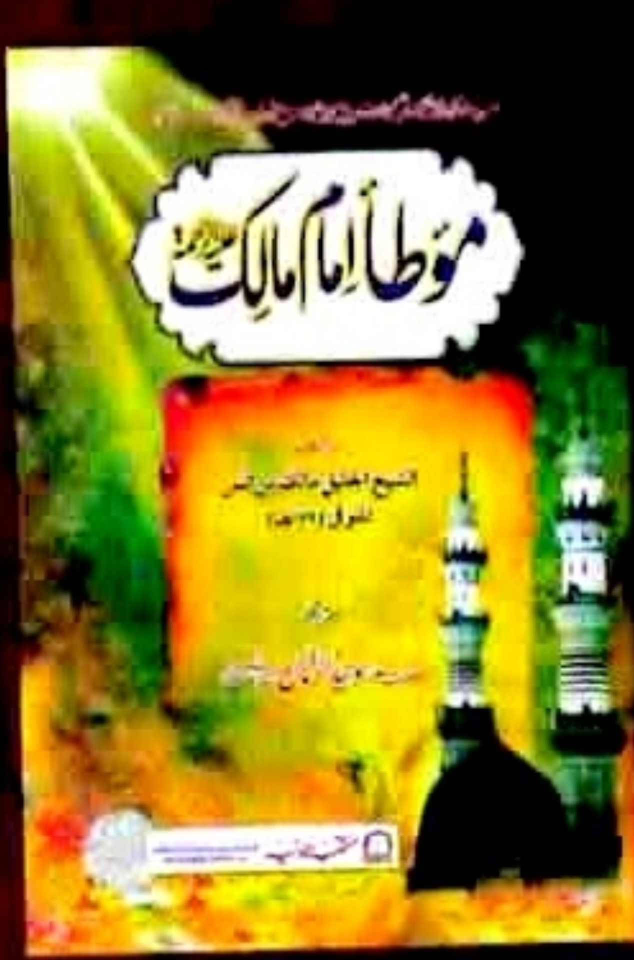
پھر یہ بات بھی توجہ کے لائق ہے کہ دعویٰ نبوت و رسالت کے بعد اگرچہ عرصہ دراز تک موسیٰ علیہ السلام کا قیام مصر میں رہا تاہم بنی اسرائیل پر اس وقت تک قانون ہدایت (تورات) نہیں اترا جب تک ان کو فرعون کی غلامی سے نجات نہیں مل گئی اور وہ ظالمانہ اقتدار کے پنجہ استبداد سے نجات پا کر ارض مقدس واپس نہیں آ گئے۔

﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ﴾

ہماری چند دیگر

خوبصورت اور معیاری مطبوعات









مکتبہ رحمانیہ

اقراء سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
Tel: +92-42-37224228 , 37355743
E-mail: maktabarehmania@gmail.com